مجالس العلم

علم اور مصادرِ علم

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

مجالسُ العِلمِ

عِلم اور مصادرِ علم

مجالسُ العلم

علم اور مصادرِ علم

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

تصنیف: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ترتیب و تخریج : جلیل اَحمد ہاشمی، سبط جمال پٹیالوی

نظر ثانی : محمد یوسف منہاجین، محمد خلیق عامر

زیر اِہتمام : فریدِ ملّت ؒ رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ - Research.com.pk

مطبع : منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور

اِشاعت نمبر 1 : جون 2017ء [1,100 - پاکستان]

قیمت :

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز کی CDs/DVDs وغیرہ سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے تحریکِ منہاجُ القرآن کے لیے وقف ہے۔

fmri@research.com.pk


بسم الله الرحمن الرحيم

مولاي صل وسلم دائما أبدا

على حبيبك خير الخلق كلهم

محمد سيد الكونين والثقلين

والفريقين من عرب ومن عجم

اللهم صل على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه وبارك وسلم

فہرس

۞ حرفِ آغاز 33

باب نمبر 1

مجالس العلم کی فضیلت و اَہمیت 41

۱۔ بہترین مجالس اور اچھے ہم نشین کون ہیں؟ 44

۲۔ صالح شخص کی محض زیارت کرنا باعثِ خیر و برکت کیسے؟ 46

۳۔ ماحول کے اِنسانی جسم و روح پر اَثرات 48

۴۔ دنیوی مجالس کے اِنسانی زندگی پر اَثرات 49

۵۔ مجالس العلم کے اِنسانی اَعمال پر اَثرات 50

قواعدِ تفسیر 51

۶۔ مجالس العلم کی اَہمیت اور فرامینِ رسول ﷺ 53

(۱) مجالس العلم جنت کے باغات ہیں 54

(۲) مجلسِ علم کو مجلسِ ذکر پر فضیلت حاصل ہے 55

مجلسِ علم و فقہ کی وجہِ فضیلت 56

(۳) مجالسِ علم وحکمت مردہ دلوں کو حیاتِ نو بخشنے کا باعث ہیں 58
(i) علماء وخطباء اور واعظین کے لیے نصیحت آمیز پہلو 59
(ii) حوالہ (reference) دینے کی اہمیت 60

باب نمبر 2

فضیلت و اَہمیتِ علم 63
۱۔ علم، نیابتِ اِلٰہی کے حصول کا باعث ہے 66
۲۔ علم وحکمت کا باہمی تعلق 68
۳۔ کلامِ اِلٰہی کا عنوان 'الکتاب' رکھنے کی حکمت 70
۴۔ جہل سے یقین تک سفرِ علم کے مراحل 70
۵۔ دورِ حاضر کا اَلمیہ 72
علم کا غلط اِستعمال کرنے والے لوگ 74
۶۔ آیاتِ متشابہات بھی قطعی ویقینی علم کی حامل ہیں 76
۷۔ اَلرَّاسِخُوْن فِي الْعِلْم کا مقام ومرتبہ 79
(۱) اَلرَّاسِخُوْن فِي الْعِلْم پر اللہ تعالیٰ کی عنایات 80
(۲) اَلزُّسُوْخ فِي الْعِلْم کی علامت 82
۸۔ عقل کی لامحدودیت کا تصور مادیت کا فتنہ ہے 83

۹۔ اَہلِ علمِ اِلٰہیہ، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور معبودیت کے گواہ ہوتے ہیں 84

۱۰۔ علمِ نبوت کی بے حساب جہات اور اِنسانیت پر حضور ﷺ کے گراں قدر اِحسانات 85

(۱) تلاوتِ آیات 86

(۲) تزکیۂ نفوس 86

(۳) تعلیمِ کتاب 87

(۴) تعلیمِ حکمت 87

۱۱۔ صاحبانِ علم کی حفاظت کا اُلوہی انتظام 88

باب نمبر 3

علم کی تاثیر اور مراتبِ علم 93

۱۔ علم الکتاب کی طاقت اور مؤثریت 95

اَلْعَالِم بِأَمْرِ اللہ اور اَلْعَالِم باللہ میں فرق 98

۲۔ علم الکتاب کی تاثیرات کا حامل کون ہے؟ 98

۳۔ قلب و باطن پر علم کے وارِد ہونے کی کیفیات و درجات 99

(۱) بیرونی نفاذ (External enforcement) 100

(۲) اندرونی نفاذ (Internal enforcement) 100

۴۔علم کا باطن پر ورود اور اِصلاحِ قلب 101
۵۔حقیقی علم کیا ہے اور حقیقی عالم کون ہے؟ 102
۶۔قرآن مجید کی پہلی وحی اور علم کی سمت کا تعین 104
۷۔مراتبِ علم 104
۸۔کمالِ علم کب اور کسے نصیب ہوتا ہے؟ 109
۹۔صاحبِ علم الیقین پر وارد ہونے والی تجلیات 112

باب نمبر 4

التفقّہ فی الدین اور اُس کے اِبلاغ کی فضیلت 115

۱۔علم اور فقہ میں فرق 117
۲۔التفقّه في الدين کی نعمت بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ سے نصیب ہوتی ہے 118
۳۔التفقه في الدين کی خیرات ہر ایک کا نصیب نہیں ہوتی 120
۴۔اللہ تعالیٰ کے صاحبِ خیر پر تین اِنعامات 122
(۱) التفقّه في الدين 123
(۲) الزهد في الدنيا 124
(۳) نفس کے عیوب سے آگہی 125
۵۔دین کی معرفت افضل ترین عبادت ہے 125

۶۔ التفقّه في الدين کا حامل روحانی طور پر ہزار عابدین سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے 126

۷۔ واردات، مکاشفات اور تجلیات کی پرکھ کا پیمانہ کیا ہے؟ 131

۸۔ فضیلتِ فقہ 132

۹۔ فضیلتِ اِبلاغِ علم 133

۱۰۔ دورِ جدید کا سب سے بڑا علمی اَلمیہ 135

۱۱۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی مبلّغ کے لیے خصوصی دعا 136

۱۲۔ اِبلاغِ علم کے لیے با صلاحیت اَفراد کی اَہمیت 137

۱۳۔ مبلغینِ علم کے لیے نبوی بشارات 141

۱۴۔ فضیلتِ حصولِ علم 146

۱۵۔ مجالسِ اَنبیاء کی جھلک، مجالسِ علماء میں دکھائی دینی چاہیں 149

۱۶۔ معرفتِ دین کے حصول کی شرائط 150

(۱) طہارتِ قلوب 150

(۲) قناعت و توکل اِختیار کرنا 151

(۳) حصولِ علم میں فلاح کن لوگوں کا مقدر بنتی ہے؟ 153

۱۷۔ طلبِ علم میں مجاہدہ، جنت کا راستہ ہے 154

۱۸۔حصولِ علم کے راستے کا ہر عمل عبادت ہے 156
ہر جگہ بارگاہِ اِلٰہی بن سکتی ہے 157
۱۹۔ دین کے علم اور فہم کا حصول افضل ترین عبادت ہے 161
اَہم علمی نکتہ! 162
۲۰۔حصولِ علم کا ارادہ ہی باعثِ ثواب ہے 162
۲۱۔حصولِ علم کے دوران اِتفاقی موت بھی شہادت ہے 164
۲۲۔ جنت میں اَہلِ علم کا درجہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد ہوگا 165
فضیلتِ علم کا بنیادی سبب 167
۲۳۔حصولِ علم کے ہمہ جہتی فضائل و اَثرات 170
(۱) حصولِ علم، خشیتِ اِلٰہی کا سبب ہے 171
(۲) حصولِ علم، عبادت و تسبیح ہے 171
(۳) حصولِ علم میں جستجو، جہاد ہے 173
(۴) فروغِ علم، صدقہ ہے 174
(۵) فروغِ علم، حصولِ قربتِ اِلٰہیہ کا ذریعہ ہے 175
(۶) علم، حلال و حرام میں تمیز کرنا سکھاتا ہے 175
۲۴۔حصولِ علم کی برکت سے حوضِ کوثر تک رسائی ہوتی ہے 176
۲۵۔علم کا ایک باب سیکھنا سال بھر کی نفلی عبادات سے افضل ہے 177

۲۶۔علم میں اضافے کی دعا اور جستجو کرنا سنتِ اَنبیاء علیہم السلام ہے 178
۲۷۔حصولِ علم کے لیے سفر کرنا سنتِ انبیاء علیہم السلام ہے 179
۲۸۔حصولِ علم کے لیے اَئمہ کا سفر 180
(۱) مضمونِ حدیث کی وضاحت 184
(۲) اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے 187
(۳) ایک نیکی کا اجر 20 لاکھ کے برابر، مگر کیسے؟ 189
(۴) اجر کے درجات 191
(۵) خلوصِ نیت کو اجر کی آرزو سے آلودہ نہ کیجیے! 193

باب نمبر 5

علم: حصولِ ہدایت اور بلندیِ درجات کا ذریعہ 195
۱۔عظمتِ قرآن کی جہات 197
(۱) قرآن منبعِ علم ہے 198
(۲) قرآنی علم، ہدایت ہے 198
(۳) قرآنی علم، رحمت کے حصول کا یقینی طریقہ ہے 199
۲۔ بنیادی دینی علم کا حصول فرضِ عین ہے 200
۳۔ دینی علوم میں تخصّص فرضِ کفایہ ہے 200

علمِ دین میں تخصّص کے مقاصد 202
۴۔قرآن سے حصولِ ہدایت کے تقاضے 203
تقوی، ہدایت اور خوف کی درمیانی منزل ہے 204
۵۔حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے 206
۶۔قرآن مجید مفصّلِ علم ہے 207
۷۔انبیاء کرام علیہم السلام اور فضیلتِ علم 209
بلندیِ درجات علم سے مشروط ہے 213
۸۔اللہ تعالیٰ علم اور فقر کو جمع فرماتا ہے 214
۹۔رسولِ مکرم ﷺ معلّم کائنات ہیں 219
۱۰۔نبوت اور ولایت دونوں کے لیے علم لازم وملزوم ہے 220
(۱) اپنے سے کم مرتبہ سے بھی حصولِ علم سنتِ اَنبیاء علیہم السلام ہے 222
(۲) کراماتِ اولیاء، معجزاتِ انبیاء علیہم السلام کا تسلسل ہیں 223
(۳) اُمتِ محمدیہ کے اولیاء کی سب سے بڑی کرامت، کرامتِ علمیہ ہے 223
(۴) علم، ولایتِ کبریٰ کے حصول کا ذریعہ ہے 224
۱۱۔اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ سے لامحدود وسائط اور ابواب کے ذریعے علم عطا فرماتا ہے 225
۱۲۔انسانی ذرائعِ علم محدود ہیں 226

باب نمبر 6

علمِ نافع اِیمان کو ترقی دیتا ہے 229

۱۔علمِ وحی تمام علوم پر فائق ہے 231

۲۔اضافۂ علم کی دُعا اوراس کی فضیلت 232

۳۔علم ہمیشہ اِرتقاء پذیر رہتا ہے 234

۴۔علمِ نبوتِ محمدی ﷺ کا کمال 235

۵۔حضور ﷺ کے عملِ اِستغفار کے رموز و اسرار! 236

۶۔ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؟ 238

۷۔علم باعثِ نجات ہے 240

۸۔ ذرائعِ علم 242

کتاب ذریعہ علم ہے 243

۹۔علمِ حقیقی کے ذرائع اور مصادر 244

۱۰۔کسی چیز کی حقیقت تک رسائی اُس سے متعلقہ علم سے ہی ممکن ہے 245

۱۱۔علم، ہدایت اور کتابِ منیر کے فہم کے لیے قرآنی اَمثال 247

(۱) تشکیلِ اِنسان اور دیگر مراحلِ اِرتقاء 248

(۲) زمین کی زرخیزی کے مراحل کا بطور دلیل ذکر 252

باب نمبر 7

حصولِ علم کے ذرائع 255

۱۔ علم کی اَقسام 257

(۱) علمِ قدیم 257

(۲) علمِ حادث 258

(i) علمِ ضروری 258

(ii) علمِ مُکتَسب 259

۲۔ علم کی تقسیم: متکلمین کے نقطہ نظر کی روشنی میں 260

(۱) جہلِ بسیط 260

(۲) جہلِ مرکب 260

مجرد ذہنی تصور کے مراتب 261

(i) وہم 261

(ii) شک 262

(iii) ظن 262

(iv) علم 263

۳۔ ذرائعِ علم 263

(۱) حسیّات 264

i۔حسِ سامعہ 265
ii۔حسِ باصرہ 265
iii۔حسِ لامسہ 265
iv۔حسِ ذائقہ 266
v۔حسِ شامہ 266
حواسِ خمسہ کا طریقہ کار 266
(۲) وجدانیات 268
(۳) بدیہیات وفطریات 270
(۴) عقلیات 271
(۵) متواترات 271
(۶) تجربیات 272
(۷) حدثیات 273

باب نمبر 8

جہاں تک حواس کی رسائی ہے، بس وہاں تک عقل کی شناسائی ہے 275
۱۔علم کیا ہے؟ 277

حاصلِ کلام 280
۲۔عمیق مشاہدہ اہلِ اسلام کی میراث ہے 282
۳۔مسلمانوں کے وقار کا راز علم اور کردار میں مخفی ہے 284
۴۔آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ! 285
۵۔حواسِ خمسہ ظاہری اور عقل کا باہمی تعلق 286
ہر ظاہر کا ایک باطن ہے 286
۶۔عقل کے حواسِ باطنی 289
(۱) حسِ مشترک 289
(۲) حسِ خیال 290
(۳) حسِ واہمہ 290
(۴) حسِ حافظہ 290
(۵) حسِ متصرّفہ 291
۷۔حواسِ ظاہری اور حواسِ باطنی کی محدودیت 292
حواس کے محتاج ہونے کی چند مثالیں 292
۸۔عقل کے فرائض 293
۹۔عقل کی ماہیت، نوعیت اور حیثیت 294

۱۰۔ عقل کا لغوی معنیٰ 296
۱۱۔ انسانی عقل اور مابعد الطبعیات سے متعلق سوالات 299
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے 299

باب نمبر 9

حصولِ علم کے باطنی ذرائع 303
۱۔ باطنی ذرائعِ علم کا قرآن وسنت سے اثبات 306
(۱) وحی کی صورتیں 306
(i) براہِ راست کلام 307
(ii) پردے کے پیچھے سے کلام 307
(iii) فرشتے کے ذریعے کلام 308
(۲) وحی اور وجدان میں فرق 308
۲۔ کشف، معجزہ اور کرامت 313
کشف و کرامت کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اثبات 315
۳۔ باطنی ذرائعِ علم کا ماخذ 317
۴۔ کشف کا کمال 320

باب نمبر 10

حصولِ علم اور قلب 323

۱۔ انسانی شخصیت کے بنیادی جواہر 325
۲۔ دل اور قلب میں فرق 326
۳۔ ایمان کی بنیاد تصدیق بالقلب ہے 326
۴۔ قلب کیا ہے؟ 328
۵۔ قرآن مجید میں قلب کا ذکر 331
۶۔ قلب کے احوال و کیفیات 338
۷۔ نورِ الٰہی کے دو چشمے: قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ 342
۸۔ مومن کا سینہ چراغ دان، جبکہ مومن کا قلب چراغ ہے 343
۹۔ قلبِ مومن پر علوم و معارف کی بارشوں کا نزول 345
۱۰۔ علمِ حق اور علمِ باطل میں فرق 347
۱۱۔ تزکیۂ قلب کی اہمیت 349
۱۲۔ صحبتِ صالحہ کے قلب پر اثرات 349
(۱) سہل پسندی ایک زہرِ قاتل ہے 351
(۲) خود احتسابی کا ایک شاندار پیمانہ 352

باب نمبر 11

حصولِ علم اور اِلہام 355

۱۔ الہام و کشف کے انکار کا سبب: علمی مزاج میں اختلاف 357

(۱) فنونِ علم میں مزاج کا تضاد کارفرما ہے 358

(۲) فروعی اختلاف پر کسی فردِ واحد کا فتویٰ عینِ اِسلام یا علم قطعی نہیں ہوتا 360

(۳) لفظ 'اجماع' کی غلط فہمی اور درست تصریح 361

(۴) ہر اجماع، اجماعِ قطعی نہیں ہوتا 363

(۵) مفتی صاحبان کا فتویٰ کس درجہ میں آتا ہے؟ 364

(۶) کسی ایک عالم یا بعض علماء کے فتویٰ سے اختلاف کفر نہیں ہے 366

۲۔ علومِ کشفیہ، علومِ لدنیہ اور علومِ الہامیہ قطعی طور پر مسلّم ہیں 367

(۱) علامہ شوکانی کا 'الہام' پر نقطہ نظر 368

(۲) اِمام ابن الصلاح کا 'الہام' پر نقطہ نظر 369

(i) خاطر کیا ہے؟ 370

(ii) ہاجز کیا ہے؟ 372

(iii) علم ہمیشہ ارتقاء پذیر رہتا ہے 373

(iv) الہام کے لیے تقویٰ شرطِ اوّل ہے 374

فجور کا الہام شیطان کی طرف سے اور تقویٰ کا الہام فرشتوں کی طرف سے ہوتا ہے 376

۳۔علم لدنی کیا ہے؟ 378

(۱) الہام اور علم لدنی میں فرق 379

(۲) خیر من جانب اللہ نصیب ہوتی ہے، جب کہ شر اپنے نفس سے جنم لیتا ہے 380

۴۔علم لدنی کا سلسلہ بدستور قائم ہے 381

۵۔علمِ فرقانی کا حصول تقویٰ کے ذریعے ممکن ہے 383

۶۔التباس سے نکلنے کا راستہ تقویٰ ہے 387

۷۔حصولِ معرفت تقویٰ ہی کے مرہون منت ہے 390

(۱) لطائفِ خمسہ 391

(۲) علومِ خفی سے انکار ممکن نہیں ہے 392

۸۔ اِلہام کا ماخذ کیا ہے؟ 393

باب نمبر 12

حصولِ علم اور مراتبِ نفس 399

۱۔الہام قلب میں کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے؟ 401

۲۔نفس درجہ بدرجہ کیسے ترقی پاتا ہے؟ 402

(۱) نفسِ اَمّارہ 403
نفسِ اَمارہ کی صفات 403
(۲) نفسِ لوّامہ 405
نفسِ لوامہ کی صفات 406
(۳) نفسِ ملہَمہ 407
نفسِ ملہمہ کی صفات 408
(۴) نفسِ مطمئنہ 409
نفسِ مطمئنہ کی صفات 412
(۵) نفسِ راضیہ 412
نفسِ راضیہ کی صفات 413
(۶) نفسِ مرضیہ 413
نفسِ مرضیہ کی صفات 415
(۷) نفسِ کاملہ (صافیہ) 415
جنت کی اقسام و درجات 416
نفسِ کاملہ صافیہ کی صفات 422
۳۔ نفس کی صفات کیسے تبدیل ہوتی ہیں؟ 422
۴۔ احوال کا بدلنا: ایک مثال سے وضاحت 424

۵۔ لطائفِ روحانیہ کیا ہیں؟ 425
(۱)لطیفۂ نفس 426
(۲)لطیفۂ قلب 426
(۳)لطیفۂ روح 427
(۴)لطیفۂ سِر 427
(۵)لطیفۂ خفی 427
(۶)لطیفۂ اخفیہ 428
۶۔ ہر ایک کے حسبِ حال تجلیاتِ الٰہیہ کا ظہور 429
۷۔ الہام پر قرآنی دلائل 430
(۱) حضرت مریم علیہا السلام کے واقعہ سے اِلہام پر اِستدلال 431
(۲) حضرت موسٰی علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کے واقعہ سے اِلہام پر اِستدلال 436
(۳) اُمتِ محمدیہ اور اِلہام 438

باب نمبر 13

اِلہام اور اُس کے مقامات 441

۱۔ ملائکہ کا نزول صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ہی مخصوص نہیں 443

۲۔ اِلہام کے نزول کی صورتیں 452

(۱) انسان نیکی یا بدی کے راستے کا انتخاب خود کرتا ہے 453

(۲) شیطان کے مکر و فریب 458

(۳) شیطان کی کرشمہ سازی: گم راہ بھی خود کو ہدایت پر سمجھتا ہے 461

(۴) شیطانی حربوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے 463

۳۔ اِلہام و اِلقاء کا عمل کیسے تشکیل پاتا ہے؟ 464

(۱) علمِ جلی 465

(۲) علمِ خفی 465

۴۔ علمِ خفی کے مراتب 469

(۱) مغیبات کا آشکار ہونا 470

غیب جاننے سے کیا مراد ہے؟ 471

(۲) مرتبہ اسماع 472

(i) اسماع کی اقسام 476

(ا) مرتبہ نازلہ 476

(ب) مرتبہ عالیہ 477

(ii) الہام کے راستے میں آنے والے حجابات 478

(ا) الحُجب العقدية 479
(ب) الحُجب القولية 479
(ج) الحُجب العملية 480
(د) حجب الكبا ئر الباطنة 480
(ر) حجب الصغائر الباطنة 480
(س) حجب الغفلة 481
(i) حجب التوسع فی المباحات 481
(ii) حجب التوسع فی الغفلات 481
(ص) حجب الخواطر 481
(۳) مرتبہ اِفہام 482
(۴) مرتبۂ بیان 486
(۵) مرتبہ تحدیث 486

باب نمبر 14

کشف اور علمِ لدنی 489
ا۔ کشف اور حجابات 491
(ا) غین 492
(۲) غیم 492

(۳) ران 492
۲۔قرآن مجید میں لفظ 'کشف' کا استعمال اور اس کے معانی 493
(۱) غفلت کا پردہ اٹھ جانا 493
(۲) قیامت کی ہولناکیوں سے پردہ اُٹھ جانا 494
(۳) عظیم نور سے پردہ اُٹھ جانا 495
۳۔کشف کی اصطلاحی تعریف 496
(۱) قرآن مجید کے غیبی معانی سے پردہ اُٹھنا 497
(۲) اُمورِ حقیقیہ کا فہم و ادراک 498
(۲) علومِ خفیہ کا اِکتشاف 498
۴۔کشف کیسے ہوتا ہے؟ 499
(۱) کشف کا اِدراک ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے ہے 500
(۲) کشفِ سرّی و کشفِ حسّی 500
(۳) کشف اور عالمِ مثال 501
(i) عالمِ مثال اور ہمارے خواب 501
(ii) رؤیا اور احلام میں فرق 505
(iii) رویائے صالحہ وحی کا چھیالیسواں حصہ ہیں 505
(iv) اَولیاء کے خواب بھی کشف ہوتے ہیں 508

(v) تعبیر کا تعلق صرف خواب سے نہیں، بلکہ صاحبِ خواب پر بھی منحصر ہے 509

۵۔ کشف کا دوسرا درجہ 'مشاہدہ' ہے 510

۶۔ کشف کا تیسرا درجہ 'معائنہ' ہے 511

۷۔ قرآن مجید سے کشف کا اِثبات 511

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے عجائباتِ خلق اور عالمِ ملکوت کا کشف 512

(۲) حضرت جبریل علیہ السلام کا مثالی شکل میں ظاہر ہونا 512

(۳) حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملکہ سبا بلقیس کا تخت منگوانا 514

مرتبۂ ولایت، نفس کی نفی کا تقاضا کرتا ہے 517

اَہم نکتہ 518

(۴) واقعہ موسیٰ و خضر علیہما السلام سے کشف کا اِستدلال 519

(i) پہلا کشف 522

(ii) دوسرا کشف 524

(iii) تیسرا کشف 525

واقعہ موسیٰ و خضر علیہما السلام سے کشف کے اِثبات پر حافظ ابن کثیر کا نقطہ نظر 526

'خضر' کی وجہ تسمیہ 529

باب نمبر 15

کشف اور مرتبۂ علمِ محمدی ﷺ 531

۱۔ غزوۂ بدر کے واقعات سے کشف کا اِثبات 533

۲۔ غزوۂ موتہ کے اَحوال سے کشف کا ثبوت 535

۳۔ نماز پنج گانہ میں اَحوالِ کشف کا رُونما ہونا 537

۴۔ حالتِ نماز میں جنت و دوزخ اور دیگر احوال کا کشف 540

(۱) جنت اور دوزخ کہاں وقوع پذیر ہیں؟ 545

(۲) وحی اور کشف میں فرق 546

(۳) حضور ﷺ کے علم کا اِرتقاء اور نکتۂ کمال 548

۵۔ زمان و مکان کے پردوں کا سمٹ جانا کشف کہلاتا ہے 550

۶۔ معجزۂ معراج مشاہدات و معائنات اور مکشوفات پر مبنی ہے 552

۷۔ قبر میں دیدارِ مصطفیٰ ﷺ بھی کشف کے ذریعے ہوگا 555

مثال سے وضاحت 560

۸۔ حضور ﷺ کے مقامِ شاہدیت سے اِثباتِ کشف 563

گواہ کے لیے موقع پر موجودگی لازم ہے 565

۹۔ کشف سے حوضِ کوثر کو دیکھنا 567

وحیِ خفی اور وحیِ جلی میں فرق 568

۱۰۔ کشف کے ذریعے شاہِ حبشہ نجاشی کے اِنتقال کی خبر دینا 570
(۱) معجزہ اور کشف میں فرق 571
(۲) کشف کے لیے مسلم یا غیر مسلم کی شرط نہیں 572
۱۱۔ حضور ﷺ پر قبروں کے اندر کے حالات کا کشف ہونا 573
۱۲۔ کشفِ محمدی ﷺ زمانوں اور فاصلوں کا محتاج نہیں ہے 574

باب نمبر 16

صحابہ کرام اور اَولیاء عظام کے مکاشفات 575
۱۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مکاشفات 577
(۱) سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کشف 577
کشف اور کرامت کیا ہے؟ 578
(۲) سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا کشف 581
(۳) سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا کشف 584
(۴) سیدنا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کا کشف 586
(۵) سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا کشف 590
(۶) امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا کشف 591
(۷) حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا کشف 592
(۸) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا کشف 593

(۹) ایک صحابیِ رسول کا کشف 595
(۱۰) شہداءِ اُحد علیہم السلام کے حوالے سے کشف 596
۲۔ اولیاء و صالحین کا کشف 599
(۱) امام زین العابدین علیہ السلام کا کشف 599
(۲) حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا کشف 600
(۳) حضرت سعید بن میبّب کا کشف 602
(۴) حضرت سفیان ثوری کا کشف 604
(۵) حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کا کشف 604
(۶) امام ابو الحسینؒ نوری کا کشف 605
(۷) شیخ اسماعیلؒ الحضرمی کا کشف 607
(۸) سیدنا شیخ عبد القادر الجیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا کشف 609
(۹) بعض دیگر اولیاء کرام کے متفرق مکاشفات 611

باب نمبر 17

کشف پر ائمہ کرام اور فقہاء و محدثین عظام کا عقیدہ 617
۱۔ امام علاؤ الدین سمرقندی (۳۳۳-۳۷۳ھ) 619
۲۔ امام ابو القاسم القشیری (۳۷۶-۴۶۵ھ) 619
۳۔ امام غزالی (۴۵۰-۵۰۵ھ) 620

۴۔ علامہ زمخشری (۴۶۷-۵۳۸ھ) 623
۵۔ قاضی ابو بکر بن العربی (۴۶۸-۵۴۳ھ) 624
۶۔ امام فخر الدین رازی (۵۴۴-۶۰۴ھ) 624
۷۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (۵۶۰-۶۳۸ھ) 629
۸۔ امام نووی (۶۳۱-۶۷۶ھ) 629
۹۔ علامہ ابنِ تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) 630
۱۰۔ امام ابن الحاج المالکی (م۷۳۷ھ) 636
۱۱۔ امام تاج الدین السبکی (۷۲۷-۷۷۱ھ) 637
۱۲۔ امام جلال الدین سیوطی (۸۴۹-۹۱۱ھ) 639
قبر میں حضور ﷺ کی پہچان کا تعلق قلبی معرفت سے ہے یا ظاہری کشف سے؟ 643
۱۳۔ محمد بن عبد الوہاب نجدی (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ) 644
۱۴۔ علامہ شوکانی (۱۱۷۳-۱۲۵۰ھ) 645
۱۵۔ علامہ آلوسی (م۱۲۷۰ھ) 646
۱۶۔ حاصلِ کلام 647
۞ مصادِر و مراجع 649

حرفِ آغاز

آج کے مادیت زدہ دور میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علم کا ذوق اور رجحان رخصت ہو رہا ہے۔ دینی و دنیوی علم سے شغف رکھنے والے لوگ ہوں یا جدید ٹیکنالوجی سے دلچسپی رکھنے والے، غرضیکہ تمام طبقات میں علم کی رغبت، محبت اور مطالعہ کا ذوق تقریباً ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے آنے کے بعد ہر مطلوبہ علمی مواد انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع سے online میسر ہے۔ جسے جیسا مواد ملے وہ اسی پر اکتفا کر لیتا ہے اور خود تحقیق کی مشقت میں پڑنا گوارا نہیں کرتا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ محض انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر اکتفا کرنے سے ہم نہ صرف صحیح اور پختہ علم سے محروم ہوتے جا رہے ہیں بلکہ تحقیق و تنقید کے بنیادی اصولوں سے بھی صرفِ نظر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انٹرنیٹ پر موجود مختلف عنوانات سے آرٹیکلز اور مختلف موضوعات پر اپنی ذاتی آرا بغیر تحقیق و تصدیق کے upload کر دی جاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں بنیادی کتب تک رسائی نہ ہونے اور تصدیق کا کوئی موثر ذریعہ نہ ہونے کے سبب معاشرے میں غلط تصورات فروغ پاتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ مضامین زیادہ تر علمی ثقاہت و اِستناد سے عاری ہوتے ہیں۔ ان مضامین کے غیر مصدقہ مواد کا بڑا حصہ کاپی پیسٹ ہو رہا ہوتا ہے، ایک نے لکھا دوسرے نے copy کر کے آگے لکھ دیا، تیسرے نے مزید copy کر کے اس سے بھی آگے لکھ دیا۔ مضامین و مقالات کا مواد بغیر تحقیق کے آگے منتقل کیا جا رہا ہے مگر اصل مصادر اور منابع تک آرٹیکل لکھنے والے اور copy کرنے والے (اِلّا ما شاء اللہ) کسی ایک کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ لہٰذا غیر تحقیقی مضامین کی صورت میں بہت سی اَغلاط اور غیر حقیقی تصورات نقل در نقل تبادلے کے باعث مسلسل آگے پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

تحقیق میں سخت کوشی و عمق بینی اور عرق ریزی کا رجحان اب برائے نام رہ گیا ہے۔ علم کی طلب رکھنے والوں کی جدید ذرائع کے باوجود اصل کتب، متون، حواشی، شروح، اُمہات

الکتب، علم کے اصل مصادر، ماخذ اور منابع تک رسائی نہیں ہوتی۔ اصل ماخذ سے مطالعہ کرنے کا ذوق ختم ہو چکا ہے، بس کمپیوٹر چلایا اور علم کی تلاش شروع کر دی۔ یعنی فرمانِ رسول ﷺ کے مطابق علم کا طوفان تو ہے مگر اِفہام وتفہیم ندارد۔ جیسے آج کل کے بچوں کو جب جمع تفریق ضرب اور تقسیم کرنا نہیں آتا تو وہ کیلکولیٹر کا استعمال کرتے ہوئے جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کر لیتے ہیں۔ جس زمانے میں کیلکولیٹر اور کمپیوٹر نہیں ہوتے تھے تو اساتذہ بچوں کو پہاڑے (tables) یاد کروایا کرتے تھے۔ بچے جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم سب خود زبانی طور پر کرتے تھے۔ اس مشق میں دماغ کا بھرپور استعمال ہوتا تھا۔ آدمی جیسے جیسے ٹیکنالوجی پر انحصار کر کے دماغ کا استعمال کم کرتا جا رہا ہے، ویسے ویسے دماغی صلاحیتیں بھی کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ دماغ کی یہ خوبی ہے کہ اسے جتنا استعمال کریں، اتنا ہی تیز ہوتا اور شاندار کارکردگی دکھاتا ہے۔

جس طرح عمر بھر دل خون pump کرتا رہتا ہے مگر تھکتا نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی بھی انجن ایسا نہیں ہے جو پچاس، ساٹھ یا سو سال تک کام کرتا رہے اور مسلسل قائم رہے مگر خالقِ کائنات کا بنایا ہوا دل، خون pump کرنے کا ایسا آلہ ہے کہ اگر انسان کی عمر سو سال ہے تب بھی روزانہ pumping کرتا ہے، یہ کبھی تھکتا نہیں ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسے آرام کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اِسی طرح اگر بندے کی عمر سو سال ہو جائے اور وہ اپنے دماغ کو روزانہ اٹھارہ سے بیس گھنٹے استعمال کرے تب بھی دماغ نہیں تھکتا بلکہ اس کی صلاحیت خوب سے خوب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ عجیب زمانہ آ گیا ہے کہ ہم دماغی صلاحیتوں کو بھرپور اِستعمال کرنے کے بجائے صرف جدید ٹیکنالوجی پر انحصار کر رہے ہیں۔

مغربی دنیا میں جدید ٹیکنالوجی کی بھرمار ہے۔ لہٰذا دیگر شعبوں کی طرح مریضوں کے علاج کے لیے بھی اس پر انحصار بڑھ گیا ہے۔ مریض کی نبض دیکھ کر مرض کی تشخیص کرنے کے بجائے ایکسرے، CT scan، MRI اور بے شمار ٹیسٹ تجویز کر دیے جاتے ہیں۔ اندازہ کریں کہ اب دماغی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے بجائے محض رپورٹ سے تشخیص ہوگی۔ اگر ایک، دو ٹیسٹس سے پتہ نہیں چلتا تو کئی ٹیسٹ مزید لکھ دیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات مریض مہینوں پڑے رہتے ہیں اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ اسے کون سا مرض لاحق ہے۔ سمجھانا یہ مقصود ہے

کہ بندہ ہر شعبہ میں جدید ٹیکنالوجی کا محتاج ہو گیا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان اور بھارت کے ڈاکٹرز clinical checkup کے ذریعے مرض کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مریض کی غربت کے پیش نظر ٹیسٹ پر انحصار کے بجائے clinical checkup کے ذریعے اپنی دماغی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ علامات کے ذریعے مرض کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور اکثر و بیشتر شافی علاج تجویز کرتے ہیں۔ انسان جب جدید ٹیکنالوجی کا محتاج ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بنائی divine technology کا جسم کے اندر استعمال بند ہو جاتا ہے اور جب کسی شے کا استعمال نہ ہو تو پھر وہ چیز زنگ آلود ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ہمارے ہاں علم کا رجحان ختم ہو گیا ہے۔ کتابوں کی خریداری اور ان کا مطالعہ قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ ماضی میں ہمارے اکابرین بنیادی کتب کا مطالعہ کرتے، اصل مصادر کو دیکھتے، ایک ایک مسئلہ کے حل کے لیے سیکڑوں کتب کو کھنگالتے تھے۔ وہ یہ سب کسی مجبوری کے باعث نہیں کرتے تھے بلکہ یہ سب ان کے ذوق، مزاج اور طبیعت کا حصہ تھا۔ افسوس! اب تحقیق و جستجو کے وہ سب ذرائع ختم ہو چکے ہیں کہ جن کے ذریعے ہمیں نسل در نسل علم منتقل ہوا ہے۔ ائمہ متقدمین و علماء ساری ساری رات مطالعہ کرتے، محدود ذرائع نقل و حمل کے باوجود علم کے حصول کے لیے دور دراز کے سفر کرتے، تصنیف و تالیف کرتے اور پڑھاتے تھے۔ اس کے برعکس آج وہ ساری چیزیں ایک click کرنے سے سکرین پر آ جاتی ہیں۔ آج کل ہم فوری مطلوبہ مواد تک رسائی کے عادی ہو چکے ہیں۔ فکر و تدبر اور عمیق بینی ختم ہو چکے ہیں۔ کمپیوٹر سے کوئی بھی مسئلہ کتاب کی نسبت جلد مل جاتا ہے۔ دوسری طرف اگر کوئی معلومات یا رہنمائی کتاب کے ذریعے حاصل کرنا چاہیں گے تو متعدد کتابوں کو دیکھنا پڑے گا، متعلقہ ابواب کھولنے پڑیں گے، فصول اور عبارتیں پڑھیں گے اور اگر وہ چیز اس کتاب میں نہیں ملے گی تو دوسری کتب سے متعلقہ مسئلہ کے حل کی کوشش کریں گے۔ یہ سارا عمل کتابوں سے واقفیت اور آگہی دیتا ہے۔ علمی حوالے سے ایک چیز کی تلاش میں دیگر بہت سی چیزیں سامنے آتی ہیں اور انہیں پڑھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ افسوس! صد افسوس! کسی چیز کو جلد از جلد حاصل کرنے کی خواہش کی وجہ سے یہ تمام ثمرات و فوائد ہم سے چھن چکے ہیں۔

علم کے حصول کے لیے محنت کے اس رجحان کو دوبارہ زندہ کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ 'مجالس العلم' کے سلسلہ کو اس لیے شروع کیا گیا ہے کہ نہ صرف پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش، بلکہ سارے عالمِ اسلام اور مغرب میں رہنے والے طلبہ و طالبات، علماء، اساتذہ، متعلقین، تشنگانِ علم اور طالبانِ علم کو جھنجھوڑا جائے اور ان میں علم کے رجحان کو دوبارہ زندہ کرنے کا احساس پیدا کیا جائے۔

ذاتِ باری تعالیٰ کا صد بار شکر ہے کہ جس نے 'مجالس العلم' کی صورت میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی سلسلۂ تعلیم و تدریس اور سلسلۂ تربیت کے لیے دیرینہ خواہش کی تکمیل کے اسباب مہیا فرمائے۔ 'مجالس العلم' کے عنوان سے زیرِ نظر تصنیف ان کے ابتدائی 18 لیکچرز پر مشتمل ہے جو سلسلہ وار خطبات 'مجالس العلم' میں بیان کیے گئے ہیں۔

'مجالس العلم' کے سلسلۂ خطبات کے آغاز کا سبب اور غرض و غایت کچھ یوں ہے کہ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے چند سال قبل خاص طور پر جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن (کالج آف شریعہ اینڈ اسلامک سائنسز) لاہور کے طلبہ کے لیے اور عمومی طور پر ملک بھر کی دینی جامعات، دینی مدارس اور تعلیمی اداروں کے معلمین، متعلمین اور مستفیدین کے لیے علمی رہنمائی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ارادہ کیا تھا کہ پانچ بنیادی علوم پر عربی میں کچھ کتب تحریر کی جائیں، جنہیں بطور متن پڑھایا جائے۔ ان کا منشا یہ تھا کہ ان کتب کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ان میں شامل موضوعات پر سلسلہ وار دروس کا آغاز کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حضور نبی اکرم ﷺ کی توجہات کے سبب شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے 'مجالس العلم' کے عنوان سے مذکورہ کتب کے موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ 17 اکتوبر 2015ء کو شروع کر دیا۔

'مجالس العلم' کے آغاز کا دوسرا سبب یہ تھا کہ مدت سے شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی دلی خواہش تھی کہ جامعہ اِسلامیہ منہاج القرآن کے طلبہ و اساتذہ کے لیے بالخصوص اور دیگر علماء و محققین اور جمیع طالبانِ علم کے لیے بالعموم ہفتہ وار ایسے دروس کا آغاز کیا جائے کہ جن کا اُسلوب خطابیہ کے بجائے تدریسی ہو اور ان پُر مغز مجالس سے کثیر حلقات مستفید ہو

سکیں۔ اس سے قبل برطانیہ اور یورپ میں ایک عشرے سے 'الھدایۃ' کے عنوان سے بھی تین روزہ کیمپ منعقد ہوتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں برمنگھم میں 'دورۂ صحیح بخاری'، 'دورۂ صحیح مسلم'، 'دورۂ صحیحین' اور حیدر آباد دکن میں بھی اُصول الحدیث اور علم الحدیث کے موضوع پر تین روزہ دروس ہوئے؛ مگر یہ سلسلہ علمی وفکری اور تنظیمی مصروفیات کی بنا پر کافی عرصہ قبل منقطع ہو چکا تھا۔ دنیا بھر کے تشنگانِ علم کی علمی ضروریات کے پیش نظر ہفتہ وار دروس شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو الحمد للہ 'مجالس العلم' کی صورت میں وقوع پذیر ہوا ہے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے زیر اہتمام 'مجالس العلم' کی ان نشستوں کا مقصد علم کی فضیلت اور اہمیت کو واضح کرنا ہے۔

'مجالس العلم' کے عنوان سے آغاز کردہ اس سلسلے میں تعارفی موضوعات کے علاوہ اصول العقیدۃ، اصول التفسیر، اصول الحدیث، اصول الفقہ، اصول الادب و التربیۃ، الفقہ الحنفی والادلۃ الشرعیۃ اور دیگر کئی موضوعات کو اپنے اپنے وقت پر تفصیل سے زیر بحث لایا جائے گا۔ اس ضمن میں ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ ان مجالس میں جہاں کوئی چیز کتابی آتی ہو، جس کا حوالہ دینا ضروری ہو اس کا حوالہ دیا جائے تاکہ قارئین اُس کتاب کی طرف بھی رجوع کر سکیں۔ امیدِ واثق ہے کہ اس کاوش سے نہ صرف علمی رجحان کا اِحیاء ہو گا بلکہ قارئین و سامعین کو کتابوں، مصنفین، ائمہ اور اکابرین سے بھی شناسائی ہوگی۔ اس طریقۂ تدریس کو اِن شاء اللہ مجالس العلم میں بہرصورت برقرار رکھا جائے گا۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی جانب سے 'مجالس العلم' کے موضوعات کے تعین کے حوالے سے بھی وسیع تر مشاورت کی گئی کہ کن موضوعات کا انتخاب کیا جائے؟ آیا صحیح بخاری وصحیح مسلم پڑھائی جائیں یا صحاح ستہ پر دروس دیے جائیں؟ اصول الحدیث کی کسی کتاب کا آغاز کیا جائے یا علم الکلام کو موضوع بنایا جائے؟ اگر مختلف فنون پر سلسلہ وار دروس دینا ہوں تو اس میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ اُس سے کسبِ فیض والوں کی تعداد بہت محدود ہوتی ہے اور دنیا بھر میں موجود لاکھوں سامعین و قارئین اس سے کماحقہٗ مستفید نہیں ہو پاتے۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا

کہ رفقاء اور اِبتدائی کلاسز کے طلبہ کے لیے الگ جبکہ علماء اور منتہی کلاسز کے طلبہ کے لیے الگ نصاب اور مجالس کا اہتمام کیا جاتا۔ چنانچہ اس مسئلہ کے حل میں متقدمین کے اسلوب کو اختیار کیا گیا کہ جن کی مجالس علم میں بالعموم ایک ساتھ دس دس ہزار طلبہ شریک ہوتے تھے اور ان میں سے ہر ایک مُتَفَنِّن اور مُتَخَصِّص نہیں ہوتا تھا لیکن ہر کوئی اُن مجالس سے یکساں مستفید ہوتا تھا۔

ہم امام احمد بن حنبل، امام بخاری، ائمہ اربعہ اور دیگر اکابر ہستیوں کے احوال میں یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے دروس میں موجود ہر شخص کی علمی و فنی سطح اگرچہ ایک جیسی نہیں ہوتی تھی لیکن عوام و خواص میں سے ہر کوئی اُن سے یکساں مستفید ہوتا تھا۔ اس طرح ان مجالس العلم سے استفادہ کرنے والوں میں محدود طبقے کے بجائے کثیر تعداد میں لوگ شامل ہوتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی مجالس نہایت جامع ہوا کرتی تھیں۔ ان مبارک اور بابرکت مجالس العلم سے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یکساں اِکتسابِ فیض کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی ہر مجلس، مجلسِ علم اور ہمہ جہتی اوصاف کی حامل ہوا کرتی تھی۔ آپ ﷺ کی مجالس، ذکر، تلاوتِ قرآن، تفسیر، حدیث، فکرِ آخرت، فقہ، دعوت، تربیت اور استفتاء الغرض تمام موضوعات پر محیط اور جامع المقاصد ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے حضور نبی اکرم ﷺ اور ائمہ اکابرین کی اتباع میں 'مجالس العلم' کو ہمہ جہت بنانے کا ارادہ کیا اور 'مجالس العلم' کے اس منہج تک پہنچے جس سے آپ مستفید ہو رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب 'مجالس العلم' کی ابتدائی اٹھارہ مجالس پر مشتمل ہے، جن میں علم کی فضیلت و اہمیت اور اس کے مختلف روحانی و مادی ذرائع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان مجالس کی ترتیب و تدوین میں حضرت شیخ الاسلام کے ریسرچ اسسٹنٹ محمد ضیاء الحق رازی، FMRi کے شعبہ ادبیات کے اِنچارج جلیل احمد ہاشمی اور شعبہ ادبیات کے سرگرم رکن سبط جمال پٹیالوی کا کلیدی کردار ہے۔ محمد خلیق عامر اور ظفیر احمد ہاشمی نے بحسن و خوبی 'مجالس العلم' کو بروقت اور بسرعت نقل کرنے کا فریضہ ادا کیا ہے۔ محمد یوسف منہاجین نے ماہ نامہ منہاج القرآن کی اداراتی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ مجالس العلم کی نظر ثانی کا بھی بھرپور حق ادا کیا ہے۔ علاوہ

ازیں محمد اطہر فریدی نے تخریج کی، جب کہ حتمی طور پر حافظ ظہیر احمد الاسنادی نے پروف ریڈنگ اور تخریج کا بغور تجزیہ کیا ہے۔

بارگاہِ اِلٰہ میں دعا ہے کہ ان 'مجالس العلم' کے ذریعے علم کا رجحان زندہ ہو اور ہم اپنی بنیاد سے اپنے تعلق کو مضبوط و مستحکم کرتے ہوئے دنیا کی امامت و قیادت کا فریضہ سرانجام دینے کے قابل ہوسکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین بجاہِ سید المرسلین ﷺ)

مرکزِ علم و تحقیق

فریدِ ملّتؒ رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ (FMRi)

17 رَمَضَان 1438ھ

باب نمبر 1

مجالس العلم

کی فضیلت و اہمیت

انسان ساری زندگی دُنیوی اور اُخروی ترقی اور درجات کی بلندی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ ہر صاحبِ نظر شخص خواہش مند ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت اسے دنیا و آخرت دونوں میں بلندی و کمال عطا فرمائے۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ بلندی، کمال اور رفعت کا حصول کیسے ممکن ہے؟ ہم میں سے اکثر لوگ اس حقیقت سے نا آشنا ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ نے درجات کی بلندی کا ذریعہ 'مجالس' کو قرار دیا ہے۔ پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کون سی مجالس اور کن لوگوں کی مجالس؟ آیئے اس سلسلے میں قرآن مجید سے رہنمائی لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○[1]

اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ (اپنی) مجلسوں میں کشادگی پیدا کرو تو کشادہ ہو جایا کرو، اللہ تمہیں کشادگی عطا فرمائے گا اور جب کہا جائے کھڑے ہوجاؤ تو تم کھڑے ہوجایا کرو، اللہ اُن لوگوں کے درجات بلند فرما دے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہیں علم سے نوازا گیا، اور اللہ اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو خوب آگاہ ہے○

اس آیت کریمہ سے درج ذیل نکات اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ اس آیت کریمہ کے پہلے حصے میں 'المجالس' جبکہ آخری حصے میں 'العلم' کا ذکر ہے۔

---

(۱) المجادلة، ۵۸: ۱۱

ہمارے اِس تعلیم و تعلم کے تحریری سلسلے کا نام 'مجالس العلم' بھی قرآن مجید کی اسی آیت مبارکہ کے ان دو الفاظ سے ماخوذ ہے۔

۲۔ اللہ رب العزت نے اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو مجالس کے نشست و برخاست کے آداب سمجھانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اگر تم یہ آدابِ مجالس بجا لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان اور علم والوں کے درجات بلند فرمائے گا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے درجات کی بلندی اور مجالس کو باہم منسلک (correlate) کیا ہے۔

۳۔ اس آیت کریمہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مجلس میں بیٹھنے سے درجات کی بلندی تبھی نصیب ہوگی جب بیٹھنے والے کو کوئی روحانی و اُخروی نفع حاصل ہو اور اس کی خیر میں اضافہ ہو۔ بالفاظِ دیگر روحانی، اُخروی یا دینی کسی بھی اعتبار سے خیر میں اضافہ درجات کی بلندی کا باعث بنتا ہے۔ یاد رہے کہ 'خیر' میں اضافہ تبھی ہوتا ہے جب بیٹھنے والے کو مجلس سے درج ذیل دو چیزیں حاصل ہوں:

۱۔ ایمان

۲۔ علم

گویا کسی مجلس میں حاضری سے درجات کی بلندی کا حصول 'خیر' کے میسر آنے سے مشروط ہے اور 'خیر' کا اضافہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب اس مجلس العلم سے انسان 'ایمان' اور 'علم' کے نور سے منور ہو کر نکلے۔

۱۔ بہترین مجالس اور اچھے ہم نشین کون ہیں؟

اس ضمن میں ہمارے ذہن میں بہت سے سوالات سر اٹھاتے ہیں، مثلاً وہ کون سی مجالس ہیں جو بیٹھنے والوں کے ایمان اور علم میں اضافے کا باعث بنتی ہیں؟ کیسی مجالس اور کن اوصاف کے حامل ہم نشین کا انتخاب کرنا چاہیے؟ مجالس کے عنوان کیا ہوں؟ آیئے! اس سلسلے میں حضور نبی اکرم ﷺ کے ان فرامین سے رہنمائی لیتے ہیں جن میں حضور نبی اکرم ﷺ نے ایسی

مجالس اور ہم نشینوں کی صفات بیان فرمائی ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ﷺ، قَالَ: قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ، أَيُّ جُلَسَائِنَا خَيْرٌ؟ قَالَ: مَنْ ذَكَّرَكُمُ اللهَ رُؤْيَتُهُ، وَزَادَ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ وَذَكَّرَكُمْ بِالآخِرَةِ عَمَلُهُ.(۱)

حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ بیان کرتے ہیں کہ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! ہمارے بہترین ہم نشین کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس کا دیکھنا تمہیں اللہ کی یاد دلا دے، جس کا بولنا تمہارے علم میں اضافہ کرے اور جس کا عمل تمہیں آخرت کی یاد دلائے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث مبارک میں صالح جلیس کی صحبت کے تین ثمرات ذکر فرمائے ہیں:

۱۔ مَنْ ذَكَّرَكُمُ اللهَ رُؤْيَتُهُ (جس کا دیکھنا تمہیں اللہ کی یاد دلا دے)

۲۔ وَزَادَ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ (جس کا بولنا تمہارے علم میں اضافہ کرے)

۳۔ وَذَكَّرَكُمْ بِالآخِرَةِ عَمَلُهُ (جس کا عمل تمہیں آخرت کی یاد دلائے)

گویا ہم نشین اگر نیک، عبادت گزار، متقی، اللہ سے محبت کرنے والے، علم و عقیدۂ صحیحہ کے حامل، صدقِ نیت اور اخلاص کے پیکر ہوں تو ان کے ساتھ مل بیٹھنے سے بھی خیر نصیب ہوتی ہے، ایمان اور علم کا نور حاصل ہوتا ہے، گناہوں کی بخشش ہوتی ہے اور درجات بلند ہوتے ہیں۔

---

(۱) ۱۔ أبو يعلى، المسند، ۴: ۳۲۶، رقم: ۲۴۳۷
۲۔ عبد بن حميد، المسند، ۱: ۲۱۳، رقم: ۶۳۱
۳۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۷: ۵۷، رقم: ۹۴۴۶
۴۔ حكيم ترمذي، نوادر الأصول، ۲: ۳۹
۵۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۱: ۶۳، رقم: ۱۶۳
۶۔ هيثمي، مجمع الزوائد، ۱۰: ۲۶۲

حضور نبی اکرم ﷺ نے اِن جامع کلمات کے ذریعے مجالسِ علم کی برکات، صحبتِ صلحاء کے اثرات اور مجالس کے انعقاد کے مقاصد واضح فرما دیے ہیں۔

۲۔ صالح شخص کی محض زیارت کرنا باعثِ خیر و برکت کیسے؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی مجلس میں ظاہری طور کچھ بھی عمل نہیں کیا؛ محنت، ریاضت و مجاہدہ، نفل، تسبیح، تلاوت، الغرض کوئی خیر کا عمل نہیں کیا تو محض صالح شخص کی زیارت اور اُسے دیکھنا خیر کا عمل کیسے بن گیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی صالح جلیس (نیک ہم نشین) کے دیدار سے خیر اور برکت میسر آنا ایسے ہی ہے جیسے حضور نبی اکرم ﷺ نے متعدد احادیث مبارکہ میں مختلف ہستیوں اور اشیاء کی زیارت پر خیر و برکت کے حصول کی خوش خبری بیان فرمائی ہے۔

۱۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَلنَّظَرُ إِلَى الْكَعْبَةِ عِبَادَةٌ.[1]

کعبہ کو دیکھنا عبادت ہے۔

۲۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

اَلنَّظَرُ إِلٰى وَجْهِ عَلِيٍّ عِبَادَةٌ.[2]

علی کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔

---

(۱) ۱۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۴:۲۹۳، رقم: ۶۸۶۴
۲۔ فاكهي، أخبار مكة، ۱:۲۰۰، رقم: ۳۲۸

(۲) ۱۔ طبراني، المعجم الكبير، ۱۰:۷۶، رقم: ۱۰۰۰۶
۲۔ حاكم، المستدرك، ۳:۱۵۲، رقم: ۴۶۸۲، ۴۶۸۳
۳۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۵:۵۸

۳۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

اَلنَّظَرُ إِلٰی وَجْهِ الْعَالِمِ عِبَادَةٌ.(۱)

عالم کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔

۴۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا مِنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُ إِلٰی وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ إِلَّا كَتَبَ اللهُ لَهٗ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً.

(اولاد میں سے) جو صالح بیٹا بھی اپنے والدین کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھے گا تو اللہ تعالیٰ ہر نظر کے بدلے میں اس کے لیے مقبول حج کا ثواب لکھ دے گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! چاہے وہ دن میں سو بار دیکھے تب بھی اُسے یہ اجر ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

نَعَمْ، اَللهُ أَكْبَرُ وَأَطْيَبُ.(۲)

جی ہاں! کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے اور وہ سب (عیوب) سے پاک ہے (کہ اُس کے خزانوں میں عنایات کی کوئی کمی نہیں ہے)۔

الغرض حضور نبی اکرم ﷺ کی احادیث کی روشنی میں جیسے کعبۃ اللہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، عالمِ دین اور والدین کو دیکھنا خیر و برکت کا باعث ہے؛ اسی طرح صالح افراد کو دیکھنا، نیک متقی بندے کو سننا اور ان کی ہم نشینی اختیار کرنا بذاتِ خود (itself) عملِ خیر ہے۔

---

(۱) ديلمي، مسند الفردوس، ۴:۲۹۴، رقم: ۶۸۶۷

(۲) ۱۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۶:۱۸۶، رقم:۷۸۵۶

۲۔ إسماعيلي، معجم الشيوخ، ۱:۳۲۰، رقم:۷

۳۔ خطيب تبريزي، مشكاة المصابيح، ۳:۱۳۸۳، رقم:۴۹۴۴

۴۔ ہندی، كنز العمال، ۱۶:۱۹۹، رقم:۴۵۵۳۵

۳۔ ماحول کے اِنسانی جسم و روح پر اَثرات

صالح لوگوں کی محض زیارت انسانی جسم اور روح پر کیا اور کیسے اثرات مرتب کرتی ہے؟ اس بات کو ہم مادی زندگی کی چند اَمثال کے ذریعے سمجھتے ہیں:

۱۔ اگر کوئی شخص جسمانی طور پر تھکا ہارا اور طبیعت میں تلخی (depression) محسوس کرے تو ڈاکٹر اُسے سبزہ اور صاف ستھری کھلی فضاء میں کچھ لمحات گزارنے اور سیر کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ اس خوش گوار فضا میں سانس لینے اور ہریالی، باغ، پھول، درخت، پانی، جھیل اور قدرتی مناظر کو دیکھنے سے اس کی طبیعت کو تازگی (freshness) ملتی ہے اور اعصابی تناؤ کم ہوتا ہے۔

۲۔ ماں باپ کو اپنی پیاری اولاد دیکھنے سے ایک فرحت حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ اپنے محبوب دوست کو دیکھنے سے طبیعت میں فرحت و تازگی آتی ہے اور انسان کا باطن اس خوش گوار تبدیلی کو اس قدر محسوس کرتا ہے کہ اس کیفیت کا اظہار لکھنے، پڑھنے اور بیان کرنے سے قاصر ہے۔

یہ قدرت کا نظام ہے کہ جس طرح چیزیں جسم پر اثرات مرتب کرتی ہیں اسی طرح اشیاء اور ماحول کے اثرات قلب و روح پر بھی رونما ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عالمِ مادیات میں انسان کو پانچ حواس عطا کیے ہیں۔ ان حواسِ خمسہ سے وہ دیکھتا، چھوتا، سونگھتا، چکھتا اور سنتا ہے۔ انہی پانچ حواس کے ذریعے انسانی جسم پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جب من پسند کھانے کا ذائقہ چکھتے ہیں تو ایک لطف محسوس ہوتا ہے۔ کئی لوگوں کو موسیقی سے فرحت ملتی ہے۔ بعض لوگ نعت سنتے ہیں تو اس سے طبیعت میں راحت ملتی ہے۔ کچھ لوگ قوالی سنتے ہیں تو اس سماع سے ان پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ گویا ظاہری طور پر خود کوئی عمل نہیں کیا، محض ماحول سے خوشبو کا جھونکا آیا تو طبیعت تر و تازہ ہوگئی۔

اسی طرح ایک عالمِ قلب و روح بھی ہے۔ حواسِ خمسہ ظاہری کی طرح باطنی حواس

یعنی روح کے احساسات بھی ہیں جن پر کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ جب کوئی خوش اِلحان قاری قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کرتا ہے تو اس سے نہ صرف جسم پر اثرات وارد ہوتے ہیں بلکہ روح بھی معطر، منور اور سرشار ہو جاتی ہے اور نورِ ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید روح کی اس کیفیت کا تذکرہ اِن الفاظ میں فرماتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَo[1]

ایمان والے (تو) صرف وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (تو) ان کے دل (اس کی عظمت و جلال کے تصور سے) خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ (کلامِ محبوب کی لذت انگیز اور حلاوت آفریں باتیں) ان کے ایمان میں زیادتی کر دیتی ہیں اور وہ (ہر حال میں) اپنے رب پر توکل (قائم) رکھتے ہیں (اور کسی غیر کی طرف نہیں تکتے)o

اسی طرح وضو اور غسل بھی باطنی طہارت کا ذریعہ ہیں۔ ظاہراً ہم جسم کو دھوتے ہیں، مگر اس وضو اور طہارت کا نور اور اثرات قلب و باطن میں بھی سرایت کر جاتے ہیں۔ جس طرح ہم پھولوں کی خوش بو محسوس تو کرتے ہیں لیکن اسے بیان یا تحریر نہیں کر سکتے، اسی طرح کسی اللہ کے مقرب اور صالح بندے کو دیکھنے اور اس کی مجلس میں بیٹھنے سے اسی طرح کے خوش گوار اثرات روح پر بھی مرتب ہوتے ہیں جنہیں محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ دنیوی مجالس کے اِنسانی زندگی پر اَثرات

مندرجہ بالا اَمثال سے جب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ماحول کے انسانی جسم اور روح دونوں پر اثرات مرتب ہوتے ہیں تو اس بات کو سمجھنا مشکل نہیں رہا کہ مجالس کے اثرات انسان

(۱) الأنفال، ۲:۸

کے ظاہر اور باطن دونوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ مجالس کے ذریعے انسان اپنے ظاہری و باطنی درجات میں بلندی کا حق دار بھی قرار پا سکتا ہے اور زوال کا شکار بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا مجلس کے انتخاب میں احتیاط کا دامن لازم پکڑیں۔ صاحبِ مجلس منتخب کرتے ہوئے دیکھیں کہ کس کی مجلس میں بیٹھا جائے اور کس سے اجتناب کیا جائے۔ اگر مجلس گپ شپ، غیبت، چغلی، کذب، جھوٹ، مبالغہ آرائی اور ٹھٹھہ و مذاق کی ہوگی تو اس کے برے اثرات قلب و باطن اور روح پر مرتب ہوں گے۔ خواہ یہ مجلس مختصر ہو یا طویل، اپنے اثرات ضرور مرتب کرے گی۔

اگرچہ کوئی شخص بری مجلس میں خاموش بیٹھا رہے۔ وہ چاہے منہ سے کچھ نہ کہے محض سنتا رہے تب بھی برائی کے اثرات اس کے ظاہر و باطن پر ضرور مرتب ہوں گے۔ کیونکہ قوتِ سماعت و بصارت کے ذریعے وہ شریک نہ ہونے کے باوجود اپنے باطن کو گدلا کر رہا ہے۔ ماحول کی برائی کے بُرے اثرات آنکھوں اور کانوں کے ذریعے اس کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ ہمیں ماحول میں جو کچھ سنائی اور دکھائی دے رہا ہوتا ہے، یا جو کچھ ہم سونگھتے اور محسوس کرتے ہیں، یہ ساری کیفیات (feelings) ایک تصور بناتی ہیں، پھر انسان کے اندر نفسیات بنتی ہیں، جو ایک دماغی ماحول بنانا شروع کر دیتی ہیں۔

۵۔ مجالس العلم کے اِنسانی اَعمال پر اَثرات

اگر عام دنیوی مجالس اپنے اچھے یا برے اثرات رکھتی ہے تو مجالس العلم کے اثرات بھی ان مجالس میں شریک ہونے والا محسوس کرتا ہے۔ اللہ رب العزت نے انہی اثرات کا ذکر اس آیت کریمہ میں فرمایا ہے:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ.[1]

اللہ اُن لوگوں کے درجات بلند فرما دے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہیں علم سے نوازا گیا۔

(۱) المجادلة، ۵۸: ۱۱

قرآن مجید کی مذکورہ آیت کریمہ جہاں یہ واضح کر رہی ہے کہ مجالس سے انسان کے ظاہر اور باطن دونوں پر اثرات مرتب ہوتے ہیں اور مجالس العلم درجات کی بلندی کا باعث بنتی ہیں، وہاں مذکورہ آیت سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ اِن مجالس کے اثرات انسانی اعمال پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کے آخر میں ارشاد فرمایا:

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ○[1]

اللہ اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو خوب آگاہ ہے○

اس آیت کریمہ میں مجالس کے آداب، ایمان اور علم کا بیان ہے جبکہ عمل کا کوئی ذکر بیان نہیں ہوا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اختتام پر فرمایا کہ 'اللہ اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو خوب آگاہ ہے'۔ ان اختتامی کلمات میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس آیت کریمہ کے بیان سے جو ماحول پیدا ہو رہا ہے، وہ پڑھنے والے کو ایک خاص طرزِ عمل کی طرف لے جائے گا اور قاری اپنے اندر عمل کی ایک نہج کو متعین کرے گا۔ یعنی اس آیت کریمہ سے عمل کا تعین ہو رہا ہے کہ انسان کیسے عمل کرنے والا بنے گا اور عمل کس طرح اس کی زندگی پر اثرات مرتب کرے گا۔ لہٰذا وہ جیسے بھی اعمال کا مرتکب ہوگا، اللہ تعالیٰ ان تمام اعمال کو خوب جاننے والا ہے۔ اگر کسی مجلس سے علم اور ایمان میں اضافہ ہوا تو لازمی بات ہے کہ مجالس میں شریک افراد سے نیک اعمال صادر ہوئے ہوں گے اور اگر کسی مجلس میں شرکت کرنے والا اپنے نامۂ اعمال کو گناہوں کی سیاہی سے کالا کرتا رہا تو واضح ہو جائے گا کہ اُس نے بُری مجالس کا انتخاب کیا۔ گویا اس کے اعمال سے اس کی مجالس کے خیر اور شر ہونے کا تعین ہو جائے گا۔

قواعدِ تفسیر

یہاں ضمناً عرض کرتے چلیں کہ زیر بحث آیت کریمہ کی روشنی میں حسبِ ذیل اُصولِ تفسیر بھی واضح ہو رہے ہیں:

---

(۱) المجادلة، ۵۸: ۱۱

۱۔ قرآن مجید میں جس بھی مقام پر یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کے کلمات کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد دو قسم کے لوگ ہوں گے:

(۱) خاص مخاطب (۲) عام مخاطب

(۱) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کے خاص اور اولین مخاطب صحابہ کرام ﷺ ہیں کہ قرآن ان سے خطاب کر رہا ہے اور حضور نبی اکرم ﷺ کے ذریعے ان کی تعلیم و تربیت فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اوامر و نواہی قرآن مجید کے ذریعے نازل فرمائے، اس کے پہلے مخاطب، سامعین، متعلمین اور مستفیدین صحابہ کرام ﷺ تھے۔

(۲) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کے دوسرے مخاطب صحابہ کرام ﷺ کی وساطت سے قیامت تک آنے والی حضور ﷺ کی جمیع اُمت ہے یعنی حضور ﷺ کا ہر امتی اس خطاب کا مخاطب ہے۔

۲۔ اسی طرح قرآن مجید میں جہاں یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کے کلمات کے ذریعے خطاب کیا گیا ہے تو اس سے اُس وقت کے غیر مسلموں کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ وہ غیر مسلم، کفار و مشرکینِ مکہ ہوں یا ہجرت کے بعد مدینہ میں آباد غیر مسلم افراد۔ یعنی جب یٰٓاَیُّھَا النَّاس کہتے تو اس حکم کے اولین مخاطب (خاص مخاطب) کفارِ مکہ تھے جبکہ مسلمان اور تمام غیر مسلم مخاطبِ ثانی (عام مخاطب) تھے۔ مگر ان کے بعد اب قیامت تک ہر انسان خواہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم اس آیت کریمہ کا مخاطب ہے۔

۳۔ تفسیر کے اعتبار سے یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ مکی سورتوں میں یٰٓاَیُّھَا النَّاس جبکہ مدنی سورتوں میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ مدنی سورتوں میں اگر خطابِ عام مطلوب ہوتا تو اہلِ ایمان اور غیر اہلِ ایمان سب کے لیے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کے کلمات سے خطاب کیا جاتا۔

۴۔ کتبِ تفسیر میں ایک ہی آیت کے کئی اسبابِ نزول بیان کیے جاتے ہیں حالانکہ آیت تو ایک ہی وقت میں اُتری تھی اس کی وجہ کیا ہے؟ مثلاً کوئی آیت غزوۂ بدر، اُحد یا خندق

کے موقع پر اُتری؛ یا ہجرت، صلح حدیبیہ، غزوہ تبوک یا حجۃ الوداع کے موقع پر اُتری یا سفر و حضر میں اُتری تو کیا وجہ ہے کہ اُس کی کئی کئی شانِ نزول بیان کیے گئے ہیں؟ حالانکہ روایات، اطلاق اور انطباق میں فرق ہوتا ہے؟

یاد رہے کہ ہر آیت کا شانِ نزول بھی دو طرح کا ہوتا ہے:

۱۔ خاص

۲۔ عام

۱۔ جب کبھی کسی خاص موقع یا کسی معاملہ پر رہنمائی کی ضرورت پیش آئی تو صحابہ کرام ﷺ نے اس وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق کسی بات کو سمجھنے کے لیے کوئی سوال کیا یا کوئی حادثہ پیش آیا یا کوئی صورتِ حال (situation) سامنے آئی تو اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر کچھ آیات نازل فرما دیں۔ یہ خاص موقع اس آیت کے نزول کا سبب یا شانِ نزول کہلایا۔

۲۔ دورِ رسالت، صحابہ کرام ﷺ، تابعین اور اتباع التابعین کے زمانے میں پھر اُس جیسا کوئی واقعہ پیش آتا تو اس خاص واقعہ سے مماثلت کی وجہ سے کہتے: **نزلت في كذا و كذا** (یہ آیت اس وقت، ایسے موقع اور اسی مسئلہ کے لیے اُتری تھی)۔ یعنی اس آیت کے معنی کا جہاں جہاں اطلاق ہوا، تمام مواقع اس آیت کے شانِ نزول میں ذکر کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی وضاحت کر دی جاتی تھی کہ یہ آیت فلاں موقع پر فلاں واقعہ کے لیے نازل ہوئی تھی۔

لہٰذا ائمہ اُصولِ تفسیر نے اِس فرق کو واضح کیا کہ تاریخی سببِ نزول تو ایک ہی ہے اور وہی نزولِ خاص کا سبب ہے۔ مگر موارد، اطلاقات، احکام کی توسیع و تطبیق اور تنفیذ و انطباق کے اعتبار سے آیت کے ذیل میں مذکور تمام واقعات اَسبابِ نزول میں بالعموم داخل ہیں۔

۶۔ مجالس العلم کی اَہمیت اور فرامینِ رسول ﷺ

مجالس العلم کی اَہمیت اور مذکورہ آیت کریمہ سے کچھ اُصول و قواعدِ تفسیر جاننے کے

بعد آیئے! اب احادیثِ نبویہ کی روشنی میں مجالس العلم کی اہمیت سے آگہی حاصل کرتے ہیں۔

(۱) مجالس العلم جنت کے باغات ہیں

حضور نبی اکرم ﷺ نے مجالس العلم کو جنت کے باغات قرار دیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِذَا مَرَرْتُمْ بِرِيَاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوْا.

جب تم جنت کے باغات کے پاس سے گزرو تو (وہاں) بیٹھ کر فراخی کے ساتھ کھایا پیا کرو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا:

يَا رَسُوْلَ اللهِ، وَمَا رِيَاضُ الْجَنَّةِ؟

یا رسول اللہ! جنت کے باغات کیا ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

مَجَالِسُ الْعِلْمِ. (۱)

علم کی مجالس۔

متعدد کتب احادیث میں یہ حدیث مجلسِ ذکر کے الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔ یعنی حضور نبی اکرم ﷺ نے مجالسِ ذکر کو جنت کے باغ قرار دیا ہے۔ یہ احادیث باہم متعارض نہیں، کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجالس العلم درحقیقت مجالس الذکر ہی ہیں۔ کیونکہ علم میں ذکر کا

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۱۱: ۹۵، رقم: ۱۱۱۵۸
۲۔ منذری، الترغیب والترھیب، ۱: ۶۳، رقم: ۱۶۱
۳۔ ھیثمی، مجمع الزوائد، ۱: ۱۲۶
۴۔ مناوی، فیض القدیر، ۱: ۴۴۲

معنی بھی پایا جاتا ہے۔علم جامع ہے۔ خالی ذکر میں علم کا پورا معنی نہیں پایا جاتا مگر علم میں ذکر کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔

(۲) مجلسِ علم کو مجلسِ ذکر پر فضیلت حاصل ہے

مجالسِ علم، مجالسِ ذکر سے افضل ہیں اور مجالسِ علم میں سے وہ مجالس جو دینی علوم کی تفہیم پر مشتمل ہوں، جن میں قرآن و حدیث سے مسائل کا حل اخذ کرنے، دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے غور و فکر کیا جائے؛ ایسی مجالس، عمومی مجالس العلم سے بڑھ کر فضیلت کی حامل ہوتی ہیں۔حضور نبی اکرم ﷺ نے ایسی ہی مجالس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے جسے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے یوں روایت کیا ہے:

خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ مِنْ بَعْضِ حُجَرِهٖ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ، فَإِذَا هُوَ بِحَلْقَتَيْنِ إِحْدَاهُمَا يَقْرَءُوْنَ الْقُرْآنَ وَيَدْعُوْنَ اللهَ، وَالْأُخْرٰى يَتَعَلَّمُوْنَ وَيُعَلِّمُوْنَ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: كُلٌّ عَلٰى خَيْرٍ هٰؤُلَاءِ يَقْرَءُوْنَ الْقُرْآنَ وَيَدْعُوْنَ اللهَ فَإِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ، وَهٰؤُلَاءِ يَتَعَلَّمُوْنَ وَإِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا فَجَلَسَ مَعَهُمْ.

وفي رواية: يَتَفَقَّهُوْنَ وَيَتَعَلَّمُوْنَ.[1]

رسول اللہ ﷺ ایک روز اپنے کاشانۂ اقدس سے باہر تشریف لائے اور مسجد میں داخل

---

(۱) ۱۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ۱:۸۳، رقم: ۲۲۹
۲۔ دارمي، السنن، ۱:۱۱۱، رقم: ۳۴۹
۳۔ بزار، المسند، ۶:۴۲۸، رقم: ۲۴۵۸
۴۔ طيالسي، المسند، ۱:۲۹۸، رقم: ۲۲۵۱
۵۔ خطيب بغدادی، الفقيه والمتفقه، ۱:۹۰

ہوئے۔ وہاں دو حلقات منعقد تھے: ایک حلقہ قرآن کی تلاوت کر رہا تھا اور اللہ سے دعا کر رہا تھا اور دوسرا تعلیم وتعلم کا کام سرانجام دے رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: دونوں بھلائی پر ہیں۔ یہ حلقہ قرآن پڑھ رہا ہے اور اللہ سے دعا کر رہا ہے، خدا چاہے تو اس کی دعا کو قبول فرمائے، چاہے نہ قبول فرمائے۔ دوسرا حلقہ تعلیم وتعلم میں مشغول ہے اور میں بھی معلم بنا کر مبعوث فرمایا گیا ہوں۔ یہ فرما کر آپ ﷺ اس حلقے میں بیٹھ گے۔

ایک روایت میں ہے: (دوسری مجلس کے لوگ) فقہی مسائل سمجھ رہے تھے اور ان کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے دونوں مجالس کو خیر پر مبنی قرار دیا۔ لیکن وہ مجلس جو فہمِ دین (دینی وفقہی مسائل کو سیکھنے اور سکھانے) کی تھی جس میں لوگ علم حاصل کر رہے تھے، نہ جاننے والوں کو دین سمجھا رہے تھے، آپ ﷺ نے اس مجلس کو تعلیم دینے کی وجہ سے افضل قرار دیا۔ اس کے بعد مزید فضیلت بیان کرتے ہوئے اپنی بعثت کا مقصد بھی واضح فرما دیا کہ مجھے بھی تعلیم دینے کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے۔ معلمِ انسانیت حضور ﷺ نے اس دوہری فضیلت کے تذکرے کے بعد خود عملاً شرکت فرما کر مجالسِ فہم دین میں شرکت کو اپنی سنتِ مبارکہ بنا دیا۔ گویا حضور نبی اکرم ﷺ نے مجالس العلم کو اس قدر اہمیت عطا فرمائی کہ ایک طرف آپ ﷺ نے حلقۂ ذکر وعلم میں سے حلقۂ علم کا انتخاب فرمایا اور دوسری طرف تعلیم وتعلم کو اپنے منصب کے طور پر بیان فرمایا۔

مجلسِ علم و فقہ کی وجہِ فضیلت

مجلسِ علم کو مجلسِ ذکر پر فضیلت دینے کی کیا وجہ ہے؟ ایک طرف اللہ کا ذکر، عبادت اور مناجات ہے جبکہ دوسری طرف دین کی تفہیم اور فقہ کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ وضو، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، طہارت، عبادات، اخلاق، معاملات، مناکحات اور معاشرت کے اصول بتائے جا رہے ہیں۔ یہ مجلس اُس مجلسِ ذکر سے کیسے افضل ہوگئی جس میں ایک بندہ اپنے مالک ومولیٰ سے

لو لگائے ہوے اُسے منانے میں مصروف ہے؟

مجلسِ علم کو مجلسِ ذکر پر حاصل فضیلت کے کئی اسباب ہیں:

۱۔ پہلا سبب یہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے خود علم کی مجلس میں بیٹھنے والے لوگوں افضل قرار دیا کہ تعلیم و تعلم کا کام کرنے والے افضل ہیں کہ وہ ایک پیغمبرانہ فریضہ ادا کر رہے ہیں اور جاہل دنیا کو علم کا نور فراہم کر رہے ہیں۔ تعلیم و تعلم شیوۂ انبیاء ہے، اسی لیے حضور نبی اکرم ﷺ نے وَإِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا کے الفاظ کے ذریعے اپنے اس منصب کا اظہار فرمایا۔ لہٰذا وہ لوگ جو بعثتِ محمدی کے مقصد کو آگے بڑھانے کی جدوجہد کر رہے ہیں، وہ ذکر کرنے والوں پر فضیلت رکھتے ہیں، کیونکہ حضور نبی اکرم ﷺ تعلیم و ترویجِ اسلام کی جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ خود تشریف فرما ہوئے۔

۲۔ مجلسِ علم کو حاصل فضیلت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ بالعموم جب آدمی دعا کرتا ہے تو اپنے لیے کرتا ہے۔ اپنی پریشانی دور کرنے، صحت یابی، کامیابی، ہدایت، اولاد، جنت، بخشش، دنیوی اُمور میں کامیابی، اُخروی کامیابی یا اللہ تعالیٰ کی قرب و رضا کے حصول کی دعا کرتا ہے۔ عام عادت یہی ہے کہ اولاً بندہ اپنے لیے مانگتا ہے، جبکہ تعلیم و تعلم کا عمل اس کے برعکس ہے۔ 'تعلّم' اپنے لیے تاکہ اپنے اندر سے جہالت نکلے اور 'تعلیم' دوسروں کو جہالت سے نکالنے کے لیے ہے۔ تعلیم کے کام میں تمام انسانیت کی فلاح پوشیدہ ہے۔ جب معلم پڑھاتا ہے تو وہ دوسرے کی خیر مانگتا ہے، دوسرے کو صحیح راہ پر چلاتا ہے اور اس عمل سے اسے خود بھی نور اور ہدایت ملتی ہے۔ لہٰذا وہ عمل جس میں آدمی دوسرے کے لیے خیر چاہے، دوسروں کے لیے نفع بخشی کا ذریعہ بنے، وہ عمل درجہ کے اعتبار سے اُس عمل سے بہت بلند ہے جس میں انسان صرف اپنے لیے ہی اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا اور طلب گار رہتا ہے۔ چنانچہ مجالس العلم کا درجہ حضور نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ فرمان کے مطابق مجالس العبادۃ سے بھی بڑھ کر ہے۔

جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا خَيْرَ فِي قِرَائَةٍ إِلَّا بِتَدَبُّرٍ، وَلَا عِبَادَةَ إِلَّا بِفِقْهٍ، وَمَجْلِسُ فِقْهٍ خَيْرٌ مِنْ

عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً.[1]

تدبر (اور غور وفکر) کے بغیر تلاوت میں کوئی بھلائی نہیں ہے، نہ ہی دین میں سمجھ بوجھ کے بغیر کوئی عبادت ہے اور فقہ کی ایک مجلس ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

(۳) مجالسِ علم وحکمت مردہ دلوں کو حیاتِ نو بخشنے کا باعث ہیں

مجالس العلم کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے علماء، حکماء اور اولیاء و عارفین کی مجالس کو مُردہ دلوں کے اِحیا (زندگی) کا ذریعہ قرار دیا ہے کہ ان کی مجالس میں بیٹھنے اور ان کی باتوں کو غور سے سننے سے اللہ تعالیٰ مُردہ دلوں کو زندہ فرما دیتا ہے۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ لُقْمَانَ قَالَ لِابْنِهٖ: يَا بُنَيَّ، عَلَيْكَ بِمُجَالَسَةِ الْعُلَمَاءِ، وَإِسْتَمِعْ كَلَامَ الْحُكَمَاءِ. فَإِنَّ اللهَ يُحْيِي الْقَلْبَ الْمَيِّتَ بِنُوْرِ الْحِكْمَةِ كَمَا يُحْيِي الْأَرْضَ الْمَيِّتَةَ بِوَابِلِ الْمَطَرِ.[2]

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو (نصیحت کرتے ہوئے) کہا: میرے بیٹے! علماء کے پاس لازمی بیٹھنا اور حکماء کی گفتگو غور سے سننا کیونکہ اللہ تعالیٰ مُردہ دل کو نورِ حکمت

(۱) ۱۔ خطيب بغدادی، الفقيه والمتفقه، ۱:۹۷
۲۔ دمياطی، إعانة الطالبين:۱۵
۳۔ ابن القيم، مفتاح دار السعادة، ۱:۱۱۸

(۲) ۱۔ مالك، الموطأ، ۲: ۱۰۰۲، رقم: ۱۸۲۱
۲۔ طبرانی، المعجم الكبير، ۸: ۱۹۹، رقم: ۷۸۱۰
۳۔ ديلمی، مسند الفردوس، ۳: ۱۹۶، رقم: ۴۵۵۰
۴۔ منذری، الترغيب والترهيب، ۱: ۶۳، رقم: ۱۶۲
۵۔ ابن عبد البر، الاستذكار، ۸: ۶۱۶، رقم: ۱۸۹۱

سے زندہ کرتا ہے جس طرح کہ وہ مردہ زمین کو زور دار بارش سے حیات بخشتا ہے۔

(i) علماء و خطباء اور واعظین کے لیے نصیحت آمیز پہلو

اِس حدیث مبارک میں علماء، خطباء، طلبہ اور مبلغین کے لیے ایک نصیحت آموز پہلو یہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے جو کلمات ارشاد فرمائے، وہ آپ ﷺ سے پہلے حضرت لقمان علیہ السلام نے بیان فرمائے تھے۔ آپ ﷺ نے وہ کلمات بیان فرماتے ہوئے ان کا حوالہ (نام) ذکر فرمایا کہ حضرت لقمان علیہ السلام نے یہ کلمات ادا فرمائے تھے۔ بھلا یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ حالانکہ ایسے اقوال حضور نبی اکرم ﷺ کی اپنی تعلیمات کا بھی حصہ ہیں اور آپ ﷺ خود بھی ایسے ہی احکام فرمایا کرتے تھے۔

حضرت لقمان علیہ السلام کے حوالے سے ان کے کلمات کو ارشاد فرمانے سے اُمت کو تربیتی حوالے سے اس جانب متوجہ کرنا مقصود تھا کہ آپ ﷺ نے افضل الرسل ﷺ ہونے کے باوجود حضرت لقمان علیہ السلام کے نام کو اس خیال سے چھپایا نہیں کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیا سمجھیں گے کہ تاجدار کائنات، افضل الرسل، خاتم الانبیاء اور سید المرسلین ﷺ، سب سے بلند مرتبے پر فائز ہیں لیکن وہ حضرت لقمان علیہ السلام کے قول کو نقل کیوں فرما رہے ہیں؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس تو حضور ﷺ کی ذات کے سوا کوئی ذریعہ علم نہیں تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے تو علم کا منبع و مصدر محض حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس کوئی کتاب نہ تھی کہ وہ گھر جا کر تصدیق کر سکتے کہ یہ قول تو حضرتِ لقمان حکیم کا ہے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کا یہ فرمانا دیانت اور امانت کا بلند و اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔ آپ ﷺ نے اس عمل کے ذریعے اُمت کو سنت عطا کی ہے کہ جس کا قول ہو اُسے اُسی کی نسبت سے بیان کیا جائے۔

لہٰذا طالبانِ علم، خطباء و واعظین اور محققین پر لازم ہے کہ جب کوئی چیز بیان کریں تو اس کا ماخذ بھی ضرور بتائیں کہ وہ اقتباس کس سے لیا گیا ہے؟ کس امام کا قول ہے؟ کس کتاب

سے مطالعہ کیا ہے؟ بیان کرنے والے پر لازم ہے کہ اس کے متعلق اپنے سامعین کو بتائیں۔ تدریس کا مسنون طریقہ یہی ہے۔

(ii) حوالہ (reference) دینے کی اہمیت

بعض لوگ تقریر یا تحریر میں ماخذ کا حوالہ نہیں دیتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید سامعین و قارئین کہیں کہ یہ تو فلاں کی بات سنا رہا ہے اور اس طرح ان کی حیثیت کم ہو جائے گی؛ لوگ سمجھیں گے کہ اس کا علم کم ہے جو دوسرے کی بات کا سہارا لے رہا ہے۔ ایسا سوچنا نہ صرف حماقت اور سنتِ نبوی کے خلاف ہے بلکہ علمی خیانت بھی ہے۔ ماخذ بیان کرنے سے مرتبہ کم نہیں ہوتا بلکہ بلند ہوتا ہے۔ اس سے بیان کرنے والے کی ثقاہت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی بات کو زیادہ معتبر اور معتمد سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ جس کا حوالہ دے رہا ہے وہ علم میں اُس سے اونچا درجہ رکھتا ہے۔ پس علم میں اونچے درجے کی حامل شخصیت کا حوالہ و سند دینے سے بیان کرنے والے کی بات کی حیثیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہمارے ہاں مصدر اور ماخذ بتائے بغیر بات کرنا عام عادت ہے، تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ اتنا بڑا عالم، محقق اور مستخرج ہے کہ اتنی بڑی بات اپنی طرف سے کہہ رہا ہے۔ اس سے اس کا مقصود اپنی تعریف و توصیف کروانا اور اپنے علم کی دھاک بٹھانا ہوتا ہے کہ لوگوں میں اسے شہرت و نام وری حاصل ہو۔ بعض احباب تو مصدر یا حوالہ بیان کرنے کی بجائے یہ بیان کر دیتے ہیں: 'اللہ تعالیٰ نے یہ بات ابھی ابھی میرے دل میں ڈالی ہے'؛ 'یہ نکتہ ابھی ذہن میں آیا ہے'؛ 'اس سے پہلے یہ کسی نے بیان نہیں کیا'۔

یاد رکھیں! ایسا کلام صریحاً باطل اور کذب ہے، ہمیں ایسے گناہوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ علم دودھ کی طرح پاکیزہ شے کا نام ہے۔ اس میں ایسے پلید اعمال کو داخل کرنے سے یہ ناپاک ہو جاتا ہے اور اس سے برکت اُٹھ جاتی ہے۔ لہٰذا جو بات یا نظریہ جہاں سے لیں اس ماخذ، واسطہ اور وسیلہ کا ذکر ضرور کریں۔ جو آدمی واسطہ، مصدر اور ماخذ کو چھپاتا ہے، وہ برکت اور مزید فیض سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس منبع و مصدرِ علمی سے جو فیض اسے ملنا تھا، اس نے اپنے

عمل سے خود اپنے آپ کو اس سے محروم کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جن زبانوں اور اذہان کو دعوت و تبلیغِ حق کے لیے منتخب کرتا ہے، انہیں چاہیے کہ وہ سچ بولیں اور خیر کا کلمہ بیان کریں۔ وہ تصور کریں کہ میں علم کا چشمہ ہوں، مصدر نہیں اور پھر اس چشمے کی اصل اور ماخذ کو بیان کریں، اس سے مصدر و ماخذ کا فیض اور توجہ بھی نصیب ہوتی ہے۔

ماخذ کا حوالہ دینا تمام ائمہ حدیث وتفسیر کا معمول تھا۔ تمام کتب کو پڑھیں، ہر جگہ ائمہ حوالے دیتے ہیں کہ 'فلاں نے یہ کہا'، 'فلاں نے یہ کہا'۔ ان تذکروں کے ساتھ کتب کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ائمہ کا یہ معمول نہیں تھا کہ وہ اس طرح کہیں کہ 'میری اپنی معرفت اتنی ہوگئی ہے کہ میں اللہ کی معرفت کی باتیں خود بیان کر رہا ہوں'۔ لہٰذا جس سے کوئی بات لی جائے، اس کا حوالہ دینا نہ صرف ضروری ہے بلکہ علمی دیانت کا تقاضا بھی ہے۔

یاد رہے کہ علم کا حوالہ دینے میں یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ جس کا حوالہ دیا جائے وہ رتبے میں بھی بڑا ہی ہو۔ صحابہ کرام ﷺ میں سے کئی صحابہ نے تابعین سے روایت کیا اور اپنی سندِ حدیث میں ان کا نام لیتے ہیں۔ تابعین نے کئی مرتبہ تبع تابعین سے روایت کی اور ان کا نام لیا۔ صحابہ اکابر ہیں اور تابعین اصاغر ہیں۔ اس کے باوجود تابعی سے روایت کر کے اپنی سند میں بتا رہے ہیں کہ سَمِعْتُ عَنْ فُلَان کہ میں نے فلاں تابعی سے یہ بات سنی۔ یہ اس لیے کہ وہ تابعی اپنے تمام حلقاتِ علم میں معتمد اور معتبر ہے، اس کی ثقاہت اور صداقت پر اعتماد ہے۔ لہٰذا صحابہ کرام ﷺ اس احساسِ کم تری میں مبتلا نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی یہ سوچتے تھے کہ وہ مجھ سے چھوٹا ہے، میں اس کا حوالہ کیوں دوں؟ اپنا حوالہ کیوں نہ دوں!

علمِ حدیث کا اُصول ہے کہ اگر کوئی محدث اپنے شیخ / استاد (جس سے روایت لی ہے) کا نام نہیں لیتا تو وہ ائمہ حدیث کے ہاں 'مدلّس' کہلاتا ہے۔ نام چھپانے کا یہ عمل 'تدلیس' ہے یعنی محدث نے اپنے سے اوپر والے کا نام چھپایا اور یہ واضح نہیں کیا کہ اس حدیث کو اس نے کس سے لیا؟ لہٰذا اس کی تدلیس کے باعث محدثین نے اس پر بحث کی ہے کہ 'مدلّس' کی بات کو مانا جائے یا نہیں؟

سمجھانا یہ مقصود ہے کہ علم اور علم کی سند کو پاک، صاف، ستھرا اور متصل رکھیں، تاکہ آپ کی بات زیادہ مستند اور پختہ تسلیم کی جائے۔

باب نمبر 2

فضیلت و اَہمیتِ علم

مجالس العلم کی فضیلت و اَہمیت اور ان مجالس سے اِکتسابِ فیض کے تقاضوں کو جاننے کے بعد آیئے اب قرآن حکیم اور سنتِ مصطفیٰ ﷺ سے علم کی فضیلت و اہمیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک فرد کی انفرادی زندگی ہو یا اقوام کی اجتماعی زندگی؛ تمام کی ترقی علم ہی کی بدولت ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب سب سے پہلے نبی ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی اور انہیں اپنی خلافت و نیابت دینے کا ارادہ کیا تو ارشاد فرمایا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً. (۱)

اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارادے کو جاننے کے بعد ملائکہ نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یقیناً عبادت و بندگی ہی فضیلت کا معیار ہے، انہوں نے اپنی اس فضیلت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا:

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ ج وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ. (۲)

کیا تُو زمین میں کسی ایسے شخص کو (نائب) بنائے گا جو اس میں فساد انگیزی کرے گا اور خونریزی کرے گا؟ حالاں کہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور (ہمہ وقت) تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔

ملائکہ کا اپنی اس فضیلت کا اظہار کرنا گویا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے آپ کو نیابت

(۱) البقرة، ۲: ۳۰

(۲) البقرة، ۲: ۳۰

اور خلافت کا مستحق قرار دینا تھا کہ تیری بے انتہا عبادت و بندگی کے باعث ہم نیابت و خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ وہ عرض کناں تھے کہ اے اللہ! اس انسان کو خلیفہ کیوں بنا رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اس سوال پر حضرت آدم علیہ السلام کے بہت سے فضائل کے بجائے اُن کی صرف ایک ہی فضیلت کو تمام ملائکہ پر ظاہر فرمایا اور وہ فضیلت 'فضیلتِ علم' تھی۔ ارشاد فرمایا:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا.[1]

اور اللہ نے آدم (علیہ السلام) کو تمام (اشیاء کے) نام سکھا دیے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو محض نام ہی نہیں سکھائے بلکہ اشیاء کے نام مع صفات و افعال بھی سکھائے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ملائکہ پر واضح فرما دیا کہ انسان کو اپنا خلیفہ و نائب بنانے، اس کے سر پر اپنی نیابت کا تاج سجانے اور تمام مخلوقات پر اسے فضیلت دینے کا سبب صرف علم ہی ہے۔

۱۔ علم، نیابتِ اِلٰہی کے حصول کا باعث ہے

معلوم ہوا کہ عبادت گزاری وجہِ نیابتِ الٰہیہ نہیں ہے بلکہ علم کا نور ہی ایسی فضیلت کا حامل ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ کا نائب بناتا ہے۔ عبادت، تسبیح اور ذکر سے علم افضل ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اتنی اعلیٰ فضیلت کا حامل یہ علم یقیناً خالی از عبادت نہیں رہ سکتا۔ جس طرح علم کے بغیر محض عبادت اللہ تعالیٰ کی نیابت کے اہل نہیں بناتی، اِسی طرح وہی علم نیابتِ الٰہی کا باعث بنے گا جس کے ساتھ عمل، صالحیت اور عبادت بھی شامل ہوگی۔

علم، عبادت کے مقابلے میں قدرے فضیلت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے آیت کریمہ میں پہلے تسبیح و عبادت کے حوالے سے ملائکہ کا بیان ذکر فرمایا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام کی علمی برتری اور فضیلت کا ذکر فرماتے ہوئے اسے وجہِ نیابت قرار دیا۔ اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اَسماء مع صفات و اَفعال کا علم عطا کرنے کے

(۱) البقرة، ۲: ۳۱

بعد ان اشیاء کو ملائکہ پر پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ○[1]

مجھے ان اشیاء کے نام بتا دو اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو۔

یعنی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ نیابتِ الٰہیہ کا تاج تمہارے سر پر سجایا جائے تو ان اشیاء کے نام بتاؤ؟ گویا اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی عبادت وتسبیحات اور حضرت آدم علیہ السلام کے علم کا موازنہ کیا ہے۔ اس کے بعد ملائکہ کو بھی ایک مشاہدہ کروایا جس سے حضرت آدم علیہ السلام کو علم کی صورت میں حاصل فضیلت اور برتری کو فرشتوں پر واضح فرما دیا۔ اس پر ملائکہ نے عرض کیا:

سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَآ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ○[2]

تیری ذات (ہر نقص سے) پاک ہے ہمیں کچھ علم نہیں مگر اسی قدر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ بے شک تو ہی (سب کچھ) جاننے والا حکمت والا ہے۔

مذکورہ آیات میں علم کا ذکر تین نسبتوں سے آیا ہے:

۱۔ پہلے مقام پر علم کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ہے۔

۲۔ دوسری آیت میں علم کی نسبت ملائکہ کی طرف ہے۔

۳۔ دوسری آیت کے آخر میں علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کو واضح کرنے کے بعد اگلی آیت میں 'علم' ہی کے حوالے سے اپنی شان کا یوں اظہار فرمایا ہے:

اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ○[3]

---

(۱) البقرة، ۲: ۳۱

(۲) البقرة، ۲: ۳۲

(۳) البقرة، ۲: ۳۳

کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی (سب) مخفی حقیقتوں کو جانتا ہوں۔اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

مذکورہ آیات کریمہ میں علم کی فضیلت کے اظہار کے ساتھ ساتھ حضرت آدم ﷺ کی خلافت و نیابت کا سبب بھی علم کو قرار دینا، اِس امر کی جانب اشارہ ہے کہ علم کو اس قدر عظمت اور فضیلت حاصل ہونے کے باعث طلبہ اور نوجوانوں کو اپنے اندر علم کی رغبت، شوق اور ایک حوصلہ افزائی (inspiration) پیدا کرنی چاہیے۔ اگر ہم صرف سند کے حصول کے لیے پڑھیں گے تو ڈگری تو ہمیں حاصل ہو ہی جائے گی، مگر علم حاصل نہیں ہوگا۔علم بہت پاکیزہ اور مقدس شے کا نام ہے۔علم جب یہ دیکھتا ہے کہ مجھے میری خاطر حاصل نہیں کیا جا رہا بلکہ کسی اور مقصد (یعنی ڈگری یا روزگار وغیرہ) کے لیے حاصل کیا جا رہا ہے تو وہ علم اپنے طالب کے قلب و روح میں نہیں اترتا۔ آدمی ڈگری کی صورت میں ایک سند یعنی piece of paper تو لے لیتا ہے مگر حقیقی علم نہیں آتا اور نہ ہی اِنسان کو وہ فضیلت حاصل ہوتی ہے جو علم کا مقصود و منتہٰی ہے۔

۲۔علم وحکمت کا باہمی تعلق

علم اگر علمِ نافع ہو تو حکمت کو جنم دیتا ہے۔علم اور حکمت دونوں باہم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے، دوسرے لفظوں میں وہ ایک دوسرے سے متصل یعنی جڑے ہوئے ہیں۔حکمت کے بغیر علم، علمِ نافع نہیں ہوتا اور جو علم حکمت عطا نہ کرے وہ علم کامل نہیں بلکہ ناقص ہوتا ہے کیونکہ اس نے علم ہونے کے تقاضے پورے کیے نہیں۔ گویا حکمت جب علیحدہ طور پر مذکور ہو تو اس کا مطلب ہے کہ اس میں پہلے سے ہی علم کا کمال موجود ہے؛ اس لیے کہ کمالِ علم ہی سے حکمت وجود میں آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ. (۱)

(۱) البقرة، ۲: ۲۶۹

وہ جسے چاہتا ہے دانائی عطا فرما دیتا ہے۔

علمِ نافع انسان کو حکمت عطا کرتا ہے اور حکمت انسان کو ہدایت کی منزل تک پہنچاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکمت کے ثمرات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًاط وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ○[1]

اور جسے (حکمت و) دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہوگئی، اور صرف وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو صاحبِ عقل و دانش ہیں○

کمالِ علم کا ثمرہ، نتیجہ اور پھل حکمت ہے۔ مذکورہ آیت کریمہ کے پہلے حصے میں فرمایا گیا کہ جسے حکمت و دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہوگئی۔ دوسرے حصے میں صاحبِ حکمت کے لیے فرمایا کہ وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو صاحبِ عقل و دانش ہیں۔ واضح ہوا کہ علم اور حکمت وہی فائدہ مند ہے جس سے بندے کو تذکّر، نصیحت اور ہدایت میسر آئے۔ اگر علم کے باوجود انسان خیر اور شر میں امتیاز نہ کر سکے، اللہ کی طرف رغبت و رجوع پیدا نہ ہو، فکرِ آخرت میسر نہ آئے تو سمجھیں وہ علم، علم نہیں ہے اور ایسی حکمت بھی حکمت نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اسی بناء پر حکمت اور تذکیر کا اکٹھا ذکر فرمایا ہے۔ تذکیر جہاں انسان کو رجوع اِلی اللہ، معرفت و قربتِ الٰہی اور بندگی کا احساس دلاتی ہے، وہاں اللہ اور بندے کے درمیان روحانی تعلق کو بھی آشکار کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت کے باب میں ایک پیمانہ واضح فرما دیا ہے کہ اگر کتابوں کے پڑھنے، اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے سے تذکّر، رغبت و معرفت، فکر، دلوں کو نصیحت اور ہدایت کا نور پیدا نہ ہو، انسان کی کیفیت نہ بدلے تو سمجھیں کہ جو کچھ حاصل ہو رہا ہے وہ علم اور حکمت نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کیا چیز ہے؟ وہ دنیوی علم تو ہو سکتا ہے جو مباحات اور ضروریات میں سے ہے مگر آخرت میں نفع مند نہیں ہوگا۔ ایسا علم دنیا کمانے اور دنیا

(۱) البقرة، ۲: ۲۶۹

کی ضروریات کی تکمیل کے لیے تو فائدہ مند ہے اور جائز بھی ہے مگر جس علم کو فضیلت عطا کی گئی ہے، وہ علم یہ نہیں ہے کیونکہ فضیلت اُسی علم کو حاصل ہے جو انسان کو تذکیر اور تذکر تک پہنچانے والا ہو۔

۳۔ کلامِ اِلٰہی کا عنوان 'الکتاب' رکھنے کی حکمت

علم کی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا تعارف بھی 'الکتاب' کے طور پر کروایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ.[1]

(یہ) وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ساتھ ربط وتعلق اور شغف پیدا کرنے کے لیے اپنے کلام کا نام 'الکتاب' رکھا ہے۔ قرآن کو 'الکتاب' کہنا بھی علم کی طرف اشارہ ہے۔ علم کا اس سے بڑا مرتبہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے 'الکتاب' کہہ کر اپنے کلام قرآن مجید کو علم کا عنوان عطا فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو 'الکتاب' کا عنوان دے کر ایک طرف علم اور کتابی علم کو غیر معمولی اہمیت وفضیلت عطا فرمائی اور دوسری جانب علم کا رجحان عام کرنے کے لیے اہلِ اسلام کو علم اور کتاب کی طرف متوجہ فرمایا ہے تاکہ وہ کتاب سے مانوس ہوسکیں۔

۴۔ جہل سے یقین تک سفرِ علم کے مراحل

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ کے فرمانِ الٰہی میں جہاں 'الکتاب' کے لفظ کا انتخاب اُمت کو علم اور کتاب کی طرف متوجہ کرنے کی طرف اشارہ ہے، وہاں اسی آیت مبارکہ میں علم کی تعریف بھی بیان کر دی گئی ہے کہ علم ہر شک کو دور کر دیتا ہے۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں، اگر اس میں کوئی شک رہے تو اسے علم نہیں کہا جاسکتا کیونکہ علم کا نور جہالت، وہم، شک اور ظن کو ختم کر

(۱) البقرة، ۲: ۲

دیتا ہے۔ اسی لیے علم کی یہ تعریف کی جاتی ہے:

إِنَّ الْعِلْمَ صِفَةٌ يَنْتَفِي بِهَا عَنِ الْحَيِّ الْجَهْلِ وَالشَّكِّ وَالظَّنِّ.[1]

بے شک علم وہ صفت ہوتی ہے جس کے ذریعے زندہ شخص سے جہالت، شک اور ظن کی نفی کی جاتی ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ جہالت اور علم صرف دو مرحلے نہیں ہیں، بلکہ جہالت سے قطعی علم تک کے سفر کے درج ذیل پانچ مراحل ہیں:

۱۔ لاعلمی (جہالت یا جہل)

۲۔ وہم

۳۔ شک

۴۔ ظن/گمان

۵۔ یقین

۱۔ کسی شے کے بارے میں بالکل نہ جاننا جہل یا جہالت کہلاتا ہے۔

۲۔ انسان جب جہل سے نکل آئے اور اس کے ذہن میں کسی شے کے بارے میں ہلکا سا ادراک یا خیال پیدا ہو کہ شاید بات یوں ہو۔ ذہن میں اس موہوم سے خیال کا آنا اور اُس کیفیت سے نکل آنا جہاں بالکل سرے سے پتہ ہی نہیں تھا مکمل لاعلمی تھی، یہ مرحلہ وہم کہلاتا ہے۔ یعنی جہل سے تھوڑا نکلے، ذہن نے کام کیا اور کچھ خیال آیا کہ یہ اس طرح بات ہے تو یہ وہم ہے۔ یعنی 0% سے زائد اور 50% سے کم جس قدر بھی علم حاصل ہو - خواہ 10% یا 20% یا 25% - یہ سارا دورانیہ وہم کا ہے۔

۳۔ وہم کے بعد تیسرا مرحلہ شک کا ہے۔ شک جہالت اور علم کے درمیان میں ہے یعنی

---

(۱) أبو معين النسفي الماتريدي، تبصرة الأدلة في أصول الدين، ۱:۱۳۶

نصف جہل اور نصف علم۔ جب کسی شے کے بارے میں انسان کا وہم طاقت ور ہو جائے، کسی شے کے بارے 50% ذہن اثبات کا کہے کہ 'ہے' اور 50% ذہن نفی کی طرف راغب ہو کہ 'نہیں ہے' تو اس کیفیت کو شک یا ریب کہتے ہیں۔ مثلاً ہم قبلہ کی سمت معلوم کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے پاس سمت معلوم کرنے کا کوئی آلہ یا مددگار بھی نہ ہو اور دو اَطراف کے درمیان ہمارا خیال برابر ہو جائے تو اس درمیانی کیفیت کو رَیب اور شک کہتے ہیں۔ شک کے مرتبے پر بھی حاصل معلومات کو علم نہیں کہہ سکتے۔

۴۔ جہل سے نکل کر وہم میں آ گئے تو یہ بھی علم نہیں ہے اور وہم سے نکل کر شک میں آ گئے تو یہ بھی علم نہیں ہے۔ انسان جب شک کے مرتبے سے آگے نکلے اور اس کا خیال طاقت ور اور غالب ہو جائے تو اس کیفیت کو ظن یا گمان کہتے ہیں۔ اسی کیفیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میرا ظنِ غالب یہ ہے، یعنی غالب خیال یا گمان یہ ہے۔ اس مرتبہ پر بھی معلومات علم نہیں کہلا سکتیں کیونکہ ظن میں بھی ابھی تک 25% شک موجود ہے۔

۵۔ پانچواں درجہ یقین کا ہے۔ جہالت سے وہم، وہم سے شک، پھر شک سے گمان تک کا سفر طے کرنے کے باوجود ہم حاصل شدہ معلومات کو 'علم' نہیں کہہ سکتے۔ جب کسی شے کے بارے میں ہم 100% جان لیں کہ یہ چیز اسی طرح ہے تو اس کیفیت کو علم کہتے ہیں۔

علم ایک سفر ہے اور یہ سفر محنت کے بغیر طے نہیں ہوتا۔ انسان مسلسل کوشش، محنت، تحقیق، مطالعہ، جستجو اور تمام ذرائع کو استعمال کرتا ہوا جہالت سے یقین کی منزل تک پہنچتا ہے۔ اس یقین کا حصول علم کہلاتا ہے۔ گویا علم ایسے ادراک و معرفت کا نام ہے جہاں جہل، وہم، شک اور ظن کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۵۔ دورِ حاضر کا اَلمیہ

علم کی اس تعریف کی روشنی میں اگر ہم معاشرے کا جائزہ لیں تو اکثر لوگ ظن کو علم بنائے پھرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو اُن کے خیال میں ہے وہ اُسے ہی علم سمجھتے ہیں۔ اسی

وجہ سے ہر شخص اپنے سے اختلاف رکھنے والے کو جاہل کہتا ہے۔ معاشرے میں علم کا رجحان نہ ہونے کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ ہمارے بہت سے علماء، اساتذہ اور طلبہ میں (اِلا ما شاء اللہ) یہ رُجحان پایا جاتا ہے کہ 'جو کچھ وہ جانتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں جانتا'۔ آج ہر شخص کی طبیعت اور مزاج کا حصہ یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ 'جو کچھ میں جانتا ہوں بس یہی علم ہے۔'

ہوسکتا ہے کہ کسی کا علم ابھی مرتبۂ وہم یا شک پر ہو اور وہ اپنے آپ کو عالم سمجھنے کی غلط فہمی کا شکار ہو۔ ہوسکتا ہے کہ جسے وہ حقیقت سمجھ رہا ہو، وہ حقیقت نہیں بلکہ ظن ہو اور اُس میں غلطی کی گنجائش بھی موجود ہو۔ مگر ہم ایسا نہیں سوچتے بلکہ اپنی معلومات کو ہی یقینی علم کے طور پر بیان کرتے ہوئے دوسروں کی تمام آراء کو یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ ہم اپنے اور علم کے ساتھ دیانت دار (honest) نہیں ہیں۔ تھوڑی بہت آگہی حاصل کرنے کے بعد خواہ وہ ایک ہی کتاب کے مطالعے تک محدود کیوں نہ ہو، ہم زور و شور سے غصے اور جلال کے ساتھ فتویٰ دیتے پھرتے ہیں۔ اختلاف کرنے والے کو سخت کلمات کہہ دیتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات تو انہیں جاہل اور کافر تک قرار دینے سے نہیں چوکتے۔ علم کے مراحل سے ناواقفیت کی بناء پر ہم یہ نہیں دیکھتے کہ جس علم کے زور پر ہم فتویٰ دے رہے ہیں، اس کے کئی مرتبے، درجے، شرائط اور تقاضے ہیں۔ ممکن ہے کہ فتویٰ دینے والے کا علم اِن تمام مراحل، مراتب، درجات، شرائط اور تقاضوں کو پورا نہ کر رہا ہو اور اُس کا علم، علم نہیں بلکہ محض شک ہو۔

لہٰذا ہمیں دوسرے کو جہالت کی تہمت دینے سے قبل سوچنا چاہیے کہ ہماری اپنی تحقیق، معلومات، ادراک اور معرفت کس مرتبے پر ہے اور حقیقت تک پہنچنے میں کتنا مطلق مطالعہ، تقابلی مطالعہ (comparative study)، مختلف آراء کا جائزہ اور تحقیق چاہیے، اور اُس کے کیا کیا احکام، علّتیں، مصادر اور اسباب ہیں؟ ہم ان تمام حقائق کو مدنظر رکھ کر ہی اس حقیقی علم تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں جو علمِ نافع ہے اور جس سے حکمت جنم لیتی ہے۔

انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کا علم بہت وسیع ہے، وہ کائنات کی حقیقتوں سے آگاہ ہے، وہ اپنی عقل سے اس کائنات اور اس کے خالق کو بخوبی سمجھ سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کا

علم بہت ہی قلیل اور اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود انتہائی محدود اور ناقص ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

هَـٰٓأَنتُمْ هَـٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُم بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ○[1]

سن لو! تم وہی لوگ ہو جو ان باتوں میں بھی جھگڑتے رہے ہو جن کا تمہیں (کچھ نہ کچھ) علم تھا مگر ان باتوں میں کیوں تکرار کرتے ہو جن کا تمہیں (سرے سے) کوئی علم ہی نہیں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے○

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں علم کے حوالہ سے تین حقیقتوں کا بیان فرمایا ہے:

۱۔ انسان کو جزوی علم عطا کیا گیا۔

۲۔ بہت سے علوم انسان کو سرے سے عطا ہی نہیں کیے گئے۔

۳۔ علمِ الٰہی کی لامحدود وسعت کے مقابلے میں انسان کا علم کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

علم کی بہت سی وسعتیں ہیں جن کا انسان کو سرے سے علم ہی نہیں دیا گیا یا اسے جزوی علم دیا گیا ہے جس کا دائرہ کار چند اُمور اور علوم کے پہلوؤں تک ہی محیط ہے۔ اس کے باوجود انسان کا رویہ اور مزاج یہ ہے کہ اپنے علم کے جزوی اور محدود ہونے کے باوجود صرف اپنی بات کے درست ہونے پر ہی اصرار کرتا ہے۔ یعنی جو علوم انسان کے حواس و عقل کے دائرے اور استعداد سے ماوراء ہیں، ان پر بھی انسان بحث کرتا اور جھگڑتا نظر آتا ہے۔

علم کا غلط اِستعمال کرنے والے لوگ

مذکورہ آیت کریمہ کی روشنی میں معلوم ہوا کہ علم کا غلط استعمال کرنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں:

---

(۱) آل عمران، ۳: ۶۶

۱۔ کلیتاً علم نہ ہونے کے باوجود بحث و مباحثہ اور تکرار کرنے والے۔

۲۔ جزوی علم کی بنیاد پر بحث و مباحثہ اور تکرار کرنے والے۔

۱۔ بحث و تکرار کرنے والا ایک گروہ یا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اُن علوم اور حقیقتوں پر بحث کرتے ہیں جن کا انہیں سرے سے کوئی علم نہیں ہوتا۔ یعنی وہ حقیقت جس کا حواس، عقل، وجدان، ذاتی ذرائع، جستجو اور تحقیق سے معرفتِ تامہ اور کامل علم نہیں حاصل ہو سکتا؛ اُس پر وہ جھگڑا کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ جن ذرائع سے اُس حقیقت کا علم ملنا تھا، انہوں نے ان ذرائع اور مآخذ کو چھوڑ دیا اور وہ اپنے ذاتی ذرائع علم، حواس، عقل، وجدان، تجربے اور مشاہدے کے ذریعے اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں؛ جبکہ وہ حقیقت انسانی ذرائع علم سے سمجھ میں آنے والی ہی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں عقل اُس حقیقت کے اِدراک کا محل نہیں ہے۔ پھر بھی کتنے تعجب کی بات ہے کہ اس پر جھگڑالو لوگ مناظرے کرتے اور فیصلے صادر کرتے نظر آتے ہیں۔

۲۔ بحث و تکرار کرنے والا دوسرا طبقہ وہ ہے جنہیں قلیل علم ہے۔ اس طبقے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی کو تیرنا نہ آتا ہو اور وہ ڈرتے ڈرتے دریا یا سمندر کے ساحل کے قریب پانی میں اترے۔ یہ پانی اس کی پنڈلیوں تک آئے مگر وہ اس میں محض اتنی حد تک داخل ہونے پر ہی دریا یا سمندر کی گہرائی اور وسعتوں کو جاننے کا دعویٰ کرنے لگے۔ اس جیسا دوسرا شخص جو اس سے کچھ آگے تک گیا ہو اور وہ اپنے مزاج کے مطابق سمندر کی گہرائی و وسعت پر بات کرے مگر دوسرا کہے کہ تمہاری یہ بات تو درست نہیں ہے۔ دونوں اشخاص اپنی اپنی بات کے درست ہونے پر باہم جھگڑا کرتے رہیں۔ وہ شخص جو نہ سمندر کی گہرائی میں کبھی گیا اور نہ کبھی جا سکا، جسے تیرنا ہی نہ آتا ہو، کیا ایسے شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ میلوں پر محیط سمندر کی تہہ اور وسعت کے متعلق بحث کرے؟

جب انسان اتنے تھوڑے علم کے ساتھ حقیقتِ علیا اور اس کلیت کی بات کرے گا تو ایسی بحث کا نتیجہ سوائے گم راہی کے اور کیا ہوگا؟ اس لیے کہ وہ شخص اُس حقیقت کو جاننے کا دعویٰ کر رہا ہے جس کی اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ درحقیقت موصوف نے تو اس ذریعے کو چھوا بھی

نہیں ہے جس ذریعے سے اسے حقیقت کا علم حاصل ہونا تھا۔

ہمارے ہاں کیمسٹری کا اسکالر فزکس پر کبھی بحث نہیں کرتا۔ فزکس کا پروفیسر بیالوجی پر کبھی بحث نہیں کرے گا۔ بیالوجی کا پروفیسر علمِ فلکیات (astronomy) پر کبھی بحث نہیں کرے گا اور کارڈیالوجی کا پروفیسر گردوں کے امراض پر بحث نہیں کرے گا۔ حالانکہ وہ بھی ڈاکٹر ہے اور بنیادی سائنسی چیزیں سب کو معلوم ہوتی ہیں۔ نیز یہ تمام علوم کسی نہ کسی حد تک ایک دوسرے کے ساتھ ملتے بھی ہیں مگر اس کے باوجود وہ اس خاص مضمون پر بحث نہیں کرے گا۔

کسی ایک مضمون کا ماہر کسی ایسے دوسرے مضمون کی حقیقت و کلیت پر بحث کرے جس کی وہ کچھ معلومات بھی رکھتا ہو تو یہ مناسب نہیں ہوگا کیونکہ اس کا علم جزوی ہے۔ اُس کی بحث سے شک، وہم اور گمان تو پیدا ہوگا مگر علم میسر نہیں آئے گا۔ افسوس! دینی علوم میں صورتِ حال اس سے یکسر مختلف ہے۔ یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ جس ذریعۂ علم سے اُس حقیقت کی معرفت ہونا تھی، اُس ذریعۂ علم کو سرے سے چھوئے بغیر ہم اس پر بحث بھی کرتے ہیں اور قوم کی ذہن سازی کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ نتیجتاً خود بھی گم راہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی بھٹکاتے پھرتے ہیں۔ ایسا رویہ علم کے باب میں ہرگز دیانت دارانہ اور منصفانہ نہیں ہے۔

۶۔ آیاتِ متشابہات بھی قطعی و یقینی علم کی حامل ہیں

اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں قرآنی علم کی قطعیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ.[1]

وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی جس میں سے کچھ آیتیں محکم (یعنی ظاہراً بھی صاف اور واضح معنی رکھنے والی) ہیں وہی (احکام) کتاب کی بنیاد ہیں اور

(۱) آل عمران، ۳: ۷

دوسری آیتیں متشابہ (یعنی معنی میں کئی احتمال اور اشتباہ رکھنے والی) ہیں۔

قرآن مجید کی اکثر آیات محکمات ہیں اور کچھ متشابہات میں آتی ہیں۔ محکمات وہ آیات ہیں جو اپنا معنی بالکل صاف، ظاہر اور واضح رکھتی ہیں اور اس معنی کی وضاحت، مفہوم اور مراد کو سمجھنے میں قاری، متعلم اور عالم کو کوئی مغالطہ و شبہ واقع نہیں ہوتا یعنی وہ آیات اپنے معنی میں خود صاف اور واضح ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کا اندازِ کلام غور طلب ہے۔ یہ نہیں فرمایا:

اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ.

کچھ آیات محکمات ہیں اور دوسری آیات متشابہ ہیں۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس فرمایا:

اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ.

یعنی واضح معنی رکھنے والی آیات اُم الکتاب ہیں اور قرآن اور علم کی بنیاد ہیں۔ اس آیت میں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم کی بنیاد اُن آیات کو فرمایا ہے جن آیات کے معنی کو سمجھنے اور تعین کرنے میں کسی قسم کے شک و شبہ، ظن اور مغالطے کی گنجائش نہ رہے۔

وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ یعنی کہ دوسری کئی ایسی آیات ہیں جن کے معنی میں احتمالات اور اشتباہ ہیں۔ جب آدمی انہیں پڑھتا اور سنتا ہے تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس آیت کا جو معنی اس کی سمجھ میں آیا ہے، اس کے علاوہ اس کا کوئی معنی ہی نہیں ہے حالانکہ ایسی آیات میں کئی معانی کا احتمال ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورتِ حال میں سمجھنے میں غلطی واقع ہوسکتی ہے۔ عقائد کے باب میں جب مرجئہ، معتزلہ، ماتریدیہ، اشاعرہ اور اس طرح کے کئی مذاہب بنے تو ان میں سے بھی کئی مذاہب کو متشابہات کے معنی کے تعین میں مغالطے ہوئے۔ نتیجتًا انہی مغالطوں کی بنیاد پر اُن کے درمیان بحثیں، مناظرے اور مجادلے بپا ہوتے رہتے تھے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ اس آیت کریمہ میں 'متشابہات' کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ان آیاتِ متشابہات میں کسی قسم کا شک و شبہ یا ظن پایا جاتا ہے۔ نہیں! نہیں! ایسا ہرگز

نہیں ہے! اس لیے کہ جس میں شک کی گنجائش رہے وہ علم، علمِ قطعی نہیں ہے جبکہ قرآنی علم قطعی ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ناممکن ہے۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آیاتِ قرآنی میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے تو پڑھنے، سننے اور سمجھنے والے کو اشتباہ کیوں ہو جاتا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جن آیات کے معانی ایک سے زائد تھے، اس سے وہ معنی مراد لے لیا جاتا ہے جو منشاء قرآن کے مطابق نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت اگلی آیت کریمہ میں فرما دی ہے:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ.(۱)

سو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے اس میں سے صرف متشابہات کی پیروی کرتے ہیں (فقط) فتنہ پروری کی خواہش کے زیراثر اور اصل مراد کے بجائے من پسند معنی مراد لینے کی غرض سے۔

یعنی جن کے دلوں میں مرض ہوتا ہے وہ چنتے ہی اُن آیات کو ہیں جن کے اندر ایک سے زائد معانی کا احتمال ہوتا ہے۔ جن آیات کے معانی کو متعین کرنے میں اشتباہ یا مغالطے کی گنجائش پیدا کی جا سکے اور معنی متعین کرتے ہوئے پڑھنے اور سمجھنے والے کے ذہن کو متذبذب (confuse) کیا جا سکے۔ اس سارے عمل کا مقصد فتنہ پروری کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ قرآن کی متشابہ آیات کو بیان کر کے دین میں فتنہ و فساد پیدا کر کے لوگوں کو دین سے متنفر کیا جا سکے۔ لہٰذا فتنہ پرور لوگ ایک عام آدمی کو آیاتِ متشابہات کا ایسا معنی بیان کر دیں گے جو اس کی اصل مراد نہیں ہے۔ وہ اس عمل سے لوگوں میں شکوک و شبہات پیدا کر کے کہتے ہیں کہ قرآن میں تو ایسا ہی لکھا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ کیا مانیں اور کیا نہ مانیں؟ گویا معاذ اللہ قرآن کی بات ہدایت پر مبنی نہیں؟

فتنہ پرور، فسادی اور کجی والے دِلوں کا ایسی متشابہ قرآنی آیات کو تلاش کرنے کا دوسرا

(۱) آل عمران، ۳: ۷

مقصد قرآن مجید نے وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ کے ذریعے فرمایا کہ وہ اس سے اصل مراد کی بجائے اپنی پسند کی تاویل لینا چاہتے ہیں۔ وہ ان کا کوئی من گھڑت معنی نکالنا چاہتے ہیں اور قرآن کے پیغام کو اصل مراد سے ہٹا کر اسے اپنے نفس کی سہولت پسندی کے مطابق منطبق کرنا چاہتے ہیں۔ گویا ایسے ناعاقبت اندیش لوگ قرآن کی آیات کا غلط استعمال (misuse) کرتے ہیں۔

۷۔ اَلرَّاسِخُوْن فِي الْعِلْم کا مقام و مرتبہ

اللہ تعالیٰ نے اسی آیت کریمہ کے اگلے حصے میں علم میں رسوخ یعنی پختگی حاصل کرنے والوں کی شان بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ○ (۱)

اور اس کی اصل مراد کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور علم میں کامل پختگی رکھنے والے کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، ساری (کتاب) ہمارے رب کی طرف سے اتری ہے، اور نصیحت صرف اہلِ دانش کو ہی نصیب ہوتی ہے○

اللہ تعالیٰ نے آیاتِ متشابہات کے حقیقی معنی و مراد کے حوالے سے اپنا ذکر فرمانے کے بعد وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ فرما کر علم میں راسخ، پختہ و کامل اور تیقن کے حامل افراد کو یہ فضیلت عطا فرمائی ہے کہ علم کے باب میں انہیں اپنے ساتھ ملا کر ذکر کیا کہ ان آیات کا معنی، مراد، مفہوم اور صحیح پیغام اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جانتے ہیں جو علم میں رسوخ (پختگی) رکھتے ہیں۔

قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کے قراءت کے اعتبار سے دو معانی ہیں:

۱۔ ایک قراءت کے اعتبار سے اس کا معنی یہ ہے: 'اللہ کے سوا اس کی اصل مراد کو کوئی نہیں جانتا اور علم میں کامل پختگی رکھنے والے (کے سوا کوئی نہیں جانتا)'۔

(۱) آل عمران، ۳: ۷

۲۔ دوسرے طریق پر اس کا معنی یہ بھی ہے کہ ان آیات کا صحیح معنی ومفہوم اور تاویل اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور جو علم میں رسوخ رکھنے والے ہیں، اُن کی شان یہ ہے:

يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا.

کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، ساری (کتاب) ہمارے رب کی طرف سے اُتری ہے۔

گویا وہ سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہوئے اُس کی کھوج پرکھ میں نہیں جاتے۔ علم میں راسخ اور پختہ لوگ جنہیں علمِ کامل اور معرفتِ تامہ نصیب ہوئی ہے اور جو وہم، شک اور ظن کے مقام سے نکل کر مرتبۂ یقین تک پہنچ گئے، اللہ تعالیٰ اُن پر اتنا انعام فرماتا ہے کہ انہیں شانِ تسلیم عطا فرما دیتا ہے۔

(ا) اَلرَّاسِخُوْن فِي الْعِلْم پر اللہ تعالیٰ کی عنایات

اللہ تعالیٰ اَلرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْم یعنی علم میں یقین اور پختگی کے حامل افراد کو شانِ تسلیم و رضا عطا فرماتا ہے۔ یہ شان کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے حسیت اور عقلیت کے دائرہ کار کو فلسفہ علم کے درج ذیل مراحل کے تناظر میں سمجھنا ہوگا:

۱۔ یونان میں جب فلاسفہ (philosophers) نے حقیقتِ علیا یعنی خالقِ کائنات کو پانے اور اسے پہچاننے کی کوشش کی اور یہ جاننا چاہا کہ حتمی حقیقت (ultimate reality) اور سچائی کیا ہے؟ تو انہوں نے اس کی ابتدا حسیّت سے کی، یعنی جو کچھ اُنہیں حواسِ خمسہ سے معلوم ہوا، انہوں نے اُسے ہی حقیقت سمجھ لیا۔ یہ دراصل فلسفہ کی بنیاد تھی۔

۲۔ پھر ایک مرحلہ یہ آیا کہ انہوں نے جانا کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو حواس سے بھی ماورا ہیں، جن کا علم حواس کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ ان حقیقتوں کو آنکھ نہیں دیکھتی، کان نہیں سنتے، زبان نہیں چکھتی، ناک نہیں سونگھتا اور ہاتھ نہیں چھوتا۔ لہٰذا صرف حواس سے حقیقت اور اُس کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حسیت کے ناقص ہونے کے مشاہدہ کے بعد فلسفہ یعنی علم اگلے دور

میں داخل ہوا اور اُنہوں نے عقل کو ہی سب کچھ قرار دے ڈالا۔ یعنی جس چیز کو عقل جانے اور سمجھے وہی حقیقت ہے۔ اُنہوں نے ایک مدت تک عقل کے ذریعے حقیقت کو پانے کی ناکام کوشش کی۔

۳۔ بعد ازاں اُن پر یہ حقیقت بھی آشکار ہوگئی کہ عقل بھی حقیقت تک نہیں پہنچا سکتی کیونکہ عقل تو خود حواسِ خمسہ کی محتاج ہے۔ کان سن کر اپنا پیغام دماغ کو نہ بھیجیں تو عقل آواز کا ادراک نہیں کر سکتی، زبان چکھ کر اپنا پیغام نہ بھیجے تو عقل ذائقے میں امتیاز نہیں کر سکتی۔ ناک سونگھ کر اور ہاتھ چھو کر اپنا سگنل نہ بھیجیں، اپنا خیال (perception) نہ بھیجیں تو عقل فیصلہ نہیں کر پاتی۔ اس سے فلاسفر اس نتیجے پر پہنچے کہ حقیقت معقولات میں بھی نہیں آ سکتی۔ گویا حقیقت محسوسات اور معقولات سے ماورا ہے۔ یعنی حواس اور عقل بھی حقیقت کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہیں۔

۴۔ اس کے بعد تشکیک کا دور آیا، یعنی وہ شک میں پڑ گئے کہ اب کیا کریں؟ کس کو حقیقت مانیں اور اصل حقیقت کیا ہے؟

اس کے برعکس **الراسخون في العلم** یعنی جو ظن، شک اور وہم سے آزاد ہوتے ہیں اور یقین کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا. (۱)

اور علم میں کامل پختگی رکھنے والے کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، ساری (کتاب) ہمارے رب کی طرف سے اتری ہے۔

گویا وہ علم جس سے نور پھوٹتا ہے، اِنشراحِ صدر ہوتا ہے، جو علم ہر شک، ریب اور ظن کو دور کر کے مرتبۂ یقین تک لے جاتا ہے، وہ علم قرآن کے چشمے اور صدرِ نبوت یعنی حضور نبی اکرم ﷺ کے سینہ اقدس سے پھوٹتا ہے۔ وہ علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، اتباع تابعین، سلف صالحین، اولیائے کاملین اور ان کے متبعین کے طریق سے آتا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے اس رہنمائی کو نہیں لیا اور خود اپنی عقل سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی، انہیں شک کے سوا کچھ

(۱) آل عمران، ۳: ۷

حاصل نہ ہوا اور وہ ہمیشہ تشکیک کی گرد میں مبتلا رہیں گے۔

(۲) اَلرُّسُوخ فِي الْعِلْم کی علامت

علم میں رسوخ کی علامت یہ ہے کہ جب رسوخ بڑھ جائے تو دعویٰ نہیں رہتا بلکہ زبان پر یہی کلمہ رہتا ہے: اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا یعنی ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ گویا انسان میں غرور، تکبر اور رعونت نہیں رہتی کیونکہ یہ سب فتور ہیں اور علم کے منافی ہیں۔ قرآن مجید نے واضح فرما دیا ہے کہ رسوخ فی العلم کے حاملین کو تسلیم (بن دیکھے ایمان لانے) کی نعمت عطا کی جاتی ہے۔ اس نعمت کے باعث ان کی طبیعتوں میں انکار، تشکیک، جہل اور ظن سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور انہیں تذکیر کی نعمت عطا ہوتی ہے، جس سے ان کے اندر تسلیم و تفویض (خود کو اللہ کے سپرد کر دینا)، نصیحت، ہدایت، اللہ کے امر کی سچائی اور حکم کو آخری فیصلہ مان لینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

علم میں رسوخ انسان پر واضح کر دیتا ہے کہ ہم مخلوق ہیں، لہٰذا ہم محدود ہیں۔ ہمارے حواس، علم، وجدان اور ذرائع سب کچھ محدود ہیں۔ اس کے برعکس ہمیں تخلیق فرمانے والا لامحدود ہے اور اس کی طرف سے وحی کی شکل میں جو علم آ گیا وہی حقیقت ہے اور جو اس کے حبیب ﷺ نے بتا دیا وہی اٹل حقیقت ہے۔ جو چیز قرآن و حدیث میں بیان کر دی گئی ہے وہ عقل و فہم، تدبر و بصیرت اور تجربے میں آئے یا نہ آئے اسے بہرصورت تسلیم کیا جائے۔ گویا اللہ تعالیٰ جنہیں رسوخ فی العلم عطا فرماتا ہے وہ یہی اعتراف کرتے ہیں کہ میرے سمجھنے میں غلطی ہے، میری عقل و فہم محدود ہے، میرا مرتبۂ علم یہاں تک نہیں پہنچا کہ میں اس بات کی حقیقت کو جان سکوں۔ اللہ تعالیٰ کے حبیب مکرم ﷺ نے جیسے فرمایا اور جو فرمایا ہے وہی سچ، درست اور اٹل حقیقت ہے۔

جو چیز قرآن و حدیث سے ثابت ہو جائے، عقل، فہم، تدبر، بصیرت، تجربہ اُس کو مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ اس کی سمجھ میں بات آ رہی ہے یا نہیں، علم میں رسوخ رکھنے والا ہر چیز کو چھوڑ پسِ پشت ڈال کر اُس پر ایمان لائے گا جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ نے متعین فرما دیا ہے۔ اس صفت سے آراستہ لوگوں کو اس آیت کے آخر میں اُولُوا الْاَلْبَاب کہا گیا ہے۔

مومن کے لیے علم کا مرتبہ یہ ہے کہ جیسے اللہ کا فرمان ہے، اسی کو بلا چون و چراں تسلیم کر لیا جائے۔ جہاں تک شک میں مبتلا کیے بغیر لے جائے بس وہاں تک جایا جائے۔ جہاں دیکھے کہ عقل اب تشکیک میں مبتلا ہو رہی ہے، وہ کیسے اور کیوں کے چکروں میں پڑ رہی ہے، وہاں عقل کو خیر باد کہہ دے کہ اب اس سے آگے رسائی ممکن نہیں ہے۔ اب آگے امرِ الٰہی ہے اور وہی حق اور سچ ہے۔ لہٰذا وہاں سرِ تسلیم خم کر دے۔ یہی علم میں رسوخ کی شان ہے۔

۸۔ عقل کی لامحدودیت کا تصور مادیت کا فتنہ ہے

دورِ حاضر میں مادیت کے فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ عقل کی لامحدودیت کا تصور ہے۔ یہ فتنہ اتنا سنگین ہے کہ مسلمان کو ایمان کے نور سے محروم تک کر دیتا ہے۔ جب عقل ایک محدود شخصیت کا حصہ ہے تو وہ خود کیسے لامحدود ہوسکتی ہے؟ عقل ہمارے دماغ میں ہوتی ہے، دماغ ہماری کھوپڑی کے اندر ہے، ہمارا سر ہمارے بدن کا حصہ ہے اور بدن ہماری شخصیت کا حصہ ہے۔ ہم سرتا پا محدود ہیں۔ ہماری ہر صلاحیت، ہر عضو کی صلاحیت اور صلاحیتوں کی ساری حدود محدود ہیں۔ ایک ایسا وجود جو سارے کا سارا محدود ہو، وہ لامحدود کا ادراک بھلا کیسے کر سکتا ہے؟ عمر بھر تالاب میں رہنے والے سمندر کا تصور نہیں کر سکتے۔ بند غار میں رہنے والے کھلی دنیا کا تصور نہیں کر سکتے۔ عمر بھر اندھیرے میں رہنے والے روشن دنیا کا تصور کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمارے سارے علوم کا تعلق ہماری طبائع، ہمارے اعضاء کی صلاحیتوں اور ہمارے محدود ادراکات کی استعداد سے ہے۔ لہٰذا ہمیں سمجھنا ہوگا کہ جب ہم لامحدود کے بارے میں فیصلہ محدود عقل و فہم سے کرنا چاہیں گے تو یہ بے عقلی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے قرآن مجید میں بار بار فرمایا ہے:

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ○[1]

اور یہ نصیحت صرف اہل دانش کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

---

(۱) آل عمران، ۳:۷

یعنی دانش مندی یہی ہے کہ انسان لامحدود کو اپنی محدود صلاحیتوں سے قطعاً نہیں جان سکتا بلکہ تسلیم و رضا کا پیکر بنتے ہوئے، اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے احکامات کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ اُس کے بڑا عالم ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب اس سے کسی شے کی آخری حقیقت کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے: من نمی دانم 'میں نہیں جانتا'۔ یہی بات سیدنا صدیق اکبر ﷺ نے بھی فرمائی ہے:

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ الْإِدْرَاکِ إِدْرَاکٌ.(۱)

اَصل اِدراک، عدمِ اِدراک کا اِدراک ہے۔

یعنی یہ جان لینا کہ میں نہیں جانتا، یہ جان لینا کہ اس حقیقتِ علیا (ultimate truth) تک میں نہیں پہنچ سکتا، یہ جان لینا کہ اس کو سمجھنا میری ذاتی استعداد سے باہر ہے۔ جب انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو یہی اصل علم ہے۔

۹۔ اَہلِ علمِ اِلٰہیہ، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور معبودیت کے گواہ ہوتے ہیں

اللہ تعالیٰ نے علماء کو اس قدر فضیلت عطا فرمائی کہ انہیں اپنی وحدانیت پر گواہ بنایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ط لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ○(۲)

(۱) ۱۔ سبکي، طبقات الشافعية الكبرى، ۹:۴۵
۲۔ غزالي، إحياء علوم الدين، ۴:۲۵۲
۳۔ آلوسي، روح المعاني، ۹:۱۲۴
(۲) آل عمران، ۳: ۱۸

اللہ نے اس بات پر گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی (اور ساتھ یہ بھی) کہ وہ ہر تدبیر عدل کے ساتھ فرمانے والا ہے، اس کے سوا کوئی لائقِ پرستش نہیں وہی غالب حکمت والا ہےo

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی ذات پر گواہی میں اپنے ساتھ ملائکہ اور اَہلِ علم کا ذکر اکٹھا فرما کر علم اور اَہلِ علم کو بے پناہ فضیلت اور برتری عطا فرمائی ہے۔ یہاں اَہلِ علم سے مراد 'الراسخون فی العلم' اور 'أولوا الألباب' ہیں۔

۱۰۔ علمِ نبوت کی بے حساب جہات اور اِنسانیت پر حضور ﷺ کے گراں قدر اِحسانات

علم کا سب سے بلند اور قوی ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا انسانیت پر احسانِ عظیم ہے کہ علوم کے جو میدان انسان پر آشکار نہیں کیے گئے تھے، آپ ﷺ نے علم کے سب سے بلند اور قوی ذریعے یعنی وحی کے نور سے وہ علوم انسانیت کو عطا فرما دیے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍo (۱)

بے شک اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا کہ ان میں انہی میں سے (عظمت والا) رسول (ﷺ) بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھےo

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں حضور نبی اکرم ﷺ کے علمِ نبوت کی وسعتوں اور

(۱) آل عمران، ۳: ۱۶۴

جہتوں کا ذکر کرتے ہوئے چار چیزوں کا تذکرہ فرمایا ہے:

۱۔ تلاوتِ آیات

۲۔ تزکیۂ نفس

۳۔ تعلیمِ کتاب

۴۔ حکمت و دانش

اللہ تعالیٰ معلمِ حقیقی ہے اور اس کی مخلوق میں سے حضور نبی اکرم ﷺ معلمِ انسانیت ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے انسانیت اور خصوصاً مومنین کو جو علوم عطا فرمائے، اِس آیت کریمہ میں اس کی ترتیب نہایت قابلِ غور ہے۔

(۱) تلاوتِ آیات

حضور نبی اکرم ﷺ قرآن کی تلاوت کے ذریعے دلوں کی تاریک کوٹھڑی اور باطن میں قرآن کا نور داخل فرماتے۔ اس نور کی برکت سے انسان کو نظر آتا کہ اُس کے مَن میں کیا ہے؟ دلوں، روحوں اور باطن میں کیا کیا غلاظت چُھپی ہوئی ہے؟ باطن میں کس قدر ریا، عجب، تکبر، دنیا پرستی اور شہوات پوشیدہ ہیں؟ گویا باطن میں قرآن کے نور کی روشنی نہ ہو تو یہاں رذائلِ اخلاق کی صورت میں موجود سانپ اور بچھو کے ہونے کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ یہ روشنی ہوگی تو پتہ چلے گا کہ مَن اور باطن میں کیا چھپا ہوا ہے؟

(۲) تزکیۂ نفوس

حضور نبی اکرم ﷺ سے تلاوتِ آیات سننے والوں پر ان کا اپنا باطن ان پر روشن ہو جاتا اور انہیں اپنے باطن میں موجود بد خصلتیں اور رذائل دکھائی دینے لگتے۔ اس صورت حال میں ان کے اندر ایک تشویش لاحق ہوتی کہ ہمیں اپنے مَن کی صفائی کرتے ہوئے ان امراض کا علاج کرنا چاہیے۔ اس کے نتیجے میں وہ حاصل ہونے والی اس روشنی کے سبب اندھیروں میں

گرنے سے بچنے اور رذائل کو ختم کرنے کی جانب متوجہ ہوتے۔ گویا روشنی سے ادراک پیدا ہوتا ہے اور اسی سے تشویش لاحق ہوتی ہے جو دل کو علاج کے لیے راغب کرتی ہے۔ یہ روشنی ہی تو ہے جس سے ایک ہمت پیدا ہوتی ہے اور انسان اپنی اصلاح کا ارادہ کرتا ہے۔ جب اندر شوق پیدا ہو جاتا تو پھر وَيُزَكِّيهِمْ کے مقصودِ بعثت کے تحت حضور نبی اکرم ﷺ ان کا تزکیہ فرماتے اور ان کے قلب و باطن کی صفائی فرماتے۔

(۳) تعلیمِ کتاب

جب تزکیہ ہو جائے، قلب و باطن کی طہارت مکمل ہو جائے اور دل کی زمین علوم و معرفتِ الٰہی کے حصول کی اَہل ہو جائے تو پھر نورِ نبوت ایسے قلوب کو علوم و معرفت کے خزانے عطا کرتا ہے۔ نتیجتاً وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ کے مصداق حضور نبی اکرم ﷺ پاکیزہ قلوب کو کتاب کا علم عطا فرماتے۔ کتاب کا علم علمِ نافع بنتا ہی تب ہے جب تزکیہ موجود ہو۔ تزکیہ نہ ہو تو خالی علم علمِ نافع اور برکت کا باعث نہیں بنتا۔

(۴) تعلیمِ حکمت

تزکیۂ نفس اور تعلیمِ کتاب کے نور کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ کا مومنین پر تیسرا بڑا احسان یہ ہے کہ آپ ﷺ انہیں حکمت و دانائی عطا فرماتے ہیں۔

ہم اگر تزکیہ نفس، قلب و باطن کی صفائی اور نورِ قرآنی و نورِ باطن کے بغیر علم حاصل کریں گے تو وہ معلومات و ادراکات تو ضرور ہوں گے مگر وہ ہمیں منزل تک نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی شک، وہم اور ظن کی گرد سے باہر نکال سکتا ہے۔ تلاوتِ آیات، تزکیہ نفوس، تعلیمِ کتاب اور حکمت یہ ساری چیزیں ملیں تو علم کامل ہو کر حقیقت کی پہچان کرواتا ہے۔ حضور ﷺ نے مومنین کو علوم کے یہ سارے انوار عطا فرمائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں حضور نبی اکرم ﷺ کے ان احسانات سے قبل لوگوں کی کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ○

اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

گمراہی، اندھیرے کا نام ہے اور علم، نور یعنی روشنی ہے۔ علم قرآن مجید سے مستنبط درج ذیل چار شرائط اور تقاضوں کو مکمل کرنے سے ہی علمِ نافع بنتا ہے:

۱۔ قرآن کے نور سے باطن پر آگاہی ملی۔

۲۔ تزکیۂ نفوس سے قلب و باطن کی صفائی ہوئی۔

۳۔ قلب و باطن میں علمِ کتاب آیا۔

۴۔ قلب و باطن میں حکمت و دانائی آئی۔

یہ چاروں چیزیں ملیں تو پھر گمراہی و ضلالت ختم ہوتی ہے اور کامل خیر نصیب ہوتی ہے۔ اس موقع پر انسان کے علم کا سفر مکمل ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ صاحبانِ علم کی حفاظت کا اُلوہی انتظام

جب علم کی یہ دولت وسیلۂ نبوت سے حاصل ہو تو پھر اس کی حفاظت کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ خود ہی فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ علم اور علماء سے پیار فرماتا ہے۔ جو علماء اپنے علم پر نہیں بلکہ محض اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں تو ربِ دو جہاں ان کی ہر حملے سے حفاظت فرماتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ط وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ. (۱)

اور (اے حبیب!) اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان (دغابازوں) میں سے ایک گروہ یہ ارادہ کر چکا تھا کہ آپ کو بہکا دیں۔ جب کہ وہ

(۱) النساء، ۴: ۱۱۳

محض اپنے آپ کو ہی گمراہ کر رہے ہیں اور آپ کا تو کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتے۔

اس آیت کا خاص پس منظر یہ ہے کہ دغا بازوں کے ایک گروہ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو دھوکہ دینے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے حبیب! کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اس لیے کہ آپ ﷺ اللہ کے فضل اور اُس کی رحمت کے سائے میں ہیں۔ آپ ﷺ معصوم ہیں اور اللہ کی رحمت اور اس کا فضل آپ ﷺ کی حفاظت فرما رہا ہے۔

اس آیت مبارکہ کے شان نزول میں امام ترمذی اور حاکم نے حضرت قتادہ بن نعمان ﷺ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ایک مرتبہ رفاعہ بن زید کے بالا خانے سے اَشیاے خوردنی اور ہتھیار چوری ہوگئے۔ یہ چوری ہمارے خاندان سے تعلق رکھنے والے بنو اَبیرق میں سے ایک منافق بشیر بن اَبیرق نے کی تھی، لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم کھا کر کہا کہ یہ چوری لبید بن سہیل نے کی ہے، حالاں کہ وہ صالح مومن تھے۔ معاملہ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا: جلد اس بارے میں فیصلہ کروں گا۔

جب بنو ابیرق کو پتہ چلا تو انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: یا رسول اللہ! قتادہ بن نعمان اور ان کے چچا ہمارے نیک مسلمان گھرانے کا پیچھا کر رہے ہیں اور بغیر گواہوں اور ثبوت کے ان پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں۔ اس کے بعد حضرت قتادہ ﷺ حاضر خدمت ہوئے اور تمام تفصیل بتائی۔ آپ ﷺ نے انہیں کہا کہ تم ایسے گھرانے پر چوری کا الزام لگا رہے ہو جن کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ نیکوکار مسلمان ہیں، حالانکہ تمہارے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ثبوت موجود نہیں۔ ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خود وحی کے ذریعے اپنے حبیب مکرم ﷺ کو ساری تفصیل سے آگاہ فرما دیا۔[1]

اس آیت کے عمومی معنی سے یہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت اگر حاصل ہو تو

---

(۱) ۱۔ ترمذي، السنن، كتاب تفسير القرآن، باب ومن سورة النساء، ۵: ۲۴۴-۲۴۶، رقم: ۳۰۳۶

۲۔ حاكم، المستدرك، ۴: ۴۲۶-۴۲۷، رقم: ۸۱۶۴

پھر گمراہ کرنے والے عناصر و عوامل بھٹکا نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بنیادی چیز بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۝[1]

اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی ہے اور اس نے آپ کو وہ سب علم عطا کر دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو علمِ کامل ہی نہیں بلکہ علمِ اَکمل، علمِ اَتم، علمِ اَوسع اور علمِ کُل عطا فرما دیا۔ آپ ﷺ کو ہر وہ چیز سکھا دی اور اس کا علم عطا کر دیا جو آپ نہیں جانتے تھے۔ گویا اس اعلانِ ربانی کے بعد آپ ﷺ کی زندگی میں کسی شے سے متعلق بے خبری اور لاعلمی رہی نہیں۔ یہ حضور نبی اکرم ﷺ کا مرتبۂ علم ہے۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ کا اعلان واضح فرما رہا ہے کہ آپ ﷺ اپنے ذرائع سے جو نہیں جانتے تھے، اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کے مرتبے کے ذریعے آپ ﷺ پر وہ تمام چشمہ ہائے علم کھول دیے اور اب آپ ﷺ وہ سب کچھ جان گئے جو کچھ آپ ﷺ کے علم میں نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نکتے پر علم کو اپنا فضلِ عظیم قرار دیا ہے۔

اگر آیت کریمہ کے دونوں حصے آپس میں ملائیں تو مضمون واضح ہو جائے گا۔ اللہ رب العزت نے آیت کے پہلے حصہ میں فرمایا:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ.

اور (اے حبیب!) اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان (دغابازوں) میں سے ایک گروہ یہ ارادہ کر چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ آپ ﷺ کو بہکا دیتے بلکہ فرمایا یہ بہکانے کا ارادہ کر

(۱) النساء، ۴: ۱۱۳

چکے تھے۔ آیتِ مبارکہ کے آخری حصے میں فرمایا:

وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا.

اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ اگر اللہ کا فضل اور رحمت ساتھ ہو تو پھر صاحبِ علم بہکتا یا پھسلتا نہیں، ٹھوکر نہیں کھاتا اور نہ ہی گم راہ ہوتا ہے۔ گویا اللہ کا فضل اور رحمت اس کی حفاظت کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر صاحبانِ علم کو متوجہ فرماتے ہوئے کہا کہ صاحبانِ علم اپنے علم پر بھروسہ نہ کریں بلکہ تواضع، عاجزی، اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبدیت اختیار کرتے ہوئے اس کے فضل اور رحمت کے طلب گار رہیں۔ جب اللہ کے فضل اور رحمت کے آگے جھکے رہیں گے، اُس کی رحمت پر بھروسہ کریں گے، اس کے فضل کی طرف رجوع کریں گے تو اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ان پر سایہ فگن ہو کر ان کی حفاظت کرے گی اور کوئی بھی انہیں متزلزل نہ کر سکے گا۔

اس مقام کو حاصل کرنے کے بعد پھر گم راہی پر مبنی کتب ہوں یا فتنہ پرور علماء، کوئی غلط بحثوں میں اُلجھائے یا غلط براہین و دلائل لائے؛ یہ سب کچھ مل کر بھی اس صاحبِ علم کو بہکا نہیں سکتے۔ یہاں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر دلیل سے علمِ صحیح مل جائے۔ کبھی دلیل غلط سمت بھی لے جا سکتی ہے۔ یہ تمام گم راہ کن ذرائع انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں اور بندہ بھٹک جاتا ہے۔ جب یہ تمام امکانات عہدِ رسالت مآب ﷺ میں موجود تھے تو آج کیوں نہیں کارفرما ہوں گے؟ آج تو اس سے بھی کہیں زیادہ موجود ہیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ طرح طرح کے دلائل دے کر ارادہ کر چکے تھے کہ معاذ اللہ آپ ﷺ کو بہکا دیں گے مگر بہکا نہیں سکتے تھے، کیونکہ اللہ کے فضل اور رحمت سے آپ ﷺ معصوم پیدا کیے گئے ہیں۔

علم اگر اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے ساتھ جڑ جائے تو عالم کی حفاظت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا حصول تکبر و رعونت، بحث و مناظروں سے نہیں ہوتا بلکہ اس کی رحمت تواضع، انکساری، بندگی و عبادت، اطاعت، عملِ صالح اور سجدہ ریزی سے آتا ہے۔ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو، اس کی مدد و نصرت اور اس کے فضل و رحمت کا سائل اور

بھکاری ہو، اس کی مدد و نصرت پر بھروسہ کرنے والا اور عبادات و اعمالِ صالحہ کے ذریعے اس کی رحمت کی طرف رجوع کرنے والا ہو تو یہ ساری چیزیں اس کے علم کو اپنی حفاظت کے حصار میں لے لیتی ہیں۔

لہٰذا اگر مقصود یہ ہو کہ علم منزل تک پہنچائے اور علمِ کامل بنے تو اس کے لیے لازم ہے کہ سفرِ علم میں نہ صرف طالبِ علم کی حفاظت ہو، بلکہ اس کا علم بھی محفوظ رہے۔ سفرِ علم میں علم کی حفاظت، علم خود نہیں کرسکتا بلکہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہی اس کی حفاظت کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت، بندگی، عبادت، اَعمالِ صالحہ، اَخلاقِ حسنہ اور تواضع و انکساری، توکل، رجوع الی اللہ اور اخلاص کے تمام ذرائع مل کر اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کا سامان مہیا کرتے ہیں، جو ہماری اور ہمارے علم کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر یہی علم، علمِ نافع بنتا ہے۔ یہی علم بندے کو رب کی پہچان کرواتا ہے اور اُسے علم و عرفان کی اُن منزلوں تک پہنچا دیتا ہے کہ جہاں وہ مسجودِ ملائک اور محبوبِ خلائق بن جاتا ہے۔

باب نمبر 3

علم کی تاثیر اور مراتبِ علم

یہ امر ذہن نشین رہے کہ وحی کا علم حق ہے اور مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اس پر ایمان لاتا ہے اور اُن شیطانی وسوسوں کو رد کر دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترنے والی وحی میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔ جب وحی سے حاصل ہونے والے علم کو شک وشبہ کے بغیر حق سمجھیں گے تو اس کا نتیجہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ اُن دلوں کو عاجزی عطا فرمائے گا۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوْبُهُمْ. (۱)

اللہ کے لیے اُن کے دل عاجز ہو جائیں گے۔

جب اِنسان کے مزاج میں نرمی و عاجزی اور اِنکساری آ جائے گی تو اس کا دل اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو جائے گا۔ واضح رہے کہ وہی علم صحیح اور نافع ہے جو دلوں کو اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز کر دے۔ جس علم کی طبیعت پُرتاثیر نہ ہو، قلب کو شعور و معرفت نہ ملے، دلوں کے اندر تواضع، انکساری اور سجدہ ریزی نہ آئے اور دل کو اللہ تعالیٰ کے حضور جھکنے کا شعور نہ ملے تو سمجھیں وہ علم بے کار اور غیر نافع ہے۔

۱۔ علم الکتاب کی طاقت اور مؤثریت

قرآن حکیم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ آتا ہے کہ جب انہوں نے اپنے دربار میں ملکہ بلقیس کا تخت منگوانا چاہا تو اپنے درباریوں (جن میں انسان و جنات دونوں موجود تھے) سے پوچھا کہ کون ہے جو ملکِ سبا سے ملکہ بلقیس کا تخت میرے پاس لائے؟ ان کے اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا گیا، قرآن مجید اسے یوں بیان کرتا ہے:

(۱) الحج، ۲۲: ۵۴

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِکَ ج وَاِنِّیْ عَلَيْهِ لَقَوِیٌّ اَمِيْنٌ○[1]

ایک قوی ہیکل جِن نے عرض کیا: میں اسے آپ کے پاس لاسکتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنے مقام سے اٹھیں اور بے شک میں اس (کے لانے) پر طاقت ور (اور) امانت دار ہوں○

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کے سردار کی اس پیش کش کو قبول نہ فرمایا کیونکہ آپ یہ خدمت کسی جن سے نہیں بلکہ انسان سے لینا چاہتے تھے۔ پوچھا کہ کوئی اور ہے جو اتنے وقت سے بھی پہلے تخت لے آئے؟ آگے قرآن بیان کرتا ہے:

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِيْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْکَ طَرْفُکَ ط فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ.[2]

(پھر) ایک ایسے شخص نے عرض کیا جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ علم تھا کہ میں اسے آپ کے پاس لاسکتا ہوں قبل اس کے کہ آپ کی نگاہ آپ کی طرف پلٹے (یعنی پلک جھپکنے سے بھی پہلے)، پھر جب (سلیمان علیہ السلام نے) اس (تخت) کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا (تو) کہا: یہ میرے رب کا فضل ہے۔

تخت لانے والا یہ ایک ایسا شخص تھا جسے اللہ تعالیٰ نے تصرّف، کشف، علم لدنی اور روحانی قوت و طاقت عطا فرمائی تھی۔ اس کی ساری خوبیاں اس آیت سے ثابت ہوتی ہیں، مگر قرآن مجید نے اس کی دیگر تمام خوبیوں کے مقابلے میں اس کا تعارف یوں کروایا:

الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ.

اُس کے پاس آسمانی کتاب کا علم تھا۔

---

(۱) النمل، ۲۷: ۳۹

(۲) النمل، ۲۷: ۴۰

گویا اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کے اندر اتنی تاثیر، قوت، طاقت اور برکت ہوتی ہے کہ وہ ہزاروں میل کی مسافت سے تخت کو پلک جھپکنے سے پہلے مطلوبہ جگہ پر لے آئے۔ اس سے علم بالوحی یا علم الکتاب کی طاقت اور رسائی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ غور طلب بات ہے کہ حضرت سلیمان ﷺ کی اُمت کا ایک ولی علم الکتاب کے فیض سے اس مقام پر فائز ہوگیا تو وہ پیغمبر جن پر وہ علم نازل ہو رہا تھا، ان کی اپنی روحانیت وقوت اور برکت کا عالم کیا ہوگا! نیز اسی نسبت سے حضور نبی اکرم ﷺ کی امت کے صاحبِ علم کا مقام اور آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آیت کریمہ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس ولی کو کتاب کا کامل علم تھا۔ ایسی بات ہرگز نہیں ہے بلکہ فرمایا کہ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ یہ مِنْ تبعیض کے لیے ہے یعنی وہ کتاب جو سلیمان ﷺ پر نازل ہوئی تھی، اس شخص کو اُس کتاب کا کچھ علم تھا۔ اس شخص کے پاس علم کے ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ وہ علم اس شخص کے دماغ کے کسی خانے میں معلومات کے طور پر محفوظ تھا۔ معلومات کے طور پر پڑھنے، لکھنے اور بیان کرنے والا علم تاثیر نہیں دیتا اور نہ ہی یہ علم معجزات، کرامات اور خوارق پیدا کرتا ہے۔ حضرت سلیمان ﷺ کے اس اُمتی کو حاصل علم صرف اس کے دماغ کے خانے میں محفوظ نہیں تھا بلکہ وہ اس شخص کے قلب و باطن اور اُس کی روح پر بھی وارد تھا۔ دراصل وہ ہمہ تن علم الکتاب ہوگیا تھا اور اس علم کی تجلیات نے اس کے قلب و روح کو وہ طاقت اور قوت عطا کر دی تھی کہ وہ ہزاروں میل کی مسافت سے اس تخت کو لانے کے قابل ہوگیا تھا۔ یہ اس علم کا ورود تھا۔ علامہ محمد اقبالؔ نے کیا خوب کہا تھا:

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کُشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشّاف

اَلْعَالِم بِأَمْرِ اللہ اور اَلْعَالِم بِاللہ میں فرق

بندے کو اس قابل ہونا چاہیے کہ اس کے وجودِ نفس اور قلب پر کتاب کے علم کا ورود ہو۔ اَمرِ الٰہی کا عالم علم کو دماغ اور اپنے فہم کی تختی پر لکھ کر رکھتا ہے جبکہ عالم باللہ اُس علم کو دماغ اور عقل کی تختی پر لکھنے کے بجائے قلب و باطن پر وارد کر دیتا ہے اور اُس علم کی تجلیات سے اپنے ظاہر و باطن کو روشن کر لیتا ہے۔ علم کی تاثیرات اُس کے وجود، کلام، زبان اور روح میں آ جاتی ہیں۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی امت کے ولی کو کتاب کے کچھ علم کی اتنی تاثیر ملی تو حضور نبی اکرم ﷺ کی امت کے اولیاء - جنہیں کتابِ محمدی (قرآن مجید) کے علم میں سے کچھ تاثیرات ملی ہیں - اُن کی برکات، کرامات اور عظمتوں کا عالم کیا ہوگا! صحیفۂ سلیمانی اپنی تاثیر، برکت، عظمت اور اپنی معجزانہ حیثیت میں تو قرآن حکیم کا مقابلہ کسی صورت نہیں کر سکتا۔ اس سے حضور نبی اکرم ﷺ کی امت کے اولیاء کا مقام اور ان کی تاثیرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نیز نبی آخر الزمان ﷺ کے علم اور روحانیت کا مقام و مرتبہ کیا ہوگا، اس کا اندازہ لگانا ہماری سوچ و فکر کے بس کی بات نہیں ہے۔

۲۔ علم الکتاب کی تاثیرات کا حامل کون ہے؟

علم الکتاب کی مذکورہ تاثیرات کن کا مقدر بنتی ہیں؟ قرآن مجید نے اس امر کو بھی واضح فرما دیا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ○ (۱)

اور (دوسری طرف) وہ لوگ جنہیں علمِ (حق) دیا گیا تھا بول اٹھے: تم پر افسوس ہے اللہ کا ثواب اس شخص کے لیے (اس دولت و زینت سے کہیں زیادہ) بہتر ہے جو ایمان لایا ہو اور نیک عمل کرتا ہو مگر یہ (اجر و ثواب) صبر کرنے والوں کے سوا کسی کو

(۱) القصص، ۲۸: ۸۰

عطا نہیں کیا جائے گا○

یعنی علمِ کتاب کے حامل لوگ ان لوگوں سے کہنے لگے جنہیں اس علم کی حقانیت، افادیت، تاثیر، برکت اور ہدایت کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یاد رکھو کہ اللہ کا اجر و ثواب صرف اسی کے لیے ہے، جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ ایمان اور نیک عمل کی توفیق صرف صبر کرنے والوں کو ہی نصیب ہوتی ہیں۔

اس آیتِ مبارکہ میں پہلے علم کا ذکر ہے اور اُس کے بعد اعمالِ صالحہ کا تذکرہ ہے۔ گویا یہاں مقصدیت بیان کر دی گئی ہے کہ بے مقصد علم تاثیر پیدا نہیں کرتا۔ علم جب تک روحانی و اخروی ثمرات پیدا نہ کرے اور اس کی کیفیات اور تاثیرات قلب و باطن پر وارد نہ ہوں تب تک بندے کو اُس پھل کی لذت نصیب نہیں ہوتی۔ وہ ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص کے پاس ذائقہ کی حس ہی نہیں تھی جبکہ وہ کیلا اور سیب کھاتا رہا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ روٹی کھا رہا ہے یا کچھ اور کھا رہا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جن کے نفوس مزکّٰی اور قلب مصفّٰی ہو جاتے ہیں اور جن کی روح ملاء اعلیٰ کے ساتھ جڑ جاتی ہے، ان پر علم الکتاب کی تاثیرات وارد ہوتی ہیں۔ جب وہ تلاوتِ قرآن کرتے ہیں تو اپنے سینے میں اُن آیات میں پنہاں روحانی لذت اور حلاوت کی تاثیر کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ قرآن حکیم کے مختلف مقامات کی تلاوت کے دوران قرآن کی نورانی وادیوں کی زیارت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ان کے لیے تمام پردے اٹھا دیے جاتے ہیں اور کیفیات و لذات اور حلاوتیں ان کے قلب و باطن پر وارد ہوتی ہیں۔

۳۔ قلب و باطن پر علم کے وارِد ہونے کی کیفیات و درجات

بندے کو یہ مراتب اسی وقت نصیب ہوتے ہیں جب وہ علم کو اپنے اوپر وارد کر لیتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس علم کو اپنی زندگی پر نافذ اور جاری کرنا ہوگا، تب ہی ہم اپنی ذات کو اس سے روشن اور منور کر سکتے ہیں۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہمارا علم صرف زبان و بیان اور زیادہ سے زیادہ دماغ تک ہوتا ہے۔ یہ علم ہمارے قلب، روح اور نفس و باطن پر وارد نہیں ہوتا۔ علم کے قلب اور باطن پر وارد ہونے کے دو درجے ہیں:

۱۔ بیرونی نفاذ (external enforcement)

۲۔ اندرونی نفاذ (internal enforcement)

(۱) بیرونی نفاذ (External enforcement)

وہ علم سب سے پہلے اوامر و نواہی کی شکل میں ہمارے ظاہر پر وارد ہونا چاہیے تاکہ جسم کا ایک ایک عضو اُس علم کے تابع ہو جائے۔ دراصل یہ اطاعت کا درجہ کہلائے گا۔ یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ ایک عضو بھی اُس علم کی حدود سے باہر نہ جا سکے اور اس علم نے جو احکام و اوامر دیے، ان پر عمل پیرا ہوا جائے اور جن نواہی سے منع کیا گیا ہے ان سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے۔

(۲) اندرونی نفاذ (Internal enforcement)

یہ علم جب باطن پر وارد ہوتا ہے تو دماغ اور عقل و فکر اس علم کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ وہ بندہ خود کو غلط سوچوں سے بچاتا ہے۔ یوں اس کی نیت کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ جب علم ظاہر پر وارد ہوا تھا تو اعمال، افعال اور حرکات و سکنات کی اصلاح ہوگئی اور ظاہری سیرت سنور گئی اور جب اس علمِ حق نے باطن کا رخ کیا تو پھر بندے کی نیت بھی سنور گئی۔

انسان جو بھی ظاہری عمل کرتا ہے اس کے پیچھے نیت کی قوت کارفرما ہوتی ہے۔ مثلاً: وہ نماز کس نیت سے پڑھ رہا ہے، روزہ کس نیت سے رکھ رہا ہے، صدقہ و خیرات کس نیت سے دے رہا ہے، لوگوں کے ساتھ نیکی، بھلائی اور احسان کس نیت سے کر رہا ہے، معاملات کس نیت سے طے کر رہا ہے اور خوش اخلاقی کس نیت سے کر رہا ہے۔ گویا ہر عمل کے پیچھے ایک نیت ہوتی ہے۔ وہ نیت اس کام کے نفاذ کی طاقت ہوتی ہے۔ یہی نیت اُس عمل کی طاقت و تاثیر کو متعین کرتی ہے۔ نیت جیسے جیسے خالص ہوتی چلی جائے گی ویسے ویسے یہ عمل کی طاقت اور تاثیر کو بڑھاتی چلی جائے گی۔

۴۔علم کا باطن پر ورود اور اِصلاحِ قلب

علم جب باطن پر مزید وارد ہوتا ہے تو قلب کی اصلاح ہو جاتی ہے۔قلب ہر غیر اللہ کے خیال سے پاک ہونے لگتا ہے۔ پھر اس بندے کی عبادات و اطاعات، حسنات و خیرات، اعمال و افعال، ارادے اور خواہشات غرضیکہ ساری چیزوں کی سمت خالقِ دو جہاں کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ گویا وہ متوجہ الی اللہ ہو جاتا ہے۔ نماز میں چہرہ کعبہ کی سمت ہوتا ہے مگر جب علم باطن میں وارد ہوتا ہے تو دل کعبہ کے بجائے ربِ کعبہ کی طرف ہو جاتا ہے۔

علمِ حق کے ورود سے باطن برے خیالات وشہوات، حرص و لالچ، بری عادات و رذائل سے محفوظ ہونے لگ جاتا ہے۔ اس طرح نور بڑھنے لگتا ہے جو قلب سے بڑھ کر روح میں اترتا ہے۔ جوں جوں علمِ حق، ظاہر پر، پھر باطن پر، پھر باطن کے باطن پر، پھر اس سے خفی پر وارد ہوتا چلا جاتا ہے، تُوں تُوں کثافتیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں علمِ حق از خود بندے کا ایسا تزکیہ کرتا ہے کہ اسے ملاء اعلیٰ کے ساتھ ملا دیتا ہے۔فرشی انسان عرشی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ چلتا پھرتا تو فرش پر ہے، مگر عرش پر رہنے والوں جیسا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے کہ جس کا ذکر سورۃ القصص کی آیت نمبر ۸۰ میں میں یوں کیا گیا:

وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ○

مگر یہ (اجر وثواب) صبر کرنے والوں کے سوا کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا○

صبر کے بھی کئی درجے ہیں:

۱۔ الصبر في الله

۲۔ الصبر لله

۳۔ الصبر على الله

۴۔ الصبر بالله

۵۔ الصبر مع اللہ

جس طرح کا صبر ہے اسی طرح کا نظم، ثمر، نتیجہ، توفیق اور تاثیر اس بندے کی شخصیت میں پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

۵۔ حقیقی علم کیا ہے اور حقیقی عالم کون ہے؟

قرآن مجید میں علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے اس کی تاثیر و ماہیت پر زور دیا گیا ہے کہ یہ علم کیسے بندے کو اس مقام تک پہنچاتا ہے۔ فرمایا:

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ.[1]

بھلا (یہ مشرک بہتر ہے یا) وہ (مومن) جو رات کی گھڑیوں میں سجود اور قیام کی حالت میں عبادت کرنے والا ہے، آخرت سے ڈرتا رہتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے۔

یعنی ایک طرف ایک منکر، محروم اور گم راہ شخص خدا سے دور ہے اور دوسری طرف ایسا مسلمان ہے جو صرف کلمہ پڑھنے والا نہیں بلکہ ایسا مومن ہے جو رات کی گھڑیوں میں قیام و سجود کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتا ہے۔ وہ آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب سے رحمت کی امید رکھتا ہے۔ بھلا وہ شخص جو محروم ہے اور وہ شخص جو سعید ہے، ایک جیسے کیسے ہو سکتے ہیں! چنانچہ اس واضح فرق کو اسی آیت کے اگلے حصے میں بیان فرمایا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ.[2]

فرما دیجیے: کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو لوگ علم نہیں رکھتے (سب) برابر ہو سکتے ہیں؟

---

(۱) الزمر، ۳۹:۹

(۲) الزمر، ۳۹: ۹

اللہ تعالیٰ نے جب ان کی برابری کو ردّ کیا تو پہلے اس علم کی ماہیت و نوعیت کو بیان کیا، کیونکہ 'علم والے اور علم نہ رکھنے والے برابر نہیں ہو سکتے'۔ اس اظہار کے لیے الگ آیت نہیں آئی۔ یہ ایک ہی آیت کریمہ کے دو حصے ہیں: پہلا حصہ بطورِ مقدمہ اور آیت کا دوسرا حصہ اس کا نتیجہ بیان کرتا ہے۔

آیت کریمہ میں علم والوں سے مراد وہ ہیں جن کے قلب و باطن پر علم وارد ہوا اور وہ علمِ الٰہی اور علمِ کتاب کی تجلیات سے روشن ہیں۔ یہاں علم سے مراد وہ علم والے نہیں ہیں جو اپنے علم کی اسناد حاصل کر کے دنیا کماتے ہیں اور امت کو تفرقہ بازی کے ذریعے فرقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خود بھی گم راہ ہوتے ہیں اور مخلوقِ الٰہی کو بھی گم راہ کرتے ہیں۔ جس علم کے حصول کے باوجود تواضع و انکساری، خشوع و خضوع صدق و اخلاص، تقویٰ و طہارت اور اپنے فرائض و واجبات کا احساس نہیں آتا تو اس صورت میں ایسا 'علم' رکھنے والوں سے تو علم نہ رکھنے والے ہی بہتر ہوں گے۔ شیخ ابو العباس مُرسی فرماتے ہیں:

اَلْعِلْمُ هُوَ الَّذِي يَنْطَبِعُ فِي الْقَلْبِ كَالْبَيَاضِ فِي الْأَبْيَضِ، وَالسَّوَادِ فِي الْأَسْوَدِ.[1]

علم وہ ہے جو دل میں یوں سرایت کر جائے جیسے سفید چیز میں سفیدی اور سیاہ چیز میں سیاہی۔

حقیقی علم تو وہ ہے جو بندے کے قلب و باطن اور اُس کے وجود پر اِس طرح وارد ہو کہ اسے رات کے اندھیروں میں سجدہ ریز کر دے۔ جو ہمہ وقت اسے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف متوجہ رکھے، آخرت کا خوف جگائے رکھے اور اس کے اندر تواضع و انکساری، تقویٰ و پرہیزگاری اور نرمی و غم گساری پیدا کر دے۔ ایسا علم انسان کے تن اور من کو بھی سنوارے گا اور باطن کو بھی نکھار دے گا۔ ایسا علم رکھنے والوں کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

(۱) شعرانی، الطبقات الکبری:۳۱۸

۶۔ قرآن مجید کی پہلی وحی اور علم کی سمت کا تعین

حضور نبی اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی آیت بھی فضیلتِ علم کو آشکار کرتی ہے۔ فرمایا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ○[1]

(اے حبیب!) اپنے رب کے نام سے (آغاز کرتے ہوئے) پڑھیے جس نے (ہر چیز کو) پیدا فرمایا○

اس آیت کریمہ نے علم کی سمت کو متعین کر دیا ہے کہ علم وہی ہے جو تجھے رب سے آشنا کر کے اس کی معرفت عطا فرما دے۔ یہ آیت علم کے باب میں علم کو رب کی معرفت کے ساتھ جوڑ رہی ہے یعنی جو علم رب کی معرفت نہ دے اور اُس کی ربوبیت کے رنگ میں نہ رنگ دے، اللہ تعالیٰ کی بزرگی کی تجلیات و اثرات دل پر نہ اتارے اور اندھیرے دور نہ کرے؛ وہ علم، علم کہلانے کا حق دار ہی نہیں ہے۔

۷۔ مراتبِ علم

اللہ تعالیٰ نے سورۃ التکاثر میں علم کے مراتب کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ○ کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ○[2]

پھر (آگاہ کیا جاتا ہے) ہرگز نہیں: عنقریب تمہیں (اپنا انجام) معلوم ہو جائے گا○ ہاں ہاں! کاش تم (مال و زر کی ہوس اور اپنی غفلت کے انجام کو) یقینی علم کے ساتھ جانتے (تو دنیا میں کھو کر آخرت کو اس طرح نہ بھولتے)○

یہ قرآنی آیات انسان کو آنے والی حقیقت سے آگاہ کر رہی ہیں حالانکہ ابھی روزِ

(۱) العلق، ۹۶: ۱
(۲) التکاثر، ۱۰۲: ۳–۵

قیامت قبروں سے جی نہیں اٹھے، ابھی دنیا میں ہی ہیں اور جنت اور دوزخ میں بھی نہیں گئے۔ اِس دنیا میں دیکھے بغیر جاننا، ماننا اور یقین کے مرتبے تک پہنچنا 'علم الیقین' کہلاتا ہے۔

علم الیقین کے مرتبے تک پہنچانے کے بعد اب مرنے کے بعد کی بات بیان ہو رہی ہے۔ فرمایا:

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ○ (۱)

تم دوزخ کو ضرور دیکھو گے۔

یعنی جس حرص نے تمہیں اور تمہاری زندگی کو برباد کیا، اُس کے نتیجے میں دوزخ کو ضرور دیکھو گے۔ اور جب دیکھ لو گے تو پھر فرمایا:

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ○ (۲)

پھر تم اسے ضرور یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے○

یہاں یقین کی آنکھ سے دیکھنے کو عین الیقین کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اُس عین الیقین یعنی مشاہدے کے بعد ہونے والا ورود حق الیقین بنتا ہے۔

اِن آیات میں علم کو 'علم الیقین' کے ساتھ جوڑا گیا ہے، یعنی جب یقین کا علم تھا تو اسے علم الیقین کہا۔ جب تک قیامت دیکھی نہیں تھی تو وہ پردۂ غیب میں تھی، اس پر ایمان لائے، اس کا علم حاصل کر لیا اور یقین کر لیا تو علم الیقین ہوا۔ جب جنت اور دوزخ میں داخل ہو گئے اور انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو اسے عین الیقین کہا۔ یعنی جب قیامت کے دن اٹھ کر دیکھ لو گے تو عین الیقین ہو جائے گا۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوخ میں داخل ہو جائیں گے تو ان کے اعمال کی روشنی میں جنت کی راحتیں اور دوزخ کی اذیتیں ان کے تن اور

(۱) التکاثر، ۱۰۲: ۶
(۲) التکاثر، ۱۰۲: ۷

من پر بیتیں گی تو اس وقت ان پر جو علم بیتے گا تو وہ حق الیقین ہوگا۔ علم کو جانا تو علم الیقین کہا، جب اس میں داخل ہو گئے تو اسے حق الیقین کہا۔

ان مراتبِ علم کو قرآن مجید کی سورۃ الواقعہ کی روشنی میں بھی دیکھتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ○ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ○[1]

جب واقع ہونے والی (قیامت) واقع ہو جائے گی○ اُس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے○

قیامت تو چونکہ بپا ہوگی اور ہر ایک شخص پر وارد ہوگی، اِس لیے قیامت کو 'واقعہ' کہا۔ جب کسی چیز کو واقعہ کہتے ہیں تو وہ مشاہدہ نہیں رہا بلکہ اب علم الیقین سے بھی بات آگے چلی گئی۔ علم الیقین بغیر دیکھے مانا تھا، عین الیقین دیکھ کر تسلیم کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت کو 'الواقعۃ' سے تعبیر فرمایا ہے اور سورت کا نام بھی یہی رکھا۔

غور طلب بات ہے کہ جب واقعہ صادر ہو جاتا ہے تو بات دیکھنے سے آگے بڑھ جاتی ہے، کیونکہ اب جو کچھ اُس کے اثرات ظاہر ہونا تھے وہ سب ظاہر ہو گئے۔ گناہ گاروں کو ہولناکی سے جو خوف زدگی پیدا ہونا تھی وہ ہو گئی اور مومنین کو اللہ تعالیٰ کے تبسم ریز چہرۂ حق نے جو راحت وسکون دینا تھا، وہ انہیں نصیب ہو گئی۔ دوسرے لفظوں میں جنہیں دوزخ میں گرانا تھا، انہیں گرا دیا گیا، جن کی شفاعت ہونی تھی، ان کی شفاعت بھی ہو گئی۔ پہلے واقعہ کا علم تھا تو علم الیقین تھا، اب قبر سے اٹھے تو واقعہ کو دیکھ لیا اور یہ عین الیقین ہے۔ اب وہ واقعہ وقوع پذیر ہو گیا، یعنی جس چیز کا علم تھا، اب وہ علم وارد ہو گیا اور کیفیت بن گیا ہے، مشاہدہ سے بات آگے چل کر واقعہ تک نکل گئی ہے تو اسے حق الیقین کہتے ہیں۔

علم کی تینوں حالتوں کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً: آپ اپنے گھر میں موجود ہیں کہ خبر ملتی ہے کہ فلاں شخص کی گاڑی کا حادثہ ہو گیا ہے، جس میں وہ شدید زخمی ہے۔ آپ اس واقعے پر صدمہ محسوس کرتے ہیں۔ اس خبر سے ملنے والی گھبراہٹ علم الیقین ہے۔

(۱) الواقعة،۵۶:۱-۲

اسی واقعہ کی دوسری شکل یہ ہے کہ آپ سڑک پر جا رہے ہیں اور اپنی آنکھوں کے سامنے ایک مہلک حادثے کو رونما ہوتے دیکھتے ہیں کہ شدید زخمی حالت میں ایک شخص کو پچکی ہوئی گاڑی سے باہر نکال کر ایمبولینس میں ہسپتال پہنچایا جا رہا ہے۔ آپ نے اس حادثے کے تمام واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا؛ یہ عین الیقین ہے۔

پہلی صورت میں حادثے کا سن کر آپ اس قدر گھبراہٹ، پریشانی اور خوف کا شکار نہیں ہوئے ہوں گے، جس قدر ایک حادثے میں ایک جیتے جاگتے انسان کو موت کے گھاٹ اترتا دیکھ کر آپ خوف محسوس کرتے ہیں۔ غور کیا جائے تو پہلی اور دوسری شکل میں آپ کے خوف زدہ ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔

اب اس کی ایک تیسری شکل یہ بھی ہے کہ یہ حادثہ اللہ نہ کرے خود آپ کے ساتھ رونما ہو رہا ہو اور شدید زخمی حالت میں آپ کو تباہ حال گاڑی سے باہر نکالا جا رہا ہے۔ آپ زخموں سے چور چور ہیں، آپ کے لیے یہ اذیت ناک صورت حال قیامت کا منظر پیش کر رہی ہے۔ اب جس پر یہ قیامت بیتے وہی اس حادثے کی ہولناکی کو زیادہ محسوس کر سکتا ہے۔ حادثے کی یہ صورت علم کا آخری درجہ ہے جسے حق الیقین کہتے ہیں۔

آپ بخوبی سمجھ گئے کہ کسی واقعہ کی خبر سن کر، دیکھ کر یا خود پر بیتنے پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ قیامت کے احوال کی خبر پڑھ کر یا سن کر جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم الیقین ہے۔ قیامت کے دن کو دیکھ کر جو کیفیات ہوں گی، وہ عین الیقین کا مرتبہ ہے اور جب یہ واقعہ خود پر بیت گیا تو یہ حق الیقین ہے۔

قرآن حکیم نے یقین کے یہی تینوں مراتب سورۃ الواقعہ میں بیان فرمائے ہیں کہ جس کا علم تھا، جس کو آنکھوں سے دیکھا تھا اب وہ تم پر بیت گیا۔ اب جو ہوگیا، اسے قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے:

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ○ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ○[1]

(۱) الواقعة، ۵۶: ۸۸

پھر اگر وہ (وفات پانے والا) مقرّبین میں سے تھا○ تو (اس کے لیے) سرور و فرحت اور روحانی رزق و استراحت اور نعمتوں بھری جنت ہے○

اب تصور دیا جا رہا ہے کہ جس پر قیامت واقعہ ہوگئی اگر وہ مقربین میں سے تھا تو اس کے لیے روحانی رزق اور استراحت ہوگی اور نعمتوں بھری جنت ہوگی۔

پھر مزید فرمایا گیا:

وَ اَمَّآ اِنْ کَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ○ فَسَلٰمٌ لَّکَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ○[1]

اور اگر وہ اصحاب الیمین میں سے تھا○ تو (اس سے کہا جائے گا) تمہارے لیے دائیں جانب والوں کی طرف سے سلام ہے (یا اے نبی! آپ پر اصحابِ یمین کی جانب سے سلام ہے)○

یعنی اب اسی وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کی دوسری صورت بیان کی جا رہی ہے کہ اب اس پر سلام کے تحائف آئیں گے۔

پھر فرمایا:

وَ اَمَّآ اِنْ کَانَ مِنَ الْمُکَذِّبِیْنَ الضَّآلِّیْنَ○ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِیْمٍ○ وَّ تَصْلِیَةُ جَحِیْمٍ○[2]

اور اگر وہ (مرنے والا) جھٹلانے والے گمراہوں میں سے تھا○ تو (اس کی) سخت کھولتے ہوئے پانی سے ضیافت ہوگی○ اور (اس کا انجام) دوزخ میں داخل کر دیا جانا ہے○

اب جب اسے سخت کھولتے ہوئے پانی کی ضیافت پر دوزخ میں داخل کیا جائے گا

(۱) الواقعة، ۵۶: ۹۱-۹۲

(۲) الواقعة، ۵۶: ۹۲-۹۴

اور وہاں آگ میں جلے گا اور کھولتا ہوا پانی اور پیپ پیے گا، جس سے اُس کی انتڑیاں کٹ جائیں گی۔ جب یہ سب کچھ بیت جائے گا تو اُس مقام پر فرمایا:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ○[1]

بے شک یہی قطعی طور پر حق الیقین ہے○

جس خبر کے بارے میں تمہیں بتایا تھا اور تمہیں اس کا علم ہوا وہ علم الیقین تھا اور جو کچھ تم نے خود دیکھ لیا وہ عین الیقین تھا۔ اب جب وہ سب کچھ تم پر بیت رہا ہے، اگر دائیں ہاتھ والے مقربین میں سے ہو تو جنت کی راحتیں، لذتیں، استراحتیں، روحانی رزق اور فرحت و سُرور کی کیفیتیں تم پر بیت رہی ہیں اور اگر بائیں ہاتھ (یعنی دوزخ) والوں میں سے ہو تو آگ میں جل رہے ہو، کھولتا ہوا پانی اور پیپ پی رہے ہو، انتڑیاں کٹ گئیں اور تمہارے پرخچے دوزخ میں اڑ گئے اور گل سڑ گئے ہوں تو اس کیفیت کو حق الیقین کہتے ہیں۔

۸۔ کمالِ علم کب اور کسے نصیب ہوتا ہے؟

سوال یہ اٹھتا ہے کہ علم کو کمال اور عروج کب نصیب ہوتا ہے؟ اور علم نافع کون سا علم ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں بھی امت کو آگاہ فرما دیا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: فَعِلْمٌ فِي الْقَلْبِ وَذٰلِکَ الْعِلْمُ النَّافِعُ، وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذَالِکَ حُجَّةُ اللهِ عَلَى ابْنِ آدَمَ.[2]

---

(۱) الواقعة، ۵۶: ۹۵

(۲) ۱۔دارمي، السنن، ۱: ۱۱۴، رقم: ۳۶۴

۲۔ابن أبي شيبة، المصنف، ۷: ۸۲، رقم: ۳۴۳۶۱

۳۔بيهقي، شعب الايمان، ۲: ۲۹۴، رقم: ۱۸۲۵

۴۔ابن المبارك، الزهد، ۱: ۴۰۷، رقم: ۱۱۶۱

علم دو (طرح کے) ہیں: ایک علم دل میں ہوتا ہے اور یہ علم نافع ہے اور ایک علم زبان پر ہوتا ہے، یہ ابن آدم پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے۔

اس حدیث مبارک میں سرورِ انبیاء ﷺ نے علم کی دو اقسام بیان فرمائی ہیں:

پہلا علم وہ ہے جو قلب کے اندر متمکن ہوتا ہے، یعنی جب یہ علم باطن پر وارد ہوتا ہے، اس کا ورودِ تام ہوتا ہے تو یہ حق الیقین بنتا ہے۔ یہ وہ یقین ہے جو قلب سے جنم لیتا ہے اور اسے علم نافع کہتے ہیں۔

دوسرا علم وہ ہے جو زبان پر ہے۔ یہ علمِ حجت ہے۔ اس علم سے فرائض و واجبات، محرمات اور منہیات متعین ہوتے ہیں۔ یہ علم واجب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علمِ واجب بھی حاصل ہونا چاہیے اور علمِ نافع بھی تاکہ بندہ دونوں کمالات تک بخوبی پہنچ سکے۔

دوسرے لفظوں میں زبان سے صادر ہونے والا علم، علم ظاہر ہے۔ اُس سے فرائض اور واجبات متعین ہوتے ہیں اور یہ حجت ہے؛ مگر جس علم کا پودا قلب کی زمین پر اگتا ہے، وہ اصل میں نافع علم ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

إِذَا أَرَادَ اللهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا فَقَّهَهُ فِي الدِّيْنِ وَأَلْهَمَهُ رُشْدَهُ. (۱)

۵۔ خطيب بغدادي، تاريخ بغداد، ۴: ۳۴۶، رقم: ۲۱۷۹

۶۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۱: ۵۸، رقم: ۱۳۹

(۱) ۱۔ بزار، المسند، ۵: ۱۱۷، رقم: ۱۷۰۰

۲۔ بيهقي، المدخل إلى السنن الكبرى، ۱: ۲۵۴، رقم: ۳۵۴

۳۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۱: ۲۴۲، رقم: ۹۳۴

۴۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۱: ۱۲۱، فرمایا: اسے امام بزار اور طبرانی نے المعجم الکبیر میں روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

۵۔ ہندی، کنز العمال، ۱۰: ۶۰، رقم: ۲۸۶۹۰

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرما لیتا ہے تو اُسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور اُس کے دل میں اُس کی رشد اور ہدایت کو ڈال دیتا ہے۔

یہاں حضور نبی اکرم ﷺ نے لفظِ علم استعمال نہیں کیا، اس لیے کہ علم کمال کو تبھی پہنچتا ہے جب عِلْم عَلَى اللِّسَان بھی ہو اور عِلْم فِي الْقَلْب بھی ہو۔ علم ظاہر بھی ہو اور علمِ نافع بھی ہو، یعنی وہ علم جو علم الیقین بھی ہو اور عین الیقین بھی ہو۔ جب یہ دو جمع ہوں تو وہ علم اپنا حقیقی ثمر انسان کو عطا کرتا ہے۔ اِسی لیے حضور نبی اکرم ﷺ نے یہاں فَقَّهَهُ فِي الدِّيْنِ کا لفظ استعمال فرمایا کہ اُسے دین میں تفقہ عطا فرماتا ہے۔ یہ علم میں گہرائی اور گیرائی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ دین کے علم، فہم اور حقائق و معارف سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

مذکورہ دونوں احادیث مبارکہ کو آپس میں ملائیں تو مؤخر الذکر حدیث کے دوسرے حصہ میں فرمایا:

وَأَلْهَمَهُ رُشْدَهُ فِيْهِ.

اور اُس کے دل میں اُس کی رشد اور ہدایت کو ڈال دیتا ہے۔

جبکہ اوّل الذکر حدیث میں فرمایا ہے کہ علم دو (طرح کے) ہیں: ایک علم دل میں ہوتا ہے اور ایک علم زبان پر ہوتا ہے۔ ان دونوں احادیث مبارکہ کو باہم جوڑنے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ حدیث مبارک میں دونوں علوم عِلْم فِي الْقَلْب اور عِلْم عَلَى اللِّسَان کو جمع فرماتے ہوئے اُسے تفقه فی الدین اور الهام فی القلب کا نام دیا گیا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہر صاحبِ علم کے لیے لازم نہیں ہے کہ اُسے رشد بھی الہام کیا گیا ہو۔ بعض اوقات اُسے احکام کا علم معلوم ہوتا ہے اور رشد کا الہام نہیں ہوتا۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ یاد رہے کہ اگر علم الاحکام ہو تو وہ عِلْم عَلَى اللِّسَان یعنی زبان کا علم ہے۔ اگر اُسے علم کا رُشد اور الہام ہو جائے تو وہ عِلْم فِي الْقَلْب ہے۔ جب یہ دونوں چیزیں جمع ہوتی ہیں تو علم الیقین بھی آ گیا، عین الیقین بھی حاصل ہو گیا اور عین الیقین کے ساتھ مرتبہ حق الیقین بھی نصیب ہو گیا۔

۹۔ صاحبِ علم الیقین پر وارد ہونے والی تجلیات

کتاب کے علم کا فیض جب بندے پر وارد ہو جائے تو بندہ روحانی طور پر اِس قدر ترقی کرتا ہے کہ وہ عین الیقین کی وادی میں داخل ہو جاتا ہے اور اس پر سارے پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ جب اُس پر علم بیتتا ہے تو وہ بندہ تبدیل ہو جاتا ہے، اُس کی آنکھ بھی تبدیل ہو جاتی ہے اور اُس کے ذائقے، کیفیات اور حالات بھی بدلتے چلے جاتے ہیں۔ گویا اُسے حق الیقین والوں کی سی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم حق الیقین کے حاملین کی صفات کا ذکر کچھ یوں کرتا ہے:

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ○[1]

اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔

صاحبِ علم احسان کرنے والا بن چکا ہے۔ اُسے علم نے کہا تھا کہ دلوں کا نرم ہونا اللہ کو پسند ہے، لہٰذا اُس کا دل نرم ہو چکا ہے۔ اب غیظ وغضب اُس کے مزاج سے نکل چکا ہے۔ چونکہ نرمی، تواضع اور انکساری اللہ کو پسند ہے، لہٰذا وہ تواضع و انکساری کا پیکر بن چکا ہے۔ اُسے علم الکتاب نے کہا تھا کہ اللہ پر توکل کرنا مومنوں کی شان ہے، لہٰذا وہ متوکل بن چکا ہے۔ اُسے علم نے کہا تھا کہ صبر وشکر اور رضا وتفویض اللہ کے قریب لے جانے والے اوصاف ہیں، اس آگہی پر وہ صاحبِ صبر وشکر، صاحبِ رضا اور صاحبِ تفویض بھی بن چکا ہے۔ اُس کا دل کامل متوکل بن چکا، اب وہ کسی امر میں بھی ناشکری نہیں کرتا، متذبذب نہیں ہوتا اور شک و شبہ کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ مرتبۂ یقین پر فائز ہے اور سرتاپا اَخلاقِ حسنہ کا عامل بن چکا ہے۔ اب وہ لوگوں سے درگزر کرتا ہے، ان کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے اور کسی پر غصہ اور جلال کا اظہار نہیں کرتا۔ وہ کسی سے نفرت، ضد اور حسد نہیں کرتا۔ اب وہ لوگوں کے لیے سراپا رحمت و نصیحت بن چکا ہے۔

---

(۱) آل عمران، ۳:۱۳۴

حق الیقین کا مطلب یہ ہوا کہ علم الکتاب جو اُسے ملا، پہلے وہ علم دماغ کے خانے میں، کتابوں، تصنیفات، درس و تدریس اور فتاویٰ جات کی شکل میں رکھا ہوا تھا۔ پھر عین الیقین ہوا تو اُس پر پردے اٹھنے لگے اور وہ دیکھنے لگ گیا۔ جب اُسے بصیرت نصیب ہوئی تو وہ کبھی اللہ کی قربت کی وادیوں میں گم ہوتا ہے، کبھی اللہ کی رضا کے گلشن میں بے خود ٹہلتا ہے، کبھی طاعتوں کی نگری میں گم ہو جاتا ہے اور کبھی انوار و تجلیات کی روشنیوں میں خیرہ خیرہ پھرتا ہے، الغرض جوں جوں پردے اٹھتے جاتے ہیں، تُوں تُوں وہ قرآن کی وادیوں میں خود کو مستغرق پاتا ہے۔

جب مرتبہ حق الیقین آتا ہے تو اب اُس کے اخلاق پہلے والے نہیں رہتے، اُس کا مزاج یکسر تبدیل ہو چکا ہوتا ہے اور وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اُسے نئے اخلاق عطا ہو جاتے ہیں اور اسے نیا کلام، نیا فہم و تدبر، اِدراک اور معرفت عطا کر دیئے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کتابوں کی نصوص اور الفاظ کے نئے معانی اس پر کھلے نہیں تھے۔ اب علم الیقین کے مقام پر یہ سب اس پر آشکار ہوتا ہے اور اُس کے احکام، الفاظ اور نصوص اُس کے ساتھ کلام کرتے ہیں۔ پھر جب مرحلہ عین الیقین میں جاتا ہے تو مزید پردے اٹھتے ہیں اور معارف اُس کے ساتھ کلام کرتے ہیں۔ جب مرحلہ حق الیقین میں جاتا ہے تو جو کچھ پڑھتا تھا، وہی کچھ ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر وہ

ذاکر همه ذکر و ذکر مذکور شود

کے مصداق ہو جاتا ہے۔

اب یہ معرفت اوروں کے پاس نہیں ہے۔ چونکہ دوسرے علم الیقین سے عین الیقین اور عین الیقین سے حق الیقین تک نہیں پہنچے۔ چنانچہ جو جہل، ظن، شک اور رَیب کی وادی میں سرگرداں ہیں وہ علم کی وادی کے مزے کہاں سے چکھیں۔ وہ علم کی وادی میں جائے گا تو تبھی اس کے بعد علم الیقین کا درجہ حاصل کرے گا۔ اس لیے کہ علم الیقین اپنے اثرات سے انسان کی طبیعت، مزاج، فہم، فکر اور ادراک کو بدلتا ہے۔

باب نمبر 4

التفقّہ فی الدین اور اُس کے اِبلاغ کی فضیلت

آقائے دو جہاں حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے جیسے بھی حالات ہوں، چاہے عروج و زوال کے مرحلے آئیں اور وہ اپنے اعمال و احوال میں محکوم و مغلوب ہو جائے اور اُس میں بہت سی برائیوں، شرور، نقائص، خرابیوں اور فتنوں کا غلبہ ہوتا چلا جائے؛ الغرض خواہ کتنا بھی زوال کا زمانہ کیوں نہ ہو، پھر بھی اللہ تعالیٰ کا ارادۂ خیر اُمت میں کچھ لوگوں کے ساتھ تسلسل سے قائم و دائم رہے گا۔ جیسے خیرات کی یہ عنایت پہلے زمانوں میں جاری رہی ہے، ویسے ہی یہ ہر کٹھن اور پرفتن دور میں رواں رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر اُمت کے آخری دور اور قربِ قیامت سے قبل فتنوں کے ظہور کا ذکر کرتے ہوئے یہ سب کچھ بیان فرمایا ہے۔

۱۔ علم اور فقہ میں فرق

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ، وَالْفِقْهُ بِالتَّفَقُّهِ، وَمَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ. وَإِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ. (۱)

---

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۱۹: ۳۹۵، رقم: ۹۲۹

۲۔ طبرانی، مسند الشامیین، ۱: ۴۳۱، رقم: ۷۵۸

۳۔ بیہقی، المدخل إلی السنن الکبریٰ، ۱: ۲۵۳، رقم: ۳۵۲

۴۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۱: ۱۲۸

۵۔ ابن حجر عسقلانی نے 'فتح الباری (۱: ۱۶۱)' میں لکھا ہے کہ اس ـــــ

اے لوگو! بے شک علم سیکھنے سے آتا ہے اور فقہ (غور وفکر کے ساتھ) سمجھنے سے آتی ہے۔ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔ اور اللہ کے بندوں میں سے اُس سے وہی ڈرتے ہیں جو علم (نافع) رکھنے والے ہیں۔

علم سیکھنے سے آتا ہے اور فقہ گہرائی میں جا کر سمجھنے سے آتی ہے۔ اگر علم اور فقہ دونوں ایک ہی چیز ہوتے تو آپ ﷺ انہیں جدا جدا بیان نہ فرماتے۔ علم محض جاننے، پڑھنے اور سیکھنے سے آتا ہے اور اِس کے لیے اساتذہ، کتابیں، مدارس، مجالس اور حلقات درکار ہوتے ہیں۔ یعنی تعلم کے جتنے ذرائع ہیں ان سے محض علم آتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے علم کو الگ ذکر کرنے بعد فقہ کو بیان فرمایا کہ فقہ، تفقہ سے حاصل ہوتی ہے۔ تفقہ تب ملتی ہے جب ایک شخص میں علم فی القلب اور علم علی اللسان یعنی دونوں مرتبے اکٹھے جمع ہو جائیں۔ اس طرح اُسے علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کی تینوں وادیوں میں سے کچھ حصہ ملتا ہے۔ پس فقہ دین کی ایسی کامل معرفت کا نام ہے جس میں پوری گہرائی اور گیرائی پائی جائے۔

۲۔ التفقّہ فی الدین کی نعمت بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ سے نصیب ہوتی ہے

تفقہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم عطا ہے۔ ظاہری ذرائع میں ہم خواہ ساری زندگی بھی گنوا دیں اور ساری عمر لکھنے، پڑھنے اور علم وفن کے حصول میں بسر کر دیں؛ اِس سے علم اور تعلم تو حاصل ہوگا مگر تفقہ نہیں آئے گی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تفقہ کسے اور کس طرح سے ملتی ہے؟

اس حوالے سے قرآن وسنت سے یہ واضح ہے کہ جس دل میں اللہ تعالیٰ رُشد و اِلہام داخل کر دے، اُسے تفقہ فی الدین نصیب ہوتی ہے اور وہ فقیہ ہوتا ہے۔ تفقہ کا حصول عطاء اِلٰہی

..... کی اسناد حسن ہے۔

۶۔ ہندی، کنز العمال، ۱۰: ۱۰۴، رقم: ۲۹۲۶۵

پر منحصر ہے اور ظاہری کاوشوں کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت درج ذیل حدیث مبارک سے ملتی ہے:

مَنْ يُّرِدِ اللهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللهُ يُعْطِي.(۱)

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے تفقہ فی الدین عطا فرماتا ہے اور یقیناً میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرمانے والا ہے۔

کامل معرفت ہو تو تفقہ فی الدین ہوگی اور اگر کامل معرفت نہ ہو تو ادھورا علم 'تفقہ فی الدین' نہیں ہوسکتا۔ اور جو تفقہ فی الدین نصیب ہوتی ہے، یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی وہ خیرات ہے جو بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ سے ملتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے جس کا جتنا قلبی و روحانی تعلق، اُسوہ و سیرت کی پیروی کا تعلق اور اَخلاق و اِتباع کا تعلق جڑتا اور پختہ ہوتا چلا جائے گا، اُسی قدر اُمتی کو درِ مصطفیٰ ﷺ سے تفقہ فی الدین کی خیرات ملتی چلی جائے گی۔ جب تک قلب کے برتن حضور نبی اکرم ﷺ کے در پر نہ رکھے ہوئے ہوں اور ان کے اندر تقویٰ و تواضع، عاجزی و انکساری اور اخلاقِ محمدی کی ترنگ نہ ہوں تو وہ ظروف اِس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان میں آقا ﷺ تفقہ فی الدین کی خیرات ڈال دیں۔ اگر دل کا برتن گندا ہے، اُس میں حسد، بغض، عناد، غیبت، چغلی، تکبر اور غضب ہے تو ایسے آلودہ برتن میں تفقہ فی الدین یعنی دین کی کامل معرفت کی

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب العلم، باب من يرد اللّٰه به خيرا يفقّهه في الدين، ۱: ۳۹، رقم: ۷۱

۲۔ بخاري، الصحيح، كتاب فرض الخمس، باب قول اللّٰه تعالى: فإن لله خمسه وللرسول ﷺ، ۳: ۱۱۳۴، رقم: ۲۹۴۸

۳۔ بخاري، الصحيح، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب قول النبي ﷺ: لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق وهم أهل العلم، ۶: ۲۶۶۷، رقم: ۶۸۸۲

۴۔ مسلم، الصحيح، كتاب الزكاة، باب النهي عن المسألة، ۲: ۷۱۸، رقم: ۱۰۳۷

خیرات نہیں ڈالی جاتی۔

حدیث مبارک زبانِ حال سے اعلان کر رہی ہے کہ اے لوگو! تقسیم تو میں ہی کرتا ہوں؛ اگر میرے اخلاق اپناؤ گے، میرے ساتھ مناسبتِ تامہ پیدا کرو گے، نسبتِ کامل جوڑو گے، اَخلاق، اُسوہ، سیرت، کلام اور زندگی کے ظاہر و باطن میں میری کامل اتباع کرو گے تو تفقہ فی الدین کی خیرات نصیب ہوگی۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓاءُ.(۱)

بس اللہ کے بندوں میں سے اس سے وہی ڈرتے ہیں جو (ان حقائق کا بصیرت کے ساتھ) علم رکھنے والے ہیں۔

اس لئے کہ اللہ کے بندوں میں سے جو علماء ہیں، اُن کے دل حقیقت میں اللہ سے ڈرتے ہیں؛ کیونکہ علمِ صحیح اُنہیں خشیت، تواضع اور انکساری سکھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حضور جھکنا سکھا دیتا ہے اور انہیں قرب کی دولت سے نوازتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ علم کی اوّلین شرط یہ ہے کہ وہ باعثِ خشیت ہو اور اُس سے خشیت الٰہی کا ثمر پیدا ہو۔ دوسری طرف تفقہ اور کامل معرفتِ دین وہ ہے جسے آقا ﷺ کی بارگاہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور وہب عطا کیا جائے۔

۳۔ التفقّہ فی الدین کی خیرات ہر ایک کا نصیب نہیں ہوتی

یہ بات توجہ طلب ہے کہ التفقہ فی الدین کی خیرات امت کے ہر فرد کو نہیں ملے گی۔ اس ضمن میں عوام ہوں یا خواص، علماء ہوں یا غیر علماء ہر ایک کی بات نہیں ہو رہی؛ بلکہ فرمایا کہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی خیر کا ارادہ فرمائے گا، اُسی کو اس نعمتِ عظمیٰ سے نوازا جائے گا۔ جیسے قرآن مجید نے سورۃ الکہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ

(۱) فاطر، ۳۵: ۲۸

میں ارشاد فرمایا:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا.(۱)

تو دونوں نے (وہاں) ہمارے بندوں میں سے ایک (خاص) بندے (خضر علیہ السلام) کو پا لیا۔

معلوم ہوا مخلوقِ الٰہی میں سے خاص بندے (خواص) ماضی میں بھی تھے اور آج بھی موجود ہیں اور مستقبل میں بھی ہوتے رہیں گے۔ عددی تناسب چاہے کم ہوتا چلا جائے، مگر موجودگی ہر دور میں رہے گی۔

اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر خیر ہر فرد کو دی جاتی تو اُس زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑھ کر افضل و اعلیٰ، ارفع و اولیٰ ہستی بھلا کون تھی؟ وہ اللہ کے رسول، علم شریعت اور علم تورات کے حامل اور کلیم اللہ تھے، لیکن جو علم بندۂ خاص حضرت خضر علیہ السلام کو عطا کیا گیا، اللہ کی وہ عنایت کچھ اور تھیں۔ اس ضمن میں قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًاo(۲)

جسے ہم نے اپنی بارگاہ سے (خصوصی) رحمت عطا کی تھی اور ہم نے اسے علمِ لدنی (یعنی اَسرار و معارف کا اِلہامی علم) سکھایا تھاo

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے جسے چنا، اُسے خصوصی رحمت اور علم لدنی (اللہ تعالیٰ کے علم خاص) کے خزانے سے بغیر کسی ظاہری واسطے، وسیلے اور ذریعے سے نواز دیا اور اُس علم کی تلاش میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بذاتِ خود تشریف لے گئے۔

مذکورہ حدیث مبارک میں بھی حضور نبی اکرم ﷺ کے فرمان مبارک کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارادۂ خیر خصوصیت کے ساتھ ہر دور میں جاری رہا، جاری ہے اور جاری رہے گا اور

(۱) الکہف، ۱۸: ۶۵

(۲) الکہف، ۱۸: ۶۵

قیامت کے بپا ہونے تک کوئی بھی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جس میں امت مسلمہ اللہ تعالیٰ کے اِس ارادۂ خیر سے کلیتًا محروم ہو جائے۔ نیز اللہ تعالیٰ دین کا تفقہ اور معرفتِ تامّہ ہر زمانے میں لوگوں کو زمانے کی ضروریات، حاجات، احوال اور ظروف کے مطابق عطا فرماتا رہے گا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی محنت پر اللہ تعالیٰ ارادۂ خیر کی نظر فرما دے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے قلب و باطن کے ظروف کو اتنا صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھیں، تزکیہ، تصفیہ، حسنِ اخلاق، حسنِ عبادات اور حسنِ معاملات کو اتنا سنوارتے اور خوب سے خوب تر کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم اِس ارادۂ خیر کے ساتھ ہم پر پڑ جائے اور ہم میں سے کسی کو منتخب کر لے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے ایسے اسباب پیدا کر دینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ہماری نیت خالص رہے اور جد و جہد مسلسل جاری رہے۔ بالخصوص طلبہ کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اِن خطوط پر اُستوار کریں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کے صاحبِ خیر پر تین اِنعامات

یہ امر قابل غور ہے کہ جہاں تفقه فی الدین اور دین کی معرفتِ تامہ (دین کی کامل معرفت) کا ذکر آتا ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کے ارادۂ خیر اور اس کے انتخاب کا تذکرہ بھی ضرور ملتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِذَا أَرَادَ اللهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا جَعَلَ فِيْهِ ثَلَاثَ خِلَالٍ: فَقَّهَهُ فِي الدِّيْنِ، وَزَهَّدَهُ فِي الدُّنْيَا، وَبَصَّرَهُ عُيُوْبَهُ.

وَفِي رِوَايَةٍ: وَمَنْ أُوْتِيَهُنَّ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرَ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ.[1]

(۱) ۱۔ ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۲۰، ابن عبد البر نے اسے حضرت معاویہ ﷺ سے روایت کیا ہے۔
۲۔ دیلمی، مسند الفردوس، ۱: ۲۴۲، رقم: ۹۳۵، دیلمی نے اسے حضرت انس بن مالك ﷺ سے روایت کیا ہے۔
۳۔ ابن أبی شیبة، المصنف، ۶: ۲۴۰، رقم: ۳۱۰۴۹

اللہ تعالیٰ جس بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اس میں تین خصلتیں پیدا فرماتا ہے:

(۱) اسے دین کا تفقّہ عطا فرماتا ہے۔

(۲) اسے دنیا سے بے رغبتی عطا کر دیتا ہے۔

(۳) اس کے عیبوں کو اس پر ظاہر فرما دیتا ہے (تاکہ وہ ان کی اصلاح کر سکے)۔

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے: جسے یہ ساری چیزیں عطا کر دی گئیں اسے دنیا اور آخرت کے خیر عطا کر دی گئی۔

ہم مختصراً علیحدہ علیحدہ تینوں خصائل پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن اس مقام پر یہ امر پیشِ نظر رہے کہ یہ تینوں خصلتیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ تینوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں۔ یہ تمام خوبیاں مل کر وہی نتیجہ پیدا کرتی ہیں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ صرف ایک چیز سے وہ نتیجہ پیدا ہو جائے اور بقیہ دونوں چیزیں نظر انداز کر دی جائیں۔ اس حدیث مبارک کی رُو سے اللہ تعالیٰ کا ارادۂ خیر ان تینوں خصائل سے مشروط ہے۔

(۱) التفقّه فی الدین

صاحبِ خیر پر پہلا انعام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے دین کا تفقہ عطا فرماتا ہے۔ یعنی اُسے دین کی گہری سوجھ بوجھ اور اس کی کامل، پختہ اور مستحکم معرفت عطا فرماتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے اندر بیک وقت علم و حکمت، بصیرت اور فراست سمیت جملہ نعمتیں پائی جاتی

۴۔ ابن أبی شیبة، المصنف، ۷: ۱۹۳، رقم: ۳۵۲۵۷

۵۔ بیهقی، شعب الإیمان، ۷: ۳۴۷، رقم: ۱۰۵۳۵، ابن ابی شیبه اور بیهقی نے اسے محمد بن کعب القرظی سے مرسلا روایت کیا ہے۔

۶۔ ہندی، کنز العمال، ۱۰: ۶۰، رقم: ۲۸۶۸۹

ہیں۔ اِس میں علم الاحکام بھی ہے اور علم الحکم و الاسرار بھی ہے۔ **التفقه فی الدین** صرف ایک کتابی علم نہیں ہے بلکہ حضور نبی اکرم ﷺ نے اِسے ہر جگہ ممتاز فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ارادۂ خاص کے ساتھ منسلک فرمایا ہے۔

تفقه فی الدین کے الگ الگ درجات اور مراتب ہیں۔ کوئی درجہ اجتہاد پر پہنچتا ہے، تو کوئی **مجتهد فی الشرع** بنتا ہے، کوئی **مجتهد فی المذهب**، کوئی **مجتهد فی المسائل** تو کوئی **مجتهد مقیّد** بنتا ہے۔ ان میں پھر **اصحابِ تخریج** اور **اصحابِ ترجیح** بھی بنتے ہیں۔ اس طرح ہر ایک کے اپنے اپنے مراتب و فضائل ہیں۔ ان میں کوئی مفتی ہے، کوئی عالم ہے، کوئی داعی ہے اور کوئی مبلغ ہے۔ یہ اپنے اپنے درجات ہیں۔ بندے کی نیت کتنی خالص اور اُس کی جد و جہد، تگ و دو اور محنت و کاوش کتنی ہے؟ یہ سب عوامل مل جل کر کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کس کو کتنا فہم عطا کرتا ہے، یہ اُسی پر منحصر ہے کہ وہ کس پر کتنا ارادۂ خیر فرماتا ہے۔[1]

(۲) الزهد فی الدنیا

صاحبِ خیر پر ہونے والے دوسرے انعام کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص کے دل سے دنیا کی رغبت ختم کر دیتا ہے۔ دنیا کا حرص، طمع اور لالچ اُس کے دل سے نکال کر اس کی جگہ صبر، شکر، قناعت اور توکل فی اللہ عطا فرما دیتا ہے۔ **وَزَهَّدَهُ فِي الدُّنْيَا** سے مراد یہ نہیں ہے کہ دنیا اس کے لئے ختم ہو جاتی ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی حرص و لالچ کو اُس کے دل سے نکال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیاوی مال و دولت اُس کے آگے نہیں چھوڑتا تاکہ وہ اُسے دیکھ کر پیچھے نہ بھاگتا رہے بلکہ وہ بندہ دنیا کی طرف اپنی پشت کر لیتا ہے۔ اس طرح یہ سمت تبدیل ہو جاتی ہے اور دنیا اُس کے پیچھے پیچھے چلتی رہتی ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا یہ اچھا محسوس ہوگا کہ آپ کا چہرہ دنیا کی طرف ہو اور وہ آپ کی طرف پشت کر کے آگے آگے بھاگی چلی جا رہی ہو یا یہ اچھا لگے گا کہ آپ کا چہرہ اپنے

(۱) تفقہ فی الدین کے مختلف درجات کی تفصیلات کے لیے راقم کی تصنیف 'تاریخِ فقہ میں ہدایہ اور صاحبِ ہدایہ کا مقام' ملاحظہ فرمائیں۔

خالق و مالک کی طرف ہو اور دنیا آپ کے پیچھے پیچھے خود ہی دوڑی چلی آئے؟ لامحالہ جسے بھی اللہ تعالیٰ نے تھوڑی بہت سوجھ بوجھ عطا فرمائی ہے وہ یہی پسند کرے گا کہ دنیا کی طرف چہرہ کرنے کے بجائے اپنا رُخ مولا کی طرف رکھے اور دنیا اس کے پیچھے ذلیل وخوار ہو کر بھاگتی چلی آئے۔ زُہد فی الدنیا کا یہی مفہوم ہے کہ بندہ دنیا میں رہتا ہے مگر دنیا اُس کے دل میں نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ دنیا کو اُس کے دل سے یوں نکال دیتا ہے کہ دنیاوی رغبت ختم ہو جاتی ہے۔

(۳) نفس کے عیوب سے آگہی

صاحبِ خیر پر تیسرا انعام یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے ایسی بصیرت عطا فرماتا ہے کہ اپنے عیوب اُس پر ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب اسے اپنے عیب نظر آنے لگتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور شرم سار اور نادم ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کی عیب جوئی نہیں کرتا، کیونکہ وہ لوگوں کے عیب دیکھنے والی اپنی آنکھ کو بند کر لیتا ہے۔ اُن کے عیوب، خرابیاں اور نقائص دیکھنے؛ اُن پر گفتگو کرنے، اچھالنے اور انہیں بے پردہ کرنے سے باز آ جاتا ہے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ عیب جُو کو دین کی معرفت سے محروم رکھتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ جن سے خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اُنہیں اپنے عیوب سے آگاہی عطا فرماتا ہے۔ جب اس پر اپنے عیب ظاہر ہوتے ہیں تو پھر اُسے خود کو عیوب سے پاک کرنے کی اتنی فکر لگتی ہے کہ دوسروں کے عیب تلاش کرنے کی فرصت ہی نہیں رہتی، کیونکہ جب بندے پر اُس کے عیب ظاہر ہو جائیں تو پھر اُسے فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اِن سے چھٹکارا کیسے پایا جائے؟ بہادر شاہ ظفر اسی کیفیت کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

یہ وہ مقام ہے جہاں بندہ صحیح معنیٰ میں دین کا فقیہ بن جاتا ہے۔

۵۔ دین کی معرفت افضل ترین عبادت ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَا عُبِدَ اللهُ بِشَيءٍ أَفْضَلَ مِنْ فِقْهٍ فِي دِيْنٍ.(۱)

جس شخص کو دین کی فقہ ومعرفت نصیب ہو جائے تو یہ سب سے افضل عبادت ہے۔

یہاں ذہن میں سوال آ سکتا ہے کہ دین کی معرفت، عبادت کیسے بن گئی؟ معرفت تو علم، تفقہ اور گہری سوجھ بوجھ کا نام ہے، یہ بھلا عبادت کا درجہ کیسے پا گئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے حقیقت میں عبادت کا معنی سمجھا ہی نہیں۔ ہمارے پاس چونکہ دین کی معرفت نہیں ہے، اِس لیے ذہن میں یہ مغالطہ جنم لیتا ہے۔ دین کی کامل معرفت ملنے کا مطلب یہ ہے کہ علمِ دین اُس کے قلب و باطن پر نازل ہوگا اور انوار وتجلیات اُس کے ظاہر و باطن کو روشن کرتے ہوئے اسے بدل کر رکھ دیں گی۔ جب دین کی کامل معرفت نصیب ہوگی تو اسے علم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے اَوامر ونواہی کی کیا اہمیت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو فرض قرار دیا ہے، اُنہیں کرنے کی ضرورت کس قدر ہے اور ترک کرنے کا گناہ کتنا ہے؟ حرام کردہ کام کرنے سے کتنا عذاب ہوگا اور اُن سے باز رہنے سے اللہ کتنا راضی ہوگا؟ گویا اِن چیزوں پر اُس کی ہمہ وقت گہری نگاہ رہے گی، جس کے نتیجے میں وہ احکاماتِ الٰہیہ پر عمل کرے گا۔

۶۔ التفقّه فی الدین کا حامل روحانی طور پر ہزار عابدین سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے

اِرادۂ خیر ایک جامع اِرادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارادے سے زیادہ جامع کسی اور کا

(۱) ۱۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۶:۱۹۴، رقم:۶۱۶۶
۲۔ دار قطني، السنن، ۳:۷۹، رقم:۲۹۴
۳۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۲:۲۶۶، رقم: ۱۷۱۲
۴۔ حكيم ترمذی، نوادر الأصول في أحاديث الرسول ﷺ، ۱: ۱۳۵
۵۔ قضاعي، مسند الشهاب، ۲: ۲۷، رقم: ۸۱۴

ارادہ نہیں ہوسکتا اور اس کی خیر سے مراد خیرِ کامل ہے۔ جس شخص کو یہ خیر نصیب ہوگئی تو پھر اُس کا اٹھنا، بیٹھنا اور کلام کرنا دین کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔ اُس کی زندگی میں دین سے مطابقت و مناسبت پیدا ہو جائے گی، اسلامی تعلیمات اُس کا اوڑھنا بچھونا بن جائیں گی، قرآن و سنت اور علم خود اس کے عمل میں ڈھل جائے گا۔ چونکہ معرفت کا مطلب یہ ہے کہ دین اُس کے لیے وہ اُسوہ بن جائے گا جو آقا ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا نام ہے، گویا اُس وقت پھر علم اور عمل باہم یک دگر ہو جاتے ہیں اور ان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں علم، عمل کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے۔ اِس وجہ سے فرمایا ہے کہ جسے یہ معرفت نصیب ہوگئی وہ اپنا کوئی بھی عمل اُس کی مخالفت میں سرزد نہیں کرسکتا۔ اگر زندگی مخالفت میں بسر ہو تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے معرفتِ الٰہی نصیب ہی نہیں ہوئی ہے۔ وہ علم صرف کتابی علم تھا، اس لیے وہ فقیہ نہیں بن سکا۔ علم اُس نے پڑھا ضرور ہے، مگر وہ اُس کے قالب میں ڈھلا نہیں ہے۔ وہ علم اُس کے من پر وارد نہیں ہوا اور نہ ہی علم نے اُسے اپنے نور سے منور کیا ہے۔ اِس وجہ سے فرمایا کہ اِس سے بہتر اللہ کی عبادت کوئی نہیں ہے، کیونکہ اُسے نہ صرف عبادت کے احکام معلوم ہوتے ہیں بلکہ وہ عبادت کے انوار بھی حاصل کرتا ہے اور اس کی لذت و حلاوت سے بھی فیض یاب ہوتا ہے۔ اس صاحبِ فقہ میں عبادت کا ایسا ذوق پیدا ہو جاتا ہے جو درجہ بہ درجہ مسلسل آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایسے فقیہ کی شان کئی احادیث میں وارد ہوئی ہے۔

۱۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

فَقِيْهٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ.[1]

(۱) ۱۔ ترمذي، السنن، كتاب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، ۵: ۴۸، رقم: ۲۶۸۱

۲۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ۱: ۸۱، رقم: ۲۲۲

۳۔ طبراني، المعجم الكبير، ۱۱: ۷۸، رقم: ۱۱۰۹۹

۴۔ طبراني، مسند الشاميين، ۲: ۱۶۱، رقم: ۱۱۰۹

ایک فقیہ، شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

۲۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی حدیث مبارک میں حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

مَا عُبِدَ اللهُ بِشَيءٍ أَفْضَلَ مِنْ فِقْهٍ فِي دِيْنٍ. وَلَفَقِيْهٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ. وَلِكُلِّ شَيءٍ عِمَادٌ وَعِمَادُ هٰذَا الدِّيْنِ الْفِقْهُ. (۱)

جس شخص کو دین کی فقہ ومعرفت نصیب ہو جائے تو یہ سب سے افضل عبادت ہے۔ ایک فقیہ ایک ہزار عابدوں سے بڑھ کر شیطان پر بھاری ہے۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی ستون ہوتا ہے اور اس دین کا ستون فقہ (دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرنا) ہے۔

یہ روایت بیان کرنے کے بعد حضرت ابوہریرہ ؓ نے فرمایا:

لَأَنْ أَجْلِسَ سَاعَةً فَأَفْقَهَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أُحْيِيَ لَيْلَةً إِلَى الْغَدَاةِ.

مجھے دینی مسائل سمجھنے کے لئے ایک گھڑی بیٹھنا پوری رات اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے بھی زیادہ محبوب ہے۔

غور طلب نقطہ یہ ہے کہ ان احادیث میں أَفْضَلُ استعمال نہیں کیا یعنی أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ نہیں فرمایا بلکہ ارشاد ہوا: أَشَدُّ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ۔ یہ حدیث کئی روایات سے وارد ہوئی ہے، ہر جگہ أَشَدُّ کا لفظ مذکور ہے۔ یعنی ایک فقیہ ایک ہزار عبادت گزاروں سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ ذہن میں آ سکتا ہے کہ اِس کا طاقت ور ہونے سے کیا تعلق ہے؟ یہی تو غور طلب

(۱) ۱۔ دارقطني، السنن، ۳: ۷۹، رقم: ۲۹۴
۲۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۶: ۱۹۴، رقم: ۶۱۶۶
۳۔بيهقي، شعب الإيمان، ۲: ۲۶۶، رقم: ۱۷۱۲
۴۔ ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۲۶
۵۔ قضاعي، مسند الشهاب، ۱: ۱۵۰، رقم: ۲۰۶
۶۔خطيب بغدادي، تاريخ بغداد، ۵: ۴۳۶، رقم: ۲۹۵۷
۷۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۲: ۱۹۲

بات ہے کہ افضل ہونا درجات کی بات ہے۔ درجات اگر ملتے ہیں تو چھینے بھی جا سکتے ہیں۔ بندہ انہیں حاصل کرتا ہے تو ان سے محروم بھی ہو جاتا ہے۔ اس لئے اُسے طاقت ور ہونا چاہیے۔ یہاں طاقت سے مراد جسمانی قوت نہیں بلکہ اس سے مراد علم اور معرفت کی طاقت ہے۔ جب یہ لیاقت اُسے ملتی ہے تو وہ علم کی اس کامل معرفت کی وجہ سے ہزار عبادت گزاروں سے زیادہ طاقت ور ہو جاتا ہے۔ اسی طاقت کی وجہ سے وہ شیطان کے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں شیطان کے دعویٰ کا ذکر اسی کے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ○ (۱)

اور ان سب کو ضرور گمراہ کر کے رہوں گا○

یعنی میں سیدھی راہ پر بیٹھوں گا اور بندوں کو گم راہ کرنے کے لیے ان پر حملے کروں گا۔ لہٰذا ابلیس روپ بدل بدل کر حملہ آور ہوتا ہے۔ اُس کے حملوں سے بچنے کے لئے اِن حملوں کی پہچان اور مقابلہ کرنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ قلب پر جن خواطر کا تجلیات کی صورت میں نزول ہوتا ہے ان میں سے کبھی کوئی تجلی شیطان کی طرف سے چمکتی ہے، کبھی نفس کی طرف سے چمکتی ہے اور کبھی کوئی تجلی رحمانی و ربانی ہوتی ہے۔ یہ ساری چیزیں عبادت کے دوران آتی ہیں۔ بندہ یہ سمجھتا ہے کہ میں کامل ہوگیا ہوں اور یہ میری کرامت ہے۔ اُسے پہچان نہیں ہو پاتی کہ یہ نور کس کا تھا؟ اگر وہ فقیہ اور کامل معرفت رکھنے والا ہوگا تو وہ خالی نور کو دیکھ کر خوش نہیں ہوگا بلکہ وہ اس کا بغور جائزہ لے گا کہ یہ نور کس طرف سے آیا ہے؟ سمت کا علم ہونا ہی تفقہ اور معرفت کہلاتا ہے۔ اگر اُس کی سمت معلوم ہوگی تو وہ پہچان لے گا کہ یہ نور شیطانی، نفسانی یا پھر رحمانی کس تجلی کا اثر ہے۔

وہ اس ضمن میں دیکھے گا کہ اِس کا رنگ کیا ہے؟ وہ دیکھے گا کہ طبیعت پر اِس کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟ عبادت کا ذوق بڑھ رہا ہے یا غفلت پیدا ہو رہی ہے؟ چنانچہ محض

(۱) الحجر، ۱۵: ۳۹

عبادت گزار ہونا اِن چیزوں سے آگاہی نہیں دیتا۔ ایک آدمی عبادت، ذکرو اذکار، مراقبے اور مجاہدے کرتا اور ہمیشہ نفلی روزے رکھتا ہے۔ یقیناً اِن چیزوں کے نتیجے میں ان کے اثرات تو مرتب ہوں گے۔ ایسے شخص کا تزکیہ بھی ہوگا، تصفیہ بھی ہوگا اور اُس سے نور بھی پیدا ہوگا۔ اس دوران کبھی کشف ہوں گے، کبھی برکتیں نازل ہوں گی اور کبھی دعائیں قبول ہونے لگیں گی۔ جوں ہی اُس کی دعائیں قبول ہونے لگیں گی تو وہ تصور کرے گا کہ میں تو کامل ہوگیا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ سب تو راستے کی چیزیں ہیں۔ اسے ہرگز کاملیت نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ کامل ہونا تو بہت آگے کا مرتبہ ہے۔ جوں ہی اُسے خود کے کامل ہونے کا خیال آیا تو سمجھ لو اس پر نفس و شیطان کا حملہ کامیاب ہوگیا۔ یہ معرفتِ تامّہ ہی ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کے فضل سے سنبھال سکے گی۔ اس موقع پر سالک مختلف قسم کی آوازیں سنتا ہے۔ وہ آواز شیطانی اور نفسانی ہوگی اور وہ وسوسہ سے آئے گی، اسے الہام ہوگا، خیال اِلقاء ہوں گے اور جو دل میں آئے گا وہ یہ سمجھے گا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے القاء کیا ہے، ملائکہ نے القاء کیا ہے، حالانکہ یہ کبھی نفس کا القاء ہوتا ہے اور کبھی شیطان کا القاء ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا○[1]

اور انسانی جان کی قَسم اور اسے ہمہ پہلو توازن و درستگی دینے والے کی قَسم○ پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دی○

یہ آیت کریمہ بتا رہی ہے کہ فسق و فجور کا بھی القاء ہوتا ہے اور تقویٰ و نور کا بھی القاء ہوتا ہے۔ ان ساری چیزوں کا تعین کرنا اور ان میں امتیاز کرنا تفقہ اور معرفت کی بدولت ہی ممکن ہے۔ وہ اپنے آپ کو اِس معرفت کے بغیر خطرات سے بچا نہیں سکتا۔ بعض اوقات آزمائش کے طور پر کوئی چیز ملتی ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ میری کرامت ہوگئی ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔

فقیہ اور صاحبِ معرفت دین کے ظاہری و باطنی دونوں احکام اور علوم کی معرفت رکھنے

(۱) الشمس، ۹۱:۸

والا ہوتا ہے۔ معرفت کی وجہ سے وہ اتنا طاقت ور ہو جاتا ہے کہ شیطان اور نفس کے حملوں سے بچ جاتا ہے۔ طاقت ور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُسے ادراک ہو جاتا ہے کہ یہ حملہ کس جہت سے ہے اور اِس کے کیا نتائج رونما ہوں گے؟ اس پر وہ **استغفر اللہ العظیم** پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے مدد کا درخواست گزار ہوتا ہے۔

۷۔ واردات، مکاشفات اور تجلیات کی پرکھ کا پیمانہ کیا ہے؟

سیدنا غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی ﷺ اپنے تزکیہ، مجاہدات اور ریاضات کے زمانے کا ایک واقعہ خود بیان فرماتے ہیں کہ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں مجاہدات اور ریاضات کے لیے جنگلوں میں قیام پذیر تھا۔ اس دوران شیطان ایک بادل کے اندر کڑک اور بجلی کی صورت میں چمکا اور مجھے ندا دی: اے عبد القادر! تو نے میری اتنی عبادت کی ہے کہ اب میں تجھ پر شریعت کے احکام و فرائض اور واجبات معاف کرتا ہوں۔ آپ نے جوں ہی یہ سنا تو **لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْم** پڑھا۔ اس پر شیطان دفع ہوگیا کیونکہ شریعت کے احکام کبھی کسی کے لئے معاف نہیں ہوتے خواہ وہ جس درجے پر بھی پہنچ جائے۔ وہ نبی کے لیے معاف نہیں ہیں تو اُمتی کو کیسے معاف ہو سکتے ہیں؟[1]

سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی کے سوانح نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیطان نے یہاں پسپائی اختیار کرنے کے بجائے ایک دوسری سمت سے دوبارہ حملہ کیا اور کہا: مبارک ہو عبد القادر! میں نے تم پر بہت بڑا حملہ کیا تھا مگر تم اپنے علم کی طاقت سے میرے اس وار سے بچ گئے۔ آپ نے پھر **لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْم** پڑھا اور کہا: تو میرے دل میں یہ خیال ڈالنا چاہتا ہے کہ میں اپنے علم کی طاقت سے بچ گیا ہوں، حالانکہ میں تو اپنے رب کے فضل سے بچا ہوں۔

جسے یہ معرفتِ تامہ اور فقہ کامل نصیب نہیں ہوگی تو وہ کوئی بھی آواز سن کر سمجھے گا کہ

(۱) ۱۔ ابن تیمیه، مجموع فتاوی، ۱:۱۷۲

۲۔ عبد الحی الحنبلی، شذرات الذہب، ۴:۲۰۰

میں تو ولیِ کامل بن گیا ہوں۔ بہت سے لوگ ایسی منزلوں پر مبتدی ہوتے ہیں۔ اوائل زمانے میں ریاضت اور مجاہدہ کرتے کرتے بھٹک جاتے ہیں اور کئی غلط خیالات کو اپنا عقیدہ بنا لیتے ہیں۔ واضح رہے کہ جو بھی واردات، تجلیات اور انکشافات ہوں گے انہیں قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اگر اُس کے مطابق ہوں گے تو قبول کیا جائے گا ورنہ مسترد کر دیا جائے گا۔ دراصل واردات، مکاشفات اور تجلیات پیمانہ نہیں ہوتے بلکہ حق کا میزان ہمیشہ کتاب وسنت ہی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جو بھی چیز مل رہی ہے اسے کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھے، اگر وہاں سے مطابقت ملے تو اللہ کا شکر بجا لائے اور اگر اُس کے مخالف کوئی شے آجائے تو ایسی ہر شے کو مسترد کر دیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا فرمان ہی ہمیشہ فائق ہوتا ہے۔

۸۔ فضیلتِ فقہ

حضور نبی اکرم ﷺ نے متعدد مواقع پر فقہ کی فضیلت یعنی دین اسلام کی معرفتِ کاملہ اور علم صحیح کے مقام و مرتبہ کو واضح فرمایا ہے۔

۱۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

وَلِكُلِّ شَيءٍ عِمَادٌ، وَعِمَادُ هٰذَا الدِّيْنِ الْفِقْهُ.(۱)

ہر عمارت کا کوئی نہ کوئی ستون ہوتا ہے۔ اور دین اسلام کا ستون فقہ ہے یعنی علم صحیح اور معرفتِ تامہ (معرفتِ کاملہ)۔

(۱) ۱۔ دارقطني، السنن، ۳: ۷۹، رقم: ۲۹۴
۲۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۶: ۱۹۴، رقم: ۶۱۶۶
۳۔ قضاعي، مسند الشهاب، ۱: ۱۵۰، رقم: ۲۰۶
۴۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۲: ۲۶۶، رقم: ۱۷۱۲
۵۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۳: ۳۳۱، رقم: ۴۹۹۵
۶۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۱: ۵۸، رقم: ۱۳۷

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو ﷺ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

قَلِيلُ الْفِقْهِ خَيْرٌ مِنْ كَثِيرِ الْعِبَادَةِ.(۱)

قلیل فقہ کثیر عبادت سے بہتر ہے۔

یعنی اگر علم میں ثقاہت و معرفت اور ظاہر و باطن کی پختگی آجائے تو پھر تھوڑا سا علم بھی کثیر عبادت سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

۹۔ فضیلتِ اِبلاغِ علم

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نہ صرف علم و فقہ کا حصول باعثِ فضیلت ہے بلکہ علم و فقہ کا ابلاغ بھی اپنے اندر بے بہا فضیلت اور حضور ﷺ کی طرف سے عطا کی جانے والی خوش خبریاں سموئے ہوئے ہے۔

۱۔ امام اعظم ابوحنیفہ ﷺ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جب ہر چیز کو میزان پر تولا جائے گا، جس کے بارے قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ.(۲)

اور ہم قیامت کے دن عدل و انصاف کے ترازو رکھ دیں گے۔

تو اُس دن ایک شخص لایا جائے گا جس کے اعمال میزان میں رکھ دیے جائیں گے۔ اُس کے نیک اعمال والا پلڑا ہلکا ہو کر اوپر ہو جائے گا اور برے اعمال کا پلڑا بھاری ہو جائے گا تو اس

(۱) ۱۔طبرانی، المعجم الأوسط، ۸: ۳۰۲، رقم: ۸۶۹۸
۲۔ بیہقی، شعب الإیمان، ۲: ۲۶۵، رقم: ۱۷۰۵
۳۔ أبو نعیم، حلیة الأولیاء، ۵: ۱۷۴
۴۔ هیثمی، مجمع الزوائد، ۱: ۱۲۰
۵۔ إسماعیلي، معجم الشیوخ، ۱: ۳۶۸، رقم: ۳۵۸
(۲) الأنبیاء، ۲۱: ۴۷

وقت:

فَيُجَاءُ بِشَيءٍ أَمْثَالَ الْغَمَامِ، أَوْ قَالَ مِثْلَ السَّحَابِ. فَيُوْضَعُ فِي كَفَّةِ مِيْزَانِهٖ فَيَرْجَحُ.فَيُقَالُ لَهٗ: أَتَدْرِي مَا هٰذَا؟ فَيَقُوْلُ: لَا.فَيُقَالُ لَهٗ: هٰذَا فَضْلُ الْعِلْمِ الَّذِي كُنْتَ تُعَلِّمُهُ النَّاسِ.(۱)

بادلوں کی طرح کوئی چیز لائی جائے گی اور اُس کی نیکیوں کے پلڑے میں ڈال دی جائے گی تو وہ بھاری ہو کر نیچے چلا جائے گا۔ اُس سے پوچھا جائے گا کہ بادلوں کی طرح کی جو چیز لا کر تمہاری نیکیوں کے پلڑے میں رکھ دی ہے، جس سے تمہارا نیک اعمال کا پلڑا بھاری ہو گیا ہے، جانتے ہو یہ کیا شے ہے؟ وہ کہے گا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اُس وقت اسے کہا جائے گا کہ یہ اُس علم کی فضیلت ہے، جو تم لوگوں کو سکھاتے تھے اور اُنہیں خیر اور نیکی کی راہ پر گامزن کیا کرتے تھے۔

دوسری روایت میں ہے کہ اسے کہا جائے گا:

هٰذَا مِنْ عِلْمِكَ الَّذِي عَلَّمْتَهُ النَّاسَ، فَعَمِلُوْا بِهٖ وَعَلَّمُوْهُ مِنْ بَعْدِكَ.(۲)

یہ تمہارا وہ علم ہے جو تم نے لوگوں کو پڑھایا اور لوگوں نے تمہارے پڑھانے اور سکھانے سے تمہاری وفات کے بعد اِس پر عمل کیا۔

یعنی تمہارے بعد تمہاری اولاد تمہارے دیے ہوئے علم کو اگلی نسلوں تک پہنچاتی رہی اور لوگوں کے اعمال درست کرتی رہی۔ اس طرح اُن سب کا ثواب تمہارے نامہ اعمال میں جمع ہوتا رہا۔ آج یہ وہ نیکی ہے جس نے تمہیں بخشش کے قابل بنا دیا اور تمہارے اعمالِ صالحہ کے ترازو کو وزنی کر دیا ہے۔

---

(۱) ۱۔ ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۴۶
۲۔ سيوطی، الدر المنثور، ۳: ۴۲۳
(۲) ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۴۷

۱۰۔ دورِ جدید کا سب سے بڑا علمی اَلمیہ

بدقسمتی سے آج متوسط طبقہ یا آسودہ حال گھرانوں کے لوگ دینی علم کو اپنے بچوں کا مستقبل (career) نہیں بناتے۔ کھاتے پیتے گھرانوں کی فہرست کے آخر میں بھی ایسا رجحان نہیں پایا جاتا کہ ان کے بچے دین کا علم حاصل کریں۔ علم دین کے حصول کے لیے زیادہ تر غریب گھرانوں کے بچے ہی رہ گئے ہیں۔ جن گھرانوں کے پاس کسی اچھے سکول، کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ کے وسائل نہیں ہیں تو وہ سوچتے ہیں کہ مدارس میں علم مفت مل رہا ہے تو چلو یہی سیکھ لیتے ہیں۔ اس سے بچہ بڑا ہو کر کچھ نہ کچھ تو کمانے والا بن جائے گا۔ ایسے لوگوں میں سے بیش تر کے لیے علم دین کی فضیلت کوئی ترجیح نہیں ہے، بلکہ ان کے لیے دینی علم کا حصول دال روٹی چلانے سے منسلک ہے۔

آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دینی تعلیم کے میدان میں مفلس اور نادار گھرانوں سے بچے آئیں گے تو اُن کا معاشرتی، سماجی اور معاشی پس منظر کیا ہوگا اور اُس سے اُن کی کیا شخصیتیں تشکیل پائیں گی؟ وہ اُسی ماحول میں پڑھتے ہوئے مسجد میں امامت کا فریضہ سنبھالیں گے۔ مسجد کی انتظامی کمیٹی اُنہیں اپنا ملازم سمجھ کر تنخواہ دے گی۔ ان حالات میں آپ ان سے کیسے ایک بہتر کردار، اعلیٰ تقویٰ اور عمدہ اخلاق کی توقع کر سکتے ہیں؟

غور طلب بات ہے کہ دین فہمی کے لئے معاشرے کی input کیا ہے، جو ہم ان اَئمہ مساجد سے توقع کرتے ہیں؟ دینی علم کا حصول تو مفلوک الحال طبقے کے بچوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اُن کے پاس نہ تو کمپیوٹر ہیں، نہ بین الاقوامی زبانوں سے آگہی، نہ اُن کے پاس جدید ٹیکنالوجی ہے، نہ اُنہیں اچھے تعلیم یافتہ اور جدید علوم سے آراستہ اساتذہ حاصل ہیں، نہ اُنہیں یونیورسٹیوں کی سہولتیں میسر ہیں اور نہ ہی اُن کے پاس بیٹھنے کا مثالی ماحول موجود ہے۔ ان تمام محرومیوں سے اِن کی شخصیت ترتیب پاتی ہے۔ یوں تلخ زمینی حقائق کے باعث ان میں کئی طرح کے نقائص اور ان کی شخصیت میں ادھورا پن رہ جاتا ہے۔ آپ ایک حد سے زیادہ ان سے بھلا کیا توقع کر سکتے ہیں کہ جو وہ ہمارے معاشرے کو منتقل کریں گے۔ آپ جتنا معیاری

مواد ڈالیں گے تو اتنی ہی اعلیٰ مصنوعات تیار ہوں گی۔ اِس پورے عمل کا ذمہ دار پورا معاشرہ اور ہمارا نظام ہے۔

۱۱۔ حضور ﷺ کی مبلّغ کے لیے خصوصی دعا

حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

نَضَّرَ اللهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ. (۱)

اللہ تعالیٰ اُس شخص کو خوش وخرم رکھے اور اُس کے چہرے کو ہشاش بشاش رکھے جس نے ہم سے کچھ سنا اور اُسے آگے لوگوں تک پہنچایا۔ بہت سے لوگ جنہیں علم پہنچایا جاتا ہے وہ ان پہچانے والوں سے کہیں زیادہ سمجھ دار، صاحب فہم و بصیرت اور با صلاحیت ہوتے ہیں۔

اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اچھی صلاحیت، استعداد، ذہانت والے لوگ علم دین کو حاصل کرنے اور بہتر انداز سے آگے پہنچانے کے عمل میں شریک ہو جائیں تو اِس سے معیار بہتر سے بہتر ہوتا چلا جائے گا۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے اِبلاغِ علم پر اس مبلّغ کو خوش وخرم رہنے کی دُعا دی ہے۔ کیا

---

(۱) ۱۔ أبو حنيفة، المسند، ۱: ۲۵۲

۲۔ ترمذی، السنن، كتاب العلم، باب ما جاء في الحث على تبليغ السماع، ۵: ۳۴، رقم: ۲۶۵۷

۳۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب من بلغ علمًا، ۱: ۸۵، رقم: ۲۳۳

۴۔ دارمی، السنن، ۱: ۸۷، رقم: ۲۳۰

۵۔ بزار، المسند، ۵: ۳۸۲، رقم: ۲۰۱۴

۶۔ ابن حبان، الصحيح، ۱: ۲۶۸، رقم: ۶۶

۷۔ بيهقی، شعب الإيمان، ۱: ۲۷۴، رقم: ۱۷۳۸

ہم تیار نہیں ہیں کہ آپ ﷺ کی اس مبارک دعا کے حق دار بنیں اور اپنی اولاد کو دین کے علم کے لیے وقف کر دیں؟ افسوس! ہمارے ہاں اب محنت، ریاضت اور مشقت نہیں ہے۔ ہم تن آسان اور سہولت پسند بن چکے ہیں۔ ہمارے معاشرے اور حالات نے ہمیں اتنا سہل پسند بنا دیا ہے کہ ہم نے اپنی زندگیوں میں اِن چیزوں کو ناممکن بنا کر رکھ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محنت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر کھاتے پیتے گھرانے، وسائل والے خاندان اپنے بچوں کو اِس ڈگر پر ڈالیں گے تو پھر عالمِ دین دنیاوی معاملات سے بے نیاز ہوگا اور حق بات بانگِ دُہل کہے گا۔ درپیش صورتِ حال کی اقبالؔ نے اپنے شعر میں کیا خوب صورت تصویر کشی کی ہے:

گلا تو گھونٹ دیا اَہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

۱۲۔ اِبلاغِ علم کے لیے باصلاحیت اَفراد کی اَہمیت

۱۔ حضرت زید بن ثابت ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا فَحَفِظَهُ حَتّٰى يُبَلِّغَهُ غَيْرَهُ، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ لَيْسَ بِفَقِيْهٍ.(۱)

اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سنی، پھر اسے یاد رکھا

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۱۸۳، رقم: ۲۱۶۳۰
۲۔ أبو داود، السنن، کتاب العلم، باب فضل نشر العلم، ۳: ۳۲۲، رقم: ۳۶۶۰، رقم: ۳۶۶۰
۳۔ ترمذی، السنن، کتاب العلم، باب ما جاء في الحث على تبليغ السماع، ۵: ۳۳، رقم: ۲۶۵۶
۴۔ نسائي، السنن الکبریٰ، ۳: ۴۳۱، رقم: ۵۸۴۷
۵۔ دارمی، السنن، ۱: ۸۶، رقم: ۲۲۹
۶۔ بزار، المسند، ۸: ۳۴۲، رقم: ۳۴۱۶

یہاں تک کہ اسے دوسروں تک پہنچایا۔ بہت سے فقیہ اپنے سے کامل فقیہ تک بات پہنچاتے ہیں اور بہت سے مسئلہ جاننے والے خود فقیہ نہیں ہوتے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث مبارکہ میں پانچ چیزوں کا ذکر فرمایا ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ اس شخص کی زندگی کو خوشیوں سے مالا مال کر دے جس نے ہم سے حدیث سنی۔

اس سے علم حدیث کے جواز کی باقاعدہ ایک سند مل گئی۔

(۲) اس برکت میں وہ بھی شامل ہیں جس نے اس حدیث کو یاد کیا۔

یہ علم حدیث کے جمع کرنے کی بات آ گئی اور اس میں راویوں کا ذکر بھی آ گیا۔

(۳) پھر اس طبقے کا ذکر ہے، جس نے نہ صرف احادیث کو خوب یاد رکھا بلکہ آگے امت تک بھی پہنچایا۔

اس میں علم حدیث کو حاصل کرنے اور پھر تبلیغ و تعلیم کے تمام مراحل کا ذکر ہو رہا ہے۔

(۴) حضور نبی اکرم ﷺ نے حدیث مبارک میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ کئی لوگ ایسے بھی ہیں جو معرفتِ دین اور فقہ کے حامل ہوتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کا ذکر فرمایا کہ جن تک یہ احادیث پہنچائی جاتی ہیں، وہ پہنچانے والوں سے زیادہ سمجھ دار اور فہم و فراست کے مالک ہو سکتے ہیں۔

(۵) آپ ﷺ نے اس امر کی جانب اشارہ فرمایا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو فقہ کے حامل ہیں مگر درحقیقت فقیہ نہیں ہیں۔

ایسے لوگ فقہ کے حامل ہونے کے باوجود فقیہ کیوں نہیں بن سکے؟ اُس کے کئی ظاہری اور باطنی اسباب ہیں۔ اُن کے پاس اتنی قابلیت، صلاحیت، عقلی اور روحانی استعداد نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں اُن کے پاس اتنی عبادت، ریاضت، سہولیات اور اتنا صدق و اخلاص نہیں تھا۔ اس ضمن میں درجنوں اسباب ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ فقہ کے حامل بنے، مگر فقیہ بننے

کے لیے جو بنیادی ضروریات تھیں، وہ پوری نہیں کر سکے۔

ہم اِس اہم نکتے پر توجہ دے رہے ہیں کہ اگر پڑھے لکھے اعلیٰ معاشی و معاشرتی درجہ کے حامل گھرانوں سے کچھ نوجوان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے وقف ہو کر نکل آئیں اور پھر ان کے والدین اور خاندان والے اپنے اوپر دینِ اسلام کا حق سمجھیں کہ ہم علم کے وارث بھی بنیں گے اور تسلسل سے نسل در نسل اُس پیغام کو بھی پہنچائیں گے۔ یوں اس میدان میں اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد کے آنے کی وجہ سے دینِ اسلام عالمی سطح پر فروغ پائے گا اور معاشرے کے انفرادی و اجتماعی مسائل کا حل قرآن و سنت کی حقیقی تعلیمات کی روشنی میں میسر آ سکے گا۔

حضور نبی اکرم ﷺ کا مذکورہ فرمان علم کی ترویج و تعلیم میں باصلاحیت اور فقیہ بننے کی صلاحیت کے حامل نوجوانوں کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ اگر باصلاحیت افراد دین کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امت کے اخلاقی اور علمی احوال میں کس قدر انقلاب بپا ہو سکتا ہے۔ اس لیے دین کے علم کو لینے اور آگے پہنچانے والے طبقہ کی عزت و احترام میں بھی بے پناہ اضافہ ہوگا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ کچھ لوگ دین کا علم اور تفقہ حاصل کرنے کے لئے نکلیں اور پھر پلٹ کر سارے معاشرے تک دین کی اس ہدایت کو پہنچائیں۔ یہ قرآن کا حکم بھی ہے اور حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مقدس بھی ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان نہایت قابل توجہ ہے کہ رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ سے مراد ہے کہ عین ممکن ہے کہ بہت سے لوگ جو میری بات کو آگے پہنچائیں وہ خود تو اتنے ذہین نہ ہوں مگر جن کو پہنچائیں اُن کی ذہانت زیادہ ہو۔ آقائے دو جہاں ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بات کر رہے ہیں کہ پہنچانے والا ہر کوئی فقیہ نہیں ہوتا۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر عالم یہ تھا تو پھر بعد کے ادوار اور آج کے زمانے تک کی صورتِ حال بھلا کیا ہوگی؟ یہ حدیث مبارکہ ہمیں دعوتِ عمل دے رہی ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ دین کی سمجھ کو لے کر پہنچانے والے بن جائیں تو حالات یکسر بدل جائیں گے۔

۲۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ابلاغِ علم کی طرف ایک موقع پر یوں متوجہ فرمایا ہے:

تَسْمَعُوْنَ وَيُسْمَعُ مِنْكُمْ، وَيُسْمَعُ مِمَّنْ سَمِعَ مِنْكُمْ. (۱)

تم مجھ سے (احادیث) سنتے ہو اور تم سے بھی (احادیث) سنی جائیں گی۔ (بعد ازاں) ان لوگوں سے بھی (احادیث) سنی جائیں گی جنھوں نے تم سے سنا ہوگا۔

ایک روایت کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

عَنْ ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ ؓ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: تَسْمَعُونَ وَيُسْمَعُ مِنْكُمْ، وَيُسْمَعُ مِنَ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ مِنْكُمْ، وَيُسْمَعُ مِنَ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ مِنْكُمْ. (۲)

حضرت ثابت بن قیس ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم مجھ سے سماعت کرتے ہو اور تم سے بھی سماعت کی جائے گی اور پھر ان لوگوں سے بھی سماعت کی جائے گی جو تم سے سماعت کرتے ہیں۔ پھر ان لوگوں سے سماعت کی جائے گی جو تم سے سماعت کرنے والوں سے سماعت کرتے ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے ان فرامین کا مطلب ہے کہ علم حاصل کرنے اور آگے دوسروں تک پہنچانے کا یہ سلسلہ پوری امت میں قیامت تک جاری رہے گا اور ایسا کرنے والوں کو آپ

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۳۲۱، رقم: ۲۹۴۷
۲۔ أبو داود، السنن، كتاب العلم، باب فضل نشر العلم، ۳: ۳۲۱، رقم: ۳۶۵۹
۳۔ طبراني، المعجم الأوسط برواية ثابت بن قيس بن شماس، ۶: ۱۹، رقم: ۵۶۶۸
۴۔ حاكم، المستدرك، ۱: ۱۷۴، ۳۲۸
۵۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۱۰: ۲۵۰، رقم: ۲۰۹۷۴

(۲) حاكم، معرفة علوم الحديث: ۶۰

ﷺ نے اہلِ حق ہونے کی خوش خبری سنائی ہے۔ کتنے خوش نصیب ہوں گے وہ گھرانے جو آقا ﷺ کے بیان کردہ اِس عظیم سلسلے کا حصہ بن جائیں گے۔ دین کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اور نئے موضوعات (subjects) جیسے انفارمیشن ٹیکنالوجی (IT)، انجینئرنگ، سوشیالوجی اور سیاسیات وغیرہ بھی سیکھیں۔ اہل علم کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے علم کو ہمیشہ update کرتے رہیں، کیونکہ اس کے بغیر دین کے علم میں وہ افادیت نہیں رہتی جو وقت کا تقاضا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جس معاشرے کا ہم نے سامنا کرنا ہے اُس سوسائٹی اور اُس کے تقاضے بھی ہمیں معلوم ہوں۔

۱۳۔ مبلغینِ علم کے لیے نبوی بشارات

حضور نبی اکرم ﷺ نے متعدد مواقع پر مبلغین علم کو مختلف خوش خبریاں عطا فرمائیں اور ان کے اس عمل کو بہترین عمل قرار دیا۔ ذیل میں ان میں سے چند خوش خبریاں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

اَللّٰهُمَ ارْحَمْ خُلَفَاءَنَا.

اے اللہ! ہمارے خلفا پر رحمت فرما۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کے خلفاء کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَأْتُوْنَ مِنْ بَعْدِي، يَرْوُوْنَ أَحَادِيْثِي وَسُنَّتِي وَيُعَلِّمُوْنَهَا النَّاسَ.[1]

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الأوسط، ۶: ۷۷، رقم: ۵۸۴۶
۲۔ منذری، الترغیب والترہیب، ۱: ۶۲، رقم: ۱۵۴
۳۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۱: ۱۲۶
۴۔ سیوطی، تدریب الراوی، ۲: ۱۲۶

میرے خلفاء وہ لوگ ہوں گے جو میرے بعد کے زمانوں میں آئیں گے اور میری احادیث، میری سنتیں اور میرا علم روایت کریں گے اور وہ علم میری امت کو سکھائیں گے۔

اِس سے بڑی فضیلت بھلا اور کیا ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علم کی اِس عظیم وراثت کو آگے چلانے والوں کو اپنا خلفاء قرار دیا ہے اور علم کو سنبھالنے، اٹھانے اور اِس تعلم اور تعلیم کے عمل کو اپنی خلافت قرار دیا ہے کہ وہ لوگ میری خلافت اور نیابت کے حامل ہوں گے۔

۲۔ حضرت انس ابن مالک ﷺ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

أَلَا أُخْبِرُكُمْ عَنِ الْأَجْوَدِ الْأَجْوَدِ؟ اللهُ الْأَجْوَدُ الْأَجْوَدِ. وَأَنَا أَجْوَدُ وَلَدِ آدَمَ وَأَجْوَدُهُمْ مِنْ بَعْدِي رَجُلٌ عَلِمَ عِلْمًا فَنَشَرَ عِلْمَهُ يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أُمَّةً وَاحِدَةً. (۱)

کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ سخیوں کا سخی کون ہے؟ اللہ تعالیٰ سب سخیوں کا سخی ہے (یعنی سب کریموں کا کریم ہے) اور میں اولادِ آدم (کائنات انسانی) میں سب سے بڑا سخی ہوں۔ میرے بعد لوگوں میں سب سے بڑا سخی وہ شخص ہوگا جس نے علم حاصل کیا، پھر اس علم کو دوسروں تک پہنچایا۔ قیامت کے دن اُس ایک شخص کو پوری امت کے برابر کھڑا کیا جائے گا۔

۵۔ زیلعی، نصب الراية، ۱: ۳۴۸

۶۔ طبری، الرياض النضرة، ۱: ۲۶۱، رقم: ۱۰۶

(۱) ۱۔ أبو يعلى، المسند، ۵: ۱۷۷، رقم: ۲۷۹۰

۲۔ ديلمی، مسند الفردوس، ۱: ۱۳۰، رقم: ۴۵۳

۳۔ منذری، الترغيب والترهيب، ۱: ۶۸، رقم: ۱۹۱

۴۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۱: ۱۶۶

۵۔ مناوی، فيض القدير، ۳: ۱۰۳

یعنی وہ ایک شخص جس نے علم نبوی حاصل کیا، اسے امت اور دنیا بھر میں پھیلایا، اُس کے درجات، فضائل، مراتب، حسنات اور خیرات اس قدر ہوں گی کہ ایک شخص تنہا امت کے برابر ہوگا۔

۳۔ حضرت سمرہ بن جندب ﷺ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا تَصَدَّقَ النَّاسُ بِصَدَقَةٍ مِثْلَ عِلْمٍ يُنْشَرُ. (۱)

لوگ صدقہ اور خیرات کرتے ہیں مگر سب سے بڑا صدقہ علم کو پھیلانا ہے۔

یعنی جو علم میں تمہیں دے کر جا رہا ہوں اس علم کو دنیا میں پھیلانے سے بڑا صدقہ کسی سخی کا نہیں ہے۔

۴۔ حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ نے بھی روایت کیا ہے:

نِعْمَ الْعَطِيَّةُ كَلِمَةُ حَقٍّ تَسْمَعُهَا، ثُمَّ تَحْمِلُهَا إِلٰى أَخٍ لَكَ مُسْلِمٍ فَتُعَلِّمُهَا إِيَّاهُ. (۲)

سب سے بڑا عطیہ جو اللہ تعالیٰ کی عطا ہے وہ کلمہ حق ہے جو بندہ سنے اور پھر جو سنا ہے اُسے اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں تک پہنچائے اور وہ کلمات اُنہیں سکھائے۔

گویا علم کا حصول و ابلاغ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عطیہ بھی ہے، بندے کے لیے سب سے بڑا صدقہ بھی ہے اور سب سے بڑی خیرات بھی ہے۔ ایسا کرنے والا تنہا ایک شخص

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۷: ۲۳۱، رقم: ۶۹۶۴
۲۔ منذری، الترغیب والترھیب، ۱: ۶۸، رقم: ۱۸۹
۳۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۱: ۱۶۶

(۲) ۱۔طبرانی، المعجم الکبیر، ۱۲: ۴۳، رقم: ۱۲۴۲۱
۲۔ منذری، الترغیب والترھیب، ۱: ۶۸، رقم: ۱۹۰
۳۔ ھیثمی، مجمع الزوائد، ۱: ۱۶۶
۴۔ مناوی، فیض القدیر، ۶: ۲۸۷

نیکیوں اور درجات میں پوری امت کے برابر ہوگا۔

۵۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَجْلِسُ فِقْهٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةٍ.(۱)

فقہِ دین کی ایک مجلس ساٹھ سال کی عبادت سے زیادہ افضل ہے۔

۶۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

يَسِيْرُ الْفِقْهِ خَيْرٌ مِنْ كَثِيْرِ الْعِبَادَةِ.(۲)

قلیل فقہِ دین کثیر عبادت سے افضل ہے۔

۷۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں:

إِنَّ الْعَالِمَ أَعْظَمُ أَجْرًا مِنَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ الْمُجَاهِدِ فِي سَبِيْلِ اللهِ.(۳)

---

(۱) ۱۔ ديلمی، مسند الفردوس، ۵: ۱۷۶، رقم: ۷۸۷۹
۲۔ خطيب بغدادی، الفقيه والمتفقه، ۱: ۹۷
۳۔ ابن القيم، مفتاح دار السعادة، ۱: ۱۱۸
۴۔ ہندی، کنز العمال، ۱۰: ۷۶، رقم: ۲۸۹۱۷

(۲) ۱۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۱: ۱۳۵، رقم: ۲۸۶
۲۔ ديلمی، مسند الفردوس، ۵: ۴۸۸، رقم: ۸۸۴۷
۳۔ خطيب بغدادی، الفقيه والمتفقه، ۱: ۹۸
۴۔ ابن القيم، مفتاح دار السعادة، ۱: ۱۱۸
۵۔ ہندی، کنز العمال، ۱۰: ۷۷، رقم: ۲۸۹۲۱

(۳) ۱۔ خطيب بغدادی، الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع، ۱: ۱۹۹، رقم: ۳۴۷
۲۔ خطيب بغدادی، الفقيه والمتفقه، ۲: ۱۹۸
۳۔ قاضی عياض، الإلماع: ۴۸

بے شک ایک عالمِ دین پوری عمر دن کو روزہ رکھنے، رات کو قیام کرنے اور میدانوں میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے شخص سے (فضیلت اور درجے میں) زیادہ اجر کا مستحق ہے۔

۸۔ حضرت ابو ذر ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا:

يَا أَبَا ذَرٍّ، لَأَنْ تَغْدُوَ فَتَعَلَّمَ آيَةً مِنْ كِتَابِ اللهِ خَيْرٌ لَکَ مِنْ أَنْ تُصَلِّيَ مِائَةَ رَكْعَةٍ، وَلَأَنْ تَغْدُوَ فَتَعَلَّمَ بَابًا مِنَ الْعِلْمِ عُمِلَ بِهِ أَوْ لَمْ يُعْمَلْ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تُصَلِّيَ أَلْفَ رَكْعَةٍ. (۱)

اے ابو ذر! تم اس حال میں صبح کرو کہ تم (رات بھر جاگ کر) اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے ایک آیت سیکھ لو تو یہ تمہارے لئے سو رکعات نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ تم اس حال میں صبح کرو کہ (اس دوران) تم علم کا ایک باب سیکھ لو چاہے اس پر عمل کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو تو یہ تمہارے لئے ایک ہزار رکعت نوافل ادا کرنے سے بہتر ہے۔

۹۔ حضرت ابو ذر ﷺ اور حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

..... ۴۔ نووی، المجموع، ۱: ۲۱

۵۔ ابن القیم، مفتاح دار السعادة، ۱: ۱۱۸

۶۔ ہندی، کنز العمال، ۱۰، ۱۱۲، رقم: ۲۹۳۶۳

(۱) ۱۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فضل من تعلم القرآن وعلمه، ۱: ۷۹، رقم: ۲۱۹

۲۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۵: ۳۳۸، رقم: ۸۳۶۲

۳۔ منذری نے 'الترغیب والترهیب (۱: ۵۴، رقم: ۱۱۶)' میں کہا ہے کہ اس حدیث کو ابن ماجه نے اسناد حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۳۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۲: ۲۳۲، رقم: ۲۲۱۴

إِذَا جَاءَ الْمَوتُ طَالِبَ الْعِلْمِ وَهُوَ عَلٰى تِلْکَ الْحَالِ مَاتَ شَهِيْدًا.(۱)

جب طالب علم کو موت آئے اور وہ اسی (حصولِ علم میں مصروفیت کی) حالت میں ہو تو اس کی موت شہید کی موت ہے۔

۱۴۔ فضیلتِ حصولِ علم

۱۔ حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں:

لَأَنْ أَعْلَمَ بَابًا مِنَ الْعِلْمِ فِي أَمْرٍ وَنَهْيٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ سَبْعِيْنَ غَزْوَةً فِي سَبِيلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ.(۲)

اوامر و نواہی کے علم کا ایک باب سیکھنا مجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑے گئے ستر غزوات سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ سے مروی ہے:

مُذَاكَرَةُ الْعِلْمِ سَاعَةٌ خَيْرٌ مِنْ إِحْيَاءِ لَيْلَةٍ.(۳)

---

(۱) ۱۔ ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱:۲۵
۲۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۶۷:۳۶۷
۳۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۱:۵۴، رقم:۱۱۵
۴۔ هيثمي، مجمع الزوائد، ۱:۱۲۴

(۲) ۱۔خطيب بغدادي، الفقيه والمتفقه، ۱: ۱۰۲
۲۔ابن القيم، مفتاح دار السعادة، ۱: ۱۱۸

(۳) ۱۔ بيهقي، المدخل إلى السنن الكبرى، ۱/۳۰۵، رقم: ۴۵۹
۲۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۲: ۴۴۱، رقم: ۳۹۱۷
۳۔ نووي، المجموع، ۱: ۲۱
۴۔ ذهبي، تذكرة الحفاظ، ۱: ۴۱، رقم: ۱۸

ایک لمحے کے لیے مذاکرۂ علم سننا پوری رات (عبادت کے لیے) جاگنے سے زیادہ افضل ہے۔

۳۔ حضرت حسن بصری ﷺ بیان کرتے ہیں:

لَأَنْ أَتَعَلَّمَ بَابًا مِنَ الْعِلْمِ، فَأُعَلِّمَهُ مُسْلِمًا أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ تَكُوْنَ لِي الدُّنْيَا كُلُّهَا، أَجْعَلُهَا فِي سَبِيْلِ اللهِ تَعَالٰى. (۱)

میں علم کا کوئی باب پہلے خود سیکھوں اور پھر دیگر مسلمانوں کو سکھاؤں، یہ مجھے اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میرے پاس پوری دنیا (کا مال و اَسباب) ہو اور میں اُسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کروں۔

۴۔ حضرت یحییٰ بن ابی کثیر روایت کرتے ہیں:

دِرَاسَةُ الْعِلْمِ صَلَاةٌ. (۲)

علم دین کی تدریس خود نماز ہے۔

اس سے مراد صلاۃ النافلۃ یعنی نفلی نماز ہے کیونکہ فرض نماز کا بدل کوئی دوسری عبادت نہیں بن سکتی۔

۵۔ حضرت سفیان الثوری اور امام شافعی فرماتے ہیں:

لَيْسَ شَيْءٌ بَعْدَ الْفَرَائِضِ أَفْضَلَ مِنْ طَلَبِ الْعِلْمِ. (۳)

فرائض کے بعد دین کا علم سیکھنے سے زیادہ افضل کوئی اور شے نہیں ہے۔

---

(۱) خطیب بغدادي، الفقیه والمتفقه، ۱:۱۰۲

(۲) نووی، المجموع، ۱: ۲۱

(۳) ۱۔ نووی، المجموع، ۱: ۲۱

۲۔ ابن القیم، مفتاح دار السعادة، ۱:۱۱۹

۶۔ حضرت ابراہیم بن ہانی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے امام احمد بن حنبل سے عرض کیا:

أَيِ شَيءٍ أَحَبُّ إِلَيكَ، أَجْلِسُ بِاللَّيْلِ أَنْسَخُ، أَوْ أُصَلِّي تَطَوُّعًا؟

آپ کو ان دونوں میں کون سی شے زیادہ محبوب ہے: رات بھر بیٹھ کر علم کی کتابت کرنا یا نفل نماز ادا کرنا؟

اُنہوں نے جواب دیا:

إِذَا كُنْتَ تَنْسَخُ، فَأَنْتَ تَعَلَّمُ بِهِ أَمْرَ دِينِكَ، فَهُوَ أَحَبُّ إِلَيَّ. (۱)

اگر تُو (علم کی کوئی بات) لکھتا ہے اور اس کے ذریعے اپنے دین کی کوئی بات سیکھ لیتا ہے تو یہ اَمر مجھے زیادہ محبوب ہے۔

یعنی امام احمد بن حنبل کو یہ عمل ساری رات کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے سے زیادہ محبوب تھا کہ ساری رات بیٹھ کر علم حاصل کیا جائے اور تصنیف وتحریر کا کام کیا جائے تاکہ امت تک علم پہنچے۔ ایسا اس لئے تھا کہ علم کے اس عمل میں مشغول ہونا دراصل حضور نبی اکرم ﷺ کی وارثت کو محفوظ کرنے کی جد و جہد ہے۔

۷۔ جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن مسیّب بیان کرتے ہیں:

لَيْسَتْ عِبَادَةُ اللهِ بِالصَّوْمِ وَالصَّلَاةِ وَلٰكِنْ بِالْفِقْهِ فِي دِيْنِهٖ. (۲)

اللہ تعالیٰ کی عبادت (محض) نماز اور روزے سے نہیں ہوتی، بلکہ اصل عبادت دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنا ہے۔

۸۔ حضرت اسحاق بن عبد اللہ بن ابی فروہ بیان کرتے ہیں:

---

(۱) خطيب بغدادي، الفقيه والمتفقه، ۱:۱۰۴

(۲) ۱۔خطيب بغدادي، الفقيه والمتفقه، ۱:۱۱۸

۲۔ابن القيم، مفتاح دار السعادة، ۱:۱۱۸

أَقْرَبُ النَّاسِ مِنْ دَرَجَةِ النُّبُوَّةِ أَهْلُ الْعِلْمِ.(۱)

درجہ نبوت کے قریب ترین لوگ اہلِ علم ہیں۔

۱۵۔ مجالسِ اَنبیاء کی جھلک، مجالسِ علماء میں دکھائی دینی چاہیں

حضرت سہل بن عبد اللہ التستری فرماتے ہیں:

مَنْ أَرَادَ أَنْ يَنْظُرَ إِلٰى مَجَالِسِ الْأَنْبِيَاءِ فَلْيَنْظُرْ إِلٰى مَجَالِسِ الْعُلَمَاءِ.(۲)

جو چاہے کہ میں انبیاءِ کرام علیہم السلام کی مجالس کو دیکھوں تو اُسے چاہیے کہ مجالسِ علماء کو دیکھ لے۔

یہاں وہ علمائے ربانیین، علمائے صالحین اور علمائے عاملین مراد ہیں جن پر علمِ دین وارد ہو چکا ہے۔ جو عالم باعمل بھی ہیں اور صالح بھی۔ ان کا علمِ نافع اُن کے ظاہر اور باطن میں نور بن چکا ہے۔ متقی اور خشیت رکھنے والے افراد ہی علماء کہلاتے ہیں۔

قرآن مجید نے علماء کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓاءُ.(۳)

بس اللہ کے بندوں میں سے اس سے وہی ڈرتے ہیں جو (ان حقائق کا بصیرت کے ساتھ) علم رکھنے والے ہیں۔

---

(۱) نووی، المجموع، ۱: ۲۱

(۲) ۱۔ خطیب بغدادی، الفقیه والمتفقه، ۱: ۱۴۹

۲۔ نووی، المجموع، ۱: ۲۱

۳۔ ابن الصلاح، أدب المفتي والمستفتي: ۷۴

۴۔ ابن الصلاح، الفتاوی، ۱: ۸

۵۔ ابن القیم، مفتاح دار السعادة، ۱: ۱۱۹

(۳) فاطر، ۳۵: ۲۸

علماء کی تعریف یہی ہے کہ اللہ کی خشیت اور خوفِ الٰہی رکھنے والے لوگ ہی علماء ہوتے ہیں۔ جس کا دل خشیتِ الٰہی سے لبریز نہیں، دل میں اللہ کا تقویٰ اور پرہیزگاری نہیں ہے وہ شخص عالمِ دین کہلانے کا بھی حق دار نہیں ہے۔

۱۶۔ معرفتِ دین کے حصول کی شرائط

ایک مرتبہ امام نووی نے اللہ تعالیٰ کے بارگاہ میں دعا کی: اے اللہ! اپنی تجلی کا فیض میری تصنیفات کو عطا کر دے تاکہ حضور نبی اکرم ﷺ کی امت میری کتابیں پڑھے اور عمر بھر اُس سے استفادہ کرے۔ نتیجتاً امام نووی کی کتابیں دنیا بھر میں شرق تا غرب مقبول ہوئیں۔ اُن کی تصانیف سے امتِ مسلمہ کو فیض مل رہا ہے۔ اولیاء کرام میں سے کسی کا فیض اس کی قبر سے حاصل ہوتا ہے، کسی کا ان کی شفقت سے ملتا ہے اور کسی کا ان کے علم سے حاصل ہوتا ہے۔

انہی امام نوویؒ نے اپنی شرح المهذب کی جلد اوّل مقدمہ میں درج ذیل آداب المتعلم تحریر فرمائے ہیں:

(۱) طہارتِ قلوب

علم فقہ اور دین کی معرفت تامہ حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ دلوں کو پاک کیا جائے۔

امام نووی فرماتے ہیں:

يَطِيبُ الْقَلْبِ لِلْعِلْمِ تَطِيبُ الْأَرْضِ لِلزِّرَاعَةِ.[1]

علم (نافع کے حصول) کے لیے دل کو (دنیاوی آلائشوں سے) اس طرح صاف کرنا چاہیے جس طرح کھیتی باڑی کے لیے زمین کو صاف کرتے ہیں۔

یعنی تصفیۂ قلب اور تزکیہ نفس ہونا چاہیے۔ اگر قلب اور نفس کی زمین خرابیوں اور پلیدیوں سے

(۱) نووی، التبيان في آداب حملة القرآن: ۲۵

پاک نہیں ہوگی تو علم خشیتِ الٰہی اور تقویٰ کا نور پیدا نہیں کرے گا۔ یہ آپ کو کامل فقیہ اور صاحبِ معرفتِ تامہ نہیں بنائے گا اور نیابتِ محمدی عطا نہیں کرے گا۔ اِن امور کے لیے چاہیے کہ نفس اور قلب کی زمین علم کی زراعت کے قابل اور صاف ستھری ہو۔ یعنی جو علائق رکاوٹ بنتے ہیں اُن سے اپنے آپ کو پاک صاف کرے۔

(۲) قناعت وتوکل اِختیار کرنا

دین کے علم کی خیرات حاصل کرنے کی دوسری شرط یہ ہے:

وَيَرْضٰى بِالْيَسِيْرِ مِنَ الْقُوْتِ، وَيَصْبِرَ عَلٰى ضِيْقِ الْعَيْشِ.(۱)

تھوڑا کھانے کو ملے تو اُس میں بھی راضی ہو اور زندگی میں اگر وسائل کی فراخی نہ بھی ہو تب بھی راضی ہو۔

یعنی معرفتِ علم کے لئے قناعت اور توکل اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اگر دنیا کی حرص بھی رہے اور اشاعت وترویج دین بھی ساتھ ساتھ ہو تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ آخرت کے کام کے لیے سودے بازی کرنا بندے کو عذاب کا حق دار بنا دیتا ہے۔ جو آدمی آخرت کا کام کرے اور اس کے عوض دنیا بھی طلب کرے، اُس کا علم اُس پر لعنت بھیجتا ہے۔ بندے کو چاہیے کہ اللہ کے دین کے لیے ایسے وقف ہو جائے کہ دین کی خدمت کو حضور نبی اکرم ﷺ کی سنت سمجھ کر اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء ورسل علیہم السلام اسی عزم کا اظہار اِن الفاظ میں فرماتے رہے:

يٰـقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ط اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ○(۲)

اے میری قوم! میں اس (دعوت وتبلیغ) پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر فقط اس (کے ذمۂ کرم) پر ہے جس نے مجھے پیدا فرمایا ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے○

(۱) نووی، المجموع، ۱: ۳۵

(۲) ھود، ۱۱: ۵۱

حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

رَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهُ، وَقَرَأَ الْقُرْآنَ فَأُتِيَ بِهِ، فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا. قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهُ، وَقَرَأْتُ فِيكَ الْقُرْآنَ. قَالَ: كَذَبْتَ، وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ عَالِمٌ، وَقَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ. فَقَدْ قِيلَ. ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهِ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ.[1]

ایک شخص جس نے (دنیا میں) علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن مجید پڑھا، (قیامت کے روز) اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں یاد کرائے گا تو وہ شخص اُن کا اقرار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں کے شکرانے میں کون سا عمل کیا؟ وہ کہے گا: میں نے علم سیکھا اور اسے سکھایا اور تیری رضا کی خاطر قرآن کی قرأت کی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا، بلکہ تو نے علم اس لئے حاصل کیا تھا تاکہ عالم کہلائے اور قرآن کی قرأت اس لیے کی تاکہ قاری کہلائے۔ پس یہ کہا جا چکا ہے۔ پھر اس شخص کے بارے میں حکم دیا جائے گا تو اسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دو۔

---

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب الإمارة، باب من قاتل للرياء والسمعة استحق النار، ۳:۱۵۱۳، رقم:۱۹۰۵

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲:۳۲۱، رقم:۸۲۶۰

۳۔ نسائي، السنن، كتاب الجهاد، باب من قاتل ليقال فلان جريئ، ۶:۲۳، رقم:۳۱۳۷

۴۔ حاكم، المستدرك، ۱:۱۸۹، رقم:۳۶۴

۵۔ أبو عوانة، المسند، ۴:۴۸۹، رقم:۷۴۴۱

(۳) حصولِ علم میں فلاح کن لوگوں کا مقدر بنتی ہے؟

امام نووی نے آدابِ علم بیان کرتے ہوئے اس امر کو بھی واضح کیا ہے کہ علم دین کے حصول سے مقصود کیا ہونا چاہیے؟ آپ لکھتے ہیں کہ امام شافعی نے فرمایا ہے:

لَا يَطْلُبُ أَحَدٌ هٰذَا الْعِلْمَ بِالْمُلْكِ وَعِزِّ النَّفْسِ فَيُفْلَحَ، وَلٰكِنْ مَنْ طَلَبَهُ بِذُلِ النَّفْسِ، وَضِيْقِ الْعَيْشِ، وَخِدْمَةِ الْعُلَمَاءِ أَفْلَحَ.(1)

جو شخص اِس علم دین میں طاقت، قوت، اقتدار، عزت یا مال و دولت اور دنیا طلب کرے، وہ کبھی فلاح نہیں پاتا۔ جس نے علم دین کو طلب کیا (اور یہی حکم آگے پہنچانے کا بھی ہے) نفس کو عاجز رکھ کر، تنگی معاش رکھ کر اور علماء و صالحین کی خدمت کر کے وہی فلاح پاتا ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی خلافت کا حصول بہت بڑا مرتبہ ہے۔ علمِ محمدی کا وارث اور حامل ہونا بہت بڑی فضیلت ہے۔ فقیہ امت ہونا بھی بہت بڑا اعزاز ہے۔ بھلے اِس کے راستے میں فقر و فاقہ اور مشکلات و پریشانیاں آئیں، گھبرائیں نہیں کیونکہ یہ چار دن کی بات ہے، ٹل جائیں گی مگر علمِ محمدی اور وراثتِ محمدی کے حصول و فروغ سے جو مرتبہ ملے گا وہ ابدی ہے۔ اسے اس دنیا میں بھی رہنا ہے، قیامت میں بھی موجود ہوگا اور آخرت میں بھی قائم رہے گا۔

علم کے اپنے آداب ہیں۔ اِس میں اگر معاشی تنگی بھی آجائے تو مطلقاً بندہ فکر نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق جوڑے رکھے اور علم کے نور کے ساتھ خوش رہے۔ فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادھم، جنید بغدادی، اویس قرنی، غوث الاعظم، داتا گنج بخش علی ہجویری، فریدالدین گنج شکر، خواجہ اجمیر رحمہم اللہ تعالیٰ جیسی عظیم شخصیات کو اپنے لیے مثالی شخصیت بنائیے۔ یہ مردانِ حق مال و دولت کے سلاطین نہیں تھے بلکہ یہ وارثِ محمدی کے تاج دار تھے۔ ان عظیم لوگوں کی شان دار زندگی کا عکس اپنے اندر اتاریں۔ اپنے اندر بے نیازی، قناعت، توکل پیدا

(۱) نووی، المجموع، ۱: ۳۵

کریں اور فقر کو بخوشی سینے سے لگائیں۔ ایسی نیت کے ساتھ علم حاصل کریں گے اور علم کو آگے پہنچائیں گے تو اِس علم کا تحقق بھی ہوگا، معرفت مضبوط و مستحکم بھی ہوگی اور اللہ تعالیٰ اِس کی اہلیت بھی عطا فرمائے گا۔ (ان شاء اللہ)

۱۷۔ طلبِ علم میں مجاہدہ، جنت کا راستہ ہے

جب ہم گھر سے طلبِ علم کی نیت سے نکل رہے ہوتے ہیں تو کبھی سوچا ہے کہ ہمیں اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ ہمیں علم ہونا چاہیے کہ یہ کس کس کی سنت ہے اور اِس کی کیا کیا برکات ہیں۔ اِس عمل کی کیا کیا عظمتیں ہیں اور اس سے ہمیں کیا کیا نصیب ہوگا؟ یہ امر ہمیشہ ذہن نشین رہے کہ تحریک منہاج القرآن کی تمام تنظیمات اور پوری تحریک میں طلبِ علم کا رجحان عام ہونا چاہیے۔ ہم طلبِ علم کے لیے ہی زندہ رہیں اور اِسی راستے پر ہمیں موت آئے۔ ہر شخص خواہ وہ زیادہ پڑھا ہوا ہے یا کم پڑھا ہوا، خواہ وہ علم اس نے کسی علم کی مجلس میں تھوڑی دیر بیٹھ کر حاصل کیا ہو، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اُسے طلبِ علم کے راستے میں کیا کیا عظمتیں نصیب ہوتی ہیں۔ یعنی یہ بات ہر ایک کے علم میں ہونی چاہیے کہ جب وہ کسی مجلسِ علم سے حصولِ علم کے بعد پلٹ کر واپس اپنے گھروں کو جائیں گے تو اِس کا اجر کیا ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سَلَکَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللهُ لَهُ بِهٖ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ. (۱)

---

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والإستغفار، باب فضل الإجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر، ۴:۲۰۷۴، رقم: ۲۶۹۹
۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲:۲۵۲، رقم: ۷۴۲۱، ۹۶۲۳
۳۔ أبو داود، السنن، كتاب الصلاة، باب في ثواب قراءة القرآن، ۲:۷۱، رقم: ۱۴۵۵
۴۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ۱:۸۲، رقم: ۲۲۵

جو شخص علم کو طلب کرنے کے لیے کسی راستے پر چلا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دے گا۔

لہٰذا جو شخص طلبِ علم کی نیت سے گھر سے نکل پڑا، وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے اس دائرے میں آ گیا جو اس حدیث مبارک میں بیان ہوا ہے۔ حصولِ علم کی نیت سے اگر کوئی ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک شہر سے دوسرے شہر تک کسی بھی طریقے سے سفر کرے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔ ہمیں اس خوش خبری کا حق دار بننے کے لئے حصولِ علم کی نیت کو خالص و صادق رکھنا ہوگا۔ اس لئے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ.(۱)

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کی طرف نہیں دیکھتا، البتہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔

کون سا مسلمان ایسا ہے جو نہیں چاہے گا کہ اُس کے لیے جنت کا راستہ آسان ہو جائے۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ جنت کا راستہ آسان کرنے لیے علم کے حصول کو اپنا معمول بنا لے۔

۵۔دارمي، السنن، ۱:۱۱۳، رقم: ۳۵۶

۶۔طبراني، المعجم الأوسط، ۴:۱۲۶، رقم: ۳۷۸۰

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب البر والصلة والآداب، بَابُ تَحْرِيمِ ظُلْمِ الْمُسْلِمِ وَخَذْلِهِ وَاحْتِقَارِهِ وَدَمِهِ وَعِرْضِهِ وَمَالِهِ، ۴: ۱۹۸۷، رقم: ۲۵۶۴

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۲۸۴، ۵۳۹، رقم: ۷۸۱۴، ۱۰۹۷۳

۳۔ ابن ماجه، السنن، كتاب الزهد، باب القناعة، ۲: ۱۳۸۸، رقم: ۴۱۴۳

۴۔ ابن حبان، الصحيح، ۲: ۱۱۹، رقم: ۳۹۴

۱۸۔ حصولِ علم کے راستے کا ہر عمل عبادت ہے

طالبِ علم کو حصولِ علم کے باعث ربِ کائنات کی بارگاہ سے مزید کیا نعمت میسر آتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت انس بن مالک ﷺ حضور نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

مَنْ خَرَجَ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ كَانَ فِي سَبِيلِ اللهِ حَتّٰى يَرْجِعَ. (۱)

جو شخص علم کی تلاش میں نکلے وہ واپسی تک اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہوتا ہے۔

مَنْ خَرَجَ کے الفاظ واضح کر رہے ہیں کہ جوں ہی کوئی حصولِ علم کی نیت سے گھر سے نکلے، اس کا یہ عمل وہیں سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کیا جانے والا عمل شمار (count) ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ دورانِ سفر چاہے آپ کھانا کھا رہے ہیں یا مشروب پی رہے ہیں یا کوئی اور شے کھا رہے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی راہ میں کیے جانے والے اعمال شمار ہوں گے۔

اسی طرح جس نے منہاج القرآن یعنی قرآن کے راستے کی نیت کر لی، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے راستے یعنی صراطِ مستقیم کی نیت کر لی اور اس راستے پر چل نکلے تو حسنِ نیت سے اس دوران کئے جانے والے دیگر اعمال بھی نیک اعمال تصور ہوں گے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی راہ میں بسر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اُن کی عمر بھر ایک ہی نیت رہتی ہے اور وہ ہر روز اپنی اُس نیت کا اعادہ کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ واپس اپنے گھر میں پلٹ جانے تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہی ہوتے ہیں۔

اگر آپ علم کی محفل میں دین کو سمجھنے کے لیے آئے ہیں۔ اس دوران نوافل نہیں پڑھ رہے، بہت زیادہ تسبیحات و اذکار نہیں کر رہے لیکن حصولِ علم اور دین کا فہم حاصل کرنے کی نیت اور فہمِ دین کو اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہزارہا نوافل کی

---

(۱) ۱۔ ترمذی، السنن، کتاب العلم، باب فضل طلب العلم، ۵: ۲۹، رقم: ۲۶۴۷

۲۔ مقدسی، الأحادیث المختارۃ، ۶: ۱۲۴، رقم: ۲۱۱۹

ادائیگی سے زیادہ فضیلت والی عبادت ہے۔

ہر جگہ بارگاہِ اِلٰہی بن سکتی ہے

یہ امر واضح رہے کہ جہاں جا کر حصولِ علم، با برکت عمل، عبادت، ذکرِ الٰہی اور درودِ پاک کے لیے کوئی بیٹھے، وہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے لیے لازم نہیں ہے کہ وہ کعبہ شریف ہی ہو یا مسجد ہو تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ بنے گی۔ بلکہ آپ اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف راغب کر کے زمین کے جس ٹکڑے پر بیٹھ جائیں، وہی اللہ کی بارگاہ بن جائے گی۔

قرآن مجید میں ہے:

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ.[1]

پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)۔

گویا قرآن مجید نے یہ واضح کر دیا کہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ ہے۔ بندے کی نیت کسی بھی جگہ کو اللہ کی بارگاہ بنا دیتی ہے۔ اکابر اولیاء اللہ جہاں جا کر ریاضت اور مجاہدے کرتے تھے، وہاں پہلے سے مسجد تو موجود نہیں ہوتی تھی، مسجد تو بعد میں وہاں تعمیر کی جاتی تھی۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر نے دریا کے پتن (کنارے) پر ڈیرہ لگایا (جسے پاک پتن کہتے ہیں) تو وہاں پہلے کوئی مسجد موجود نہیں تھی۔ اسی طرح حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری جب ہجویر سے لاہور جلوہ افروز ہوئے تو وہاں تو ہر طرف دیارِ کفر تھا کوئی مسجد موجود نہ تھی۔ آپ تو آ کر ایک جگہ بیٹھ گئے، دور دراز سے لوگ آپ کے پاس آنے لگے۔ گویا پہلے اللہ والا اپنا ڈیرہ وہاں ڈالتا ہے پھر مساجد بھی بنتی ہیں، ادارے بھی بنتے ہیں اور مراکز بھی بن جاتے ہیں۔ اِسی طرح تمام اولیاء کرام نے دنیا بھر کی شرک نگریوں میں توحید کے مراکز قائم کیے۔ جس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ کا بندہ بیٹھ جاتا ہے اسی جگہ کو بارگاہِ الٰہی ہونے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

---

(۱) البقرة، ۲: ۱۱۵

آقائے دوجہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وَجُعِلَتْ لِي الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا.[1]

ساری زمین میرے لیے سجدہ گاہ بنا دی گئی ہے۔

کسی جگہ کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا درجہ پانا اینٹوں، سریے، سیمنٹ اور معمار کا مرہونِ منت ہونا نہیں بلکہ لوگوں کے وہاں خلوصِ نیت کے ساتھ بیٹھنے سے عبارت ہے۔ گویا صدقِ نیت کی بناء پر کوئی جگہ اللہ کی بارگاہ قرار پاتی ہے۔ اِس لیے کہ اللہ تو بندے کے اندر بھی ہے اور باہر بھی ہے۔ ہرسمت، ہرطرف اور ہرسُو اللہ ہی اللہ ہے۔

قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ.[2]

آپ فرما دیں: مشرق ومغرب (سب) اللہ ہی کے لیے ہے۔

لہٰذا جدھر چاہے رخ کرلو، اُدھر ہی اللہ کی بارگاہ ہے۔اس لئے کہ اُسی کا یہ ارشاد ہے:

---

(۱) ۱۔بخاری، الصحیح، کتاب التیمم، قول الله تعالی: فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا، ۱:۱۲۸، رقم: ۳۲۸

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۳۰۱ رقم: ۲۷۴۲

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۲۴۰، ۲۵۰، ۴۱۱، ۴۴۲، ۵۰۱ رقم: ۷۲۶۵، ۷۳۹۷، ۹۳۲۶، ۷۰۳، ۱۰۵۲۴

۴۔ ترمذی، السنن، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء أن الأرض کلها مسجدا، ۲: ۱۳۱، رقم: ۳۱۷

۵۔نسائی، السنن ، کتاب الغسل والتیمم، باب التیمم بالصید، ۱: ۲۱۰، رقم: ۴۳۲

۶۔ ابن ماجه، السنن، کتاب الطهارة وسنتها، باب ما جاء فی السبب، ۱: ۱۸۸، رقم: ۵۶۷

(۲) البقرة، ۲: ۱۴۲

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ○[1]

ہم تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہیں۔

نہ صرف یہ کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے بلکہ اس کی نشانیاں ہمارے اندر موجود ہیں:

وَ فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ○[2]

اور خود تمہارے نفوس میں (بھی ہیں)، سو کیا تم دیکھتے نہیں ہو○

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نشانیاں لوگوں کے نفوس کے اندر موجود ہیں مگر وہ ان نشانیوں میں غور وفکر نہیں کرتے۔ ان باتوں کا مقصد یہ ہے کہ ہر جگہ اللہ کی بارگاہ اس لئے ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے، بندہ جہاں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرے، وہی بارگاہِ الٰہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث قدسی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اقدس ہے:

أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي، فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي، وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا، وَإِنْ أَتَانِي يَمْشِي، أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً.[3]

---

(۱) ق، ۵۰: ۱۶

(۲) الذاریات، ۵۱: ۲۱

(۳) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالی: ویحذرکم اللہ نفسہ، ۶: ۲۶۹۴، رقم: ۶۹۷۰

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب الحث علی ذکر اللہ تعالی، ۴: ۲۰۶۱، رقم: ۲۶۷۵ ←

میرا بندہ میرے متعلق جیسا خیال رکھتا ہے میں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں۔ جب وہ میرا ذکر کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ اپنے دل میں میرا ذکر (یعنی ذکرِ خفی) کرے تو میں بھی (اپنی شان کے لائق) اپنے دل میں اس کا ذکر کرتا ہوں اور اگر وہ جماعت میں میرا ذکر (یعنی ذکرِ جلی) کرے تو میں اس کی جماعت سے بہتر جماعت (یعنی فرشتوں) میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اگر وہ ایک بالشت میرے نزدیک آئے تو میں ایک بازو کے برابر اس کے نزدیک ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ ایک بازو کے برابر میرے نزدیک آئے تو میں دو بازوؤں کے برابر اس کے نزدیک ہو جاتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آئے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

آپ ایک لمحہ آنکھیں بند کر کے اپنے من سے اللہ کو یاد کریں اور اللہ کے حبیب ﷺ پر درود پاک پڑھیں، آپ کے اِس عمل نے آپ کی یہ جگہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ بھی بنا دی اور حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ بھی بنا دی۔ اِسی لیے فرمایا گیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ○[1]

اور (اے رسولِ محتشم!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر○

یعنی آپ ﷺ کی رحمت بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی طرح ہر ایک کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جہاں

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲:۴۱۳، رقم: ۹۳۴۰

۴۔ ترمذی، السنن، کتاب الزہد، باب فی حسن الظن باللہ، ۵:۵۸۱، رقم: ۳۶۰۳

۵۔ ابن ماجه، السنن، کتاب الأدب، باب فضل العمل، ۲:۱۲۵۵، رقم: ۳۸۲۲

(۱) الأنبیاء، ۲۱:۱۰۷

بیٹھ کر آ قائے دو جہاں ﷺ کا غلام حضور ﷺ کو یاد کر لے، آپ ﷺ کی بارگاہ میں ہدیہ نعت پیش کر دے، وہی جگہ آ قا ﷺ کی بارگاہِ رحمت بن گئی۔ اس میں نہ گھنٹوں، ہفتوں اور مہینوں کی قید ہے اور نہ ہی مقامات کی قید ہے۔ رسولِ مکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی -'ساری زمین میرے لیے سجدہ گاہ بنا دی گئی ہے' - میں یہی حکمت کارفرما ہے۔ پہلی امتوں کے لیے شرط تھی کہ عبادت کے لیے ایک مخصوص جگہ کا ہونا ضروری تھا، خواہ وہ جگہ لکڑی کی ہی ہو اور اسے اٹھا کر چلنا پڑے۔ آ قائے دوجہاں ﷺ نے اپنی شریعت میں یہ حکم ختم فرما دیا کہ جس پاک زمین پر کوئی امتی سجدہ کر لے، وہی بارگاہِ الٰہی ہے۔ واضح ہوگیا کہ کوئی جگہ عمارت اور اینٹوں سے بارگاہِ ربانی نہیں بنتی بلکہ خلوصِ قلب اور صدقِ نیت سے بنتی ہے۔

۱۹۔ دین کے علم اور فہم کا حصول افضل ترین عبادت ہے

۱۔ حضرت عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

أَفْضَلُ الْعِبَادَةِ الْفِقْهُ وَأَفْضَلُ الدِّيْنِ الْوَرَعُ.(۱)

افضل ترین عبادت دین کا فہم اور علم حاصل کرنا ہے اور سب سے افضل دین تقویٰ و ورع ہے۔

۲۔ کسی محفل میں دین کا فہم، دین کی سمجھ بوجھ اور علم حاصل کرنے کا عمل بذاتِ خود سب سے افضل عبادت ہے۔ اگر اسی محفل میں کوئی اضافی نفلی عبادت کریں گے تو یہ سونے پر سہاگہ ہے لیکن اگر نفلی عبادت اس مجلس میں شامل نہ بھی ہو تو پھر بھی خلوصِ نیت سے دین سیکھنا، دین کا علم لینا، تربیت لینا، دین کا فہم لینا بذاتِ خود ایک افضل عبادت ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الأوسط، ۹: ۱۰۷، رقم: ۹۲۶۴
۲۔ طبرانی، المعجم الصغیر، ۲: ۲۵۱، رقم: ۱۱۱۴
۳۔ قضاعی، مسند الشهاب، ۲: ۲۴۹، رقم: ۱۲۹۰
۴۔ هیثمی، مجمع الزوائد، ۱: ۱۲۰

نے اس عبادت کی فضیلت اور ثواب بھی بیان فرمایا ہے۔

حضرت ابو ذر غفاری اور حضرت ابوہریرہ ؓ دونوں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے:

لَبَابٌ يَتَعَلَّمُهُ الرَّجُلُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَلْفِ رَكْعَةٍ تَطَوُّعًا.(۱)

جو شخص علم کا ایک باب (موضوع) سیکھ لے تو وہ مجھے ایک ہزار رکعت نفل پڑھنے سے زیادہ محبوب ہے۔

اَہم علمی نکتہ!

جب صحابہ کرام ؓ کوئی ایسی شرعی چیز بیان کریں کہ فلاں عمل کا اتنا اجر وثواب ہے اور عقل یہ فضیلت و ثواب قبول نہ کرے یعنی اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ اس عمل کا ثواب اس قدر اعلیٰ بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟ ہمیشہ یاد رکھیں کہ ایسی بات صحابہ کرام ؓ نے آقائے دوجہاں ﷺ سے سنے بغیر بیان نہیں کی، خواہ صحابہ اس روایت میں رسولِ مکرم ﷺ کا اسم گرامی لیں یا نہ لیں۔ بالفاظِ دیگر جو بات قیاس، رائے اور عقل پر مبنی نہیں مگر صحابی وہ بات کریں اور وہ حضور نبی اکرم ﷺ کا نام نہ بھی لیں کہ میں نے آقا ﷺ سے اس طرح سنا، تب بھی وہ رسول اللہ ﷺ کی ہی حدیث ہوتی ہے۔

۲۰۔ حصولِ علم کا ارادہ ہی باعثِ ثواب ہے

حصولِ علم کی اس قدر فضیلت وثواب کو سُن کر کہیں یہ خیال نہ آ جائے کہ یہ تو اُن کے لیے ہے جو حصولِ علم میں بہت زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے! بے شک جو جتنا وقت صرف کرے گا، اُس کے درجات اتنے ہی بلند ہوتے چلے جائیں گے اور اُسے مزید

(۱) ۱۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۹: ۲۴۷
۲۔ ابن عساکر، تاریخ مدینة دمشق، ۶۷: ۳۶۷
۳۔ منذری، الترغیب والترهیب، ۱: ۵۴، رقم: ۱۱۵

رحمتیں اور برکتیں ملیں گی۔ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌo[1]

اور ہر صاحبِ علم سے اوپر (بھی) ایک علم والا ہوتا ہےo

علم کی کوئی حد نہیں ہے مگر اس موقع پر بیان شدہ فضیلت و ثواب ہر اُس شخص کے لیے ہے جو علم کی طلب کی نیت سے گھر سے نکلتا ہے۔ اللہ کی خاطر دین کا علم حاصل کرنے کی نیت لے کر جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن آتا ہے یا کسی اور علمی مرکز پر جاتا ہے اور اُس پر قائم رہتا ہے، اُس کے لیے یہ فضیلت ہے۔ اس لئے کہ حدیث مبارک میں سیکھنے کے ارادہ و خواہش کا ذکر ہے، ابھی عمل کرنے کی فضیلت و ثواب بیان نہیں ہوا۔ حضرت ابو ذر ﷺ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے مجھے فرمایا:

يَا أَبَا ذَرٍّ، لَأَنْ تَغْدُوَ فَتَعَلَّمَ آيَةً مِنْ كِتَابِ اللهِ خَيْرٌ لَکَ مِنْ أَنْ تُصَلِّيَ مِائَةَ رَكْعَةٍ، وَلَأَنْ تَغْدُوَ فَتَعَلَّمَ بَابًا مِنَ الْعِلْمِ عُمِلَ بِهٖ أَوْ لَمْ يُعْمَلْ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تُصَلِّيَ أَلْفَ رَكْعَةٍ.[2]

اے ابو ذر! تم اس حال میں صبح کرو، کہ تم (رات بھر جاگ کر) اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے ایک آیت سیکھ لو تو یہ تمہارے لئے سو رکعات نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ تم اس حال میں صبح کرو کہ (اس دوران) تم علم کا ایک باب سیکھ لو چاہے اس پر عمل کیا

---

(۱) یوسف، ۱۲: ۷۶

(۲) ۱۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فضل من تعلم القرآن وعلمه، ۱: ۷۹، رقم: ۲۱۹

۲۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۵: ۳۳۸، رقم: ۸۳۶۲

۳۔ منذري نے 'الترغيب والترهيب (۱: ۵۴، رقم: ۱۱۶)' میں کہا ہے کہ اسے امام ابن ماجه نے اسناد حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۳۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۲: ۲۳۲، رقم: ۲۲۱۴

گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو تو یہ تمہارے لئے ایک ہزار رکعت نوافل ادا کرنے سے بہتر ہے۔

یعنی عمل کرے گا تو عمل کا ثواب اور اجر اضافی ملے گا۔ ابھی عمل نہیں کیا، صرف ارادہ کیا ہے تو یہ ثواب ہے اور اگر عمل کرے گا تو وہ نورٌ علیٰ نور ہو گا، وہ علم نافع بنتا چلا جائے گا، اُس میں برکتوں کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور درجات بلند سے بلند تر ہوتے چلے جائیں گے۔

یہاں ایک باب سے مراد ایک موضوع (subject)، ایک نکتہ ہے جیسا کہ ان مجالس العلم کے ذریعے آپ ایک موضوع سیکھ رہے ہیں، اِسے باب کہتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جو شخص علم کا ایک باب سیکھ لے تو وہ ہمیں ایک ہزار رکعت نفل پڑھنے سے زیادہ محبوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کسی علمی مجلس میں طلبِ علم اور فقہ الدین کے لیے بیٹھے ہیں اور دوسری طرف آپ کا جی چاہے کہ میں یہاں کیوں بیٹھوں؟ بلکہ اس کے بجائے نفل پڑھ لیتا ہوں۔ فرمایا: علم کا ایک باب سیکھنا، ہزار رکعت نفل سے زیادہ محبوب ہے۔ ایک رات میں کوئی ایک ہزار نوافل بمشکل ادا کر سکتا ہے مگر علم کے لئے چند لمحات کا وقف کر دینا ایک ہزار نوافل سے بھی زیادہ اجر و ثواب عطا کرتا ہے۔

۲۱۔ حصولِ علم کے دوران اِتفاقی موت بھی شہادت ہے

حضور نبی اکرم ﷺ نے حصولِ علم کے ارادہ و خواہش کا ثواب فقط ایک ہزار رکعت نفل سے زیادہ محبوب قرار نہ دیا بلکہ اس کے ساتھ طالبِ علم کی ایک ایسی فضیلت بھی اسی حدیث مبارک میں بیان کی جس سے اسلام میں علم کی اہمیت و فضیلت مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔

حضرت ابو ذر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِذَا جَاءَ الْمَوتُ طَالِبَ الْعِلْمِ وَهُوَ عَلٰى تِلْکَ الْحَالِ مَاتَ شَهِيْدًا. (۱)

(۱) ۱۔ ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۲۵

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جب طالب علم کو موت آئے اور وہ اسی (حصولِ علم میں مصروفیت کی) حالت میں ہو تو اس کی موت شہید کی موت ہے۔

امام منذری نے یہ حدیث مبارک ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے:

إِذَا جَاءَ الْمَوتُ لِطَالِبِ الْعِلْمِ وَهُوَ عَلٰى هٰذِهِ الْحَالَةِ مَاتَ وَهُوَ شَهِيْدٌ. (۱)

اگر کوئی شخص علم کی طلب میں نکلا یا علم کی طلب میں بیٹھا اور حصول علم کے مرحلہ کے دوران اُس کی اتفاقاً موت واقع ہوگئی تو وہ شہید ہے۔

۲۲۔ جنت میں اَہلِ علم کا درجہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد ہوگا

حضور نبی اکرم ﷺ کے فرامین کی روشنی میں نہ صرف یہ بات متحقق ہے کہ حصولِ علم کے دوران اتفاقی موت شہادت کا درجہ رکھتی ہے بلکہ جنت میں انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اہل علم کا درجہ ہونا بھی ثابت شدہ امر ہے۔

۱۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ، فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ. (۲)

..... ۲۔ ابن عساکر، تاریخ دمشق، ۶۷: ۳۶۷

۳۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۱: ۵۴، رقم: ۱۱۵

۴۔ہیثمي، مجمع الزوائد، ۱: ۱۲۴

(۱) ۱۔ منذری، الترغیب و الترهیب، ۱: ۵۴، رقم: ۱۱۵

۲۔ هیثمی، مجمع الزوائد، ۱: ۱۲۴

۳۔هندی، کنز العمال، ۱۰: ۶۰، رقم: ۲۸۶۹۳

(۲) ۱۔دارمي، السنن، ۱: ۱۱۲، رقم: ۳۵۴

۲۔ ابن عساکر، تاریخ دمشق الکبیر، ۵۱: ۶۱ ←

اگر کسی کو موت اس حال میں آئے کہ وہ علم حاصل کر رہا تھا تاکہ اس علم کے ذریعے اسلام کو زندہ کرے تو اس کے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان جنت میں صرف ایک درجے کا فرق ہوگا۔

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ جَاءَهُ أَجَلُهُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لَقِيَ اللهَ وَلَمْ يَكُنْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ إِلَّا دَرَجَةُ النُّبُوَّةِ. (۱)

جس کو علم حاصل کرتے ہوئے موت آ گئی، وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان صرف درجہ نبوت کا فرق ہوگا۔

موت آنے کا تو کوئی بھروسہ نہیں ہے کہ نہ جانے کب اور کہاں آجائے۔ اس کا تو ایک وقت مقرر ہے اور وہ ہر صورت بر وقت آ کر رہے گی۔ لہٰذا اگر کوئی شخص حصولِ علم کے سفر کے دوران وفات پا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے جنت کی اُن منزلوں میں ٹھہرائے گا جن کے اوپر والی منزل پر انبیاء رہ رہے ہوں گے۔ یعنی ایک منزل کا فرق ہوگا۔ درمیانی منزل اولیاء، صدیقین اور شہداء کی ہوگی جب کہ اوپر انبیاء کرام علیہم السلام ہوں گے اور اُن کے زیرِ سایہ علم طلب کرنے والے ہوں گے۔

۳۔ ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۴۶

۴۔منذري، الترغيب والترهيب، ۱: ۵۳، رقم: ۱۱۰

۵۔ ہيثمي، مجمع الزوائد، ۱: ۱۲۳

(۱) ۱۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۹: ۱۷۴، رقم: ۹۴۵۴

۲۔ خطيب بغدادي، تاريخ بغداد، ۳: ۷۸، رقم: ۱۰۵۶

۳۔ خطيب بغدادي، الفقيه والمتفقه، ۲: ۱۶۵

۴۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۳: ۵۵۹، رقم: ۵۷۵۵

۵۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۱: ۵۳، رقم: ۱۱۰

یہ بات قابلِ غور ہے کہ حدیث مبارک میں یہ شرط نہیں لگائی کہ کتنا بڑا عالم، فقیہ، محدّث، محقق، مفسر اور مجتہد ہو تو اُسے یہ مقام نصیب ہوگا۔ بلکہ فرمایا جو بھی علم طلب کرنے والا ہوگا، اُسے یہ مقام عطا کیا جائے گا۔ یہ علم کی اپنی فضیلت ہے، یعنی نفسِ علم کی فضیلت ہے کہ کوئی اگر اُس کی طلب کے لیے نکلے، نیت کو قائم رکھے اور اس دوران موت آ جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کے دن جنت میں انبیاء کرام علیہم السلام کی منزلوں کے سائے میں جگہ عطا فرمائے گا۔

فضیلتِ علم کا بنیادی سبب

دین کے علم کا حصول اللہ کی رضا والی نیت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ حصولِ علم میں یہ بات ہر وقت مستحضر رہے کہ 'عبادت کی توفیق ہو، خوف الٰہی نصیب ہو، دین کا فہم مجھ پر کھلے، تاکہ میں مزید نیک اعمال کر سکوں، برائیوں سے رک سکوں، علم کے ذریعے مجھے پتہ چلے کہ اللہ کے حقوق میرے اوپر کیا ہیں؟ علم حاصل ہوگا تو پتہ چلے گا کہ میرے رشتے داروں، بہن بھائیوں، اولاد، اعزاء و اقارب اور پڑوسیوں کے مجھ پر کیا حقوق ہیں تاکہ وہ حقوق احسن انداز سے ادا کر سکوں۔ جب علم حاصل ہوگا تو پتہ چلے گا کہ میرے نفس کے مجھ پر کیا حقوق ہیں۔ اِس معاشرے کے غریبوں اور کم زوروں کے حقوق مجھ پر کیا ہیں۔' اس لئے کہ یہ سب چیزیں علم ہی سے آشکار ہوتی ہیں۔ انسان جب عمل کرتا ہے تو اس کا اجر وثواب الگ ہے، وہ تو اضافتاً ملتا ہی ہے مگر اس حدیث میں جو فضیلت بیان ہو رہی ہے وہ مطلقاً نفسِ علم کی ہے۔ اس لئے کہ اُس علم کے اندر ہزارہا اعمال کے راستے پڑے ہوئے ہیں جو کھلنے ہیں۔ نفسِ علم کی اس فضیلت کی وجہ سے حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے ابو ذر! علم کا ایک باب سیکھنا تمہارے لیے ایک ہزار رکعت نماز نفل پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے۔

ایسا اس وجہ سے ہے کہ جب علم کو اللہ کے لیے حاصل کرتے ہیں تو اُس نیت کی وجہ سے اعمالِ صالحہ کے دروازے کھلنے کا خیال ہوتا ہے، تقویٰ کے حصول کا خیال ہوتا ہے، اللہ اور اس کی مخلوق کے حقوق کا علم حاصل ہوتا ہے اور انسان ان کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں کہ ہم جنہیں لاعلمی کی وجہ سے نہیں کر پاتے۔ مثلاً مرد

بہت سارے حقوق اپنی بیویوں کے ادا نہیں کر پاتے، اس لئے کہ اُنھیں علم ہی نہیں ہے کہ بیوی کے حقوق کون کون سے ہیں؟ اسی طرح بیویاں بھی بہت سے ایسے کام نہیں کرتیں، ایسے رویے اختیار نہیں کرتیں، کیونکہ اُنھیں علم ہی نہیں ہے کہ شوہر کے حقوق کیا ہیں؟ ہم رشتے داروں کے ساتھ غصہ، ناراضگی اور قطع تعلق کرتے ہیں کیونکہ ہمیں علم ہی نہیں ہے کہ ہم پر اُن کے حقوق کیا ہیں اور انہیں ادا نہ کرنے کی سزا کیا ہے؟ ہم پوری زندگی ہزارہا کام ایسے کرتے رہتے ہیں جو گناہ ہوتے ہیں مگر ہمیں علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتنے بڑے گناہ ہیں۔ لہٰذا ہم انہیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ کتنے ہی ایسے امور کو علم نہ ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دیتے ہیں جبکہ ان کے کرنے پر اجرِ عظیم ہوتا ہے۔

ایک کمزور غریب کی مدد کر دینا، کسی بے علم کو علم دے دینا، کسی محتاج کی مدد کر دینا، کسی راستہ پوچھنے والے کے لیے رک کر اُسے راستہ بتا دینا، راستے میں پتھر پڑا دیکھا تو اٹھا کر ایک طرف رکھ دینا، اگر ایک چھوٹے سے فعل کا بھی ہمیں علم ہو کہ اِس کے اندر کتنا اجر چھپا ہوا ہے تو ہم چلتے چلتے کئی کئی عبادتیں کرتے چلے جائیں گے۔ آقائے دو جہاں ﷺ نے علم کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ہی علم کا ایک باب سیکھنا ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر قرار دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

بَابٌ مِنَ الْعِلْمِ نَتَعَلَّمُهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنْ أَلْفِ رَكْعَةٍ. (۱)

علم کا ایک باب سیکھ لینا ہمارے نزدیک ایک ہزار رکعت نماز نفل پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔

روایت میں إِلَيْنَا (ہمیں) سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سوچ یہ تھی۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اُنہیں یہ شعور کہاں سے آیا تھا؟ دراصل مربیِ انسانیت حضور نبی اکرم ﷺ نے ان کی تربیت ہی اس نہج پر فرمائی تھی۔ یہ دین کے باب میں اُن کی سوچ، فہم اور

(۱) ۱۔ خطيب بغدادي، تاريخ بغداد، ۹:۲۴۷
۲۔ عسقلاني، لسان الميزان، ۲:۱۴۵، رقم: ۶۴۷

سوجھ بوجھ تھی جو اُنہیں آقائے دوجہاں ﷺ نے عطا فرمائی تھی۔ وہ فہم یہ تھا کہ جو دین کا ایک باب اللہ کی رضا کے لیے، اپنے آپ کو اور دوسروں کو سنوارنے کی نیت سے سیکھے تو اس کا یہ عمل ایک ہزار رکعت نماز نفل پڑھنے سے بھی زیادہ افضل ہے۔

حضرت ربیع بیان کرتے ہیں:

سَمِعْتُ الشَّافِعِيَّ يَقُوْلُ: طَلَبُ الْعِلْمِ أَفْضَلُ مِنْ صَلَاةِ النَّافِلَةِ.(۱)

میں نے امام شافعی سے سنا ہے کہ فقط علم حاصل کرنا، نفلی نماز سے زیادہ افضل ہے۔

امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل؛ کل ائمہ رحمہم اللہ کا مشرب تھا کہ اگر رات کو امتِ محمدیہ کے لیے علم کا کام کر رہے ہوتے، احادیث جمع اور انہیں نقل کر رہے ہوتے، اُن سے فقہ اخذ کر کے کتاب مرتب فرما رہے ہوتے، مسائل اور اصول کا استنباط کر رہے ہوتے اور علم میں مشغول ہوتے تو علم کی مشغولیت کو چھوڑ کر نفل پڑھنے کے لیے مصلّٰی پر نہیں جاتے تھے۔ ہاں اگر دین کے علم، سنت و حدیث اور فقہ کا کام نہیں کر رہے تو ساری رات نوافل میں بسر کرتے تھے۔ اگر نفلی نماز اور علم دین، علم قرآن، علم حدیث اور علم فقہ کا ایک وقت میں ٹکراؤ ہو جاتا تو کل ائمہ اور اولیاء علم کو فوقیت دیتے تھے کیونکہ یہ افضل ہے۔ افضل کو چھوڑ کر کم فضیلت والی شے کی طرف جانا صاحبِ علم کا کام نہیں ہے بلکہ جاہلین کا شیوہ ہے۔

جس طرح فرض چھوڑ کر سنت کی طرف جائیں تو سنت قبول نہیں ہوتی۔ اسی طرح سنت کو چھوڑ کر نفل کی طرف جائیں تو وہ بھی قبولیت کا درجہ نہیں پاتے۔ ہم جب اعلیٰ کام کو چھوڑ کر ادنیٰ کرتے ہیں تو ادنیٰ بھی قبول نہیں ہوتا اور اعلیٰ تو ہم پہلے ہی چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ علم کی مجلس، علم کی تحقیق، علم کی تصنیف، علم پر عمل اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دین کی علمی و فکری خدمت نفلی عبادات سے کئی درجہ بہتر ہے۔

---

(۱) ۱۔ شافعي، المسند، ۱: ۲۴۹

۲۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۲: ۴۳۸، رقم: ۳۹۱۰

۳۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۹: ۱۱۹

۲۳۔ حصولِ علم کے ہمہ جہتی فضائل و اَثرات

حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنے فرامین میں حصول علم کی اہمیت، فضیلت اور اس کے ہمہ جہتی اثرات کو متعدد مواقع پر واضح فرمایا ہے۔

ذیل میں مذکور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں حضور نبی اکرم ﷺ نے حصولِ علم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے امت کو متعدد 'جوامع الکلم' عطا فرمائے ہیں۔

تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ، فَإِنَّ تَعَلُّمَهُ لِلّٰهِ خَشْيَةٌ، وَطَلَبَهُ عِبَادَةٌ، وَمُذَاكَرَتَهُ تَسْبِيْحٌ، وَالْبَحْثَ عَنْهُ جِهَادٌ، وَتَعْلِيْمَهُ لِمَنْ لَا يَعْلَمُهُ صَدَقَةٌ، وَبَذْلَهُ لِأَهْلِهِ قُرْبَةٌ، لِأَنَّهُ مَعَالِمُ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ. (۱)

علم حاصل کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے علم سیکھنا خوف اِلٰہی پیدا کرتا ہے، اور اس کا طلب کرنا عبادت ہے، اور اس کا مذاکرہ تسبیح ہے اور اس کی جستجو میں لگے رہنا جہاد ہے۔ بے علم کو علم سکھانا صدقہ ہے اور جو اس کا اہل ہو اس پر خرچ کرنا (اللہ کی) قربت کا باعث ہے، کیونکہ حلال وحرام کا فہم حاصل کرنے کے لیے علم نشانِ راہ ہے۔

آیئے! اس حدیث مبارکہ کا بالتفصیل مطالعہ کرتے ہیں:

---

(۱) ۱۔ ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۱۱۵، رقم: ۲۰۲
۲۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۲: ۴۱، رقم: ۲۲۳۷
۳۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۱: ۲۳۹
۴۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۱: ۵۲، رقم: ۱۰۷
۵۔ ابن رجب الحنبلي، جامع العلوم والحكم، ۱: ۲۳۵
۶۔ رازی، التفسير الكبير، ۲: ۱۷۵
۷۔ ثعالبی، الجواهر الحسان في تفسير القرآن، ۱: ۲۴۶

(۱) حصولِ علم، خشیتِ اِلٰہی کا سبب ہے

حدیث مبارک کے پہلے حصے میں فرمایا گیا ہے:

تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ، فَإِنَّ تَعَلُّمَهُ لِلّٰهِ خَشْيَةٌ.

علم حاصل کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے علم سیکھنا خوف اِلٰہی پیدا کرتا ہے۔

اس نکتہ پر تمام طلبہ، طالبات بھی توجہ دیں اور قوم کا ہر بچہ، ہر ماں، ہر بیٹی، ہر بہن، ہر بھائی اور ہر بزرگ جو علم سے اکتساب کرتا ہے، سب غور کریں کہ وہ کتنا بڑا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ علم سیکھنے کے عمل سے خوفِ الٰہی اور خشیتِ قلبی نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ سورۃ فاطر کی آیت نمبر 28 میں بھی بیان ہوا ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے اس سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ ہم اِسی باب کے گزشتہ صفحات میں یہ آیت مبارکہ quote کر چکے ہیں۔ لہٰذا جو علم حاصل کرتے ہیں اور عالم ہو جاتے ہیں، جتنا علم اُن کے دل میں اترتا چلا جاتا ہے اتنا ہی خوفِ الٰہی اُنھیں نصیب ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ علم اللہ کی خشیت اور خوف پیدا کرتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک فرمایا کرتے تھے:

كَيْفَ يَدَّعِي رَجُلٌ أَنَّهُ أَكْثَرُ عِلْمًا، وَهُوَ أَقَلُّ خَوْفًا وَزُهْدًا!(۱)

جو شخص خوف الٰہی اور دنیا سے بے رغبتی میں کمتر ہو وہ کیسے یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ زیادہ علم والا ہے۔ (اگر وہ علم میں زیادہ ہوتا تو خوف و زہد میں بھی زیادہ ہوتا۔)

(۲) حصولِ علم، عبادت و تسبیح ہے

۱۔ زیر بحث حدیث مبارک میں حضور نبی اکرم ﷺ نے حصولِ علم کو خشیتِ الٰہی کا سبب بیان کرنے کے بعد فرمایا:

---

(۱) شعراني، الطبقات الكبرى: ۹۰

وَطَلَبَهُ عِبَادَةٌ وَمُذَاكَرَتَهُ تَسْبِيْحٌ.

اِس علم کو حاصل کرنا، عبادت ہے اور اِس علم کا مذاکرہ کرنا (یعنی ایک دوسرے کو سنانا) تسبیح ہے۔

جیسے ہم تسبیح پکڑ کر اللہ، اللہ کرتے اور استغفار پڑھتے ہیں۔ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دیگر اسماءِ مبارکہ اور اوراد کی تسبیح کرتے ہیں۔ اسی طرح حصولِ علم میں بحث کرنا، تکرار کرنا ایک دوسرے سے سمجھنا اور سمجھانا بھی تسبیح وعبادت ہے۔

۲۔ حضرت سعید بن مسیّب بیان کرتے ہیں:

لَيْسَتْ عِبَادَةُ اللهِ بِالصَّوْمِ وَالصَّلَاةِ وَلٰكِنْ بِالْفِقْهِ فِي دِيْنِهٖ.(۱)

اللہ تعالیٰ کی عبادت (محض) نماز اور روزے سے نہیں ہوتی، بلکہ اصل عبادت دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنا ہے۔

۳۔ حضرت مکحول فرماتے ہیں:

مَا عَبِدَ اللهُ بِأَفْضَلَ مِنَ الْفِقْهِ.(۲)

فقہ (دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے) سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی کوئی عبادت نہیں ہے۔

۴۔ امام زہری فرماتے ہیں:

مَا عُبِدَ اللهُ بِمِثْلِ الْفِقْهِ.(۳)

---

(۱) ۱۔ خطيب البغدادي، الفقيه والمتفقه، ۱:۱۱۸
۲۔ ابن القيم، مفتاح دار السعادة، ۱:۱۱۸
(۲) ابن القيم، مفتاح دار السعادة، ۱: ۱۱۸۔
(۳) ۱۔ عبد الرزاق، المصنف، ۱۱: ۲۵۶، رقم: ۲۰۴۷۹
۲۔ ابن حيان، الثقات، ۷: ۱۴۱، رقم: ۹۳۷۲
۳۔ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۲۴

اللہ تعالیٰ کی عبادت جس طرح فقہ (دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے) سے ہوتی ہے کسی اور کام سے نہیں ہوتی۔

(۳) حصولِ علم میں جستجو، جہاد ہے

آپ ﷺ نے علم کی فضیلت اور حصولِ علم میں جستجو کرنے کو جہاد سے تعبیر فرمایا ہے۔ زیر بحث حدیث مبارک کے اگلے حصے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالْبَحْثُ عَنْهُ جِهَادٌ.

اور اس (علم) کی تلاش میں رہنا جہاد ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

مَنْ جَاءَ مَسْجِدِي هٰذَا لَمْ يَأْتِ إِلَّا لِخَيْرٍ يَتَعَلَّمُهُ أَوْ يُعَلِّمُهُ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الْمُجَاهِدِ فِي سَبِيْلِ اللهِ. وَمَنْ جَاءَ لِغَيْرِ ذٰلِکَ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ رَجُلٍ يَنْظُرُ إِلٰى مَتَاعِ غَيْرِهٖ. (۱)

جو میری اس مسجد میں صرف خیر (علم) سیکھنے یا سکھانے کیلئے آیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہد کی طرح ہے۔ جو اس کے علاوہ کسی اور (دنیوی) نیت سے آیا، وہ اس آدمی کی طرح ہے جو دوسرے کے مال کی طرف دیکھتا ہے۔

یعنی اِس علم کی جستجو میں لگے رہنا، نئی سے نئی چیز کی کھوج لگانا، زیادہ سے زیادہ سننا، سمجھنا اور ذہن نشین کرنا اور اِس کی کھوج میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہنا، یہ بھی ایک جہاد ہے۔ حصولِ علم کی طلب بھی ایسے ہی ہے گویا آپ میدانِ جنگ میں جہاد کے

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۴۱۸، رقم: ۹۴۰۹

۲۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، ۱: ۸۲، رقم: ۲۲۷

لیے گئے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ خشیت اور خوفِ الٰہی بھی اِسی علم میں ہے، عبادت بھی علم میں ہے، تسبیح بھی علم میں ہے اور جہاد بھی علم ہی میں ہے۔

(۴) فروغِ علم، صدقہ ہے

آپ ﷺ نے اس موقع پر صرف حصولِ علم ہی کی فضیلت کو واضح نہیں فرمایا بلکہ فروغِ علم کی بھی اہمیت وفضیلت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَتَعْلِيْمَهُ لِمَنْ لَا يَعْلَمُهُ صَدَقَةٌ.

اور جو شخص علم نہیں رکھتا اُس کو یہ علم پڑھانا صدقہ ہے۔

ایک اور حدیث مبارک میں ارشاد ہوتا ہے:

أَفْضَلُ الصَّدَقَةِ أَنْ يَتَعَلَّمَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ عِلْمًا ثُمَّ يُعَلِّمَهُ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ. (۱)

سب سے افضل صدقہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان شخص علم سیکھے اور پھر وہ اسے اپنے مسلمان بھائی کو بھی سکھائے۔

یعنی فروغِ علم گویا خیرات کرتا ہے۔ جس طرح ہم اپنی کمائی اللہ کی راہ میں صدقہ کرتے ہیں اور اجر وثواب ہمارا نصیب بنتا ہے اس طرح جب ہم کسی دوسرے کو علم کی دولت

---

(۱) ۱۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب ثواب معلم الناس الخير، ۱: ۸۹، رقم: ۲۴۳

۲۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۱: ۳۵۴، رقم: ۱۴۲۱

۳۔ مقدسي، فضائل الأعمال، ۱: ۱۳۲، رقم: ۵۷۹

۴۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۱: ۵۴، رقم: ۱۲۰

۵۔ مزي، تهذيب الكمال، ۱۹: ۵۹

۶۔ مناوي، فيض القدير، ۲: ۳۷

۷۔ كناني، مصباح الزجاجة، ۱: ۳۵

سے نوازتے ہیں تو ہمارا یہ عمل صدقہ وخیرات سے بھی بڑھ کر ہمیں اجر وثواب عطا کرتا ہے۔

(۵) فروغِ علم، حصولِ قربتِ اِلٰہیہ کا ذریعہ ہے

فروغِ علم جہاں صدقہ و خیرات ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی قربت کا باعث بھی ہے۔ آپ ﷺ نے مذکورہ حدیثِ مبارک کے ذیل میں ہی ارشاد فرمایا:

وَبَذْلَهُ لِأَهْلِهِ قُرْبَةٌ.

اور جو اِس کا اہل ہو اُس پر علم کو خرچ کرنا اللہ کی قربت کا ذریعہ ہے۔

اگر علم دینے والا لوگوں کو اہلِ علم بنا رہا ہے اور اُن کے دلوں کے برتن میں علم کی دولت ڈال رہا ہے تو گویا وہ ایک ایسا عمل کر رہا ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی قربت نصیب ہو رہی ہے۔ جیسے اولیاء اللہ کو قربت الٰہیہ نصیب ہوتی ہے، ایسے ہی فروغِ علم میں مصروف احباب روحانی مقامات پر فائز کر دیے جاتے ہیں۔

(۶) علم، حلال وحرام میں تمیز کرنا سکھاتا ہے

حضور نبی اکرم ﷺ نے حصولِ علم اور فروغِ علم کے فضائل بیان کرتے ہوئے آخر میں ان فضائل کا سبب ذکر فرمایا:

لِأَنَّهُ مَعَالِمُ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ.[1]

کیونکہ یہ علم حلال اور حرام میں فرق کرنے والی چیز ہے۔

یعنی علم، حلال اور حرام کے درمیان فرق واضح کرتا ہے۔ بندے کو معرفت عطا کرتا ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔

---

(۱) ۱۔ ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضله، ۱: ۵۵
۲۔ دیلمی، مسند الفردوس، ۲: ۴۱، رقم: ۲۲۳۷

۲۴۔ حصولِ علم کی برکت سے حوضِ کوثر تک رسائی ہوتی ہے

مذکورہ احادیث مبارکہ سے یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے وقت کی کوئی شرط نہیں ہے؛ خواہ ایک رات بیٹھے، چند لمحے، ایک ساعت، یا پھر ایک گھنٹہ بیٹھے، اُس پر بھی ان احادیث میں مذکور برکتوں اور سعادتوں کا اطلاق ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ ﷺ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَمِلَ بِهٖ حَشَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ آمِنًا وَيُرْزَقُ الْوُرُوْدَ عَلَى الْحَوْضِ. (۱)

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لیے علم حاصل کیا اور اُس پر عمل کیا، اُسے روزِ محشر (کی پریشانی سے) امان مل گئی اور اُسے حوضِ کوثر پر جامِ کوثر عطا کیا جائے گا۔

یعنی علم اس لیے حاصل کریں تا کہ دین کی سمجھ میں اضافہ ہو، اُس سے اللہ کا خوف و خشیت پیدا ہو، اللہ کی قربت نصیب ہو اور تقویٰ بڑھ سکے۔ یہ نیتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اگر ہم یہ نیت کریں کہ اس سے ہمارا علم بڑھے، نیک اعمال کریں، اللہ کا خوف بھی پیدا ہو اور تقویٰ کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں قربت اور رغبت بھی پیدا ہو تو اِس نیت کے ساتھ علم حاصل کرنے اور اُس پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت کے دن وہ بندہ قبر سے حالتِ امن میں اٹھایا جائے گا۔ قیامت کے دن اُسے پریشانی نہیں ہوگی۔ وہ وہاں ایسے سکون سے اٹھے گا جیسے تعطیلات میں کسی سیاحتی مقام پر گیا ہوا ہے۔ جبکہ لوگ قیامت کی ہولناکیوں کے ماحول میں پریشان حال اٹھیں گے۔ اِس علم کو حاصل کرنے کے باعث اللہ تعالیٰ اُسے آقا ﷺ کی بارگاہ میں حوضِ کوثر پر آنے کی توفیق عطا فرمائے گا، جہاں ساقیِ کوثر ﷺ اپنے دستِ مبارک سے کھڑے غلاموں کو آبِ کوثر کے جام بھر بھر کر عنایت کر رہے ہوں گے۔

---

(۱) ربیع، المسند، ۱: ۳۰، رقم: ۲۱

۲۵۔علم کا ایک باب سیکھنا سال بھر کی نفلی عبادات سے افضل ہے

قبل ازیں حدیث بیان کی جا چکی ہے کہ حصولِ علم ہزار رکعت نفل پڑھنے سے زیادہ افضل ہے مگر ایک موقع پر آپ ﷺ نے علم کے کسی ایک موضوع کو سیکھنے کی فضیلت اس سے بھی کئی درجہ بڑھ کر بیان فرمائی ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

بَابٌ مِنَ الْعِلْمِ يَحْفَظُهُ الرَّجُلُ لِصَلَاحِ نَفْسِهٖ وَصَلَاحِ مَنْ بَعْدَهٗ أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ حَوْلٍ. (۱)

جو شخص اپنی ذات کی اصلاح کے لئے یا اپنے بعد آنے والے لوگوں کی اصلاح کے لیے علم کا ایک باب یاد کرتا ہے، اس کا یہ عمل پورا ایک سال عبادت کرتے رہنے سے افضل ہے۔

جو شخص علم کا ایک باب اپنی ذات اور نفس کی اصلاح کے لیے اور اپنے بعد آنے والی نسلوں اور اولادوں کی اصلاح کی خاطر یاد کرتا، سیکھتا ہے کہ کوئی خیر کی بات آگے کسی کو سمجھا سکوں تاکہ اگلی نسلیں سنور جائیں، تو اس کا یہ عمل پورا ایک سال نفلی عبادت جاری رکھنے سے زیادہ افضل ہے۔

یہی وجہ کہ ایک موقع پر حضور نبی اکرم ﷺ نے فقہ دین کو عبادت کا بہترین حصہ قرار دیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) ۱۔ ابن جعد، المسند، ۱: ۱۶۳، رقم: ۱۰۴۷

۲۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۲: ۳۴۱

۳۔ ذهبي، سير أعلام النبلاء، ۵: ۲۷۵

خَيْرُ دِيْنِكُمُ السُّنَنُ وَخَيْرُ الْعِبَادَةِ الْفِقْهُ.(۱)

تمہارے دین میں بہترین حصہ (رسول اللہ ﷺ کی) سنتیں ہیں اور عبادت کا بہترین حصہ فقہ (دین کا علم) ہے۔

گویا دین کے علم جیسا کوئی حصہ عبادت میں نہیں اور آقا ﷺ کی سنت جیسا کوئی حصہ دین اسلام میں نہیں۔

۲۶۔ علم میں اضافے کی دعا اور جستجو کرنا سنتِ اَنبیاء علیہم السلام ہے

علم کی فضیلت و اہمیت بایں طور پر بھی واضح ہوتی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم میں اضافے کی دعا کرنے کی باقاعدہ تلقین کی گئی۔ ارشاد فرمایا:

قُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا○(۲)

آپ (رب کے حضور یہ) عرض کیا کریں کہ اے میرے رب! مجھے علم میں اور بڑھا دے○

خالقِ دوجہاں کی آقائے دو جہاں ﷺ پر بے حد و بے شمار نعمتیں ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے کسی ایک نعمت کا نام لے کر یہ نہیں فرمایا کہ مجھ سے اِس میں اور اضافہ طلب کریں۔ اگر مالکِ لوح وقلم نے ایسا فرمایا ہے تو صرف اور صرف علم کے لیے فرمایا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو علم اتنا محبوب ہے کہ خود حضور نبی اکرم ﷺ کو یہ دعا سکھائی ہے کہ مجھ سے علم میں اضافہ طلب کریں۔ جب نبیِ مکرم ﷺ کو یہ سکھایا جا رہا ہے کہ ہمہ وقت اپنی شان، مرتبے اور عظمت کے مطابق علم میں اضافہ طلب کرتے رہیے تو پھر اس ضمن میں امت کے لئے علم میں اضافہ کی دعا کس قدر ضروری اور اہمیت کی حامل ہے، اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ہر روز، ہر ہفتے اور

(۱) ۱۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۹: ۱۰۷، رقم: ۹۲۶۴
۲۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۲: ۱۷۵، رقم: ۲۸۷۶
(۲) طٰه، ۲۰: ۱۱۴

ہر مہینے اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے سفر کرتے رہیں گے اور علم بڑھانے کی کاوش کرتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ کو ہمارا یہ عمل کتنا محبوب ہوگا!

۲۷۔ حصولِ علم کے لیے سفر کرنا سنتِ انبیاء علیہم السلام ہے

درحقیقت علم میں اضافہ کے لئے جستجو کرنا سنتِ انبیاء کرام علیہم السلام ہے۔ حصولِ علم کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ عظام رضی اللہ عنہم اور اکابرینِ امت دور دراز سفر کیا کرتے تھے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کا واقعہ بھی دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ ہمارے ایک بندے خضر کا مقام یہ ہے کہ:

عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًاo[1]

ہم نے اسے علمِ لدنی (یعنی اَسرار و معارف کا اِلہامی علم) سکھایا تھاo

اُس کے پاس میرا عطا کردہ علم لدنی ہے۔ آپ اُس کے پاس جائیں اور وہ علم سیکھیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا درجہ اور رتبہ حضرت خضر علیہ السلام سے زیادہ بلند ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام تو مذہب مختار اور جمہور کے نزدیک اللہ کے نبی نہیں بلکہ ولی ہیں۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ صرف نبی بلکہ رسول بھی ہیں۔ وہ صرف کلیم اللہ اور رسول ہی نہیں ہیں بلکہ اولو العزم اور بلند مرتبت پانچ رسولوں میں سے ایک ہیں۔ وہ صاحبِ کتاب اور صاحبِ امت بھی ہیں اور قرآن مجید میں سب سے زیادہ مرتبہ ان کا نام لے کر ذکر کیا گیا ہے۔ ان حقائق سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کا درجہ کس قدر بلند ہے۔ اس کے باوجود اُن کو فرمایا کہ علم لدنی میں خضر آپ سے آگے ہے۔ آپ اُن سے وہ علم حاصل کرنے کے لیے جائیں۔

سورۃ الکہف کی آیت نمبر 60 سے 66 اور مزید آگے ایک طویل مضمون ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع بن نون کو ساتھ لیا اور حضرت خضر علیہ السلام کی طرف چل نکلے۔ وہ جب وہاں پہنچے تو قرآن مجید بیان کرتا ہے:

---

(۱) الکہف، ۱۸: ۶۵

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا○[1]

اس سے موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ اس (شرط) پر رہ سکتا ہوں کہ آپ مجھے (بھی) اس علم میں سے کچھ سکھائیں گے جو آپ کو بغرضِ ارشاد سکھایا گیا ہے○

یعنی اے خضر! میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، آپ جہاں بھی جائیں مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس دوران وہ خاص علم جو اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ اور خزانہ خاص سے آپ کو نوازا ہے، اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیں۔

قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اولو العزم رسول ہو کر بھی حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جا رہے ہیں اور اُن کی رفاقت کے لیے طویل سفر کی مشقتیں بھی اٹھا رہے ہیں۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام جتنا عالم تو کوئی نہیں ہے! وہ تو اللہ کے برگزیدہ رسول اور صاحبِ کتاب نبی ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے خود کلام فرمایا:

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا○[2]

اور اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) سے (بلاواسطہ) گفتگو (بھی) فرمائی○

حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام سے علم سکھانے کا کہنا اِس امر کی طرف اشارہ ہے کہ علم سیکھنے کا عمل زندگی کے کسی موڑ اور کسی مرحلے پر بھی ختم نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ہونا چاہیے۔ علم سیکھنے کی ضرورت ہر وقت ہر کسی کو رہتی ہے۔ خیر کا یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہوسکتا۔

۲۸۔ حصولِ علم کے لیے ائمہ کا سفر

۱۔ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین حصولِ علم کے لئے اور احادیث کے فہم و روایت کے لئے دور دراز کا سفر کیا کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن بریدہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم

(۱) الکہف، ۱۸: ۶۶

(۲) النساء، ۴: ۱۶۴

ﷺ کے ایک صحابی، حضرت فضالہ بن عبید ؓ کی طرف روانہ ہوئے جو مصر میں تھے۔ پھر جب ان کے ہاں پہنچ گئے تو صحابی نے کہا:

أَمَا إِنِّي لَمْ آتِکَ زَائِرًا وَلَکِنِّي سَمِعْتُ أَنَا وَأَنْتَ حَدِيثًا مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ. رَجَوْتُ أَنْ يَکُونَ عِنْدَکَ مِنْهُ عِلْمٌ.

میں (صرف) آپ کی زیارت کے لیے نہیں آیا بلکہ میں نے اور آپ نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث سنی تھی اور مجھے امید ہے کہ آپ کو میری نسبت بہتر یاد ہوگی۔

حضرت فضالہ بن عبید ؓ نے کہا: وہ کون سی ہے؟ اُس صحابی ؓ نے وہ بیان کردی اور بیان کرنے کے بعد کہا:

فَمَا لِی أَرَاکَ شَعِثًا وَأَنْتَ أَمِيرُ الْأَرْضِ.

میں آپ کے بال بکھرے ہوئے دیکھتا ہوں حالانکہ آپ اس سرزمین کے حاکم ہیں!

حضرت فضالہ بن عبید ؓ نے کہا:

إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ کَانَ يَنْهَانَا عَنْ کَثِيرٍ مِنَ الْإِرْفَاهِ. قَالَ: فَمَا لِي لَا أَرَى عَلَيْکَ حِذَاءً.

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں زیادہ آرائش اور زیب و زینت سے منع فرمایا ہے لیکن کیا بات ہے کہ میں آپ کو ننگے پیر دیکھ رہا ہوں؟

صحابی ؓ نے کہا:

کَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْمُرُنَا أَنْ نَحْتَفِيَ أَحْيَانًا. (۱)

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۶: ۲۲، رقم: ۲۴۰۱۵

۲۔ أبو داود، السنن، کتاب الترجل، ۴: ۷۵، رقم: ۴۱۶۰

۳۔ دارمي، السنن، المقدمة، باب الرحلة في طلب العلم واحتمال العناء فيه، ۱: ۱۵۱، رقم: ۵۷۱

حضور نبی اکرم ﷺ ہمیں حکم فرمایا کرتے تھے کہ کبھی ننگے پیر بھی رہا کریں۔

۲۔ ابن جابر بیان کرتے ہیں: میں نے حضرت بسر بن عبید اللہ حضرمی شامی کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے:

إِنْ كُنْتُ لَأَرْكَبُ إِلَى الْمِصْرِ مِنَ الْأَمْصَارِ فِي الْحَدِيثِ الْوَاحِدِ لِأَسْمَعَهُ.(۱)

میں فقط ایک حدیث کو سننے کی خاطر ایک شہر سے دوسرے شہر تک سفر کرتا رہا ہوں۔

۳۔ امام مالک فرماتے ہیں:

بَلَغَنِي أَنَّ سَعِيْدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ كَانَ يَقُولُ: إِنْ كُنْتُ لَأَسِيرُ اللَّيَالِيَ وَالْأَيَّامَ فِي طَلَبِ الْحَدِيْثِ الْوَاحِدِ.(۲)

..... ۴۔ بيهقي، شعب الإيمان،۵: ۲۲۷، رقم: ۶۴۶۸

۵۔ خطيب البغدادي، الرحلة في طلب الحديث: ۱۲۴، رقم: ۳۹۔

(۱) ۱۔ دارمي في السنن، المقدمة، باب الرحلة في طلب العلم واحتمال العناء فيه، ۱: ۱۴۹، رقم: ۵۶۳

۲۔ ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۱۷۹، رقم: ۳۷۵

۳۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۱۰: ۱۶۵

۴۔ خطيب بغدادی، الرحلة فی طلب الحديث، ۱: ۱۴۷، رقم: ۵۷

(۲) ۱۔ بيهقي في المدخل إلى السنن الكبرى،: ۲۷۷، ۲۷۸، رقم: ۴۰۱

۲۔ ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۹۴

۳۔ ابن سعد، الطبقات الكبرى،۲: ۳۸۱

۴۔ خطيب بغدادی، الكفاية: ۴۰۲

۵۔ خطيب بغدادی، الرحلة في طلب العلم: ۱۲۷

۶۔ ذهبي، تذكرة الحفاظ، ۱: ۵۵

۷۔ ذهبي، سير أعلام النبلاء، ۴: ۲۲۲

مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت سعید بن مسیّب فرمایا کرتے تھے: میں ایک حدیث کی تلاش میں کئی کئی دن اور راتیں سفر کرتا تھا۔

۴۔ حضرت ابو عثمان النہدی ﷺ بہت بڑے زاہد، عالم اور کبار تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے سن ایک سو ہجری میں وفات پائی تھی۔ وہ بیان کرتے ہیں:

بَلَغَنِي عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ، أَنَّهُ قَالَ: بَلَغَنِي أَنَّ اللهَ يُعْطِي عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ بِالْحَسَنَةِ الْوَاحِدَةِ أَلْفِ أَلْفِ حَسَنَةٍ. (۱)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ کی طرف سے مجھے یہ روایت پہنچی کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ ایک نیکی کرنے والے کو دس لاکھ نیکیوں کے برابر اُس کا اجر دے گا۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں یہ حدیث سُن کر حیران ہوگیا اور اِسے سمجھنے کے لئے حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے ملنا چاہا۔ میں نے معلوم کیا کہ حضرت ابو ہریرہ ﷺ کہاں ہیں؟ پتہ چلا وہ حج پر مکہ معظّمہ گئے ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

فَحَجَجْتُ ذَالِكَ الْعَامَ وَلَمْ أَكُنْ أُرِيْدُ الْحَجَّ إِلَّا لِلِقَائِهِ فِي هٰذَا الْحَدِيْثِ. (۲)

میں اُس سال حج کے لیے گیا حالانکہ میرا حج کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ مگر حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے یہ حدیث سماعت کرنے گیا۔

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۵۲۱، رقم: ۱۰۷۷۰
۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۵۲۱، رقم: ۱۰۷۷۰
۳۔ ابن أبی شیبة، المصنف، ۷: ۱۲۷، رقم: ۳۴۷۰۳
۴۔ بیهقی، الزهد الکبیر: ۲۷۸، رقم: ۷۱۳
۵۔ خطیب بغدادی، الرحلة فی طلب الحدیث، ۱: ۱۳۲-۱۳۴، رقم: ۴۶

(۲) خطیب بغدادی، الرحلة فی طلب الحدیث، ۱: ۱۳۲-۱۳۴، رقم: ۴۶

صرف ایک حدیث نبوی کو حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے سننے اور سمجھنے کی وجہ سے حج کرنے گیا۔ یعنی حج کی نیت سے نہیں بلکہ حدیث اور علم کے حصول کی نیت سے گیا۔ پس ان کے اس عمل سے طلبِ علم کی نیت سے سفر کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔[1]

(۱) مضمونِ حدیث کی وضاحت

مذکورہ حدیث سے جہاں ایک جلیل القدر تابعی کا حصولِ علم کے لئے سفر کرنا ثابت ہوتا ہے وہاں مضمونِ حدیث میں بھی ایک خاص علمی وفکری اور روحانی نکتہ موجود ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے حضرت ابو عثمان النہدی کو جو جواب دیا اس کے فہم کے لئے تمہیداً کچھ نکات ذیل میں درج کئے جارہے ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ جیسے جیسے نیت خالص سے خالص تر، روشن سے روشن تر، بلند سے بلند ترین اور اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترین ہوتی چلی جاتی ہے؛ ویسے ویسے اس کا اجر بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر کے بڑھنے کا کوئی حساب نہیں ہے، البتہ قرآن مجید میں کم سے کم کا پیمانہ یہ ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا.[2]

جو کوئی ایک نیکی لائے گا تو اس کے لیے (بطورِ اجر) اس جیسی دس نیکیاں ہیں۔

قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ اور مذکورہ حدیث کا آپس میں بظاہر فرق نظر آتا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا بلکہ اس آیت کو اس طرح سمجھنے میں ہمیں غلطی ہوئی ہے۔ آیت کے الفاظ پر غور کریں تو سمجھ آجائے گی کہ ہم نے اس کا مفہوم سمجھنے میں کہاں غلطی کی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

(۱) اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے راقم کی تالیف کردہ اَربعین ''علم حدیث کے لیے سفر کرنے کی فضیلت (التحديث فی الرحلة لطلب الحديث)'' ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) الأنعام، ۶: ۱۶۰

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا.

جو کوئی ایک نیکی لائے گا تو اس کے لیے (بطورِ اجر) اس جیسی دس نیکیاں ہیں۔

یعنی جو نیکی اُس شخص نے کی ہے اُس نیکی کی دس مثل اُسے اجر ملے گا۔ ہر شخص کی جو نیکی ہے، دیکھنے میں تو اُس نیکی کا عمل ایک جیسا ہے، مگر اس نیکی کی نیت کی وجہ سے، اُس عمل کی کیفیت، ماہیت، حقیقت اور درجہ ہر ایک سے جدا ہو رہا ہے۔ ایک نیت ہی سب کو بدل رہی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہزار لوگوں نے دو دو نفل پڑھے، لیکن ہر ایک کی نیت کا ستھرا پن دوسرے سے جدا ہے۔ ایک معمول کے لحاظ سے نفل پڑھ رہا ہے، اُس نے ارادہ تو اللہ کی عبادت کا کیا، لیکن اس کا دھیان دس جگہوں سے گھوم بھی آیا ہے اور ساتھ میں وہ نیکی بھی کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے باوجود اُس کی نیکی قبول بھی کر لی۔

دوسرے شخص نے اللہ اکبر کہہ کر اپنی نیت باندھی اور سلام پھیرنے تک اپنے ذہن کو کہیں بھٹکنے نہیں دیا۔ اب اس کی نیکی اور اُس پہلے شخص کی نیکی اللہ تعالیٰ کے ہاں نماز کے قبول ہونے کی حد تک تو قبول ہوگئی، مگر دونوں کا درجہ ایک جیسا نہیں رہا۔ اِس نے بھی نیکی کی مگر نیکی میں اس کا دل و دماغ دس جگہوں پر بیوی بچوں اور مختلف لڑائی جھگڑوں میں گھومتا رہا جبکہ دوسرے شخص کا دل و دماغ مکہ معظّمہ اور مدینہ طیبہ کی زیارات میں مشغول رہا۔

پھر تیسرے شخص نے بھی وہی دو نفل پڑھے۔ اُس کی نیت خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تھا۔ اس دوران اُس کا دھیان کعبے سے بالکل نہیں ہٹا۔

ایک چوتھے شخص نے بھی دو نفل پڑھے اور اس دوران اپنا دھیان کعبہ سے صاحبِ کعبہ کی طرف کر لیا۔ اُس کا دھیان اللہ کی طرف چلا گیا، مگر یک سوئی سے جم نہیں سکا۔

ایک اور شخص نے نفل پڑھے اور وہ اس دوران اللہ تعالیٰ کے نور کو تکتا رہا۔

پھر ایک اور نے نفل پڑھے تو اُس کا دھیان عرشِ معلیٰ تک جا پہنچا۔

ایک اور کا دھیان لامکاں تک جا پہنچا۔

پھر ایک اور کا دھیان بارگاہِ صمدیت میں جا پہنچا۔

اب وہی دونفل شیخ اکبر نے بھی پڑھے اور وہ دونفل ہم نے بھی پڑھے۔ وہ دونفل حضورغوث الاعظم نے بھی ادا کیے اور وہ حضرت داتا گنج بخش نے بھی پڑھے۔ وہی حضرت جنید بغدادی نے بھی ادا کیے۔ یہ اولیائے کاملین اپنے دونفلوں میں کہاں تک جا پہنچے۔ اُس کی حقیقت، ماہیت کچھ اور ہوگئی جبکہ ہمارے دونفلوں کی ماہیت کچھ اور ہی رہی۔

قرآن مجید کہہ رہا ہے کہ ہر شخص جو نیکی کرتا ہے اُس کو اُس نیکی کے مطابق دس گنا اجر ملتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی نے جو نیکی کی یا عمل کیا اس کا کیا درجہ ہوگا اور پھر اس اعلیٰ مقام و درجہ کے مطابق کم از کم دس گنا اجر ایک نیکی پر اُنہیں میسر آیا۔

اِس مثال کو آپ ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں نیکیوں پر پھیلا دیں۔ ایک شخص نے کسی کی مدد کی مگر اسے یہ عمل ساری زندگی یاد رہا۔ اس کا یہ عمل بھی نیکی ہے، اللہ اُسے دس گنا اجر دے گا۔ اُس نے کسی غریب پر دس روپے خرچ کیے تھے تو سو روپے کا اجر ہوا، سو خرچ کیے تو ہزار کا اجر ہوگا۔ ہزار خرچ کیے تو دس ہزار کا اجر ہوگیا، مگر یہ نیکی اُسے یاد رہی۔ جب اس پر مشکل وقت آیا تو اُس کے ذہن میں آیا کہ میں نے بھی اِس کی مدد کی تھی، مگر اِس نے تو مشکل میں مجھے بھول کر پوچھا بھی نہیں۔ اب اُس کی یہ نیکی اپنے آپ آئینے میں آ گئی۔

ایک نیکی ایسی ہے کہ اُس نے کی اور وہ بھول گیا۔ اپنا وقت آیا تو اسے پتہ ہے کہ میں نے فلاں کی مدد کی تھی مگر وہ اسے اپنے دھیان میں ہی نہیں لاتا۔ یہ نیکی کا دوسرا درجہ ہے۔

تیسرا درجہ یہ بھی ہے کہ وہ سرے سے ہی بھول گیا کہ میں نے کبھی اِس کے ساتھ نیکی بھی کی تھی یا نہیں، یعنی اس کا مقصد اس پر احسان جتلانا نہیں بلکہ خالصتاً اللہ کی رضا تھا۔ گویا کوئی نیکی اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اور کوئی کسی اور نیت سے کرتا ہے مگر نیت ہر نیکی کے عمل کا درجہ بڑھاتی یا کم کرتی چلی جاتی ہے۔

(۲) اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے

اِس لیے حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ. (۱)

مومن کی نیت اُس کے عمل سے بہتر ہوتی ہے۔

ایک اور مقام پر آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ. (۲)

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔

گویا نیت عمل کو نیچے بھی گرا دیتی ہے اور اسے اوپر بھی اٹھا دیتی ہے۔ نیت عمل کو آسمان پر بھی پہنچا دیتی ہے اور وہ عمل کو عرش اور ماورائے عرش تک بھی پہنچا دیتی ہے۔ حتیٰ کہ

---

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۶:۱۸۵ رقم:۵۹۴۲

۲۔ هندی، کنز العمال، ۳:۱۶۹، ۱۷۱، رقم:۷۲۳۶، ۷۲۳۷، ۷۲۷۰، ۷۲۷۱

۳۔ رازی، التفسیر الکبیر، ۴:۶، ۱۱:۸، ۱۲:۹۰

۴۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۸:۲۹۳

(۲) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الإیمان، باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول الله ﷺ، ۱:۳، رقم: ۱

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الإیمان، باب ما جاء أنّ الأعمال بِالنِيّةِ والحِسْبَةِ وَلِكُلِّ امْرِىءٍ مَا نَوَى، ۱:۳۰، رقم: ۵۴

۳۔ مسلم، الصحیح، کتاب الإمارة، باب قوله: إنما الأعمال بالنية وأنه يدخل فيه الغزو وغيره من الأعمال، ۳:۱۵۱۵، رقم:۱۹۰۷

۴۔ أبو داود، السنن، کتاب الطلاق، باب فيها عني به الطلاق والنيات، ۲:۳۶۲، رقم: ۲۲۰۱

نیت اُسی عمل کو اللہ کی بارگاہ میں بھی پہنچا دیتی ہے۔ اِس لیے آقا ﷺ نے فرمایا تھا:

لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِي، فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا، مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيْفَهُ. (۱)

میرے صحابہ کو برا مت کہو۔ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کردے تو پھر بھی وہ ان کے سیر بھر یا اس سے آدھے کے برابر نہیں پہنچ سکتا۔

یعنی ان کی نیت اتنی خالص ہوتی ہے کہ کوئی اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح ایک ننھے سے ایٹم سے ہولناک بم بن جاتا ہے۔ پتھر کا بھی اتنا ہی ذرہ ہوتا ہے مگر اُس سے کچھ نہیں بنتا۔ لوہے کا بھی ایک ذرہ ہوتا ہے مگر اُس سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ ایٹم اُس لوہے یا پتھر کے ٹکڑے سے کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے مگر وہ خالص ہوتے ہوتے، اُس کی تجرید ہوتے ہوتے، تخلیص ہوتے ہوتے، اُس کا صفا، تزکیہ ہوتے ہوتے اس مرتبے پر جا پہنچتا ہے کہ وہ بم بن کر دنیا کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

اِسی طرح نیکی اگر اتنی خالص اور طاقت ور ہوتی چلی جائے تو سورج کی طرح روشن

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب فضائل الصحابة، باب قول النبی ﷺ: لو کنت متخذاً خلیلا، ۳:۱۳۴۳، رقم:۳۴۷۰

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب فضائل الصحابة، باب تحریم سب الصحابة، ۴: ۱۹۶۷، رقم:۲۵۴۰

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳:۱۱، رقم:۱۱۰۹۴، ۱۱۵۳۴، ۱۱۵۳۵، ۱۱۶۲۶

۴۔ أبو داود، السنن، کتاب السنة، باب في النهی عن سب أصحاب رسول اللہ ﷺ، ۴:۲۱۴، رقم:۴۶۵۸

۵۔ ترمذی، السنن، کتاب المناقب، باب: (۵۹)، ۵:۶۹۵، رقم:۳۸۶۱

۶۔ ابن ماجه، السنن، باب فضائل أصحاب رسول اللہ ﷺ، فضل أهل بدر، ۱:۵۷، رقم:۱۶۱

ہو جاتی ہے۔ کئی ایک کی نیکی بادلوں کی طرح رہتی ہے۔ کئی ایک کی نیکی زمین کی طرح رہتی ہے، کئی ایک کی نیکی اندھیری سی رہتی ہے۔ نیت کسی کے عمل کو تاریک رات بنا دیتی ہے، کسی کی نیت اُس کے عمل کو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن کر دیتی ہے، کسی کی نیت اُسے سورج کی طرح روشن کر دیتی ہے اور کسی کی نیت اس نیکی کو عرش کے ساتھ ملا دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت مبارکہ میں فرمایا کہ جو شخص بھی ایک نیکی کرے گا اُسے اُس کی نیکی کے حساب سے دس گنا دیا جائے گا۔ اب کسی کو تو واقعی دس گنا ملتا ہے، کسی کی نیکی ہی اتنی اعلیٰ بن گئی تھی کہ نیت نے اسے بہت اونچا کر دیا تھا۔ لہٰذا جب اس بلند مقام کی حامل نیکی کو کم از کم دس گنا زیادہ اجر ملا تو وہ عرش تک جا پہنچتی ہے۔ اللہ والوں، صاحبانِ تقویٰ، صاحبانِ ولایت، صاحبانِ قربت، صاحبانِ رضا، کاشفان قلب اور مردانِ حق جو صرف اپنے رب کی رضا کے لیے جیتے ہیں وہ نہ جنت کے لیے اور نہ ہی کسی اور چیز کے لیے جیتے ہیں، اُن کی نیکی کئی درجے اوپر چلی جاتی ہے۔ اُن کی نیکی دیکھنے میں ایک تھی، مثلاً دو رکعت پڑھی مگر وہ بیس ہزار کے برابر تھی اور اُسے جب دس گنا اجر ملا تو وہ دو لاکھ بن گئی۔

کسی اللہ والے کے نفل دو ہی تھے۔ اُس کی نیت نے اُسے اتنا اونچا اور بلند سے بلند تر کر دیا کہ جب اسے دس سے ضرب ہوئی تو آیت وہی رہی، اصول وہی رہا، ضرب دینے کا فارمولہ بھی وہی رہا مگر اُس کی نیت کی طاقت نے اُس دو رکعت نفل کے خالص عمل کو دو لاکھ کے برابر کر دیا اور جب دس گنا ملا تو اُس کا اجر بیس لاکھ کا ہوگیا۔ کسی کی نیکی نیت میں کمزوری کے باعث ایک ہی رہی اور کسی کا اجر دس گنا ہوگیا اور کسی کا بے حد و بے حساب ہوگیا۔

اِس طرح مذکورہ آیت کریمہ اور مذکورہ حدیث نبوی میں تطبیق ہو جاتی ہے کہ نیت کا اخلاص دس گنا سے لے کر بیس گنا تک اجر عطا کر دیتا ہے۔

(۳) ایک نیکی کا اجر 20 لاکھ کے برابر، مگر کیسے؟

حدیثِ مبارک کی اس وضاحت کے بعد اب آیئے حضرت ابو عثمان النہدی کی

روایت کا مطالعہ کرتے ہیں کہ جب اُنہوں نے حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے ملاقات کی تو اُن سے کیا کہا اور اُنہوں نے اس حدیث مبارک کی کیسے وضاحت فرمائی؟ وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہ ﷺ کے پاس پہنچا اور ان سے کہا: اے ابو ہریرہ! آپ کی وساطت سے مجھ تک ایک حدیث پہنچی ہے، میں چاہتا تھا کہ آپ سے براہِ راست سنوں اور سمجھوں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ دس لاکھ نیکیوں کا اجر ایک نیکی کے عوض کیسے بن گیا؟ میں یہ سمجھنے اور حدیث لینے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔

فَحَجَجْتُ ذَالِکَ الْعَامَ وَلَمْ أَکُنْ أُرِیْدُ الْحَجَّ إِلَّا لِلِقَائِهٖ فِي هٰذَا الْحَدِیْثِ. (۱)

میں اُس سال حج کے لیے گیا حالانکہ میرا حج کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ مگر حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے یہ حدیث سماعت کرنے گیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے جواب دیا کہ اے ابو عثمان النہدی! تم نے جو سنا ہے وہ تھوڑا سنا ہے، میں اِس سے بھی عجیب تر بات تمہیں بتاتا ہوں۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ایک نیکی کے عوض اللہ دس لاکھ نیکیوں کا اجر دیتا ہے، یہ بتانے والے کو مغالطہ ہوا ہے۔ اچھا کیا جو میرے پاس آ گئے۔ میں نے کہا تھا:

إِنَّ اللهَ لَیُضَاعِفُ الْحَسَنَةَ أَلْفَي أَلْفِ حَسَنَةٍ. (۲)

یقیناً اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا اجر بڑھا کر بیس لاکھ کے برابر کر دیتا ہے۔

ایک نیکی کا اجر بیس لاکھ کیسے بنتا ہے؟ اس کی مزید وضاحت کے لئے حضرت ابو ہریرہ

---

(۱) ۱۔ خطیب بغدادی، الرحلة فی طلب الحدیث، ۱: ۱۳۲-۱۳۴، رقم: ۴۶
۲۔ أحمد بن حنبل، الزہد: ۱۷۳

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۲۹۶، ۵۲۱، رقم: ۷۹۳۲، ۱۰۷۷۰
۲۔ خطیب بغدادی، الرحلة فی طلب الحدیث: ۱۳۲-۱۳۴، رقم: ۴۶

ﷺ نے قرآن مجید سے اس کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً. (۱)

کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے پھر وہ اس کے لیے اسے کئی گنا بڑھا دے گا۔

حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں نیکی کا اجر بڑھانے میں اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی بے حد و حساب اور کثیر اجر دیتا ہے، لامحدود بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بارے میں فرمایا:

فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ○ (۲)

سو آخرت (کے مقابلہ) میں دنیوی زندگی کا ساز و سامان کچھ بھی نہیں مگر بہت ہی کم (حیثیت رکھتا ہے)○

جب آخرت میں پہنچیں گے تو دنیا چھوٹی اور قلیل شے نظر آئے گی۔ اللہ تعالیٰ پوری دنیا کو آخرت کے مقابلے میں قلیل چیز فرما رہا ہے کہ آخرت کے مقابلے میں ساری دنیا قلیل ہے اور نیکی کا اجر اللہ تعالیٰ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً بے حساب و کثیر فرما رہا ہے۔ اِس بات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نیکی کا اجر بڑھاتے بڑھاتے اللہ تعالیٰ نے جب اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً کہا تو اُس سے مراد کتنا بڑھانا ہوگا۔

(۴) اجر کے درجات

قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ط وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ○ (۳)

---

(۱) البقرۃ، ۲: ۲۴۵

(۲) التوبۃ، ۹:۳۸

(۳) البقرۃ، ۲: ۲۶۱

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال (اس) دانے کی سی ہے جس سے سات بالیاں اُگیں (اور پھر) ہر بالی میں سو دانے ہوں (یعنی سات سو گنا اجر پاتے ہیں) اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے (اس سے بھی) اضافہ فرما دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا خوب جاننے والا ہےo

اس آیت مبارکہ میں نیکیوں پر ملنے والے مختلف درجات کا تذکرہ ہے:

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ میں ایک نیکی کا اجر سات سو گنا ہونا بیان کیا گیا۔ یعنی کسی کو دس گنا، کسی کو ستر گنا، کسی کو سو گنا اجر ملا مگر کسی کو اس آیت کے مطابق سات سو گنا اَجر ملا۔ بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ فرمایا: وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ کہ پھر ایسے بھی ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ جتنا چاہتا ہے اضافہ فرما دیتا ہے۔ اِس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ کیوں؟ تیسرے درجے میں اس کا بھی جواب دے دیا کہ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ، یعنی اللہ کی وسعت کا تصور بھی کرلیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ میں سات سو گنا اور پھر اس سے زائد اور آخر میں اپنی وسعت کا تذکرہ بھی کر دیا تو آیت کریمہ کے اِن وعدوں کو جمع کریں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک نیکی کا عوض کس طرح بیس لاکھ تک پہنچتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری کہ اللہ تعالیٰ سات سو گنا عطا کرتا ہے تو آقا ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا:

رَبِّ زِدْ أُمَّتِي.[1]

میرے مولا! میری امت کے لیے اجر اور بڑھا دے۔

اِس پر دوسری آیت اتری جس میں فرمایا:

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً.[2]

---

(۱) طبرانی، المعجم الأوسط، ۶: ۱۰، رقم ۵۶۴۵

(۲) البقرة، ۲: ۲۴۵

پھر وہ اس کے لیے اسے کئی گنا بڑھا دے گا۔

آقا ﷺ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:

رَبِّ زِدْ أُمَّتِي.

میرے مولا! میری امت کے لیے اجر اور بڑھا دے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الزمر کی آیت نمبر دس اتاری اور فرمایا:

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ○

بلاشبہ صبر کرنے والوں کو اُن کا اجر بے حساب انداز سے پورا کیا جائے گا○

یعنی میرے محبوب! اگر آپ امت کے لئے مزید اجر کی دعا کر رہے ہیں تو سن لیں کہ جو صبر کریں گے، نیکی کریں گے، اخلاص پر رہیں گے، اللہ کی رضا کے لیے صبر کریں گے، تقویٰ اختیار کریں گے اور عمل کو جاری رکھیں گے، استقامت اختیار کریں گے تو ان کو پھر میں اتنا اجر دوں گا کہ وہ لکھنے پڑھنے اور ضرب تقسیم میں نہیں آئے گا۔ گویا اب اجر دس گنا بھی نہ رہا، سو گنا بھی نہ رہا، سات سو گنا بھی نہ رہا، ہزار گنا بھی نہ رہا، دس لاکھ گنا بھی نہ رہا اور بیس لاکھ گنا بھی نہ رہا بلکہ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ کہ حساب کتاب ہی میں نہیں آئے گا۔ لوگوں کے قلم رک جائیں گے، حساب رک جائیں گے، علمِ ریاضی ختم ہو جائے گا مگر اجر نہ رک پائے گا۔

یہ اضافہ کیسے ہوگا؟ اس کے لئے واضح کر دیا کہ نیت جتنی خالص ہوتی چلی جائے گی اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ کی اتنی ہی نوید ملتی رہے گی۔

(۵) خلوصِ نیت کو اَجر کی آرزو سے آلودہ نہ کیجیے!

ہماری خرابی یہ ہے کہ ہم نیکیاں بہت کرتے ہیں اور ان کے اجر پر بھی ہماری نظریں جمی ہوتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دین کی خدمت کر رہے ہیں، مشن کی خدمت کر رہے ہیں مگر جب امت کی خدمت، دین کے فروغ، تنظیم اور تحریک کے کاموں، اعمالِ صالحہ، مساجد کی تعمیر،

اداروں کے قیام اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں تو ہم ان نیکیوں کے کرنے میں نیتوں کو خلط ملط کر تے ہوئے ان اعمال کا اجر مانگتے ہیں۔ اُس کے بدلے میں عہدہ مانگتے ہیں، اُس کے بدلے میں حیثیت (status) مانگتے ہیں، عزت مانگتے ہیں، بدلے میں اچھی گاڑیاں مانگتے ہیں، سہولتیں مانگتے ہیں، ایک دوسرے کا اچھا جواب (response) مانگتے ہیں اور اونچا مرتبہ مانگتے ہیں۔ جب یہ خلط ملط ہوتا ہے تو پاک میں ناپاک شامل ہوتا چلا جاتا ہے۔ پس جب ان نیک اعمال پر نیت خالص نہیں رہتی تو پھر اجر بھی بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

اگر ہم اپنی نیت میں سے یہ ساری ناپاک چیزیں نکال دیں، یہ گرد و غبار بھی نکال دیں، جھاڑ پھونک بھی نکال دیں، مال و زر کی تمنا بھی نکال دیں اور نیت خالص سے خالص تر رکھ کر صرف اللہ کے ساتھ جڑ جائے، اللہ کی رضا کے سوا کچھ بھی طلب، چاہت اور خواہش نہ رکھیں اور نہ ہی اجر میں کوئی گمان کریں تو نیت کا اس قدر بلند ہونا اجر کے بغیر حساب بڑھنے کا باعث بنتا ہے۔ پھر بندہ دو نفل پڑھ کر بیس لاکھ نفلوں کا ثواب کما لیتا ہے۔ وہ پڑھے گا تو دو رکعت نماز نفل، مگر اُس کے نامہ اعمال میں بیس لاکھ نوافل کا اجر لکھا جائے گا۔ یہ تو آقا ﷺ نے عدد گن کر وعدہ فرما دیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ یعنی بیس لاکھ نیکیوں کا ایک نیکی کے عوض نامہ اعمال میں لکھا جانا تو ایک بات ہے مگر میرے حبیب! اگر آپ کی امت میں سے کسی کی نیکی اپنی خلوصِ نیت کی بناء پر عرش سے آگے میری بارگاہ تک پہنچ جائے تو وہ نیکی اجر و حساب سے بھی باہر نکل جائے گی اور بے حد، بے شمار اور بے حساب اجر کی حق دار ٹھہرے گی۔

باب نمبر 5

علم
حصولِ ہدایت اور بلندیِ درجات کا ذریعہ

ہر دور میں انسانی علم کا موضوع حقیقت تک رسائی رہا ہے۔ انسان نے اپنے حواس اور عقل سے حقیقت تک پہنچنے کی ہر ممکن جد و جہد بھی کی لیکن وہ ہر موقع پر ناکام ہوا۔ اس لیے کہ وہ محدود اور ناقص ذرائع سے لامحدود حقیقت کو پہچاننے اور اس تک رسائی کی طاقت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس طلب اور علمی تشنگی کو ختم کرنے کے لیے انبیاءِ کرام علیہم السلام کے ذریعے وحی کی شکل میں حقیقی علم کی نعمت عطا فرمائی اور اس سلسلے کی آخری کڑی حضور نبی اکرم ﷺ پر کائناتِ انسانی کے لیے علم بالوحی پر مشتمل کتاب نازل فرمائی۔ اس حوالے سے قرآن مجید عظمت کی کئی جہات کا حامل ہے۔

ا۔ عظمتِ قرآن کی جہات

اللہ تعالیٰ نے علم بالوحی یعنی قرآن مجید کی اہمیت وفضیلت کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ○[1]

اور بے شک ہم ان کے پاس ایسی کتاب (قرآن) لائے جسے ہم نے (اپنے) علم (کی بنا) پر مفصّل (یعنی واضح) کیا، وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے○

اس آیت کریمہ میں قرآن مجید کو کائناتِ انسانی کے لیے علم و ہدایت اور معرفت و رحمت کے حصول کا ذریعہ بناتے ہوئے قرآنی فضیلت کے درج ذیل تین اہم پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے:

---

(۱) الأعراف، ۷: ۵۲

(۱) قرآن منبعِ علم ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو تفصیلی علم کا منبع و سرچشمہ بنایا اور اس کا تعارف کرواتے ہوئے اسے کتابِ علم قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں علم پر تاکید (emphasis) فرمائی کہ آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر نازل ہونے والے کلام کی شان یہ ہے کہ یہ علم پر ایک مفصّل، جامع اور مبسوط کتاب ہے۔ اگر قرآنی الفاظ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ فرما کر ایک طرف قرآن مجید کو علم کی کتاب قرار دیتے ہوئے علم کی فضیلت کو بھی آشکار فرما دیا اور دوسری طرف علم پر اسے مفصّل بھی قرار دے دیا۔ گویا دونوں معانی اس کی شان میں شامل ہیں۔

(۲) قرآنی علم، ہدایت ہے

قرآن مجید کو علم کی ایک جامع کتاب قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس آیت کریمہ میں قرآنی علم کی شان بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ کتاب جہاں علم عطا کرتی ہے وہاں خود ہدایت کی روشنی سے نوازتی بھی ہے۔ یعنی قرآنی علم انسانیت کو حقیقت تک پہنچاتا ہے۔ اِس علم کے بعد وہم، تشکیک اور ظن ختم ہو جاتا ہے، انسان حقیقی منزلِ علم تک پہنچتا ہے اور یہی حقیقی علم اسے ہدایت کا نور عطا فرماتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہی علم معتبر، معتمد اور حاصل کئے جانے کے قابل ہے جو انسان کو ہدایت عطا کرے۔ علم اور ہدایت کو باہم متعلق کر دیا گیا کہ جس علم سے ہدایت نہ ملے وہ علم بے کار ہے اور علمِ نافع نہیں ہے۔ نیز ہدایت کے لیے بھی لازم ہے کہ علمِ صحیح میسر آئے۔

دنیاوی علم کا بھی ایک اصول ہے خواہ وہ سائنس کا علم ہو یا ٹیکنالوجی، آرٹس، social sciences، human sciences، space sciences، medical sciences؛ الغرض کوئی بھی دنیاوی علم ہو، اگر وہ علم ہمیں ایک خاص منزل، شعور اور معرفت عطا نہ کرے تو علم کا وہ سارا عمل (process) بے کار ہے۔ اگر دنیاوی علوم کے لیے اصول ہے کہ اُن سے بھی اُن کا

مقصود حاصل ہو تو وہ علم جو علمِ کامل، علمِ نافع اور قرآنی علم ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ سراپا ہدایت نہ ہو۔ جب دنیاوی علوم دنیا کے امور میں خاص مقاصد اور منزل کا شعور دیتے ہیں تو قرآنی علم انسان کو وہ ہدایت دیتا ہے جو بندے کو اللہ کی معرفت عطا کر دے۔

ہدایت اور علم دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اگر بات ہدایت سے علم کی طرف کی جائے تو پھر معنیٰ یہ ہے کہ ہدایت علم سے ہی ملتی ہے۔ ہدایت کے طلب گار اگر قیاس آرائیوں، اپنی ذاتی رائے، عقل کے گھوڑے دوڑانے اور اپنے گمان کی کوشش سے ہدایت چاہیں گے تو ایسا ممکن ہی نہیں۔ ہدایت کے لیے علمِ کامل، علمِ نافع، علمِ صحیح میسر ہو، تب جا کر ہدایت ملتی ہے۔ اگر بات علم سے ہدایت کی طرف کی جائے تو پھر معنی یہ ہے کہ علم کے لیے لازمی ہے کہ وہ صحیح ہو، تبھی اس کا نتیجہ ہدایت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ گویا ہدایت کے لیے لازمی ہے کہ اس کے حصول کے لیے علم کی شرط پوری ہو اور اسی علم کا صلہ بصورتِ ہدایت میسر آئے گا جو علم، علمِ صحیح ہوگا۔

(۳) قرآنی علم، رحمت کے حصول کا یقینی طریقہ ہے

قرآنی علم کی تیسری شان یہ ہے کہ یہ علم اور ہدایت کے ساتھ ساتھ رحمت بھی عطا کرتا ہے۔ جب قرآنی علم سے انسان ہدایت کے نور تک پہنچتا ہے تو پھر قرآن مجید اُس کے لیے رحمت بن جاتا ہے۔ قرآن مجید کے انسانیت کے لیے رحمت ہونے کے متعلق ایک اور جگہ ارشاد گرامی ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ. (۱)

اور ہم قرآن میں وہ چیز نازل فرما رہے ہیں جو ایمان والوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے۔

مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ سے عظمتِ قرآن کی تین جہات قرآن کا کتابِ علم ہونا، قرآنی علم کا سراپا ہدایت ہونا اور قرآنی علم کا باعثِ رحمت ہونا ثابت ہوتا ہے۔

---

(۱) بني إسرائيل، ۱۷:۸۲

۲۔ بنیادی دینی علم کا حصول فرضِ عین ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ علم کی اہمیت اور فضیلت کا تذکرہ فرمایا اور خصوصاً بنیادی فرائض کے علم کے حصول کو مسلمانوں پر فرض اور لازم ٹھہرایا ہے۔ جبکہ دینی علوم میں تخصّص اور مہارت و پختگی کے حصول کو فرضِ کفایہ قرار دیا ہے۔

سورۃ التوبہ میں ارشاد فرمایا:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ط فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ○ (۱)

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سارے کے سارے مسلمان (ایک ساتھ) نکل کھڑے ہوں تو ان میں سے ہر ایک گروہ (یا قبیلہ) کی ایک جماعت کیوں نہ نکلے کہ وہ لوگ دین میں تفقُّہ (یعنی خوب فہم و بصیرت) حاصل کریں اور وہ اپنی قوم کو ڈرائیں جب وہ ان کی طرف پلٹ کر آئیں تاکہ وہ (گناہوں اور نافرمانی کی زندگی سے) بچیں○

اس قدر بنیادی ضرورت کے علم کا حصول فرضِ عین ہے جس سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی توحید کا علم میسر آئے، حضور نبی اکرم ﷺ کے خاتم النبیین ﷺ ہونے کا علم ہو، آخرت کا پتہ چلے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے بنیادی فرائض معلوم ہوں۔ اس فرض کا تارک گناہ گار ہوگا۔ اس قدر بنیادی علم کے حصول میں کہیں بھی رہنے والے کسی بھی شخص کو کوئی رعایت و معافی نہیں ہے۔

۳۔ دینی علوم میں تخصّص فرضِ کفایہ ہے

یہ اسلام کے آسانی اور رحمت پر مبنی ہونے کا ایک اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنیادی

(۱) التوبة، ۹: ۱۲۲

دینی علم کے حصول کو تو ہر ایک پر فرض قرار دیا مگر علومِ دین میں بالتفصیل فہم و بصیرت حاصل کرنے، ماہر ہونے اور اس میں تخصّص حاصل کرنے کے عمل کو اللہ تعالیٰ نے مومنین پر فرضِ عین قرار نہیں دیا۔ اس لیے کہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ تمام مسلمان جملہ دنیوی معاملات اور ذمہ داریوں کو خیر باد کہتے ہوئے دینی علوم میں ماہر بننے اور دین میں تخصّص (specialization) کرنے لگ جائیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسے ناقابلِ عمل اور ناممکنات امر کا حکم ہی نہیں دیا بلکہ فرمایا:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ. (۱)

ان میں سے ہر ایک گروہ (یا قبیلہ) کی ایک جماعت کیوں نہ نکلے کہ وہ لوگ دین میں تفقُّہ (یعنی خوب فہم و بصیرت) حاصل کریں۔

یعنی معاشرے کے ہر گروہ، طبقہ اور ہر قبیلے میں سے ایک جماعت حصولِ علم میں کمال پانے اور دین میں تفقہ اور دینی علوم میں معرفت و بصیرتِ تامہ حاصل کرنے کے لیے ضرور نکلے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں دینی علوم کا حصول اور اس میں تفقہ اور دین کی گہری سمجھ بوجھ حاصل کرنے کو فرض قرار دیا گیا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ہر شخص (every single individual) کے لیے اسے لازم نہیں قرار دیا بلکہ فرمایا کہ ہر ایک کے لیے دین میں تفقہ حاصل کرنا ممکن نہیں، لہٰذا معاشرے میں سے ایک طبقہ ایسا ہو جو اس حوالے سے اس فریضہ کی تکمیل کرے۔ اس آیت کریمہ کے ان دو حصوں کے ربط سے ثابت ہوگیا کہ تفقہ فی الدین یعنی علمِ دین میں مہارت کا حصول فرضِ عین نہیں بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔

اگر معاشرے کے کچھ لوگ علمِ دین میں مہارت حاصل کر لیں تو سب کی طرف سے یہ فرض ادا ہو جائے گا۔ جیسے نمازِ جنازہ فرض کفایہ ہے۔ اگر کچھ لوگ پڑھ لیں تو سب کی طرف سے فرض کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف بھی سنتِ کفایہ ہے۔ اگر محلے کے کچھ لوگ مسجد میں اعتکاف بیٹھ گئے تو وہ سنت پورے محلے کی طرف سے ادا ہو جائے گی اور بقیہ اَہلِ محلّہ کے ذمہ گناہ نہیں رہے گا۔

---

(۱) التوبة، ۹: ۱۲۲

اگر کوئی معاشرہ ایسا ہے کہ اس کا کوئی گھرانہ بھی اپنے بچوں کو دین کے لیے مختص نہیں کرنا چاہتا بلکہ ہر شخص دنیاوی علوم میں لگا ہوا ہے اور التفقه فی الدین کے لیے کوئی اپنے بچے کو وقف نہیں کر رہا تو قرآن مجید نے واضح کر دیا کہ پورا معاشرہ فرض کے تارک ہونے کی بناء پر گناہ گار ہوگا اور اس پر سخت مواخذہ ہوگا۔

علمِ دین میں تخصّص کے مقاصد

اللہ تعالیٰ نے علم دین میں تخصّص کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ○[1]

اور وہ اپنی قوم کو ڈرائیں جب وہ ان کی طرف پلٹ کر آئیں تاکہ وہ (گناہوں اور نافرمانی کی زندگی سے) بچیں○

یعنی اگر کچھ لوگ علمِ دین میں تخصّص (specialization) کر لیں گے اور صاحبانِ بصیرت بننے کے بعد جب پلٹ کر اپنے علاقوں میں آئیں گے تو اب اُن کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ وہ اپنی قوم کو دوزخ کے عذاب سے ڈرائیں، آخرت کا خوف دلائیں، اللہ کی طرف راغب کریں، ان کو گناہوں اور نافرمانی کی زندگی سے بچائیں، گناہ و بدی اور ثواب و نیکی کے بارے میں آگاہی دیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول اور ناپسندیدہ کاموں کے مابین فرق بتائیں۔ الغرض لوگوں کو فہم و بصیرت دینا اور راہ راست پر لانا علم دین میں تخصّص کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد ہے۔

اِس آیت کریمہ سے بھی دیگر آیات کی طرح واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک علم وہی صحیح، معتبر اور مقبول ہے جس کے ذریعے لوگوں کو ہدایت نصیب ہو۔ جو علم صاحبِ علم اور متعلمین و طالبانِ علم (جسے پہنچایا جا رہا ہے) دونوں کے لیے ہدایت کا باعث نہ بنے تو وہ علم بے کار ہے۔ ایسا شخص یہ سمجھے کہ گویا اس نے علمِ صحیح حاصل ہی نہیں کیا۔

---

(۱) التوبة، ۹: ۱۲۲

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ کے الفاظ کے ذریعے دو مقاصد بیان فرما دیئے کہ لوگ دین میں تفقہ حاصل کریں اور اس معرفت کے حصول کے بعد لوگوں کی ہدایت کا سامان مہیا کریں۔ ان دونوں احکام کو لامِ تعلیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے یعنی اس کی علّت اور سبب بیان کیا جا رہا ہے۔ گویا علم کی بنیادی خاصیت یہ ہے کہ وہ محرومِ ہدایت لوگوں کو رُشد و ہدایت سے نوازتا ہے۔

۴۔ قرآن سے حصولِ ہدایت کے تقاضے

قرآنی علم ہمیں ہدایت اور رحمت کے حصول کی ضمانت عطا کرتا ہے لیکن کیا قرآن ہر ایک کو ہدایت عطا کرتا ہے؟ کیا قرآن مجید سے علمِ ہدایت اور رحمت پانے کے کچھ تقاضے بھی ہیں؟ آیئے اسے سمجھنے کے لیے ہم سورۃ البقرہ کی پہلی آیات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

الٓمّٓ○ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لاَ رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ○[1]

الف لام میم (حقیقی معنی اللہ اور رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں)○ (یہ) وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، (یہ) پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے○

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں پہلے قرآن کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب منبعِ علم ہے اور اس میں کوئی رَیب و شک نہیں ہے۔ یہ کتاب حق سے آشنا کراتی ہے۔ جس طبیعت، من، روح اور دل پر یہ کتاب اور اس کے انوار وارد ہو جائیں، اس سے شک کی گرد کو نکال دیتی ہے اور اس میں تشکیک و شبہات کا اندھیرا نہیں رہنے دیتی۔

اس کے بعد آیت کریمہ نے دوسرے سوال کی وضاحت کر دی کہ یہ کتاب کن لوگوں کو ہدایت عطا کرتی ہے۔ فرمایا:

---

(۱) البقرۃ، ۲: ۱-۲

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ○

(یہ) پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے○

یعنی اس کتاب سے ہدایت ان ہی کو میسر آئے گی جو صاحبانِ تقویٰ ہوں گے۔

آیئے! اب ہم اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ، ہدایت اور خوف کی درمیانی منزل ہے

تقویٰ کا لفظ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ تقویٰ کا معنی سمجھنے کے لیے ہمیں انسانی زندگی کی دو کیفیات کو سمجھنا ہوگا:

۱۔ ایک ایسا بے خوف شخص جو پے در پے گناہ، بے حیائی، ظلم اور نافرمانیوں کا مرتکب ہو رہا ہے اور اسے احساس وفکر ہی نہیں ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور میرا انجام کیا ہوگا؟

۲۔ دوسری کیفیت یہ ہے کہ کسی کو شعور مل جائے اور وہ دیکھ لے کہ میں تو بڑی بربادی و ہلاکت میں ہوں، میرا انجام تو بہت برا ہوگا، میں نے خسارے کا سودا کیا ہے۔ جب یہ احساس اُسے ہونے لگے، آلودہ زندگی کے انجام اور اُخروی ہلاکت و بربادی کا خیال دل میں آئے تو اس کے نتیجے میں اس کے اندر خیر کی طرف توجہ اور توبہ کی طلب پیدا ہو جائے گی۔ اُسے یہ احساس ستانے لگے گا کہ میں گناہوں کی اس زندگی سے کنارہ کشی اختیار کروں۔ طبیعت میں اس تبدیلی، ہیجان، تڑپ اور طلب کا پیدا ہونا تقویٰ کہلاتا ہے۔

لہٰذا یہ امر واضح ہو گیا کہ قرآن مجید ہر پڑھنے والے، بحث و مناظرہ کرنے والے اور دِل کی گہرائیوں کے بجائے صرف حلق سے پڑھنے والے کے لیے ہدایت کا باعث نہیں ہوگا۔ وہ شخص جو اُسے اپنی ذاتی آراء، خواہشات، دشمن کے ساتھ لڑنے اور اسے دلائل کے لیے استعمال کرے، اس کے لیے یہ کتاب ہدایت کا باعث نہیں ہوگی۔ بلکہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے مصداق وہ لوگ جو اپنی موجودہ پس ماندگی اور گناہوں کی زندگی کا انجام دیکھ کے ڈر گئے، یہ اُن کے لئے ہدایت ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کے اندر ایک خوف اور تڑپ پیدا ہوگئی اور اس تڑپ نے ان کے

اندر ایک طلب اور رغبت پیدا کر دی کہ یہ ہم کیا کر بیٹھے ہیں؟ ہمیں اب راستہ بدلنا ہے، ہمیں حق کی طرف جانا ہے، ہمیں رجوع اِلی اللہ کرنا ہے۔ جن کی طلب اور تڑپ اس طرح صادق ہوگئی اور جو اخلاص کے ساتھ اس امر کی طرف متوجہ ہوگیا کہ میں ہدایت لوں، مجھے کوئی ہدایت دے تاکہ میں تاریک رات کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے نکل کر اُجالوں کی طرف سفر کا آغاز کروں، میں گناہوں کی آلودہ زندگی چھوڑ کر اس کی اطاعت و پیروی اختیار کروں، اللہ کی دوری چھوڑ کر اس کی قربت کا راستہ تلاش کروں، دوزخ کے اِمکانات سے نکل کر جنت کے اِمکانات کو اپنے لیے روشن کروں۔ جس بندے کے اندر یہ طلب پیدا ہوگئی، وہی متقی ہے اور ایسی ہی سچی طلب کرنے والوں کے لیے قرآن ہدایت ہے۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ قرآن ہر ایک کی جھولی میں ہدایت نہیں ڈال دیتا بلکہ اپنے پڑھنے والے کے دل کو دیکھتا ہے کہ کیا اس کے باطن میں حصولِ ہدایت کی سچی تڑپ ہے اور یہ ہدایت و رحمت کے حصول کے کتنے تقاضے پورے کرتا ہے؟ اگر تقاضے پورے کیے ہوں، طلب اور تڑپ سچی ہو تو پھر قرآن اسے ہدایت کی دولت سے نوازتا ہے۔ قرآنِ مجید نے نہ صرف متقین کے لئے اپنا ہدایت ہونا بیان فرمایا بلکہ ہدایت یافتہ اور متقین کی علامات بھی بیان کر دی ہیں۔ ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ○[1]

جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز کو (تمام حقوق کے ساتھ) قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے (ہماری راہ) میں خرچ کرتے ہیں○

یعنی اللہ تعالیٰ نے معیار، تقاضے اور پیمانے بھی بیان فرما دیے۔ ان تقاضوں سے واضح ہوتا ہے کہ کس میں ہدایت کے لیے کتنی سچی طلب اور تڑپ ہے۔ الغرض پورے قرآن مجید میں ہر جگہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کو علم کا نتیجہ قرار دیا اور علم کو قرآن کے ساتھ جوڑا ہے۔ گویا علمِ قرآنی کو ہدایت کے حصول کے لیے شرط قرار دیا گیا ہے۔

---

(۱) البقرة، ۲: ۳

۵۔ حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو معجزات عطا فرمائے جن کے ذریعے انہوں نے انسانی عقل کو عاجز کیا اور خالق کائنات کی وحدانیت اور اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو سراپا معجزہ بنایا۔ حضور نبی اکرم ﷺ معراج پر گئے، آپ ﷺ نے چاند کو دوٹکڑے کیا، ڈوبے سورج کو واپس پلٹایا، مُردے زندہ فرمائے، آپ ﷺ کے ہاتھوں میں پتھر بھی بول اٹھے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر تمام معجزات میں آقا ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے۔ قرآنِ حکیم کے بعد آپ ﷺ کا دوسرا بڑا معجزہ معراج ہے جس کا ذکر قرآن نے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جب بھی کفار ومنکرین کو چیلنج کیا تو حضور نبی اکرم ﷺ کے عالمِ خارج کے بے شمار معجزات میں سے کسی بھی حسی معجزے کے ساتھ چیلنج نہیں کیا بلکہ فرمایا:

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○[1]

آپ فرما دیں کہ تم اللہ کے حضور سے کوئی (اور) کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو (تو) میں اس کی پیروی کروں گا اگر تم (اپنے الزامات میں) سچے ہو○

کفار اس چیلنج کا جواب دینے سے عاجز آ گئے تو پھر چیلنج کیا کہ اگر تمہیں شک ہے کہ میرا محبوب جو کلام لے کر آیا ہے، یہ حق نہیں تو پھر اس جیسی دس سورتیں ہی لے آؤ۔ ارشاد فرمایا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○[2]

کیا کفار یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس (قرآن) کو خود گھڑ لیا ہے، فرما دیجیے: تم (بھی) اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور اللہ کے سوا (اپنی مدد کے لیے)

---

(۱) القصص، ۲۸:۴۹

(۲) هود، ۱۱:۱۳

جسے بھی بلا سکتے ہو بلالو اگر تم سچے ہو○

پھر تیسری بار چیلنج کیا اور فرمایا: چلو ایک سورت ہی لے آؤ:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ (۱)

کیا وہ کہتے ہیں کہ اسے رسول (ﷺ) نے خود گھڑ لیا ہے، آپ فرما دیجیے: پھر تم اس کی مثل کوئی (ایک) سورت لے آؤ، (اور اپنی مدد کے لیے) اللہ کے سوا جنہیں تم بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو○

سورۃ البقرۃ میں بھی یہی چیلنج دیا۔ فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ. (۲)

اور اگر تم اس (کلام) کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے (برگزیدہ) بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ۔

الغرض تین بار چیلنج کیا اور تینوں بار قرآن کی مثل کلام بنانے کا چیلنج دیا۔

۶۔ قرآن مجید مفصّلِ علم ہے

قرآن مجید کی سب سے بڑی شان اس کا مفصّلِ علم ہونا ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ○ (۳)

اور بے شک ہم ان کے پاس ایسی کتاب (قرآن) لائے جسے ہم نے (اپنے) علم (کی بنا) پر مفصّل (یعنی واضح) کیا، وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے○

---

(۱) یونس، ۱۰: ۳۸

(۲) البقرۃ، ۲: ۲۳

(۳) الأعراف، ۷: ۵۲

یعنی وہ لوگ جو آپ ﷺ اور اس کتاب قرآن کے منکر ہیں اور اس بارے شک میں مبتلا ہیں، آپ ﷺ کی نبوت اور قرآن کی حقانیت پر ثبوت مانگتے ہیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کو علم کی مفصل کتاب بنا کر دلیل بنایا کہ یہ اس قدر عظیم کتاب ہے کہ اس جیسی ایک سورۃ بنانا بھی ساری انسانیت کے لیے ممکن نہیں ہے۔ قرآن مجید کے مفصلِ علم ہونے پر اس کی متعدد آیات شاہد ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ.(۱)

ہر ایک چیز کی تفصیل لکھ دی (ہے)۔

۲۔ سورۃ النحل میں قرآن مجید کے بیان کی وسعت کے بارے میں ارشاد فرمایا:

تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ.(۲)

ہر چیز کا بڑا واضح بیان ہے۔

۳۔ سورۃ الانعام میں قرآنی علوم کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ○(۳)

نہ کوئی تر چیز ہے اور نہ کوئی خشک چیز مگر روشن کتاب میں (سب کچھ لکھ دیا گیا ہے)○

۴۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعے انسان کو علم مفصل عطا کرتے ہوئے فرمایا:

اَلرَّحْمٰنُ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ○(۴)

---

(۱) الأعراف، ۷: ۱۴۵

(۲) النحل، ۱۶: ۸۹

(۳) الأنعام، ۶: ۵۹

(۴) الرحمن، ۵۵: ۱-۴

(وہ) رحمٰن ہی ہےo جس نے (خود رسولِ عربی ﷺ کو) قرآن سکھایا۔ اُسی نے (اِس کامل) انسان کو پیدا فرمایاo اُسی نے اِسے (یعنی نبیِ برحق ﷺ کو مَا کَانَ وَمَا یَکُون کا) بیان سکھایاo

۵۔ اسی طرح قرآن مجید کی پہلی وحی میں حضور نبی اکرم ﷺ کو علم عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَo خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍo اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُo الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِo عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْo[1]

(اے حبیب!) اپنے رب کے نام سے (آغاز کرتے ہوئے) پڑھیے جس نے (ہر چیز کو) پیدا فرمایاo اس نے انسان کو (رحمِ مادر میں) جونک کی طرح معلق وجود سے پیدا کیاo پڑھیے اور آپ کا رب بڑا ہی کریم ہےo جس نے قلم کے ذریعے (لکھنے پڑھنے کا) علم سکھایاo جس نے انسان کو (اس کے علاوہ بھی) وہ (کچھ) سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھاo

یعنی قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی صداقت کا سب سے بڑا معجزہ ہے اور قرآن کے معجزہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل اور شان اس کا مفصّلِ علم ہونا ہے۔

۷۔ انبیاء کرام علیہم السلام اور فضیلتِ علم

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو علم کی نعمت سے سرفراز فرمایا اور ہر نبی کو علم کے ذریعے ہی اس کی اُمت پر فضیلت اور مقام و مرتبہ عطا فرمایا:

۱۔ سیدنا آدم علیہ السلام کی فضیلتِ علم کے حوالے سے ارشاد ہوتا ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَةِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ

(۱) العلق، ۹۶:۱-۵

بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ○ قَالَ يٰاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ج فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لا وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ○[1]

اور اللہ نے آدم (علیہ السلام) کو تمام (اشیاء کے) نام سکھا دیے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا، اور فرمایا: مجھے ان اشیاء کے نام بتا دو اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو○ فرشتوں نے عرض کیا: تیری ذات (ہر نقص سے) پاک ہے ہمیں کچھ علم نہیں مگر اسی قدر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، بے شک تو ہی (سب کچھ) جاننے والا حکمت والا ہے○ اللہ نے فرمایا: اے آدم! (اب تم) انہیں ان اشیاء کے ناموں سے آگاہ کرو، پس جب آدم (علیہ السلام) نے انہیں ان اشیاء کے ناموں سے آگاہ کیا تو (اللہ نے) فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی (سب) مخفی حقیقتوں کو جانتا ہوں، اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو○

۲۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی فضیلتِ علم کے حوالے سے ارشاد فرمایا:

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ج وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا.[2]

چنانچہ ہم ہی نے سلیمان (علیہ السلام) کو وہ (فیصلہ کرنے کا طریقہ) سکھایا تھا اور ہم نے ان سب کو حکمت اور علم سے نوازا تھا۔

۳۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی فضیلتِ علم کو مشترکہ طور پر یوں بیان فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ج وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ

(۱) البقرة، ۲: ۳۱-۳۳

(۲) الأنبياء، ۲۱: ۷۹

مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ○[1]

اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو (غیر معمولی) علم عطا کیا، اور دونوں نے کہا کہ ساری تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت بخشی ہے○

۴۔ حضرت نوح علیہ السلام کی فضیلتِ علم کے حوالے سے قرآن حکیم فرماتا ہے:

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ○[2]

میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمہیں نصیحت کر رہا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے○

دوسرے مقام پر فرمایا:

قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○[3]

(نوح علیہ السلام نے) فرمایا: میرے علم کو ان کے (پیشہ وارانہ) کاموں سے کیا سروکار؟○

۵۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلتِ علم کے حوالے سے ارشاد فرمایا:

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ○[4]

پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب عطا کی اس شخص پر (نعمت) پوری کرنے کے لیے جو نیکوکار بنے اور (اسے) ہر چیز کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت بنا کر (اتارا) تاکہ وہ

---

(۱) النمل، ۲۷: ۱۵

(۲) الأعراف، ۷: ۶۲

(۳) الشعراء، ۲۶: ۱۱۲

(۴) الأنعام، ۶: ۱۵۴

(لوگ قیامت کے دن) اپنے رب سے ملاقات پر ایمان لائیں○

۶۔ حضرت یوسف ﷺ کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ○[1]

اسی طرح تمہارا رب تمہیں (بزرگی کے لیے) منتخب فرما لے گا اور تمہیں باتوں کے انجام تک پہنچنا (یعنی خوابوں کی تعبیر کا علم) سکھائے گا اور تم پر اور اولادِ یعقوب پر اپنی نعمت تمام فرمائے گا جیسا کہ اس نے اس سے قبل تمہارے دونوں باپ (یعنی پردادا اور دادا) ابراہیم اور اسحاق (ﷺ) پر تمام فرمائی تھی۔ بے شک تمہارا رب خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے○

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف ﷺ کو مقامِ نبوت کے لیے منتخب فرمانے کا تذکرہ کرنے کے بعد علم کی نعمت کے عطا کیے جانے کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ جنہیں وہ منتخب کرتا اور برگزیدہ بناتا ہے تو انہیں سب سے پہلے علم کی نعمت عطا فرماتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنہیں بزرگی اور عظمت عطا فرمانا چاہتا ہے تو اُنہیں عزت و تکریم اور فضیلت علم کے نور سے ہی عطا فرماتا ہے۔

حضرت یوسف ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے علمِ تعبیر الرؤیا عطا فرمایا۔ یہ علم حقائق و اسرار اور مثال کی حقیقتوں کا علم ہے۔ یہ علم ذہانت و فطانت اور بصیرت و حکمت کے علوم کا مجموعہ ہے۔ حقائق اور اسرار کے علم تک پہنچے کے لیے انسان کو کئی علوم کی منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ کے الفاظ کے ذریعے حضرت یوسف ﷺ کو علم کی نعمت کی کثرت اور وسعت عطا کئے جانے کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔

---

(۱) یوسف، ۱۲: ۶

سورۂ یوسف میں ہی دوسرے مقام پر آپ کو علم عطا فرمانے کا اظہار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے علم کی عطا کو نیکوکاروں کے لیے اپنی بارگاہ سے صلہ اور اجر قرار دیا۔ ارشاد فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ○[1]

اور جب وہ اپنے کمالِ شباب کو پہنچ گیا (تو) ہم نے اسے حکمِ (نبوت) اور علم (تعبیر) عطا فرمایا، اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو صلہ بخشا کرتے ہیں○

گویا علم کی اتنی عظیم شان ہے کہ جہاں ہر نبی کی نعمتِ نبوت کا ذکر کیا وہاں نعمتِ علم کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ افسوس آج ہم علم سے کوسوں دور ہیں اور بغیر علم کے ہدایت و بزرگی اور کرامت کے طلب گار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے والد گرامی کا تذکرہ بھی علم کے ساتھ ہی فرمایا۔ ارشاد گرامی ہے:

وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ○[2]

اور (اس خواہش و تدبیر کو لغو بھی نہ سمجھنا تمہیں کیا خبر) بے شک یعقوب (علیہ السلام) صاحبِ علم تھے اس وجہ سے کہ ہم نے انہیں علمِ (خاص) سے نوازا تھا مگر اکثر لوگ (ان حقیقتوں کو) نہیں جانتے○

الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر بھی نبوت اور علم کے ساتھ فرمایا اور اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر بھی نبوت اور علم کے ساتھ فرمایا۔

بلندیِ درجات علم سے مشروط ہے

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف نبوت اور علم کو باہم متعلق کیا بلکہ درجات کی بلندی کو بھی علم

(۱) یوسف، ۱۲: ۲۲

(۲) یوسف، ۱۲: ۶۸

کے ساتھ مشروط فرمایا ہے:

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ○[1]

ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں۔ اور ہر صاحبِ علم سے اوپر (بھی) ایک علم والا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اِس آیت مبارکہ میں دو مضامین بیان فرمائے ہیں:

۱۔ ہم لوگوں کو درجہ بدرجہ بلندیاں، رتبے اور درجات عطا کرتے ہیں۔

۲۔ ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہوتا ہے۔

آیت کریمہ کے اِن دونوں حصوں کو ملانے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ درجات کی بلندی بھی علم کی بلندی کے ساتھ ہے۔ گویا درجات کی بلندی کا سبب بھی علم ہے۔

یہاں ذہن میں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ عبادت، نوافل، روزے اور نیک اعمال سے بھی تو درجات بلند ہوتے ہیں، پھر علم سے بلندیِ درجات حاصل ہونا منفرد کیسے ہوا؟

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تمام اَعمالِ صالحہ، اَخلاقِ حسنہ اور اُمورِ خیر سے درجات بلند ہوتے ہیں لیکن درجات کی بلندی میں بھی درجہ بندی ہے کہ کس عمل سے محض درجہ بلند ہوتا ہے اور کس عمل سے درجات بہت زیادہ بلند ہوتے ہیں۔ تمام اَعمالِ صالحہ سے درجات بلند ہوتے ہیں مگر علمِ صحیح کے ذریعے درجہ سب سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔ اسی لیے مرتبۂ نبوت کو ہر جگہ علمِ صحیح اور علمِ نافع کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ چونکہ کائنات میں نبوت سے بڑھ کر کوئی درجہ نہیں ہے، اس لئے سب سے اونچے درجے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ علم کو جوڑا ہے۔

۸۔ اللہ تعالیٰ علم اور فقر کو جمع فرماتا ہے

یہاں ضمناً ایک ضروری نکتہ واضح کرتے چلیں کہ اللہ تعالیٰ جسے علم کی نعمت عطا فرماتا

(۱) یوسف، ۱۲: ۷۶

ہے اسے وسعتِ مال کی نعمت عطا نہیں فرماتا، بلکہ ہمیشہ علم کے ساتھ فقر کو جمع فرماتا ہے۔ وہ لوگ جو علم اور خصوصاً علمِ دین حاصل کر رہے ہیں اور خدمتِ دین کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں یا اساتذہ و معلمین ہیں، وہ اس بات پر غم زدہ نہ ہوا کریں کہ ان کے ہاں دنیا داروں کی طرح مال کی فراوانی نہیں ہے۔ یہ نہ سوچا کریں کہ وہ اتنے متمول نہیں جتنے صنعت کار، تاجر، دنیا دار، سیاست دان یا دیگر پیشوں سے وابستہ لوگ ہیں۔ اہلِ علم ہر وقت پریشان رہتے ہیں، کبھی قرض اُٹھاتے ہیں، مشکل حالات میں زندگی گزارتے ہیں حتیٰ کہ اُنہیں اکثر اوقات اچھے کپڑے، سواری اور گھر بھی میسر نہیں آتا۔ اہلِ علم کو چاہیے کہ اس فقر کا ذکر کبھی دل اور زبان پر نہ لائیں کیونکہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلْفَقْرُ فَخْرِي.(۱)

فقر میرا فخر ہے۔

ایک مقام پر ہے:

إِنَّ الْفَقِيْرَ الصَّابِرَ خَيْرٌ مِّنَ الْغَنِيِّ الشَّاكِرِ.(۲)

بے شک صبر کرنے والا فقیر شکر کرنے والے غنی سے بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جنہیں سب سے زیادہ علم عطا کیا، ان کو فقر کے ساتھ جوڑا ہے۔ علم اور فقر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ علم اور فقر میں گہری دوستی ہے۔ اس ضمن میں مستثنیات بہت کم ہوتی ہیں، مگر عام قاعدہ یہ ہے کہ علم اور فقر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے لوگ کہتے تھے کہ آپ کے دسترخوان پر تو روکھی سوکھی ملتی

---

(۱) ۱۔ عسقلاني، تلخيص الحبير، ۳: ۱۰۹، رقم: ۱۴۱۵

۲۔ ابن ملقن الأنصاري، خلاصة البدر المنير، ۲: ۱۶۱، رقم: ۱۸۴۰

(۲) ۱۔ ملا علی قاری، مرقاة المفاتيح، ۴: ۷۳

۲۔ مبارکپوری، تحفة الأحوذی، ۷: ۱۷

ہے، لیکن اگر دمشق (شام) جائیں تو وہاں دسترخوان پر بہت اعلیٰ کھانے ملتے ہیں اور وہاں کے ملازم بھی بڑے زرق برق لباسوں میں ہوتے ہیں مگر آپ کے ہاں ایسا نہیں۔ آپ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ علم اور فقر کو جوڑتا ہے، علم اور مال کو بہت کم اکٹھا کرتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند انبیاء کرام مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہت ملی؛ بقیہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام تو ہجرتیں ہی کرتے رہے ہیں۔ اپنی اپنی قوم کی طرف سے انہیں ظلم وستم کا شکار ہونا پڑا، فاقے برداشت کرنا پڑے، حتیٰ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شہادتیں تک ہوتی رہیں۔ الغرض انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگیاں تو فقر کے ساتھ گزری ہیں۔

قاعدہ یہ ہے کہ علم اور فقر کی گہری دوستی ہے جب کہ علم اور مال و دولت کی آپس میں بہت کم بنتی ہے۔ حضور ﷺ نے فقر پر فخر فرمایا ہے۔ اگرچہ اِس روایت پر جرح بھی کی گئی ہے لیکن معناً درست ہے اور کثیر ائمہ کرام وصوفیاء عظام نے اسے اپنی کتب میں درج کیا اور اس سے استشہاد کیا ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ ہم بھی فقر پر فخر کریں۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنے کی روش کو اپنائیں۔ چند روزہ آزمائش اور مشکلات ضرور ہیں مگر علم کے ذریعے جو عزت اور قربِ الٰہی میسر آتا ہے وہ مال میں ہرگز نہیں ہے۔

۱۔ امام مالک فرماتے ہیں:

لَا يَبْلُغُ أَحَدٌ مَا يُرِيْدُ مِنْ هٰذَا الْعِلْمِ حَتّٰى يَضُرَّ بِهِ الْفَقْرُ، وَيُؤْثِرَهُ عَلٰى كُلِّ حَاجَةٍ.[1]

کوئی شخص اُس علم میں سے جو کچھ چاہتا ہے اسے حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ فقر اُسے متاثر نہ کرے اور جب تک وہ اپنی ہر ضرورت پر اس علم کو ترجیح نہ دے۔

---

(۱) ۱۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۶: ۳۳۱

۲۔ خطيب بغدادی، الفقيه والمتفقه، ۲: ۱۸۶

۲۔ امام شافعی بیان کرتے ہیں:

لَا يَصْلُحُ طَلَبُ الْعِلْمِ إِلَّا لِمُفْلِسٍ. قِيْلَ: وَلَا لِغَنِيٍّ مَكْفِيٍّ؟ قَالَ: لَا. (۱)

طلبِ علم مفلس شخص کو ہی زیب دیتا ہے۔ عرض کیا گیا: اور کیا مال دار شخص کو یہ زیب نہیں دیتا؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔

۳۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے:

لَا شَيْءَ أَزْيَنَ بِالْعُلَمَاءِ مِنَ الْفَقْرِ وَالْقَنَاعَةِ وَالرِّضَا بِهِمَا. (۲)

علماء کو فقر و قناعت اختیار کرنے اور ان دونوں پر خوش رہنے سے زیادہ کوئی چیز زیب نہیں دیتی۔

۴۔ اسی طرح یہ بھی منقول ہے کہ امام محمد بن ادریس شافعی فرمایا کرتے تھے:

لَا يُدْرَكُ الْعِلْمُ إِلَّا بِالصَّبْرِ عَلَى الضُّرِّ. (۳)

علم نقصان و تکلیف پر صبر سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ امام شافعی نے یہ بھی فرمایا ہے:

فَحَقٌّ عَلٰى طَلَبَةِ الْعِلْمِ بُلُوْغُ غَايَةِ جُهْدِهِمْ فِي الاسْتِكْثَارِ مِنْ عِلْمِهٖ، وَالصَّبْرُ عَلٰى كُلِّ عَارِضٍ دُوْنَ طَلَبِهٖ، وَإِخْلَاصُ النِّيَّةِ لِلّٰهِ فِي اسْتِدْرَاكِ عِلْمِهٖ نَصًّا وَاسْتِنْبَاطًا، وَالرَّغْبَةُ إِلَى اللهِ فِي الْعَوْنِ عَلَيْهِ. (۴)

---

(۱) ۱۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۹:۱۱۹

۲۔ خطيب بغدادی، الفقيه والمتفقه، ۲:۱۸۷

(۲) شعراني، الطبقات الكبرى:۷۷

(۳) خطيب بغدادی، الفقيه والمتفقه، ۲:۱۸۶

(۴) ۱۔ شافعی، أحكام القرآن، ۱:۲۱ ←

طالبانِ علم پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے غایت درجہ محنت کریں، اور اس کی طلب میں آنے والی ہر رکاوٹ پر صبر کریں، اور اپنے علم کو نصاً اور استنباطاً حاصل کرنے میں نیت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص رکھیں۔ اور اس کام میں مدد حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت رکھیں۔

۶۔ امام ابراہیم آجری بیان کرتے ہیں:

مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ بِالْفَاقَةِ وَرِثَ الْفَهْمَ.(۱)

جس نے فقر و فاقہ کے ساتھ علم طلب کیا وہ فہم کا وارث بنا۔

۷۔ امام شقیق بلخی فرمایا کرتے تھے:

إِذَا كَانَ الْعَالِمُ طَامِعاً، وَلِلْمَالِ جَامِعاً فَبِمَنْ يَقْتَدِي الْجَاهِلُ؟(۲)

جب عالم دین طمع کرنے والا اور مال جمع کرنے والا ہو تو جاہل کس کی پیروی کرے؟

۸۔ امام ابوالحسن شاذلی فرمایا کرتے تھے:

أَرْبَعٌ لَا يَنْفَعُ مَعَهُمْ عِلْمٌ: حُبُّ الدُّنْيَا، وَنِسْيَانُ الْآخِرَةِ، وَخَوْفُ الْفَقْرِ وَخَوْفُ النَّاسِ.(۳)

چار چیزوں کے ہوتے ہوئے علم نفع نہیں دیتا: دنیا کی محبت، آخرت کی فراموشی، تنگ دستی کا خوف اور (ملامت کرنے والے) لوگوں کا ڈر۔

لہٰذا اہلِ علم اپنے اندر صبر، شکر اور قناعت پیدا کریں۔ فقر کے خوف، لوگوں کی ملامت

۲۔ شافعی، الرسالة:۱۹

۳۔ خطیب بغدادی، الفقیه والمتفقه، ۲:۲۰۴

(۱) خطیب بغدادی، الفقیه والمتفقه، ۲:۱۸۶

(۲) شعرانی، الطبقات الکبری:۱۱۵

(۳) شعراني، الطبقات الکبری:۳۰۹

کے ڈر اور معاشرے میں عزت کے حصول میں دشواری کے سبب لوگ علمِ دین کی راہ پر نہیں آتے اور والدین بچوں کو دین نہیں پڑھاتے کہ پیسے نہیں ملتے، گزارہ نہیں ہوتا اور تنخواہ بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ یہ بات درست ہے مگر علم اور مال کو اللہ تعالیٰ نے بہت کم باہم جوڑا ہے جبکہ علم، فقر اور آخرت کو زیادہ آپس میں زیادہ ملایا ہے اور یہ اُلوہی فیصلہ ہے۔

۹۔ رسولِ مکرم ﷺ معلّمِ کائنات ہیں

سب سے بڑا منبعِ علم وحیِ الٰہی ہے جس کے ذریعے انبیاء کرام علیہم السلام کو علم نصیب ہوا۔ اسی لیے نبی کو دنیا میں کسی استاد کے پاس پڑھنے کی حاجت نہیں ہوئی۔ انبیاء کرام علیہم السلام نہ کسی مدرسے اور سکول گئے اور نہ ہی کسی استاد کے پاس زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا لقب مبارک بھی اُمّی ہے یعنی دنیا میں کسی استاد سے نہیں پڑھے۔ بعض لوگ نادانی، جہالت اور بدعقیدگی کی بناء پر 'اُمی' کا ترجمہ معاذ اللہ 'اَن پڑھ' کرتے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے لیے امّی کا معنی 'ان پڑھ' کرنا بہت بڑا ظلم، گمراہی اور گستاخی ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے تو براہ راست اللہ تعالیٰ سے پڑھا ہے۔ تمام انسان اپنے جیسے انسانوں سے پڑھتے ہیں جبکہ اللہ کا نبی صرف اللہ سے ہی پڑھتا ہے۔

کتنے ظلم کی بات ہے کہ انسان انسانوں سے پڑھ کر علم والے ہو جائیں اور جس نے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست یا جبریل امین علیہ السلام کے واسطے سے پڑھا ہے، ان کو ہم اَن پڑھ کہیں؟ ایسا کہنا بذاتِ خود اَن پڑھوں، احمقوں اور جاہلوں والی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو خود پڑھایا ہے جس کا ثبوت یہ ارشاد ربانی ہے:

وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ. (۱)

اور اس نے آپ کو وہ سب علم عطا کر دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے۔

جب قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ خود یہ اعلان کر رہا ہے کہ اے میرے محبوب! اللہ نے

(۱) النساء، ۴: ۱۱۳

آپ کو تعلیم دی ہے تو اس اعلان کے بعد کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ آپ کو اَن پڑھ کہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا معلّم ہے اور اس نے براہِ راست اپنے حبیب مکرم ﷺ کو تعلیم دی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ○[1]

اور تمہیں وہ (اسرارِ معرفت وحقیقت) سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے○

جو ہستی انسانیت کو کتاب کا علم عطا فرمائے، ان کو ہم کیسے اَن پڑھ کہہ سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ خود نبی اکرم ﷺ کو علمِ کامل سے نوازا ہے۔ اس حوالے سے قرآن نے ایک اور مقام پر بھی ارشاد فرمایا:

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى○[2]

ان کو بڑی قوّتوں والے (ربّ) نے (براہِ راست) علمِ (کامل) سے نوازا○

الغرض اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کمالِ علم سے سرفراز فرمایا اور پھر انبیاء کو انسانیت کا معلم بنا کر انہیں تعلیم دینے کا فریضہ سونپا۔

۱۰۔ نبوت اور ولایت دونوں کے لیے علم لازم وملزوم ہے

جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے علم ضروری ہے، اسی طرح اولیاء کے لیے بھی علم ناگزیر ہے۔ علم کے بغیر ولایت نہیں ملتی۔ نبوت اور ولایت کے ذرائعِ علم الگ الگ ہو سکتے ہیں مگر نبوت و ولایت دونوں کے لئے علم کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اولیاء اکثر مروجہ ذرائع یعنی سکول، مدرسہ، ادارہ، اساتذہ اور نصابات کے ذریعے علم حاصل کرتے ہیں۔ تمام اولیاء علماء ہوتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں علمِ لدنی عطا کرتے ہوئے اپنی بارگاہ سے براہِ راست علم عطا کر دیتا ہے، اُن کے سینوں اور ارواح میں اپنا چشمۂ علم کھول دیتا ہے اور القاء

(۱) البقرة، ۲: ۱۵۱

(۲) النجم، ۵۳:۵

کے طریق سے علم عطا فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات میں علم کی خیرات تقسیم فرمائی ہے۔ کسی کو تخلیق کے ساتھ یعنی فطری علم عطا کرتا ہے تو کسی کو مروجہ دنیاوی ذرائع علم سے گزارتا ہے۔ کسی کو براہِ راست علمِ لدنی سے سیراب کرتا ہے تو کسی کو وحی اور کتاب کے ذریعے علم کی نعمت عطا کرتا ہے اور کسی خوش نصیب کو اپنے سامنے بٹھا کر براہِ راست علم عطا فرماتا ہے۔

قرآن مجید میں مذکور علمِ نبوت کی حامل ہستی حضرت موسیٰ ﷺ اور علمِ لدنی کی حامل ہستی حضرت خضر ﷺ کے واقعہ سے بھی اسی جانب رہنمائی ملتی ہے۔ حضرت موسیٰ ﷺ کو وحی کے ذریعے علم عطا کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو کوہِ طور پر بلا کر اَلواح (تختیاں) عطا فرمائیں جبکہ سیدنا خضر ﷺ کو نبوت کے مرتبے کے بغیر براہِ راست اپنے خزانہ خاص سے علمِ لدنی عطا فرمایا ہے۔ (خِضْر اور خَضِرْ دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔)

حضرت خضر ﷺ کے پاس الہامی علم تھا، کتابی (intellectual) اور مکتبی (institutional) علم نہیں تھا۔ وہ حواسِ خمسہ، وجدان، تجربات، عقل کے ذریعے حاصل ہونے والا علم نہیں رکھتے تھے۔ چونکہ وہ نبی بھی نہیں تھے، لہٰذا وحی کا علم بھی ان کے پاس نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی بارگاہِ خاص سے وہبی اور الہامی علم عطا فرمایا تھا۔

حضرت موسیٰ ﷺ نے ملاقات کے دوران حضرت خضر ﷺ سے کہا:

هَلْ اَتَّبِعُکَ عَلٰٓی اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا○[1]

کیا میں آپ کے ساتھ اس (شرط) پر رہ سکتا ہوں کہ آپ مجھے (بھی) اس علم میں سے کچھ سکھائیں گے جو آپ کو بغرضِ ارشاد سکھایا گیا ہے○

گویا حضرت موسیٰ ﷺ حضرت خضر ﷺ کو حاصل علم لدنی کو نہ صرف علم مان رہے ہیں بلکہ اس علم کو ذریعۂ رشد و ہدایت ماننے کے ساتھ ساتھ اس میں سے حصہ بھی مانگ رہے

(۱) الکهف، ۱۸: ۶۶

ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی اس ملاقات کے تناظر میں علم کے درج ذیل مزید نکات بھی سامنے آتے ہیں:

(۱) اپنے سے کم مرتبہ سے بھی حصولِ علم سنتِ اَنبیاء علیہم السلام ہے

قرآنِ مجید نے اس مقام پر علم اور علماء کو حاصل مقام و مرتبہ کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ فرما دیا ہے کہ ایک نبی بھی حصولِ علم کے لیے سفر کر رہے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ حصولِ علم کا یہ سفر اپنے سے کم مرتبہ کے حامل ایک ولی کی طرف ہے۔ بلاشبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ حضرت خضر علیہ السلام سے افضل ہے۔ ان کے تشریف لے جانے سے ثابت ہوا کہ بعض اوقات افضل کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ مفضول (اپنے سے کم فضیلت والے) سے علم لینے جائے۔ گویا بڑا اپنے سے چھوٹے سے بھی علم حاصل کر سکتا ہے اور یہ سنتِ انبیاء ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمیشہ چھوٹا ہی بڑے سے لے یا مفضول ہی افضل سے لے۔ کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین سے بھی اکتساب کرتے اور تابعین، اتباع التابعین سے بھی اکتساب کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول کا درجہ اونچا ہے مگر چونکہ حضرت خضر علیہ السلام کو علمِ لدنی (علم خاص) ملا ہے۔ لہٰذا اس کو لینے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس گئے۔

اس کی مزید وضاحت اس مثال سے بھی ہوتی ہے کہ بڑے اونچے عہدے پر فائز ایک شخص اگر طب (ڈاکٹری) کا علم لینے کے لیے طبیب کے پاس جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس طبیب (ڈاکٹر) سے درجے میں نیچے چلا گیا۔ ایک بڑے اونچے درجے کا عالم اگر کسی خاص ٹیکنالوجی کا علم رکھنے والے کے پاس جائے، یا کسی ماہر کے پاس کوئی خاص مضمون (subject) سمجھنے کے لیے جائے تو اس سے افضل اور مفضول کا تعین نہیں ہوتا۔ جب اللہ کا نبی اپنے سے کم مرتبہ والے کے پاس جاتا ہے تو یہ اُمت کے لیے ایک سنت بنتی ہے۔ اس واقعہ سے مزید برآں یہ بھی ثابت ہوا کہ علم کی تلاش میں صاحبِ علم کے پیچھے جانا، ان سے اکتسابِ علم کرنا اور ان کی مجلسِ علم میں بیٹھنا سنتِ انبیاء ہے۔

(۲) کراماتِ اولیاء، معجزاتِ انبیاء علیہم السلام کا تسلسل ہیں

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنی ذات کی دلیل اور نشانی بنایا ہے۔ لہٰذا ان کے وجود سے اپنی قدرت کے اظہار کے لیے انہیں معجزات عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح ہر ولی اپنے نبی کی دلیل اور نشانی ہوتا ہے اور اس ولی کی کرامت نبی کے معجزات کا تسلسل ہوتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام؛ الغرض کسی بھی نبی کی اُمت کا ولی ہو، اس کی ساری کرامات اس کے نبی کے معجزات کا تسلسل ہوں گی۔ اولیاء اللہ کی کرامات سے اس نبی کے معجزات کا ثبوت ملتا ہے۔ ہر ولی کی کرامت نبی کے معجزے کے تابع اور اس کا تسلسل ہوتی ہے۔

(۳) اُمتِ محمدیہ کے اولیاء کی سب سے بڑی کرامت، کرامتِ علمیہ ہے

اُمت محمدی ﷺ کے تمام اولیاء کی کرامات معجزاتِ محمدی ﷺ کا تسلسل ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے معجزات اگر درخت ہیں تو اُمت محمدی ﷺ میں قیامت تک آنے والے جمیع اولیاء کی کرامات حضور ﷺ کے معجزات کے درخت کی شاخیں اور اس کے پتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اولیاء کی کرامات معجزاتِ محمدی ﷺ کا تسلسل ہیں تو پھر ان اولیاء سے صادر ہونے والی سب سے بڑی کرامت کیا ہے؟ عرف عام میں پانی پر چلنا، ہواؤں میں اڑنا، پتھر توڑ دینا، دلوں میں پیدا ہونے والی خواہشات اور خیالات کو جان لینا اور مردے زندہ کر دینا بہت بڑی کرامت سمجھا جاتا ہے۔ مگر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں:

> یہ تمام اعمال بڑی کرامات نہیں ہیں، اس لیے کہ ہواؤں میں اڑنا بڑی کرامت ہوتی تو مکھیاں اور پرندے سب سے بڑے ولی ہوتے۔ پانی پر چلنا بڑی کرامت ہوتی تو مچھلیاں سب سے بڑی ولی ہوتیں۔ لہٰذا اولیاء کی سب سے بڑی کرامات یہ نہیں بلکہ

ان کی سب بڑی کرامت علمِ صحیح ہے۔[1]

پس جب کراماتِ اولیاء معجزات انبیاء کا تسلسل ہیں اور حضور نبی اکرم ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے جو کتابِ علم ہے، تو اُمت محمدی ﷺ کے اولیاء کی سب سے بڑی کرامت علمِ نافع ہے۔

(۴) علم، ولایتِ کبریٰ کے حصول کا ذریعہ ہے

شیخ عبدالقادر جیلانی امام و سلطان الاولیاء ہیں، غوث الثقلین ہیں، وہ اس مرتبہ قطبیت اور غوثیت تک پہنچنے کا اپنا حال بیان فرماتے ہیں:

دَرَسْتُ الْعِلْمَ حَتّٰی صِرْتُ قُطْبًا

وَنِلْتُ السَّعْدَ مِنْ مَوْلَی الْمَوَالِي[2]

(سچی طلب اور تڑپ کے ساتھ) علم کے حصول نے مجھے مقامِ قطبیتِ کبریٰ پر فائز کر دیا اور میرے مولی سے مجھے علم کے نور کے سبب سارے رتبے نصیب ہو گئے۔

حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں:

طَرِيْقُنَا مُقَيَّدٌ بِالْعِلْمِ: عِلْمُ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ.[3]

ہمارا طریق علم کے ساتھ مقید ہے: یعنی کتاب وسنت کا علم۔

سلوک، ادب، ولایت، تصوف، طریقت اور طریقِ معرفت پر مبنی ہمارا طریق جس سے اولیاء بنتے ہیں، یہ طریق علم کے بغیر طے نہیں ہوتا اور وہ علم کتاب وسنت کا علم ہے۔ گویا علم ناگزیر ہے، جس کے بغیر طریقِ ولایت بھی طے نہیں ہوتا اور نبوت بھی بغیر علم کے نہیں ہے۔

---

(۱) ابن عربی، الفتوحات المكية، ۴:۲۳

(۲) عبد القادر جيلاني، القصيدة الغوثية۔

(۳) ابن القيم، مدارج السالكين، ۲:۱۰۰

۱۱۔ اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ سے لامحدود وسائط اور ابواب کے ذریعے علم عطا فرماتا ہے

اللہ تعالیٰ کے علم دینے کے ذرائع محدود نہیں ہیں جب کہ انسان خود اور اس کے ذرائع محدود ہیں۔ اللہ چونکہ خود غیر محدود ہے، لہٰذا اس کی عطائیں اور ان کے ذرائع بھی غیر محدود ہیں۔ وہ اپنی نعمتیں مختلف ذرائع اور طرق سے عطا فرماتا رہتا ہے۔ وہ جسے چاہے جس طرح چاہے علم عطا کر دے۔ کسی کو سوئے ہوئے، کسی کو جاگے ہوئے، کسی کو چلتے پھرتے، کسی کو پڑھتے ہوئے، کسی کو مراقبہ کرتے ہوئے اور کسی کو سلوک کے طریقے پر چلتے ہوئے علم کی منزل پر پہنچا دے۔ یہ سب اُس کا اپنا فیصلہ اور عطا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ○ (۱)

اللہ جسے (خود) چاہتا ہے اپنے حضور میں (قربِ خاص کے لیے) منتخب فرما لیتا ہے اور اپنی طرف (آنے کی) راہ دکھا دیتا ہے (ہر) اس شخص کو جو (اللہ کی طرف) قلبی رجوع کرتا ہے○

یعنی کسی کو اللہ چن لیتا ہے اور خود منزل پر پہنچا دیتا ہے اور کسی کو اللہ اپنا راستہ دکھا دیتا ہے کہ یہ میرا راستہ اور میرے قرب کا طریقہ ہے، مجھ تک پہنچنا ہے تو اس طریقے پر بڑھتے آؤ۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. (۲)

اور جو لوگ ہمارے حق میں جہاد (اور مجاہدہ) کرتے ہیں تو ہم یقیناً انہیں اپنی (طرف سَیر اور وصول کی) راہیں دکھا دیتے ہیں۔

---

(۱) الشوریٰ، ۴۲: ۱۳

(۲) العنکبوت، ۲۹: ۶۹

یعنی کسی کو اپنی معرفت وقربت کا ایک راستہ اور کسی کو کئی اور راستے دکھا دیتا ہے۔ نبی اپنی محنت، نوافل، عبادات، مشقتوں، ریاضتوں اور تزکیہ نفس کے ذریعے نبی نہیں بنتا، یہ ناممکن ہے بلکہ یہ مرتبہ خاص وہبِ الٰہی ہے، اس نے جسے چن لیا، اسے نبی بنا دیا جبکہ ولایت میں وہب بھی ہے اور کسب بھی ہے۔

۱۲۔ انسانی ذرائعِ علم محدود ہیں

اللہ تعالیٰ کے ذرائعِ علم کے برعکس انسانی ذرائعِ علم محدود ہیں۔ یہ ہماری نادانی ہوتی ہے کہ ہم محدود عقل رکھنے والے لامحدود کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں اور جب ہمیں سمجھ نہیں آتی تو پریشان ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں: 'یہ بات میری عقل میں نہیں آتی۔' یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ انسان کی عقل میں بہت ساری چیزیں بالکل نہیں آتیں جبکہ ہم اُنہیں تسلیم بھی کرتے ہیں۔ مثلاً: کسی انسان کا اپنے ماں باپ کی حلالی اولاد ہونا عقل میں نہیں آتا۔ یہ بھی ہم نشانات، علامات اور بیانات سے معلوم کرتے ہیں۔ ماں باپ نے بتایا کہ ہمارے بیٹے ہو تو سارے مانتے ہیں کہ فلاں کا بیٹا ہے۔ گھرانے والوں نے بتایا کہ تم ان کے بیٹے ہو، اس تصدیق اور گواہی پر مان لیا۔ محلے داروں نے بھی تصدیق کر دی کہ ان کے بیٹے ہو، بس مان لیا۔ یہ سب شہادتیں اور گواہیاں ہیں۔

ماضی میں DNA کی سائنس تو نہیں تھی اور آج بھی ہر کوئی DNA کا ٹیسٹ نہیں کرواتا کہ اپنی ولادت اور نسب کی تحقیق کرائے۔ سائنس تو آج چلی ہے مگر صدیوں سے لوگ نسب کو مانتے چلے آ رہے ہیں کہ فلاں کا بیٹا فلاں ہے۔ اس نسبت کی تصدیق کا علم سماعت و علامات اور نشانات کے ذریعے آیا۔ یہ سمعی چیز ہے۔ انسان کا اپنا نسب بھی عقل میں نہیں آتا مگر پھر بھی وہ تسلیم کیے ہوئے ہے۔ جب ہم عقل میں نہ آنے کے باوجود نشانات اور علامات سے اپنے نسب کو مانتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں تو پھر دیگر چیزیں جو عقل میں نہیں آتیں اُنہیں ماننے میں کیا تامل ہے؟ لہٰذا ہمیں جتنی عقل ہے اتنا ہی اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ہم اگر بیس کلو وزن اٹھا سکتے ہیں تو بیس کلو ہی اٹھانا چاہیے، اپنے اوپر چالیس کلو گرام

کا بوجھ نہ ڈالیں۔ ضرورت سے زیادہ بوجھ اٹھانے پر ہم اپنے آپ کو ہی ہلاکت اور نقصان میں ڈالیں گے۔ ہر ایک کی صلاحیت و طاقت محدود ہے۔ ہر شے کی طرح عقل کی بھی ایک حد ہے۔ کچھ چیزیں اس کے دائرۂ ادراک میں آ سکتی ہیں جبکہ کچھ نہیں آ سکتیں۔ اگر عقل کے ادراک میں نہ آنے والی چیزوں کو بھی عقل کے پیمانے سے جانچنا چاہیں گے یا عقل کو وہاں لے جانا چاہیں گے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ یہ اللہ کا ایک نظام ہے، جس کی پیروی میں ہی نجات ہے۔

اِس تمام بحث کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود عطائیں اور لامحدود ذرائع اگر ہماری عقل وفہم میں نہیں آتے تو اُن کا کلیتًا انکار نہ کریں، کیونکہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور فضل ہوتا ہے کہ وہ اپنے چنیدہ بندوں کو نبوت و ولایت کے ذریعے ایسے لامحدود کمالات، معجزات اور کرامات عطا فرماتا ہے، جن تک انسانی عقل کی رسائی ناممکن ہوتی ہے۔

باب نمبر 6

علمِ نافع اِیمان کو ترقی دیتا ہے

گزشتہ باب میں ہم نے اس امر کا مطالعہ کیا تھا کہ علم، حصولِ ہدایت اور درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ انبیاء کرام علیہم السلام کی فضیلتِ علم کو نمایاں طور پر بیان فرمایا ہے۔ نیز اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے کہ بلندیِ درجاتِ علم سے مشروط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت و ولایت دونوں کے لئے علم کو لازم قرار دیا۔ قرآن مجید میں مذکور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ سے اسی امر کا اظہار ہوتا ہے۔ زیرِ نظر باب میں ہم علم ہی کی فضیلت و اہمیت کے عنوان کے تحت علمِ وحی کے برتر و فائق ہونے کا مطالعہ کریں گے۔

۱۔ علمِ وحی تمام علوم پر فائق ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پرورش کرنے والے چچا (آزر) کو اَہلِ عرب میں اَزمنہ قدیم سے پرورش کرنے والے کے لئے مروج لفظ والد کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

يٰٓاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا○[1]

اے ابا! بے شک میرے پاس (بارگاہِ الٰہی سے) وہ علم آچکا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا تم میری پیروی کرو میں تمہیں سیدھی راہ دکھاؤں گا○

یہاں اُس علم کی طرف اشارہ ہے جو رُشد و ہدایت، فہم و بصیرت اور حقائق کی معرفت کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس آیت کریمہ سے ایک نکتہ یہ واضح ہوتا ہے کہ بالعموم علمِ صحیح کے حامل

---

(۱) مریم، ۱۹:۴۳

صاحبِ علم کی اتباع کرنی چاہیے۔ یعنی اگر وہ علم کتاب وسنت اور وحی ربانی کی ہدایت پر مبنی ہو تو ہر اس شخص پر جس کے پاس اس درجے کا علم نہیں ہے، اس صاحبِ علم کی پیروی لازم ہوتی ہے۔

اس آیت کریمہ سے دوسرا نکتہ یہ واضح ہوا کہ اس علمِ صحیح کی پیروی کی وجہ سے پیروکار بھی ہدایت پا جائے گا۔ گویا علمِ صحیح ہدایت تک پہنچاتا ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ علم اور ہدایت باہم لازم وملزم ہیں۔ واضح رہے کہ ہدایت منزل من اللہ علم سے ملتی ہے۔ کسی اور ذریعے سے حاصل ہونے والا علم اگر منزل من اللہ علم اور وحی پر مبنی علم سے ٹکرا جائے تو پھر ایسا علم خود بہ خود مسترد ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسبت کی وجہ سے وحی پر مبنی علم سب علوم پر فائق ہوتا ہے۔

۲۔ اضافۂ علم کی دُعا اور اس کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ایک اور جہت سے بھی فضیلتِ علم کو واضح فرمایا ہے۔ اس جہت کا تعلق حضور نبی اکرم ﷺ کی علم کے ساتھ والہانہ وابستگی سے ہے۔ اس سے علم کی عظمت وفضیلت مزید اجاگر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو ہدایت فرمائی:

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۭ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۝[1]

پس اللہ بلند شان والا ہے وہی بادشاہِ حقیقی ہے، اور آپ قرآن (کے پڑھنے) میں جلدی نہ کیا کریں قبل اس کے کہ اس کی وحی آپ پر پوری اتر جائے، اور آپ (رب کے حضور یہ) عرض کیا کریں کہ اے میرے رب! مجھے علم میں اور بڑھا دے۝

اس آیت کا آغاز اللہ تعالیٰ کی توحید سے ہوتا ہے اور اس آیت کریمہ کا اختتام حضور ﷺ کو تلقین کی گئی دُعا 'وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا' پر ہوتا ہے (جس پر ہم باب نمبر 4 میں

(۱) طٰہٰ، ۲۰:۱۱۴

مختلف پیرائے میں بحث کر چکے ہیں)۔

یہاں ایک اہم چیز توجہ طلب ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں اور بڑے بڑے انعامات، اکرامات، احسانات اور بلند درجات سے نوازا۔ نیز کائنات میں ہر نعمت معیار اور مقدار دونوں لحاظ سے سب سے زیادہ حضور نبی اکرم ﷺ کو عطا ہوئی، ان تمام نعمتوں میں اضافہ کے لئے ایک ہی قاعدہ ارشاد فرمایا:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ.(۱)

اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم پر (نعمتوں میں) ضرور اضافہ کروں گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر ایک نعمت کے لیے فرمایا کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں اپنی اس نعمت میں تمہارے لئے مزید اضافہ فرماؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن مجید میں یہ حکم نہیں فرمایا کہ فلاں نعمت میں اضافے کے لیے میرے محبوب دعا کیا کریں۔ عمر، اخلاق، تقویٰ، عملِ صالح، صحت و تندرستی اور عافیت و سلامتی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے انسان پر انعامات اور نعمتیں اس حد تک ہیں کہ ہم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔ ارشاد فرمایا:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللهِ لَا تُحْصُوْهَا.(۲)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو (تو) پورا شمار نہ کر سکو گے۔

مگر قرآن مجید میں کسی ایک نعمت کا بھی نام لے کر صراحتاً اس طرح کا حکم نہیں فرمایا کہ اس میں مزید اضافے کے لیے دعا کیا کریں۔ صرف ایک نعمت ایسی ہے جس میں اضافے کی دعا کا حکم فرمایا اور وہ نعمت 'علم' ہے۔ اس کی بابت فرمایا:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًاo(۳)

---

(۱) ابراہیم، ۱۴:۷

(۲) ابراھیم، ۱۴: ۳۴

(۳) طٰہٰ، ۲۰:۱۱۴

اور آپ (ربّ کے حضور یہ) عرض کیا کریں کہ اے میرے رب! مجھے علم میں اور بڑھا دے○

اس سے علم کی قدر و منزلت اور اللہ تعالیٰ کی نگاہِ عظیم میں علم کے مقام و مرتبہ کا اظہار ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو تلقین فرمائی جا رہی ہے کہ میرے حبیب! عرض کیا کریں کہ میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔ معلوم ہوا کہ علم اتنی بڑی نعمت ہے کہ آقا ﷺ کو بھی اس میں ہر وقت اضافے کے لیے دعا کی تلقین کی گئی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ عامۃ المسلمین بھی آقا ﷺ کی سنت کی پیروی میں علم میں اضافہ کے لئے ہمیشہ رب کائنات کی بارگاہ میں ملتمس رہا کریں۔

۳۔ علم ہمیشہ اِرتقاء پذیر رہتا ہے

اس آیت کریمہ سے دوسرا نکتہ یہ واضح ہوتا ہے کہ علم کسی جامد شے کا نام نہیں بلکہ یہ ہمیشہ اِرتقاء پذیر رہتا ہے۔ دیگر علوم کی طرح علمِ نبوت میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جب غارِ حرا میں آقائے دو جہاں ﷺ پر پہلی وحی کا نزول ہوا تو علمِ نبوت کا درجہ کچھ اور تھا اور جب آپ ﷺ دنیا سے رخصت ہوئے تو علمِ رسالت اپنے نکتۂ کمال پر تھا۔ آپ ﷺ کے اپنے مراتبِ علم بھی لحہ بہ لحہ، روز بروز، وقت بوقت بڑھتے چلے گئے اور جب آقا ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو علم کے باب میں کوئی حقیقت ایسی نہیں رہ گئی تھی جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا نہ فرمائی ہو۔ دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ کو اپنی حیاتِ مبارکہ میں کسی گوشے اور کسی امر کی نسبت، یا کسی بھی پہلو کے حوالے سے لاعلمی نہیں رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے وصال سے قبل ایسی ہر حالت کو آگہی سے بدل دیا تھا۔ یہ سب وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِی عِلْمًا سے مستفاد ہوتا ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اللہ کے نبی کی دعا کبھی ردّ نہیں ہوتی اور پھر خصوصاً وہ دعا جس کے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہو۔ اس آیتِ مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ خالقِ دو جہاں، محمد مصطفیٰ ﷺ کے علمِ نبوت میں لحہ بہ لحہ اضافہ فرمانا چاہتا ہے اور انہیں اس درجۂ کمال تک پہنچانا چاہتا ہے کہ اس سے آگے مخلوق کے لیے علم کا کوئی اور درجہ باقی نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ مکرم ﷺ کا علم اس درجے کو پہنچ چکا تھا کہ جہاں تمام مخلوقات کا علم قیامت تک بھی

رسائی حاصل نہ کر سکے گا۔ آپ ﷺ کا علم اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ اس سے آگے صرف اور صرف علمِ خالق یعنی اللہ کے علم کی کارفرمائی ہے۔

۴۔ علمِ نبوتِ محمدی ﷺ کا کمال

عقیدے کا ایک نکتہ اس موقع پر واضح کر دیں کہ جس علم میں اضافے اور مرتبۂ کمال تک پہنچانے کا حکم اللہ تعالیٰ خود فرمائے اور آقا ﷺ تعمیلِ ارشادِ الٰہی میں عمر بھر رَّبِّ زِدْنِی عِلْمًا کی صدا بلند کرتے رہے ہوں تو بتایئے! مرتبۂ علم میں ایسی کون سی شے رہ گئی ہوگی جو حضور نبی اکرم ﷺ کے دامنِ علم میں نہ سمائی ہو۔ آج علمِ مصطفیٰ ﷺ کو محدود کرنے والے حضور ﷺ کو تلقین کی گئی اس دعا کو اس تناظر میں دیکھیں تو اُنہیں اپنے تمام اعتراضات کا جواب خود بہ خود مل جائے گا۔

محبوبِ ربِ دو جہاں حضرت محمد ﷺ پر اعتراض کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ہر معاملے کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے جبکہ اصول یہ ہے کہ کسی بھی معاملے کو اگلے فرد کے حال، مرتبہ، صلاحیت اور استعداد کے مطابق قیاس کرنا چاہیے۔ جب دوسرے بندے کے اصل مقام سے شناسائی ہوگی تو پھر تمام الزامات اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ اسی اصول کی روشنی میں اگر علمِ مصطفیٰ ﷺ کو دیکھا جائے تو پھر کسی اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ آقائے دو جہاں ﷺ کا مقام و مرتبہ یہ ہے:

وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰىo[1]

اور بے شک (ہر) بعد کی گھڑی آپ کے لیے پہلی سے بہتر (یعنی باعثِ عظمت و رفعت) ہےo

یعنی آقا ﷺ کی حیات طیبہ میں ہر اگلا دن آپ ﷺ کو پہلے دن سے بہتر اور بلند رتبے پر فائز کرتا نظر آتا ہے۔ اسی تناظر میں فرمایا گیا کہ مومن کا اگلا دن پچھلے دن کے برابر

(۱) الضحیٰ، ۹۳:۴

رہے تو یہ اس کے لیے خسارہ کی بات ہے۔ اس لئے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مومن کا اگلا دن پچھلے دن سے اس کے ایمان کے بڑھنے کا نقیب ہو اور ایمان کا درجہ، اللہ کے قرب، تقویٰ اور اس کی مشیت کے مدارج بتدریج بڑھتے چلے جانے چاہئیں۔

۵۔ حضور ﷺ کے عملِ اِستغفار کے رموز و اَسرار!

اس موقع پر اس امر کا بیان بھی زیرِ بحث موضوع کو مزید واضح کرے گا کہ جب ہر لمحہ حضور نبی اکرم ﷺ کا مقام و مرتبہ بڑھتا رہتا ہے اور علمِ مصطفیٰ ﷺ کمال سے مزید کمال تر کی طرف محوِ سفر ہی رہتا ہے تو اس فرمانِ مصطفیٰ ﷺ کا کیا مطلب ہے جسے حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

وَاللهِ، إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللهَ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً.(۱)

خدا کی قسم! میں روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ بارگاہ خداوندی میں استغفار اور توبہ کرتا ہوں۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

مَا أَصْبَحْتُ غَدَاةً قَطُّ إِلَّا اسْتَغْفَرْتُ اللهَ فِيْهَا مِائَةَ مَرَّةٍ.(۲)

---

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب الدعوات، باب استغفار النبي ﷺ في اليوم والليلة، ۵: ۲۳۲۴، رقم: ۵۹۴۸

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۲۸۲، ۳۴۱، رقم: ۷۷۸۰، ۸۴۷۴

۳۔ نسائي، السنن الكبرىٰ، ۶: ۱۱۴، رقم: ۱۰۲۶۷

۴۔ ابن حبان، الصحيح، ۳: ۲۰۴، رقم: ۹۲۵

۵۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۸: ۳۲۹، رقم: ۸۷۷۰

(۲) ۱۔ ابن أبي شيبة، المصنف، ۷: ۱۷۲، رقم: ۳۵۰۷۵

۲۔ نسائي، السنن الكبرى، ۶: ۱۱۵، رقم: ۱۰۲۷۵

۳۔ عبد بن حميد، المسند، ۱: ۱۹۶، رقم: ۵۵۸

۴۔ طبراني، الدعاء: ۵۱۰، رقم: ۱۸۰۹

کوئی صبح طلوع نہیں ہوتی مگر میں اس میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ سرورِ کون و مکاں ﷺ تو گناہوں سے پاک اور معصوم عن الخطا ہیں۔ استغفار تو گناہ، غلطیوں، خطاؤں اور لغزشوں کے ازالے کے لیے ہوتا ہے۔ جب نبی گناہوں اور لغزشوں سے مبرا ہے تو وہ استغفار کیوں کرتا ہے؟

اس سوال کے کئی جواب ہیں۔ اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف ایک نکتہ تحریر کرتا ہوں کہ اس ضمن میں عرفاء، محدثین اور اہل علم نے یہ بیان کیا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کی ہر گھڑی پہلے سے اونچے رتبے والی ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کا بعد میں آنے والا لمحہ خوب سے خوب تر کی بہترین مثال لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر اگلا دن پچھلے سے زیادہ افضل ہوتا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ آپ ﷺ کا درجہ بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہوتا ہے۔ جب آپ ﷺ ایک بلند رتبے پر کھڑے ہو کر پیچھے نگاہ ڈالتے تو پچھلے والا رتبہ موجودہ کی نسبت کم دکھائی دیتا۔ لہٰذا آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی بندگی بجا لانے کے اعتبار سے موجودہ رتبے کے مقابلے میں پچھلے رتبے کو کم خیال کرتے ہوئے استغفار کے لائق سمجھتے۔

گویا آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے ہر نئے رتبے پر فائز ہوتے ہوئے دیکھتے کہ گزشتہ لمحہ اور رتبہ اگلے لمحے اور رتبے کے مقابلے میں نیچے تھا، لہٰذا وہ محسوس فرماتے کہ اللہ کا حقِ عبدیت ادا کرنے میں موجودہ لمحہ کی نسبت کچھ کمی رہ گئی ہے، جس شان سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق اب ادا ہو رہا ہے، پچھلا لمحہ اس سے نیچے تھا تو آپ ﷺ اس موقع پر استغفار کرتے کہ شاید پچھلے لمحہ اور رتبہ پر تیری بندگی کا حق شایانِ شان ادا نہ ہوا۔ اس طرح جوں جوں لمحہ بہ لمحہ، آپ ﷺ کی شان اور رتبہ بلند ہوتا چلا جاتا اور آپ ﷺ پلٹ کر پچھلے رتبہ کو دیکھتے تو وہ رتبہ موجودہ رتبہ کے مقابلے میں کم تر ہوتا۔ اس طرح دن میں ستر یا سو مرتبہ آپ ﷺ کی حالت مبارک متغیر ہوتی اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغفار کے طالب ہوتے۔ گویا ستر یا سو مرتبہ استغفار کہنے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن میں آپ ﷺ کا رتبہ سو مرتبہ بلند کرتا جاتا ہے۔

۶۔ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؟

حضور نبی اکرم ﷺ کی اسی شان وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى کا فیض اُمتِ محمدیہ کو بھی نصیب ہوا ہے۔ اسی لیے مومن کی شان میں کہا گیا ہے:

اَلصَّادِقُ يَتَقَلَّبُ فِي الْيَوْمِ أَرْبَعِيْنَ مَرَّةً.(۱)

یعنی صادق شخص کے حال میں دن میں چالیس مرتبہ تغیر رونما ہوتا ہے۔

جس شخص کے حال میں تغیر پذیری نہ ہو وہ سمجھ لے کہ حالت نفاق میں ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ اگر ایمان ہے تو اس میں نمو بھی ہوگی، ارتقاء بھی ہوگا اور اس میں ترقی بھی ہوگی، اس لئے کہ درحقیقت ایمان کا تقاضا یہی ہے۔

مثلاً: اگر آپ کوئی پودا زمین میں لگاتے ہیں۔ اس پودے کو اگر اچھی زمین بھی میسر ہو، کھاد بھی معیاری ہو، پانی بھی مناسب وقت پر مل رہا ہو اور دھوپ کا بھی مناسب انتظام ہو، اگر یہ سارے تقاضے پورے ہو رہے ہوں تو پودے کی نشو ونما بھی اچھی ہوگی اور وہ آئے روز نمو کرتا جائے گا۔ اگر زمین اچھی ہو، کھاد، پانی، روشنی اور دیگر ضروریات بطریقِ اَحسن مل رہی ہوں اور مالی بھی اس کی مناسب دیکھ بھال کر رہا ہو، اس کے باوجود اگر پودا نہ بڑھے تو اس کا مطلب ہے کہ اُسے کوئی کیڑا یا مرض لگا ہوا ہے۔ ایسے حالات میں باغبان کو تشویش ہوتی ہے کہ پودے میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر پودے کا علاج کیا جاتا ہے۔ اس کے اردگرد خودرَو جڑی بوٹیاں اکھاڑتے ہیں اور اس پر سپرے کرتے ہیں۔

علی ہٰذا القیاس یہی ایمان کی مثال ہے۔ جس طرح پودا نہ بڑھے تو تشویش ہوتی ہے، عین اسی طرح ایمان بھی ایک پودا ہے جو قلب کی زمین پر اگتا ہے۔ اگر وہ ہر روز نہ بڑھے تو مومن کو تشویش ہونی چاہیے کہ میرے قلب کی زمین میں کون سی خرابی ہے جس بناء پر اس کی نمو

(۱) ۱۔ ابن القیم، مدارج السالکین، ۲: ۲۷۴
۲۔ سبکی، طبقات الشافعیة الکبری، ۲: ۲۶۵

رُکی ہوئی ہے؟ ہوسکتا ہے کہ اسے نفاق، حرص یا ریاکاری کا مرض لاحق ہوگیا ہو، ممکن ہے کہ نیت میں کوئی خلط ملط ہوگیا ہو، کوئی غیر خالص چیز مل گئی ہو یا اس میں گناہوں کی کثافت آ گئی ہو، اسے اطاعتِ الٰہی کا پانی نہ مل رہا ہو۔ اسے خلوص پر مبنی اللہ کے قرب اور رضا کی نیت نہ مل رہی ہو اور اس کی باقاعدہ دیکھ بھال نہ ہو رہی ہو۔

الغرض اس ضمن میں سو اسباب ہیں۔ ان حالات میں مومن کو تشویش لاحق ہوتی ہے کہ میرے ایمان کا پودا ایک ہی جگہ کیوں کھڑا ہے اور کیا وجہ ہے کہ یہ بڑھ کیوں نہیں رہا؟ اس لیے کہا گیا کہ جس کے ایمان کی حالت میں تغیر (ارتقاء)، ترقی کرنا، توانا ہونا اور بڑھنا نہ ہو، وہ جان لے کہ وہ منافق ہے۔ اس لئے کہ مومن تو دن میں درجنوں مرتبہ اپنا حال بدلتا ہے، یعنی اس کی حالتِ ایمانی میں تغیر و تبدل آتا رہتا ہے، اس کا ایمان مسلسل ارتقاء پذیر رہتا ہے۔

اب اس نکتے کا اطلاق حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر یا کسی اور پیکرِ نبوت پر کریں۔ قابلِ غور بات ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے قلب کی مقدس سرزمین سے اچھی کس کے دل کی زمین ہوگی اور پھر پیغمبر کی اتباع میں مومن کے سینے کی دھرتی سے کس کی زمین اچھی ہوگی اور اس ضمن میں اللہ سے بڑھ کر بھلا اور کون باغبان ہوگا؟ حضور نبی اکرم ﷺ کے علم کے پودے کو بڑھانے، پرورش اور دیکھ بھال کرنے والی ذات ربِ لم یزل خود ہے اور زمین قلبِ مصطفیٰ ﷺ ہے۔ وہ دل جس پر اللہ اپنی وحی اتارتا اور اس میں دیدارِ الٰہی جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ قلب جس کے بارے میں فرمایا گیا:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰىo[1]

(اُن کے) دل نے اُس کے خلاف نہیں جانا جو (اُن کی) آنکھوں نے دیکھاo

پس قلبِ مصطفیٰ ﷺ کی انہی خوبیوں کی بناء پر آپ ﷺ کے احوال، کیفیتِ ایمانی، درجات، مراتب، صلاحیتوں، استعداد، علم، تقویٰ اور پرہیزگاری کی شان میں لمحہ بہ لمحہ سُرعتِ رفتاری سے اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى کا انعکاس آپ ﷺ کے ہر

(۱) النجم، ۵۳:۱۱

لمحے اور ہر حال میں ہوتا رہتا ہے اور یہی چیز آپ ﷺ کے علم کے بارے میں بھی ہے کہ حضور ﷺ کے علم میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ غارِ حرا میں جب اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ کے ذریعے رابطہ جڑا تھا تو اُس وقت علم کی کیفیت کچھ اور تھی۔ اگلے ایام اور ماہ و سال میں وہ کیفیت نہ تھی بلکہ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ رَّبِّ زِدْنِی عِلْمًا کے ذریعے یہ سلسلہ ارتقاء جاری رہا اور بالآخر علم اپنے درجۂ کمال پر پہنچ گیا۔ علم کے وہ تمام سمندر، جو خالقِ دو جہاں نے اپنی مخلوق کے لیے ممکن بنائے تھے، وہ سب کے سب آقائے دوجہاں ﷺ کے قلبِ اقدس میں جذب فرما دیے۔ آپ ﷺ کی شانِ اقدس میں تمام علم سما گیا، صرف وہ علم باقی رہ گیا جو خالقِ کائنات کے شایانِ شان تھا اور مخلوقات میں سے کوئی بھی اس میں شریک نہ ہوسکتا تھا۔ گویا علم کی صورت میں نعمت کے اضافہ کی ایک واحد دعا ہے کہ جس کو مزید مانگنے کی تلقین فرمائی اور اس کے سوا کسی اور نعمت پر زور نہیں دیا۔

۷۔ علم باعثِ نجات ہے

گذشتہ سطور میں ہم اس امر کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ ہر پیغمبر کے علم و حکمت اور حکم نبوت کو اللہ تعالیٰ نے باہم جوڑا ہے، یعنی دونوں کو لازم و ملزوم ٹھہرایا ہے۔ علم اور نبوت کے اس تعلق کے علاوہ علم کی یہ شان بھی ہے کہ علم باعثِ نجات ہے۔ علمِ صحیح وہی ہوتا ہے جو بندے کو خبائث اور برے کاموں سے نجات دے۔ جو علم برے کام، فسق و فجور، گندگی، خبائث، بری عادات، برے اخلاق اور برے اعمال سے نجات نہ دے، وہ علم ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کے حوالے سے مذکورہ دونوں پہلوؤں کا قرآن مجید میں ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَلُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓىِٕثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ○[1]

(۱) الأنبیاء، ۲۱: ۷۴

اور لوط (علیہ السلام) کو (بھی) ہم نے حکمت اور علم سے نوازا تھا اور ہم نے انہیں اس بستی سے نجات دی جہاں کے لوگ گندے کام کیا کرتے تھے۔ بے شک وہ بہت ہی بری (اور) بدکردار قوم تھی○

آیئے! اب اس آیت مبارکہ کا اطلاق علمِ صحیح اور باعثِ نجات علم کے تناظر میں کرتے ہیں۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ جو علم اَعمالِ سیئہ کو ختم نہ کرے اور ان کی جگہ اعمال صالحہ، تقویٰ، قربتِ الٰہی کا شوق، پرہیز گاری اور آخرت و جنت کی طرف رغبت پیدا نہ کرے، برے اعمال، بری عادات، برے افعال و حرکات سے بندے کو نجات نہ دے، وہ علم، علمِ صحیح نہیں ہے بلکہ وہ صرف سفید کاغذ پر تحریر کردہ سیاہ حروف ہیں۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکمِ نبوت اور علم بیان کرکے پھر فرمایا: وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ یعنی وہ قریہ جہاں فحش اور برے کام ہوتے تھے، اس سے نجات ملی؛ مگر پہلے علم کا ذکر کیا۔ آیت مبارکہ میں مذکور حکمت، علم اور نجات من الخبائث اِن تین چیزوں کو باہم جوڑا جائے تو یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ علم کے اندر ایک in-built خوبی، شان اور تاثیر یہ ہے کہ وہ تقویٰ سے محبت کرتا ہے، وہ مَن کی کیفیت اور اندر کے حال کو بدلتا ہے، پرہیزگاری لاتا ہے اور خبائث و برائیوں سے نجات دلاتا ہے۔

اسی طرح علم اور نبوت دونوں رفعتوں کا اکٹھا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے حوالے سے بھی کیا گیا ہے:

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا.(1)

چنانچہ ہم ہی نے سلیمان (علیہ السلام) کو وہ (فیصلہ کرنے کا طریقہ) سکھایا تھا اور ہم نے ان سب کو حکمت اور علم سے نوازا تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس فضیلت کا اظہار کرنے کے بعد سب انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر فرمایا کہ ہم نے ان سب کو علم اور حکمت سے نوازا تھا۔ گویا تمام انبیاء علیہم السلام کا بالجملہ ذکر

(1) الأنبياء، 21:79

کر کے ان کی شان بیان فرما دی کہ ان کی نمایاں عظمت ہی یہ تھی کہ وہ سب کے سب صاحبانِ علم وحکمت تھے۔

۸۔ ذرائعِ علم

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد ذرائعِ علم کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کچھ ذرائع علم کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ○[1]

تو کیا انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی کہ (شاید ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل (ایسے) ہو جاتے جن سے وہ سمجھ سکتے یا کان (ایسے) ہو جاتے جن سے وہ (حق کی بات) سن سکتے، تو حقیقت یہ ہے کہ (ایسوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں○

۱۔ آیت مبارکہ میں ذرائع علم میں سے ایک ذریعہ علم 'مشاہدہ' کا ذکر ہے کہ مشاہدات سے بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے کہیں سیر کرنا، زمین میں چلنا پھرنا، گزشتہ اُمم اور قوموں کے کھنڈرات کو دیکھنا، اجڑے ہوئے محلات کو دیکھنا، جن پر سزائیں اور اللہ کے عذاب اترے، ان کے حالات کو دیکھنا، یہ تمام مشاہداتِ علم ہی ہیں جن کے ذریعے اُنہیں دنیا کی بے ثباتی کا علم ہو رہا ہے۔

۲۔ اس آیت مبارکہ میں دیگر ذرائع علم دل، کان اور آنکھیں بھی مذکور ہیں۔ یعنی ان کے دلوں کو وہ صلاحیت اور استعداد مل جاتی کہ وہ بات کو سمجھ سکتے ہیں اور ایسے کان مل جاتے کہ وہ سننے لگتے ہیں۔

---

(۱) الحج، ۲۲:۴۶

اب یہاں پر کانوں کا بہرا پن مراد نہیں ہے۔ کان تو ہر ایک کے ہیں مگر یہ سننا دو قسموں کا ہے:

۱۔ ایک وہ سننا جو کہ فہم نہ دے۔

۲۔ ایک وہ سننا جو صحیح فہم دے۔

یہاں مراد ایسے کان کا مل جانا ہے کہ جن کی مدد سے وہ سن سکتے یعنی حقیقت کو سمجھ سکے۔

پھر قرآن مجید نے اس نکتے کو مزید واضح فرمایا:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ○[1]

تو حقیقت یہ ہے کہ (ایسوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

یہاں اشارہ آنکھوں کے اندھے پن کی طرف نہیں بلکہ اس طرف ہے کہ ان کے قلوب اندھے ہیں اور ان کے اپنے دماغوں کی حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی۔ اس طرح ذرائع علم کو اور بڑھا دیا ہے۔

کتاب ذریعہ علم ہے

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے کتاب کو بھی ذریعہ علم قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ط اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ○[2]

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں ہے، بے

---

(۱) الحج، ۲۲:۴۶

(۲) الحج، ۲۲:۷۰

شک یہ سب کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے، یقیناً یہ سب اللہ پر (بہت) آسان ہےo

جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے، اس تمام کا کتاب میں درج ہونے کا بیان اس امر کو واضح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کو علم کا استعارہ قرار دیا ہے۔

یہ آیات علم کی حقیقت و ماہیت اور علم کے مصادر و حالات کو بیان کر رہی ہیں۔

۹۔ علمِ حقیقی کے ذرائع اور مصادر

علم کے طرق، وسائل، آلات، ذرائع اور مصادر کیا ہیں جن سے علم حاصل ہوتا ہے اور ان ذرائع کی کیا حیثیت ہے؟ اس پر فلسفیوں نے اپنے اپنے انداز سے گفتگو کی ہے۔ ارسطو کے زمانے سے لے کر عرب دنیا کے وہ مسلمان فلسفی جن کی کتب مدارس میں صدیوں پڑھائی جاتی رہی ہیں، ان تمام فلسفیوں کا علم، آلاتِ علم، ذرائعِ علم، مصادرِ علم، وسائلِ علم، علم کی حقیقت، ماہیت اور وسائل پر ایک نقطہ نظر تھا۔ بعد ازاں علم کے ہی تناظر میں علم الکلام بھی ان کا موضوع بنا۔ متکلمین نے اس پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ پھر علم الکلام سے ہمارے فقہاء، اصولیین اور علم اصول پر بات کرنے والوں نے بھی اخذ کیا۔ اصول فقہ کی اکثر بڑی کتب، علم الاصول اور اصول فقہ پر ہیں۔ وہ علم کی ماہیت اور حقیقت پر بھی بات کرتی ہیں۔ الغرض متکلمین جب علم العقائد اور علم الکلام پر لکھتے اور عقیدہ و علم الکلام کی زبان میں بات کرتے ہیں تو وہ بھی اکثر و بیشتر علم کی ماہیت، حقیقت، اس کے آلات، ذرائع، وسائل اور اس کے اثرات و احکامات پر بھی بات کرتے ہیں۔ فلاسفہ، متکلمین اور اصولیین کا بھی یہ مشترک مضمون رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں علم ایک ایسا موضوع ہے جو جہاں بہت سارے علوم اور فنون میں کام دیتا ہے اور 'العلم' بذات خود ایک موضوع (subject) بن گیا ہے جس کے باقاعدہ اصول موجود ہیں۔

اب جدید سائنسی علم (scientific knowledge) اور اس کے ذرائع آگئے ہیں۔ علم تو بہر صورت علم ہی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ذرائع بڑھتے چلے جا رہے ہیں،

انہی بنیادوں پر ان دائروں میں توسیع ہوتی چلی گئی، اس کے طریقہ کار اور حالات بدلتے چلے گئے، مگر علم کی اصل وہی ہے۔

۱۰۔ کسی چیز کی حقیقت تک رسائی اُس سے متعلقہ علم سے ہی ممکن ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح فرما دیا ہے کہ ہر مضمون/ موضوع کا ایک خاص علم ہوتا ہے۔ اُس خاص متعلقہ علم کے بغیر اس موضوع پر کلام کرنا گم راہی کا راستہ کھولتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ○[1]

اور کچھ لوگ (ایسے) ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم و دانش کے جھگڑا کرتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں○

گویا علم کے بغیر تکرار کرنے کا نتیجہ سرکش شیطان کی پیروی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اسماء و افعال، اس کی شانِ خالقیت اور اس کے دیگر پہلوؤں جیسے ادق اور منفرد موضوع پر ایک ان پڑھ آدمی تو بات ہی نہیں کر سکتا۔ وہ کیا اور کتنی دیر بات کرے گا؟

اس آیت مبارکہ میں ایسے لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانہ اقدس میں موجود تھے۔ مفسرین نے ان کے نام بھی بتائے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اسماء و افعال اور تخلیقِ خلق پر بحث کرتے تھے (مگر ہم یہاں تفسیری پہلو زیر بحث نہیں لائیں گے)۔ وہ موت کی حقیقت اور بعث بعد الموت پر بحث کرتے تھے کہ مرنے کے بعد ہڈیاں خاک میں مل جائیں گی تو کس طرح سے نُشور ہوگا،؟ یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ حشر کب اور

---

(۱) الحج، ۲۲:۳

کیسے بپا ہوگا؟ وہ ان معاملات کو رد کرتے اور اللہ تعالیٰ کے ان اوصاف کے بارے میں بغیر علم کے جھگڑا کرتے تھے۔ ان کے پاس اپنا علم تو تھا ہی نہیں، وہ محض اپنی عقل وفہم سے رائے قائم کرتے تھے۔ قرآن مجید نے ان فلسفیوں کے مجرد رائے سے بحث کرنے کے طریقِ کار کو ردّ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسا کرنا سرکش شیطان کی پیروی کرنے کے مترادف ہے۔ نیز قرآن مجید نے یُجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ فرما کر اُن کے علم کی نفی کی کہ ان کے پاس علم نہیں ہے اور وہ بغیر علم کے ان امور پر بحث کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بحث کرنے والے اللہ تعالیٰ کے اَسماء وصفات، اَفعال، قدرت، خلق اُولیٰ اور نشأۃ بعد الموت کی نفی جس علم کی بنیاد پر کر رہے تھے اور جسے وہ اپنے طور پر علم سمجھ رہے تھے، قرآن مجید نے واضح کر دیا کہ وہ علم زیر بحث موضوع تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ اس علم میں موضوع کی صحیح معرفت اس کا احاطہ اور کامل ادراک کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس علم کی حدود انتہائی محدود ہیں اور اس میں صحت اور ہدایت کا فقدان ہے۔ اس علم کی سمت درست نہ ہونے کے باعث اس میں اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ اس موضوع پر گفتگو اور بحث کرتے ہوئے کسی صحیح مقام اور نتیجے پر پہنچا جا سکے۔

لہٰذا جن معلومات، فہم اور ذہنی تصورات کے تحت وہ اللہ تعالیٰ کی حقیقت کی نفی کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی نفی کردی کہ تم جس شے کو علم سمجھے بیٹھے ہو، یہ علم ہی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ایسی صورت بھی ہوتی ہے کہ انسان جسے علم سمجھتا ہے، قرآن اس کی نفی کرتے ہوئے فرما رہا ہے کہ وہ علم ہی نہیں ہے۔ بعض اوقات علم ایک چیز کو جاننے کے لیے کچھ مناسب راہ نمائی تو کر دیتا ہے مگر اس سے اوپر والے درجے پر اس علم کی قابلیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ راہ نمائی کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ گویا اب اس مرحلہ پر تو اس موضوع و مقام کے لیے وہ علم نہ رہا۔

اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کے اختتام پر پھر یہی فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا ہُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیۡرٍ ○[1]

(۱) الحج، ۲۲:۸

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ (کی ذات و صفات اور قدرتوں) کے بارے میں جھگڑا کرتے رہتے ہیں بغیر علم و دانش کے اور بغیر کسی ہدایت و دلیل کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے (جو آسمان سے اتری ہو)○

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین سے تین چیزوں کی نفی فرمائی:

۱۔ ان کے پاس نہ تو علم ہے۔

۲۔ ان کے پاس نہ ہی ہدایت ہے۔

۳۔ ان کے پاس نہ ہی روشن کتاب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آیتِ مبارکہ میں ہدایت اور کتابِ منیر (روشن کتاب) کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ قرآن مجید خالق کا کلام ہے۔ اس لیے یہ اُم الکتاب محض مترادفات بیان نہیں فرماتی کہ ایک لفظ کے مترادف کے طور پر دو یا چار الفاظ وارِد کر دے۔ ایسا نہیں ہے! قرآن حکیم کے ہر لفظ کا اپنا الگ معنی، اپنا اطلاق اور اپنی ایک معنویت ہے۔ لہٰذا اِس موقع پر بھی علم، ہدایت اور کتابِ منیر ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر بیان نہیں ہوئے۔

۱۱۔ علم، ہدایت اور کتابِ منیر کے فہم کے لیے قرآنی اَمثال

علم کیا ہے؟ ہدایت کیا ہے؟ کتاب منیر کیا ہے اور ان کی حدود کتنی اور کیا کیا ہیں؟ ان کی ماہیتوں میں کیا کیا فرق ہے؟ کس کس کا حکم قابلِ قبول ہے اور کس کا حکم نا قابلِ قبول ہے؟ کس کا حکم کس باب میں قبول کرنا ہے اور کس کا حکم کس باب میں قبول نہیں کرنا ہے؟ ان موضوعات پر گفتگو سے قبل قرآن مجید کی مذکورہ آیات یعنی سورۃ الحج کی آیت نمبر 3 اور آیت نمبر 8 کے درمیان آنے والے مضمون پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اِن دو آیات کے درمیان آنے والے مضمون کی کیا اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے آغاز میں بھی یہ فرمایا کہ 'علم کے بغیر اللہ کی شان میں جھگڑتے ہیں' اور اختتام پر بھی یہ فرمایا کہ 'علم، ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کی شان میں جھگڑتے ہیں'۔ ان دو آیات کے درمیان یہ دلیل ایسی ہے جسے ہر صاحبِ علم بھی

سمجھ سکتا ہے، صاحبِ ہدایت بھی پہچان سکتا ہے اور صاحبِ کتابِ منیر بھی اس کی حقیقت کو پرکھ سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ○[1]

اور اسے دوزخ کے عذاب کا راستہ دکھائے گا○

یعنی وہ لوگ جو گم راہ ہو جاتے ہیں، گم راہی انہیں دوزخ کا راستہ دکھاتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جو لوگ گم راہ ہوتے ہیں اور وہ اپنی دانست میں گم راہی کو ہی ہدایت کا راستہ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ وہ حق شناسی نہ ہونے کے سبب سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم حق پرست ہیں۔ اگر ان کو یہ پتہ چل جائے کہ ہم گم راہ ہیں تو وہ فوراً اپنا قبلہ درست کرلیں۔ وہ گم راہی اُنہیں اپنے اَحوال پر غور کرنے کی فرصت نہیں دیتی بلکہ انہیں مزید گمراہیوں کی گھاٹیوں میں پہنچاتے ہوئے دوزخ میں لے جاتی ہے۔

(۱) تشکیلِ اِنسان اور دیگر مراحلِ اِرتقاء

گم راہی اور ہدایت کا ذکر کرنے کے بعد اگلی آیت میں اس مکمل مضمون کا ذکر کیا کہ کفار و مشرکین میں بعض لوگ کیا بحث کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں رد کرتے ہوئے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ط وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ج وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ م بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا.[2]

---

(۱) الحج، ۲۲:۴

(۲) الحج، ۲۲:۵

اے لوگو! اگر تمہیں (مرنے کے بعد) جی اٹھنے میں شک ہے تو (اپنی تخلیق و اِرتقاء پر غور کرو کہ) ہم نے تمہاری تخلیق (کی کیمیائی ابتداء) مٹی سے کی پھر (حیاتیاتی ابتداء) ایک تولیدی قطرہ سے پھر (رِحمِ مادر کے اندر جونک کی صورت میں) معلّق وجود سے پھر ایک (ایسے) لوتھڑے سے جو دانتوں سے چبایا ہوا لگتا ہے، جس میں بعض اعضاء کی ابتدائی تخلیق نمایاں ہو چکی ہے اور بعض (اعضاء) کی تخلیق ابھی عمل میں نہیں آئی تاکہ ہم تمہارے لیے (اپنی قدرت اور اپنے کلام کی حقانیت) ظاہر کر دیں، اور ہم جسے چاہتے ہیں رحموں میں مقررہ مدت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر ہم تمہیں بچہ بنا کر نکالتے ہیں، پھر (تمہاری پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ، اور تم میں سے وہ بھی ہیں جو (جلد) وفات پا جاتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو نہایت ناکارہ عمر تک لوٹائے جاتے ہیں تاکہ وہ (شخص یہ منظر بھی دیکھ لے کہ) سب کچھ جان لینے کے بعد (اب پھر) کچھ (بھی) نہیں جانتاo

کفار و مشرکین اس امر پر بحث کرتے ہوئے انکار کرتے تھے کہ مردہ ہو جانے کے بعد جب ہڈیاں، گوشت، ہمارے اعصاب، جلد، یہ سب کچھ خاک میں مل کر خاک ہو جائے گا اور کچھ نہیں بچے گا تو ہم دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے؟ بعث بعد الموت یعنی قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونا کیسے ہوگا؟ ان کی یہ بحث بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر کتابِ منیر کے ہوتی تھی۔

قرآن مجید نے اس پر دلائل علم دیے اور فرمایا: اے لوگو! اگر تم مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک رکھتے ہو، تو پھر اپنی تخلیق اور ارتقاء پر بھی غور کرو۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے درج ذیل مراحل کو بطور دلائل بیان فرمایا:

(i) فَاِنَّا خَلَقْنٰـكُمْ مِّنْ تُرَابٍ

ہم نے جب تمہاری پہلی تخلیق مٹی سے کی ہے، تو پھر تمہارا مٹی سے دوسری بار اٹھانا کیا مشکل ہے؟ جب تم کچھ بھی نہ تھے تو اس رب نے تمہاری اصل کو مٹی سے بنایا، اب اسی پاک ذات کا تمہیں دوبارہ مٹی سے اٹھانا کیا مشکل ہوگا؟

(ii) ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ

اللہ تعالیٰ نے تمہاری کیمیائی ابتداء مٹی سے فرمائی، پھر تمہاری حیاتیاتی اِبتدا ماں کے رحم میں ہوئی۔ حیاتیاتی اور کیمیائی ابتدا وہ تاریخ ہے کہ کس طرح نسلاً بعد نسل تشکیل ہوتی چلی گئی۔ جب تمہاری حیاتیاتی ابتدا کا وقت آیا تو تمہاری ابتدا ایک نطفہ سے یعنی تولیدی قطرہ، ایک چھوٹی سی بُوند سے ہوئی۔

(iii) ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ

پھر ماں کے پیٹ کے اندر جونک کی طرح تمہیں ایک معلق وجود بنا دیا۔

(iv) ثُمَّ مِنۡ مُّضۡغَةٍ

پھر ایک معلق وجود سے تمہیں ایک ایسے لوتھڑے میں منتقل کیا جو چبایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

(v) مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ

جس میں بعض اعضاء کی ابتدائی تخلیق نمایاں ہو چکی ہے کہ اِس لوتھڑے کے اندر جسم کے اعضاء بن رہے ہیں اور بعض اعضاء کی تخلیق ابھی عمل میں نہیں آئی۔ یعنی وہ دکھائی نہیں دیتے کہ یہ اعضاء بن رہے ہیں۔

اِن مراحل کا ذکر کرنے کے بعد لِنُبَيِّنَ لَكُمۡ کے ذریعے اس امر کا اظہار فرمایا کہ ان مراحل کا مقصد یہ ہے کہ تاکہ ہم تمہارے لیے اپنی قدرت اور اپنے کلام کی حقانیت ظاہر کریں۔

اللہ تعالیٰ یہاں ان حقائق کو بیان فرما رہا ہے کہ بغیر علم کے تم شور مچاتے اور جھگڑا کرتے ہو۔ یہ نبی اپنی وحی کے ذریعے تمہیں غیب کے وہ حقائق بتاتے ہیں جو کئی پردوں کے پیچھے ماں کے رحم میں تشکیل پا رہے ہیں۔ یہ علم، ہدایت اور کتابِ منیر ہے۔

(vi) رحمِ مادر میں بچے کی تشکیل کا ذکر فرما کر مزید دلائل دیتے ہوئے فرمایا:

وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی.

اور پھر ہم جسے چاہتے ہیں رحموں میں مقرر مدت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض بچے رحم سے گر جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ جنہیں چاہتا ہے وہ رحمِ مادر میں مقررہ مدت تک محفوظ رہتے ہیں۔

(vii) جن بچوں کو وہ رحمِ مادر میں محفوظ رکھتا ہے، اب ان کی پیدائش کے بعد کے مراحل بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا.[1]

پھر ہم تمہیں بچہ بنا کر نکالتے ہیں، پھر (تمہاری پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ، اور تم میں سے وہ بھی ہیں جو (جلد) وفات پا جاتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو نہایت ناکارہ عمر تک لوٹائے جاتے ہیں تاکہ وہ (شخص یہ منظر بھی دیکھ لے کہ) سب کچھ جان لینے کے بعد (اب پھر) کچھ (بھی) نہیں جانتا۔[2]

یعنی کچھ لوگ جوانی کی عمر میں جلد وفات پا جاتے ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو بڑھاپے تک رہتے ہیں۔ جب ان کے لیے اٹھنا، بیٹھنا اور چلنا پھرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ طویل العمری اور ضعف و نزاری کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اس عمر تک بھی جاتے ہیں جہاں سب کچھ جان لینے بعد بھی وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ اسے نسیان ہونے لگ جاتا ہے، بھولنے لگ جاتا ہے، اس کے اعضاء مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ جس طرح اس کے اعضاء اچھے

---

(۱) الحج، ۲۲: ۵

(۲) اِنسانی تخلیق کے کیمیائی و حیاتیاتی مراحل اور اِرتقاء کی مکمل تفصیلات جاننے کے لیے راقم کی کتب - 'اِسلام اور جدید سائنس' اور 'اِنسان اور کائنات کی تخلیق و اِرتقاء' کا مطالعہ فرمائیں۔

طریقے سے ابتدا میں کام نہیں کرتے تھے، اب بڑھاپے میں بھی وہی کیفیت پلٹ آتی ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم فرماتا ہے:

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ○[1]

اور ہم جسے طویل عمر دیتے ہیں اسے قوت وطبیعت میں واپس (بچپن یا کمزوری کی طرف) پلٹا دیتے ہیں، پھر کیا وہ عقل نہیں رکھتے○

گویا پوری انسانی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے اسے اس بات کی دلیل کے طور پر بیان فرما دیا کہ یہ لوگ اللہ کے بارے میں اُس چیز پر جھگڑا کرتے ہیں جن کا انہیں سرے سے علم ہی نہیں ہے۔ اللہ کی ذات تو وہ ذات ہے جس نے اپنے نبی کو وحی کے ذریعے تمام علومِ غیبیہ پر مطلع فرما دیا ہے۔

(۲) زمین کی زرخیزی کے مراحل کا بطور دلیل ذکر

انسان کی نشو ونما اور اس کی ابتدا اور ارتقا بطورِ دلیل بیان کرنے کے بعد منظر بدلا اور فرمایا:

وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ○[2]

اور تو زمین کو بالکل خشک (مُردہ) دیکھتا ہے پھر جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو اس میں تازگی و شادابی کی جنبش آ جاتی ہے اور وہ پھولنے بڑھنے لگتی ہے اور خوشنما نباتات میں سے ہر نوع کے جوڑے اگاتی ہے○

اللہ تعالیٰ آیت مبارکہ کے اس حصے میں اس انسان کو اپنی قدرتِ کاملہ کی طرف متوجہ کر رہا ہے جو بغیر علم کے رب کائنات کی قدرتوں اور اُس کے اختیار پر بحث کرتا ہے۔ فرمایا جا

(۱) یس، ۳۶:۶۸
(۲) الحج، ۲۲: ۵

رہا ہے کہ اے انسان! غور کر تیری کیمیائی ابتدا، پھر حیاتیاتی ابتدا اور ابتدا تا انتہا کیسے نشو و نما ہوئی۔ اے انسان! اب اپنے اردگرد زمین پر بھی غور کر کہ یہ زمین بالکل مردہ ہوتی ہے اور ہم اس پر پھر پانی برسا دیتے ہیں جس سے اس مردہ زمین میں تازگی اور شادابی کی جنبش و حرکت ہوتی ہے اور اس میں تازگی آنے لگتی ہے۔ وہ پھلنے پُھولنے اور بڑھنے لگتی ہے۔ پھر جس طرح انسانوں میں بھی جوڑے ہوتے ہیں، اسی طرح نباتات میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ یہ سارا وہ علم ہے جو چودہ سو سال کے بعد انسان کو سائنس کے ذریعے آج ملا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ نے چودہ صدیاں پہلے ہی قرآن کی شکل میں یہ سب کچھ واضح فرما دیا تھا۔

ان تمام حقائق کو بیان کرنے کے بعد اگلی آیت میں فرما دیا کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کی ذات و صفات، قدرتوں اور شانوں میں بغیر علم، بغیر کسی ہدایت، دلیل اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے علم، ہدایت اور کتابِ منیر کو سمجھانے کے لئے مثالیں دیں کہ اس کی قدرت کے کئی مظاہر ایسے ہیں جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں، دماغ ان سے متاثر ہو کر انہیں مانتا ہے۔ ان میں کئی چیزیں ایسی بھی ہیں کہ جنہیں کبھی آنکھ دیکھ ہی نہیں پاتی۔ اس ضمن میں جو کچھ ماں کے رحم کے اندر غیب کے پردوں میں ہو رہا ہے، کسی ذریعے کی ان تک رسائی نہیں کہ دماغ کو وہ تصور منتقل کر سکے۔

پس ان میں سے کئی چیزیں ایسی ہیں جو کتابِ منیر سے معلوم ہوتی ہیں۔

کچھ چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ودیعت کی ہیں، ان کے ذریعے معلوم ہو جاتی ہیں۔

کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اِکتسابی علم کے ذرائع اور ان کے حالات کے ذریعے سے معلوم ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب انسان کے اندر ودیعت کردہ ہدایت کے وسائل بھی جواب دے جاتے ہیں اور جہاں آلاتِ علم بھی بے بس ہو جاتے ہیں تو وہاں پھر بندے کی رہنمائی کے لئے کتابِ منیر اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے۔

باب نمبر 7

حصولِ علم کے ذرائع

یونانی فلاسفہ کے ہاں یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ ذہن میں کسی بھی شے کی نسبت جو تصور قائم اور واقع ہو اُسے علم کہتے تھے۔ خواہ وہ تصور کسی کے موجود ہونے یا نہ ہونے کا قائم ہو، خواہ اس تصور پر وہ راسخ ہو یا نہ ہو، خواہ اس تصور میں متردد ہو، خواہ وہ تصور واقعہ کے مطابق ہو یا خلافِ واقعہ ہو، یونانی فلاسفہ ہر چند اُسے علم سے ہی تعبیر کیا کرتے تھے۔ جدید دور میں علم کا یہ تصور رد کر دیا گیا ہے۔ اگر وہ تصور مرتبۂ تصدیق تک پہنچ جائے، جازم اور پختہ ہو جائے تو اُسے بھی علم کہتے ہیں۔ اگر اُس میں ظن رہے، شک آجائے تب بھی اُسے علم ہی کہتے ہیں، حتیٰ کہ وہم کے درجے کو بھی علم کہتے ہیں اور جہلِ مرکب کو بھی علم ہی کہتے ہیں۔ (باب نمبر 2 میں اس پر ضروری بحث گزر چکی ہے۔)

علم کے مختلف درجات کے لحاظ سے اس کی درج ذیل تقسیم کی جاتی ہے:

ا۔ علم کی اَقسام

بنیادی طور پر علم کی دو اقسام ہیں:

۱۔ **العلم القدیم / علمِ قدیم**

۲۔ **العلم المُحدَثُ /علمِ حادث**

(ا) علمِ قدیم

علمِ قدیم صرف اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے، کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ بھی قدیم ہے اور اُس کی تمام صفات بھی قدیم ہیں۔ علمِ قدیم کی حقیقت یہ ہے کہ اُس کی نہ تو ابتدا ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی کوئی ابتدا ہے، نہ کوئی انتہا اور نہ ہی اس کی

کوئی حد ہے۔ اسی طرح اُس کی صفتِ علم کی بھی کوئی ابتدا، انتہا یا حد نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ایسا نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے کہ یہ اتنے عرصے اور مدت سے ہے اور معاذ اللہ اس سے پہلے ایک دور ایسا بھی تھا کہ جب یہ علم اُس کے پاس نہ تھا۔ علمِ قدیم کی شان یہی ہے کہ اس میں کوئی عدم نہیں ہوتا۔

(۲) علمِ حادث

علمِ حادث کی شان اور تعریف یہ ہے:

اَلْحَادِثُ مَا لَمْ يَكُنْ فَكَانَ.(۱)

حادث وہ ہوتا ہے جو پہلے نہیں ہوتا پھر وہ ہو جاتا ہے۔

گویا جو پہلے نہ ہو اور پھر ہو جائے وہ علم حادث کہلاتا ہے۔ علمِ حادث کی دو اقسام ہیں:

۱۔ علمِ ضروری

۲۔ علمِ مُکتسب

(i) علمِ ضروری

علمِ ضروری سے مراد وہ علم ہے جو بدیہی طور پر اِکتساب اور غور و تامل کے بغیر براہِ راست انسانی عقل میں ودیعت کر دیا جاتا ہے، کیونکہ بشر کی جب تخلیق ہوتی ہے تو بحیثیت انسان اس کے لیے یہ علوم ضروری ہوتے ہیں۔ یہ صلاحیت انسان کی بنیادی حاجت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بدیہی طور پر پورا کر دیا ہے۔ مثلاً ایک ان پڑھ شخص بھی کوئی ذریعہ استعمال کئے بغیر یہ جانتا ہے کہ دو کا عدد ایک سے زیادہ ہوتا ہے یا وہ جانتا ہے کہ ایک آدمی بیک وقت ایک

(۱) ۱۔ ابن سالم الآمدی، غاية المرام: ۲۷۱
۲۔ زکریا الأنصاری، الحدود الأنيقة: ۷۳

ہی حالت میں ہوسکتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ بیٹھا بھی ہو، کھڑا بھی ہو؛ وہ ساکن بھی ہو اور حرکت بھی کر رہا ہو۔ اِن چیزوں کے جاننے کی صلاحیت اس کی تخلیق کے وقت سے ہی اس میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ الغرض ایسی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ جن کے حصول کے لئے کسی واسطے یا استدلال کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، اُنہیں بدیہی معلومات کہا جاتا ہے۔

(ii) علمِ مُکتَسب

علمِ مُکتسب سے مراد وہ علم ہے جو انسان مختلف ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ جو علم آنکھوں سے دیکھ کر، گفتگو سے سن کر، ناک سے سونگھ کر، زبان سے چکھ کر، ہاتھوں سے چھو کر اور دماغ کے تفکر و تدبر سے حاصل ہو وہ علم مُکتسب کہلاتا ہے؛ جب کہ علمِ ضروری کے لئے ان تمام مراحل (process) میں مشغول نہیں ہونا پڑتا۔

بدیہی اور اکتسابی علم کے عنوان سے یہ دونوں اقسام علمِ حادث (مخلوق کے علم) کی شانیں ہیں۔ بدیہی علم یعنی علمِ ضروری اللہ تعالیٰ کی جانب سے بنیادی انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس کی طبع میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم ہر حاجت سے ماوراء ہے۔ علمِ قدیم کی شان یہی ہے کہ وہ ان چیزوں سے بالاتر ہوتا ہے، کیونکہ اگر اُسے کسی چیز کے جاننے کے لیے کسی ذریعے کی حاجت ہو تو پھر یہ عجز ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ تو ایسے ہر عجز سے پاک اور بالاتر ہے۔ خالقِ دو جہاں کو نہ کسی کسب کی ضرورت ہے، نہ اسے کوئی حاجت ہے اور نہ ہی وہ کسی چیز کو جاننے کے لیے کوئی کوشش کرتا ہے، کیونکہ اُس کا علم تو ازلی اور ابدی ہے۔

انسانی علم کی دو حیثیتیں ہیں:

اَوّلاً یہ بدیہی طور پر عقل میں رکھا گیا ہے، جسے طریقِ ضرورت کہتے ہیں۔

اس کے برعکس طریقُ الکسب ہے۔ اس میں انسان ذرائع استعمال کر کے علم حاصل کرتا ہے۔

۲۔علم کی تقسیم: متکلمین کے نقطہ نظر کی روشنی میں

متکلمین اور اصولیین نے جہل کی دو اقسام بیان کی ہیں:

۱۔ جہلِ بسیط

۲۔ جہلِ مرکّب

(۱) جہلِ بسیط

امام سبکی جمع الجوامع میں جہل کی تعریف یوں کرتے ہیں:

إِنْتِفَاءُ الْعِلْمِ الْمَقْصُوْدِ. (۱)

مقصود علم کی مکمل نفی ہو جانا۔

گویا ان کے ہاں کوئی علم حاصل نہ ہو اور کسی چیز کی مکمل طور پر نفی ہو جائے تو اسے جہلِ بسیط کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں علم کا مکمل طور پر فقدان اور مکمل انکار (total negation of knowledge) ہے کہ اس کا کوئی تصور ہی قائم نہیں ہو سکا اور اس حوالے سے بالکل اندھیرا (darkness) و جہالت ہے۔ پس اسے جہلِ بسیط کہا جاتا ہے۔

(۲) جہلِ مرکب

جہلِ مرکب کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

تَصَوُّرُ الْمَعْلُوْمِ عَلٰی خِلَافِ مَا هُوَ بِهٖ. (۲)

شے کی حقیقت کے خلاف غلط تصور قائم ہونا۔

---

(۱) سبکی، جمع الجوامع، ۱:۲۱۱

(۲) حمووی، معجم البلدان، ۳: ۳۸۵

یعنی جس شے کا علم حاصل کرنا چاہتے ہیں، ذہن میں اس کا خلافِ واقعہ تصور قائم ہوجائے۔ یہاں مکمل لاعلمی، جہالت، علم کا مکمل خلا اور فقدان نہیں ہے بلکہ کچھ تصور ضرور ہے، مگر وہ تصور غلط ہے، مطابقِ واقعہ نہیں اور حقیقت کے خلاف ہے۔ جب حقیقت کے خلاف غلط تصور قائم ہو جائے تو اسے جہلِ مرکّب کہتے ہیں۔

فلاسفہ جہلِ بسیط کو علم میں شامل نہیں کرتے تھے چونکہ یہ تو مکمل انکار (total negation) ہے، لیکن جہلِ مرکب پر وہ علم کے لفظ کا اطلاق کرتے تھے۔ اگرچہ یہ تصور غلط ہے مگر اُنہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کو تو فقط یہ سروکار ہے کہ ذہن میں ایک تصور قائم ہو گیا تھا، لہٰذا وہ مجرّد ذہنی تصور کو علم کہتے تھے۔

مجرد ذہنی تصور کے مراتب

اس مجرد ذہنی تصور کے کئی مراتب ہیں:

۱۔ وہم

۲۔ شک

۳۔ ظن

۴۔ علم

ذیل میں مختصراً ان مراتب کی وضاحت کی جاتی ہے:

(i) وہم

فلاسفہ وہم کو علم تصور کرتے ہیں، چونکہ وہم سے بھی ذہن میں ایک تصور تو قائم ہوتا ہے مثلاً کوئی شخص کہتا ہے کہ مجھے فلاں وہم ہو رہا ہے۔ اسی طرح وہم کے مریض وضو کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہاتھ نہیں دھلے، پھر وہ اسی وہم کی بنیاد پر بار بار ہاتھ دھوتے چلے جاتے ہیں۔ ہم وہم کو بے شک مسترد کر دیں مگر اس وہم کا مطلب ہے کہ ذہن میں اس کا ایک تصور قائم

ہوگیا ہے۔

علم مکمل تصدیق اور مرتبہ یقین کی انتہا ہے جبکہ جہلِ مرکب حقیقت اور واقعہ کے بالکل خلاف تصور ہے۔ یہ دوسری انتہا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان تردّد ہے، جہاں ذہن متردد ہوتا ہے۔ جب انسان جہل سے معمولی سا نکلتا ہے مگر تھوڑا سا تصورِ جہل کی طرف راغب بھی ہوتا ہے تو اسے وہم کہتے ہیں۔

(ii) شک

جب آدمی تصور میں پختگی اور جزم کی طرف چلتا ہوا وہم سے آگے بڑھتا ہے تو درمیان میں اس مقام پر رک جاتا ہے، جو یقین اور جہل کے درمیان واقع ہے، اسے شک کہتے ہیں۔ شک کے درجے پر 50% جانبِ یقین (جانبِ علم) اور 50% جانبِ جہل ہے۔ فلاسفہ شک کو بھی علم کہتے ہیں۔

(iii) ظن

جب تصور شک سے آگے بڑھ جائے تو پھر اس درجے کو ظن کہا جاتا ہے۔ فلاسفہ ظن کو بھی علم کا درجہ دیتے ہیں مگر علم الکلام میں مسلمان ائمہ، اصولیین اسے علم نہیں بلکہ ظن ہی کہتے ہیں۔ احادیث کے حوالے سے خبرِ متواتر، خبرِ مشہور، خبرِ عزیز، خبرِ غریب، خبرِ احاد کی جو اَبحاث آئی ہیں کہ یہ علم کا فائدہ دیتی ہیں جب کہ دوسرے کہتے ہیں کہ علم کا فائدہ نہیں بلکہ ظن کا فائدہ دیتی ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ بھی یہ ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ یہ علم کا فائدہ دیتی ہے تو اس علم سے مراد علمِ یقین ہی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس حدیث سے جو حکم ثابت ہوگا وہ علمِ یقینی ہوگا۔ اگر قرآن کی نصِ صریح ہے یا خبرِ متواتر ہے تو علمِ یقینی کا فائدہ ہوگا۔ اگر اخبارِ احاد ہے تو چیز کا وجود ثابت ہوگا مگر وہ ثبوت درجہ ظن میں ہی ہوگا۔ اسی طرح کسی بحث میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ علمِ ظنی کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم الکلام میں ظن اور یقین میں فرق کیا جاتا ہے۔

(iv) علم

علم وہ مقام ہے جہاں ذہن تصدیق کرتا ہے اور مرتبہ یقین تک پہنچتا ہے۔ فلسفی اِدراک کو بھی علم کہتے تھے۔ بعض نے کہا کہ یہ علم نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ادراک ہمیں ایک تصور تک پہنچاتا ہے، جو فلاسفہ کے نزدیک علم ہونے کے لیے کافی تھا۔ اُصولیین نے اسے علم نہیں کہا۔ اصولیین کے ہاں اس تصور پر چونکہ ذہن کا حکم قائم نہیں ہوتا، اس لیے وہ محض اِدراک کہتے ہیں۔ اس ضمن میں اگر حکم قائم ہو جائے تو پھر تصدیق ہے اور تصدیق شانِ علم ہے کہ وہ جازم ہوتا ہے۔

علم تک پہنچنے کے تین مراحل ہیں:

۱۔ ادراک

۲۔ تصور

۳۔ علم

پہلے اِدراک (perception) آتا ہے، پھر تصور (conception) بنتا ہے اور پھر مزید کچھ شرائط ملیں - جن میں تصدیق اور مطابقِ واقعہ ہونا شامل ہے - تب جا کر علم وجود میں آتا ہے۔

۳۔ ذرائعِ علم

اللہ تبارک و تعالیٰ نے علم کے مختلف ذرائع، وسائط، وسائل اور طریقے بنائے ہیں۔ علم الکلام یا علم اصول الدین میں اُنہیں **الطُّرُقُ المُوصِلَة** کہا جاتا ہے یعنی وہ ذرائع اور طریقے جو ہمیں علم تک پہنچاتے ہیں۔ ذرائع علم درج ذیل ہیں:

۱۔ **حسّیات:** جو علم حواسِ خمسہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ **وجدانیات:** انسان کے اندر وجدان ہے جسے عرفِ عام میں چھٹی حس کہتے ہیں۔

۳۔ **فطریات:** یہ بدیہیات میں سے ہیں کہ انسانی فطرت میں ان چیزوں کا ادراک رکھا ہوا ہے۔

۴۔ **عقلیّات:** جو علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ حواسِ خمسہ سے حاصل ہونے والا علم اور عقل سے حاصل ہونے والا علم الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ علم تب بنے گا جب یہ دونوں ذرائع اپنے فرائضِ منصبی (functions) کو اکٹھا ادا کریں گے۔

۵۔ **متواترات:** ایک ایسی چیز جس پر نسل در نسل، صدی در صدی اتفاق چلا آ رہا ہو، اسے متواترات کہتے ہیں۔

۶۔ **تجربیات:** کچھ چیزیں مسلسل تجربات سے جب ایک ہی نتیجہ دیں اور یقین تک لے جائیں تو اسے تجربیات کہتے ہیں۔

۷۔ **حدثیات:** اگر مسلسل تجربات ایک ایسے نکتہ تک پہنچا دیں جس پر یقین نہ ہو بلکہ ظن کی کیفیت پیدا ہو تو اُسے حدثیات کہتے ہیں۔

ان ذرائع علم کی تفصیلات ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں:

(ا) حسّیات

یہ درج ذیل پانچ حواس پر مشتمل ہے، جنہیں حواسِ خمسہ ظاہری کہتے ہیں:

۱۔ حِسِّ سامعہ: کانوں سے سننے کی صلاحیت

۲۔ حِسِّ باصرہ: آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت

۳۔ حِسِّ لامسہ: ہاتھوں سے چھونے کی صلاحیت

۴۔ حِسِّ ذائقہ: زبان سے چکھنے کی صلاحیت

۵۔ حِسِّ شامہ: ناک سے سونگھنے کی صلاحیت

ہر حِسّ کا ایک محدود دائرہ کار ہے، جو چیز اس کے حیطۂ اِدراک سے باہر ہوگی اس مخصوص (specific) شے کو (perceive) نہیں کیا جا سکتا۔

آیئے ان حواس پر ایک تفصیلی نظر ڈالتے ہیں:

i۔ حسِ سامعہ

حسِ سامعہ سے مراد سننے کی حس ہے، اس سے ہم آواز معلوم کرتے ہیں۔ اس حس کے ذریعے ہمیں نہ صرف بولنے والے کی جنس، نوع کے بارے میں پتہ چلتا ہے بلکہ بولنے والے کے جذبات و احساسات کا بھی اس کی آواز کے ذریعے ادراک ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آواز کی سمت اور اس کے قرب و بعد کا بھی ایک تصور قائم ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اس حس کے علاوہ کسی دوسری حس سے مذکورہ اَشیاء و کیفیات کو جاننا چاہیں تو یہ ناممکن ہوگا۔

ii۔ حسِ باصرہ

آنکھوں سے جن چیزوں کا ادراک کیا جاتا ہے، وہ مبصرات ہیں۔ اب اگر چاہیں کہ آنکھ کے ذریعے ہم کسی آواز کو سن سکیں تو آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ یاد رہے کہ ادراک (perception) ایک خام مواد ہے جسے علم بنانے کے لیے عقل کے کارخانے میں بھیجا جاتا ہے۔ علم وہ مربوط اور منظّم صنعت (product) ہے جس کی ذہن تصدیق کرے، جو جازم ہو اور جس پر ذہن کو یقین اور اطمینان ہو۔

اگر کسی ٹیکسٹائل مشین میں دھاگہ ہی نہ ڈالیں اور توقع کریں کہ وہاں سے کپڑا نکل آئے گا تو ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہمیں ایک خام مواد بھی ڈالنا پڑتا ہے۔ چنانچہ حسِ باصرہ علم کو تشکیل دینے کے لئے دیکھنے سے متعلق اپنے حصے کا مواد، عقل کے کارخانے میں بھیجتی ہے۔

iii۔ حسِ لامسہ

حسِ لامسہ سے مراد چھونے کی حس ہے۔ اس سے ہمیں کسی شے کے سخت و نرم اور

گرم و سرد ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔ اگر ہم ہاتھوں سے آنکھوں کا کام لینا چاہیں یا کان کا کام لینا چاہیں تو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اس کا بھی اپنا دائرہ کار ہے جس سے باہر نہیں جایا جا سکتا۔ اگر اس کے مخصوص دائرے سے ہٹ کر کسی اور چیز کو دریافت کرنا چاہیں گے، جو اُس حس سے متعلق نہیں ہے تو ہمیں وہ ادراک نہیں ملے گا جو ہم حاصل کرنا چاہ رہے ہوں گے۔

iv۔ حسِ ذائقہ

حسِ ذائقہ سے مراد چکھنے کی صلاحیت ہے۔ ہم جب چکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ فلاں کھانے کا ذائقہ کیا ہے؟ نمک زیادہ ہے یا مرچیں کم ہیں؛ میٹھا ہے، کڑوا ہے یا پھر ترش ہے۔ دیگر حسوں کی طرح اس حس کا دائرۂ کار بھی محدود ہے۔ اگر ذائقے کے ذریعے اس پکوان کی شکل، کیفیت، حجم معلوم کرنا چاہیں تو ایسا ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

v۔ حسِ شامہ

حسِ شامہ سے مراد سونگھنے کی حس ہے۔ اِس حس کا آلہ/عضو ہمارا ناک ہے جو خوشبو یا بدبو کا پتہ دیتا ہے۔ حسِ شامہ کے بغیر یہ سب کچھ معلوم نہیں کیا جاسکتا۔

حواسِ خمسہ کا طریقہ کار

حواسِ خمسہ میں سے سنائی دینے والی حس کو 'مسموعات' کہتے ہیں۔ نظر آنے والی کو 'مبصرات' یا 'منظورات' کہتے ہیں۔ جو چیزیں لمس میں آتی ہیں اور انہیں چُھو کر ادراک ہوتا ہے، انہیں 'ملموسات' کہتے ہیں۔ جو ذائقے میں آتی ہیں، انہیں 'مذوقات' کہتے ہیں۔ جنہیں سونگھا جاتا ہے جیسے خوشبو، بدبو؛ ان کو 'مشمومات' کہا جاتا ہے۔ پس کسی شے کے ادراک کے لیے ان پانچ مختلف دائروں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مادی کائنات کے ادراک کے لئے ذرائع علم میں سے پہلا ذریعہ 'حسیات' کو پانچ اقسام میں تقسیم فرما دیا ہے۔ وہ شے نظر آ سکتی ہے تو ان کے لیے آنکھ اپنا

فریضہ سرانجام دے گی۔ کوئی چیز سنائی دے سکتی ہے تو اس حوالے سے کان کام کریں گے۔ کسی چیز کو چھوا جا سکتا ہے تو اس کے لیے ہاتھ کام کریں گے۔ کسی کو چکھا جا سکتا ہے تو اس ضمن میں زبان کام دے گی۔ کسی شے کو سونگھا جا سکتا ہے تو اس حوالے سے ناک کام کرے گی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے عالمِ مادیات میں انہیں محسوسات کہا ہے۔ یہ سارے محسوسات، مدرکاتِ حسّی ہیں اور ہر قسم کی حس کے لیے ایک خاص حاسہ بنا دیا گیا ہے۔ جب تک یہ تمام پانچوں محسوسات اپنا اپنا خام مواد عقل کے کارخانے میں نہیں بھیجتے تب تک صحیح علم وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس حوالے سے بڑی دلچسپ حکایت پیش کی جاتی ہے:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی گاؤں میں پانچ اندھے رہتے تھے۔ ایک دن گاؤں والوں نے ایک ہاتھی ان کے سامنے لا کھڑا کیا اور ہر ایک کو کہا کہ اس کو چھوؤ اور بتاؤ کہ ہاتھی کی شکل کیسی ہے؟ ہر ایک نے خوب اچھی طرح سے اُسے چُھوا۔ اس دوران کسی کا ہاتھ اس کے پیٹ پر لگا، اب وہ جتنا بھی اس پر ہاتھ پھیرتا چلا گیا دور تک وہ پیٹ ہی پیٹ تھا، اس نابینا کو تو ہاتھی دیوار کی مانند لگا۔ اس نے مفروضہ پیش کیا کہ ہاتھی دیوار کی طرح ہوتا ہے۔ دوسرے نابینے کا ہاتھ اس کی ٹانگوں پر لگ گیا، اس نے کہا کہ ہاتھی ستون کی طرح کا ہوتا ہے۔ ایک نابینے کے ہاتھ میں اس کے کان آ گئے، اس نے کان کو خوب اچھی طرح دیکھا تو اس نے سمجھا کہ ہاتھی بڑے دستی پنکھے کی طرح کا ہوتا ہے۔ ایک نابینا کے ہاتھ میں اس کا سونڈ آ گیا تو اس نے کہا کہ وہ تو بڑے موٹے رسّے کی طرح کا لمبا ہوتا ہے۔

اب وہ تمام چونکہ نابینا تھے، لہٰذا دیکھنے کی حس یعنی آنکھ سے حاصل ہونے والا مواد عقل کو منتقل نہ کر سکے اور اس بنا پر ان کے ذہن میں ہاتھی کا صحیح نقشہ قائم نہ ہو پایا، کیونکہ ان کی یہ حس معدوم تھی۔ ان کی جس حس نے تصور قائم کرنا تھا کہ شکل وصورت کیسی ہے؟ وہ ان کے پاس تھی ہی نہیں جبکہ باقی چاروں حواس کا خیال (perception) مل کر بھی کسی تصور (conception) تک نہ لے جا سکی۔ اُصولیین اور متکلمین اِسے حسیّات کہتے ہیں۔

(۲) وجدانیات

ذرائع علم میں سے دوسرا بڑا ذریعۂ علم 'وجدانیات' ہے۔ اس ذریعۂ علم کو یہ نام امام فخرالدین رازی نے دیا ہے۔ یہ چیزوں کا ایک اور دائرہ ہے جو اس کائنات میں موجود ہے۔ وجدانیات دراصل ہمارا شعورِ باطنی ہے۔ جیسے حواسِ خمسہ ظاہری تھے ویسے ہی شعورِ باطنی ہے۔ یہ شعورِ باطنی بھی ایک احساس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بدیہی طور پر بندوں میں رکھ دیا ہے۔ جس سے وہ حسیات کے دائرے میں نہ آنے والی کچھ چیزوں کا ادراک اور احساس کرتا ہے۔

اس کی ایک مثال خوف ہے۔ خوف کی کیفیت کا حواسِ ظاہری کے ذریعے ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ پانچوں حواس سے خوف کا پتہ نہیں چلتا۔ قرآن مجید میں خوف کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ.(۱)

اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔

آیتِ مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ خوف بھی اپنا وجود رکھتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○(۲)

خبردار! بے شک اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ و غمگین ہوں گے○

پہلی آیت کریمہ میں خوف کا اثبات بیان کیا کہ طرح طرح کے خوف آئیں گے اور ان کے ذریعے آزمایا جائے گا۔ پھر دوسرے مقام پر فرمایا کہ جو اللہ کے دوست ہو جاتے ہیں

(۱) البقرة، ۲: ۱۵۵
(۲) يونس، ۱۰: ۶۲

انہیں دنیا کا کوئی خوف نہیں رہتا، بلکہ ان سے خوف ہٹا لیا جاتا ہے۔ گویا ثابت ہوا کہ خوف بھی اپنا وجود رکھتا ہے مگر پانچوں کے پانچوں حواس سے خوف اور غم کا پتہ نہیں چلتا۔

اِسی طرح ہم نے ایک منظر دیکھا کہ اس سے ذہن میں ایک حلاوت اور کیفیت پیدا ہوئی یا کھانے سے ایک لذت ملی جو ذائقہ سے آگے کی چیز ہے، یا کسی چیز سے تکلیف، اذیت اور رنج و الم ملا۔ ان تمام کا ادراک ظاہری حواس سے نہیں ہوتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آپ کے اس فعل سے مجھے بہت دکھ ہوا۔ اب یہاں غور طلب بات ہے کہ فعل تو آنکھوں نے دیکھا، اب آنکھ دکھ اور اذیت کا فیصلہ تو نہیں کر سکتی۔ کان نے کوئی ناگوار بات سنی تو کان کا کام تو یہ ہے کہ اس نے جو آواز سنی، اس نے وہ الفاظ کی صورت میں عقل کو منتقل کر دی، اب یہاں کان تو صرف منتقل کر رہے ہیں۔ اسی طرح کسی کی بات پر غصہ آجانا یا بھوک محسوس ہونا، یہ وہ کیفیات ہیں جو پانچوں حواس سے معلوم نہیں ہوتیں۔ ہمیں یہ تمام کیفیات ایک شعورِ باطنی کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں اور ان کا ادراک ہوتا ہے۔ اس میں تحقیق، استدلال، غور و خوض اور مطالعہ نہیں چاہیے۔ یہ وہ کیفیات ہیں جو روزمرہ زندگی میں مختلف عالمِ مادیات میں رہتے ہوئے مختلف تصورات، مسموعات، مبصرات، ملموسات اور مشمومات سے قائم ہوتی ہیں۔ انہیں وجدانیات کہا جاتا ہے۔

وجدانیات کے اس درجے کے باوجود ان پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح حواس اِدراک یعنی perceive کرتے ہیں، خام مواد دیتے ہیں مگر علم نہیں بناتے اور ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح وجدانیات سے بھی علم حاصل نہیں ہوتا۔ چونکہ ہر شخص کی کیفیات مختلف ہیں اور وہ حجت نہیں ہے۔ ایک شخص کو ایک بات پر اذیت ہوتی ہے جبکہ دوسرے کو اسی بات پر کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ ایک شخص کو ایک بات پر لذت اور فرحت حاصل ہوتی ہے جبکہ دوسرے کو ایسا محسوس نہیں ہوتا۔ ایک شخص کو ایک بات پر غصہ آتا ہے جبکہ دوسرے کو بالکل نہیں آتا۔ کسی بات پر ایک شخص خائف ہوتا ہے جب کہ دوسرا جرأت مند ہے۔ اسے خوف یا تو کم محسوس ہوتا ہے یا پھر سرے سے نہیں ہوتا۔ الغرض یہ چیزیں چونکہ ان کے مقدمات میں نہیں ہیں، یہ دلائل نہیں بن سکتے اور ان پر علم کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ پھر ہر شخص کا مزاج اور میلان

جدا جدا ہے۔ طبیعت اور میلان مختلف ہوگا تو نتائج بھی مختلف ہوں گے۔ لہٰذا یہ دلائل نہیں بن سکتے اور ان پر علم کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ اگرچہ ان پر علم کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی مگر ان ادراکات کو مرتبۂ علم تک پہنچانے میں یہ چیزیں کار آمد ہیں۔ ایک تصور کو اپنے کمال تک پہنچانے میں یہ فائدہ مند (helpful) ضرور ہیں۔

(۳) بدیہیات و فطریات

ذرائع علم میں سے تیسرا ذریعہ بدیہیات یا فطریات ہیں۔ یہ وہ امور ہیں جو حواس کے ذریعے بھی نہیں معلوم ہوتے اور یہ وجدانیات کے دائرے میں بھی نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک دو سے کم ہے، تین کا عدد دو سے زیادہ ہے۔ ایک آدمی ایک وقت میں ایک حالت میں ہوتا ہے، بیک وقت اس کی دو حالتیں نہیں ہوسکتیں۔ مثلاً آپ بھیگتے ہیں تو آپ کو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ پانی ہے۔ جل گئے تو معلوم ہوگا کہ یہ آگ ہے۔ یعنی ایسی چیزیں جن کا اثر ہو تو آپ کو مؤثر کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح بعض اور چیزوں کا بھی بدیہی یا فطری طور پر انسان کو علم ہوتا ہے۔ جیسے بچہ جب پیدا ہوتا ہے اور ابھی اس نے کچھ سیکھا نہیں ہوتا مگر جونہی اسے بھوک لگتی ہے تو وہ رونے لگتا ہے۔ پھر جب ماں اسے دودھ دے دیتی ہے تو وہ رونا بند کر دیتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اُسے یہ رونا کس نے سکھایا؟

پرندہ گھونسلے میں انڈے سے نکلتا ہے، تھوڑے عرصے بعد اپنے پر نکالتا ہے، اسے کسی نے اڑنا نہیں سکھایا، وہ خود بخود اڑنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ سب بدیہیات اور فطریات میں سے ہے ۔ یہ بدیہات اور فطریات خواہ حیوانوں کو نصیب ہوں، پرندوں یا انسانوں کو نصیب ہوں۔ یہ فطری طور پر ایک ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان سب کے اندر رکھ دی ہے۔ یہ ان کی زندگی کی ضرورت ہے، اس سے ان کی حاجت پوری ہوتی ہے۔ جانور وہ راستے خود وضع کرتے ہیں جہاں سے انہیں کسی چیز کو لینا ہے، کیسے چونچ کو کھولنا ہے اور کیسے دانہ ڈالنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہی کیفیات نباتات میں بھی ہوتی ہیں۔ پودوں کی بھی مخصوص حرکات ہوتی ہیں۔ قدرت کی جانب سے ان کے اندر بھی کچھ چیزیں ودیعت کی گئی ہیں۔ ان کا بھی ایک نباتاتی شعور ہوتا ہے ۔

اگرچہ یہ انسانی شعور جیسا نہیں ہوتا مگر ان کے اندر بھی حواس موجود ہوتے ہیں۔

(۴) عقلیات

ذرائع علم میں سے چوتھا بڑا ذریعہ عقلیات ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ حواسِ خمسہ سے حاصل ہونے والا علم اور عقل سے حاصل ہونے والا علم الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ علم تب بنے گا جب یہ دونوں ذرائع اپنے فرائضِ منصبی کو اکٹھا سرانجام دیں گے۔ (یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے، اِسے ہم علیحدہ باب کے طور پر ذکر کریں گے۔)

(۵) متواترات

اصولیین اور متکلمین بیان کرتے ہیں کہ 'سمع و عقل' اگر جمع ہو جائے تو ذرائع علم میں سے پانچواں ذریعہ 'متواترات' بنتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح حس اور عقل جمع ہو جائے تو 'محسوسات' اور 'معقولات' بنتے ہیں۔ متواترات کی مثال یہ ہے کہ ایک ایسی چیز جو پہلے زمانے میں گزری، ہم نے نہیں دیکھی مگر نسل بعد نسل ہر زمانے کی کثیر تعداد جن میں عالم، جاہل، نیک، بد، اچھے، برے، سمجھ دار، ناسمجھ، معاشرے، اقوام اور نسلیں سب شامل ہیں، ہمیشہ سے اس پر اتفاق ہوتا رہا ہے، اسے متواترات کہتے ہیں۔ الغرض ایسی چیز جس پر ہر زمانے، ہر دور اور ہر نسل کے لوگ اتفاق کرتے چلے آئیں اور عقل یہ کہے کہ اگر یہ بات غلط اور جھوٹ ہوتی تو اتنے لوگ اس پر اتفاق نہ کرتے، کوئی تو اس تصور کو رد کرتا۔ جب اتنا کثیر اتفاق ہو تو پھر وہ متواترات میں آجاتا ہے۔

بعض لوگ تواتر کو اہمیت نہیں دیتے جبکہ درحقیقت یہ بہت اہم چیز ہے۔ اس حوالے سے مسجدِ حرام کی مثال لے لیجیے۔ قرآن مجید کی کوئی آیت اور حدیث نبوی کی کوئی ایسی نص نہیں ہے جو اس امر کا تعین کر دے کہ مسجدِ حرام بالکل (exactly) اسی جگہ ہے۔ اس مقام سے ایک میل، فرلانگ، دو سو یا پانچ سو فٹ باہر کسی اور جگہ پر نہیں تھی۔ یا یہ کہ یہاں سے دور تھی مگر بعدازاں لوگوں نے سہولت کے لیے یہاں بنالی۔ اس پر کوئی دلیل یا کوئی نص نہیں ہے۔ یہ

متواترات میں سے ہے کہ مسجدِ حرام عین اس مقام پر ہے۔ پس متواترات سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ علمِ قطعی اور علمِ یقینی ہوتا ہے، کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

احادیثِ نبوی کی مثال لیں۔ یہ بھی متواترات میں سے ہے۔ صحابہ کرام کے دور سے تابعین کا زمانہ جڑا ہوا ہے اور تابعین سے اتباع التابعین کا دور جڑا ہے اور ان سے سلف صالحین کے ادوار زنجیر کی طرح آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس طرح تمام صدیاں، زمانے اور قرون آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ نسل در نسل متصل ہم تک یہ علم پہنچا اور اس پر امت کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ گویا اس علم پر امت چودہ صدیوں سے متفق رہی، اس پر اجماع اور تواتر رہا ہے۔ چنانچہ یہ علمِ یقینی متواترات میں سے ہے، کوئی بھی صاحبِ شعور شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

جب قطعی تواتر ثابت ہو جائے تو پھر عقل بھی اس کی پابند ہو جاتی ہے۔ عقل اپنے پاس سے اس سے اختلاف کی کوئی دلیل نہیں لا سکتی جب کہ عقل کی دلیل بھی یہی تواتر بنے گا اور تواتر کی بنیاد سماع و بصارت پر ہے۔ وہ جو نسل در نسل سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں، سب کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے۔ یہ تو از خود ایک بہت بڑی قطعی دلیل بن گئی۔ اس سے اجماع کی جو اہمیت ہماری شریعت اور فقہ اسلامی میں ہے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اگر تواتر قطعی ہے تو یہ چیزیں متواترات میں سے ہے اور ذریعۂ علم ہیں۔ اس سے علمِ یقینی حاصل ہوتا ہے۔

(۶) تجربیات

ذرائع علم میں سے تجربیات کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ کچھ چیزیں تجربہ سے آتی ہیں۔ سائنس بھی تجربیات میں سے ہے۔ سائنس میں ایک مفروضہ یا قیاس کو سامنے رکھ کر اس پر تجربہ کیا جاتا ہے۔ جب کئی تجربات اس کی تائید کرتے ہیں اور کوئی بھی تجربہ اس سے مختلف نتیجہ نہیں دیتا اور تمام تجربات ایک ہی نتیجہ دیتے ہیں تو یہ چیز آگے چل کر سائنسی قانون بن جاتی ہے۔ کثرت کے ساتھ جس کا مشاہدہ بار بار ہو، نتیجہ ایک نکلے، تو ان مشاہدات سے علمِ

یقینی مل جاتا ہے اور عقل کو جزم اور اس پر اطمینان نصیب ہو جاتا ہے۔ مثلاً: آگ میں ہاتھ ڈالیں تو ہاتھ جل جاتا ہے، پانی سے ہاتھ گیلے ہو جاتے ہیں، خوراک کھانے سے طاقت آتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جس جس شے کے تجربے زندگی میں پے در پے ہوتے ہیں اور تمام لوگوں کے تجربات ایک ہی نتیجہ بتاتے ہوں تو اس سے علوم جنم لیتے ہیں اور یہ علوم تجربیات کہلاتے ہیں۔ یہ بھی ایک ذریعۂ علم ہیں۔

(۷) حدثیات

تکرارِ مشاہدہ اور تکرارِ تجربہ اگر یقین تک پہنچائے تو اسے تجربیات کہتے ہیں۔ وہ مشاہدہ اگر بار بار یقین تک نہ پہنچائے اور اس میں جزم نہ ہو بلکہ وہ تکرار ظن تک پہنچائے اور اس سے ایک تھیوری اور نظریہ تیار (develop) ہو جائے تو وہ حدثیات میں آتا ہے۔ یہ بھی ایک ذریعۂ علم ہے۔

مثلاً: جب ہم چاند کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ پہلی رات کا چاند باریک سا ہوتا ہے پھر وہ بڑھتا بڑھتا چودھویں رات کو کامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ گھٹنے لگ جاتا ہے اور آخر میں یہ پھر بالکل باریک سا رہ جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چاند کی روشنی دراصل اس کا اپنا نور نہیں یہ کسی کے نور کا انعکاس ہے، یعنی کسی کے نور سے چمکتا ہے۔ جیسے جیسے سمت تبدیل ہوتی رہتی ہے اور اس کے جتنے حصے پر روشنی پڑتی ہے اتنا حصہ چمکتا ہے اور وہی اس کو موٹا، باریک، کامل اور ناقص کرتا ہے۔ چاند کا نور سورج کی روشنی سے مستفاد ہے۔ دوسرے لفظوں میں دراصل سورج کا نور ہے جو چاند پر پڑ رہا ہے اور جتنے حصے پر پڑتا ہے، چاند کا اتنا ہی حصہ چمکتا ہے۔ صرف وہی چمک دار حصہ جو ہمیں نظر آتا ہے، اسے ہم چاند کہتے ہیں۔

اگر چاند کا اپنا نور ہوتا تو یہ ہمیشہ پورا چمکتا رہتا۔ اس طرح جو چیزیں انسانی مشاہدے میں آتی ہیں اور براہِ راست ہمارے احاطہ میں بھی نہیں ہیں لیکن عقل نے انہیں ترتیب دے کر اس سے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے تو وہ چیزیں حدثیات کے ضمن میں آتی ہیں۔

مذکورہ ذرائع علم سے انسان اِس کائنات میں غور وفکر کرتا، نئے نظریات تلاش کرتا اور اپنی تحقیق کا اطلاق کرتے ہوئے حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اس دوران ہر آن وہ نئے سے نئے شاہکار تراشتا چلا جا رہا ہے۔

باب نمبر 8

جہاں تک حواس کی رسائی ہے،
بس وہاں تک عقل کی شناسائی ہے

گزشتہ باب میں ہم حصولِ علم کے ذرائع کے حوالے سے 'عقل' کے علاوہ دیگر وسائط کا تفصیلی مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس باب میں ہم عقل اور اس کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کریں گے کہ عقل کی حدود، فرائض اور اختیار کہاں تک ہیں؟ لیکن اس سے قبل ہم علم کی ایک جامع و مانع تعریف کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ جس سے ہمیں علم کی حقیقت معلوم ہو سکے۔

۱۔ علم کیا ہے؟

مختلف اَئمہ نے علم کی تعریفات کی ہیں۔ ذیل میں 'علم' کے مفہوم کو جاننے کے لئے چند تعریفات ذکر کی جا رہی ہیں:

۱۔ امام ابو اسحاق البخاری - جو الزاهد الصفار کے نام سے مشہور ہیں - نے بعض لوگوں کے حوالے سے علم کی یہ تعریف کی ہے:

إِنَّهُ دَرْكُ الْمَعْلُوْمِ عَلٰى مَا هُوَ بِهٖ.[1]

کسی چیز کی اصل ماہیت کا ادراک کر لینا علم کہلاتا ہے۔

بعد ازاں انہوں نے اپنی ہی اِس تعریف کو رد کر دیا اور کہا کہ ادراک احاطہ کرنے کو کہتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا احاطہ اور ادراک ممکن نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○[2]

---

(۱) امام أبی المعین میمون النسفی الماتریدی، تبصرة الأدلة فی أصول الدین، ۱:۱۳۲

(۲) الأنعام، ۶:۱۰۳

نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اور وہ بڑا باریک بین بڑا باخبر ہے○

اس تعریف کی رو سے مطلب یہ ہوا کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کا علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے علم کی یہ تعریف نہیں کی جاسکتی۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں ہوسکتا تو اللہ تعالیٰ کو جاننے کا نام علم نہ ہوا۔ یوں انہوں نے اپنی اس تعریف کی خود ہی نفی کر دی۔

۲۔ معروف محدث، فقیہ اور مفسر ابو بکر محمد بن علی بن اسماعیل الکفال الشاشی (م۲۹۱ھ) نے علم کی تعریف میں کہا ہے:

إِنَّهُ إِثْبَاتُ الشَّيءِ عَلٰى مَا هُوَ بِهٖ.[1]

کسی شے کو اس کی ماہیت کے مطابق ثابت کر دینا علم ہے۔

ہر چیز کی اپنی ماہیت، حقیقت اور کیفیت ہے۔ انسان کی اپنی ماہیت، سر، آنکھیں، پاؤں، چہرہ اور اس کا جسم ہے۔ ہر حیوان کی بھی اپنی ماہیت، شکل وصورت اور کیفیت ہوتی ہے۔ اسی طرح دیگر اشیاء مثلاً کرسی، میز، قلم الغرض ہر چیز کی ایک ماہیت اور وجود (existence) ہوتا ہے۔ پس جس حالت اور ماہیت پر وہ استوار ہے اُس وجود کو ثابت کر دینے کے عمل کا نام علم ہے۔ دوسرے الفاظ میں کسی چیز کو اس کی ماہیت کے مطابق ثابت کر دینے کا نام علم ہے۔

۳۔ بعض علماء نے کہا ہے:

اَلْعِلْمُ أَنَّهُ تَبَيُّنُ الْمَعْلُوْمِ عَلٰى مَا هُوَ بِهٖ.[2]

---

(۱) أبو المظفر، قواطع الأدلة فی الأصول، ۱: ۲۳

(۲) ۱۔ غزالی، المنخول:۳۷

۲۔ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ۱:۴

۳۔ قنوجی، أبجد العلوم، ۱:۲۸

کسی شے کا ماہیت کے مطابق کسی پر واضح ہو جانا علم کہلاتا ہے۔

ہر جگہ شرط عَلٰی مَا هُوَ بِهٖ چل رہی ہے۔ یعنی شے کی ماہیت اور واقعہ کے مطابق معلومات کا ہونا علم کہلاتا ہے۔ اگر وہ واقعہ کے مطابق نہیں ہے تو پھر اُسے علم نہیں کہا جائے گا بلکہ اسے 'جہلِ مرکب' کہا گیا ہے۔ یعنی کسی چیز کے بارے میں جو پتہ چلا وہ اس کی اصل حقیقت، ماہیت اور ہیئت کے مطابق نہیں ہے اور اگر اس کے بارے میں سرے سے معلوم ہی نہ ہو سکے تو پھر وہ 'جہلِ بسیط' ہے۔ اس پر گزشتہ باب میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

چنانچہ علم ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جو چیز موجود ہے اُس کے مطابقِ حال، مطابقِ ماہیت، مطابقِ کیفیت، مطابقِ اصلیت، مطابقِ حقیقت اور مطابقِ واقعہ معلومات حاصل ہوں۔ گویا علم میں شرط عائد ہوگئی ہے کہ اس کے اندر صحت ہونی چاہیے۔ اگر معلوم شے صحیح نہیں تو اسے علم نہیں کہتے۔ وہ تصور، جہلِ مرکب، وہم، شک یا ظن تو ہوسکتا ہے؛ اس کے کئی مرتبے اور کئی تعریفات ہیں مگر اسے علم نہیں کہا جا سکتا۔

علم کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں صحت اور مطابقِ واقعہ ہونا پایا جائے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ علم علمِ صحیح ہے اور علمِ صحیح تبھی ہوگا جب ہم اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت کی طرف جائیں گے۔ پھر معلوم کرنا پڑے گا کہ کون سا ذریعہ اور کون سا وسیلہ ایسا ہے جو ہمیں علمِ صحیح تک پہنچائے۔

۴۔ امام نسفی نے بیان کیا ہے کہ ابواسحاق اسفرائینی کا قول ہے:

إِنَّ الْعِلْمَ هُوَ مَعْرِفَةُ الْمَعْلُوْمِ عَلٰى مَا هُوَ بِهٖ.[1]

کسی شے کا عین مطابقِ واقعہ جان لینا علم کہلاتا ہے۔

یعنی جس کا علم حاصل کرنا چاہ رہے ہیں اُس کا عین مطابقِ واقعہ معرفت ہو جائے

---

(۱) أبو معين ميمون النسفى الماتريدى، تبصرة الأدلة فى أصول الدين، ۱: ۱۳۰

تو وہ علم ہے۔ بعد ازاں کئی لوگوں نے اس تعریف کو اپنایا اور بعض اسے رد کرتے رہے اور کہا گیا کہ علم اور معرفت میں فرق ہے۔

۵۔ پھر معتزلہ کے بڑے علماء میں سے ابو القاسم عبد اللہ الکعبی البلخی نے تعریف کی ہے:

اَلْعِلْمُ: اِعْتِقَادُ الشَّيءِ مَا هُوَ بِهِ.(۱)

عین مطابقِ ماہیت معلوم ہونے والی چیز پر اگر عقیدہ قائم ہو جائے تو اُسے علم کہتے ہیں۔

۶۔ بعض معتزلہ نے اعتقاد کے ساتھ سکونِ نفس کا اضافہ کیا کہ اطمینان بھی ہو جائے:

اَلْعِلْمُ: اِعْتِقَادُ الشَّيءِ مَا هُوَ بِهِ، مَعَ سُكُوْنِ النَّفْسِ إِلَيْهِ.(۲)

عین مطابق ماہیت معلوم ہونے والی شے پر اگر عقیدے کے ساتھ ساتھ سکونِ نفس بھی نصیب ہو جائے تو یہ علم کہلاتا ہے۔

بعض نے اِسے بھی رد کر دیا، مثلاً بغدادی نے اصول الدین میں رد کیا اور نسفی نے اسے ابو ہاشم الجبائی کی طرف منسوب کیا کہ یہ ان کا قول ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اعتقاد علم نہیں ہے بلکہ فعلِ قلب ہے۔

حاصلِ کلام

امام ابو اسحاق البخاری تمام تعریفات اور ان کے نقائص بیان کر کے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے بارے میں ایک ایسی پختہ اور حتمی شکل کا ادراک ہو جہاں اخفا

---

(۱) أبو معين ميمون النسفى الماتريدى، تبصرة الأدلة فى أصول الدين، ۱: ۱۲۶

(۲) أبو معين ميمون النسفي الماتريدي، تبصرة الأدلة في أصول الدين، ۱۲۶:۱

اور لاعلمی ختم ہو جائے، تردد یا شک نہ رہے اور نہ ہی کسی قسم کا ظن رہے، یہ علم کہلاتا ہے۔ یعنی وہ شے جو وجود (exist) رکھتی ہے، اُس کے جاننے میں اخفا اٹھ جائے اور کشف ہوجائے تو یہ انکشاف علم کہلاتا ہے۔

علم کی اس تعریف کو امام نسفی اور امام ماتریدی سمیت دیگر تمام علماء نے مجموعی طور پر اپنایا ہے کہ یہ تعریف جامع اور کامل ہے اور اسے قرآن مجید کی آیات کی تائید بھی حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًاo[1]

اور یہ کہ اللہ نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ فرما رکھا ہے۔

اس آیت میں کسی چیز پر احاطہ ہونا بھی علم سے ثابت ہوگیا۔

پھر فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِo[2]

یقیناً اللہ پر زمین اور آسمان کی کوئی بھی چیز مخفی نہیںo

یہاں اللہ تعالیٰ پر کسی بھی شے کے مخفی نہ ہونے کا ذکر ہے۔ اب صاف ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے علم کے لیے تو کسی قسم کا پردہ نہیں کیونکہ خالقِ کائنات کا علم قدیم ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے علم کی شان بیان کی جا رہی ہے کہ اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کبھی کوئی شے مخفی تھی اور اب وہ نہیں رہی۔ یہ تو مخلوق کے علمِ حادث کی شان ہے۔ مالکِ دو جہاں پر کبھی بھی کوئی شے مخفی نہ تھی، نہ ہے اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ یہ خفا کا اٹھ جانا علم کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔

---

(۱) الطلاق، ۶۵:۱۲

(۲) آل عمران، ۳:۵

۲۔عمیق مشاہدہ اَہلِ اِسلام کی میراث ہے

علم کی تعریفات کے سلسلے میں جو کچھ بیان کیا گیا، اس سے ہمیں جہاں علم کی جامع و مانع تعریف حاصل ہوئی وہاں یہ امر بھی سامنے آیا کہ آج ہمیں مغربی علم (western knowledge) کے حوالے سے یہ طریق نظر آتا ہے کہ وہ کسی شے کے بارے میں جاننے کے لئے اس چیز کی گہرائی اور چھوٹی چھوٹی باریکیوں میں چلے جاتے ہیں، کسی شے کے ایک ایک پردے کو اٹھا کر تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ تعریفات کرتے ہیں، تقسیمات عمل میں لاتے ہیں۔علم کی یہ استعداد اور میلانِ طبع (aptitude) اصل میں مغرب کی پیدا کی ہوئی نہیں بلکہ یہ ملکہ اسلامی تاریخ میں پیدا ہوا ہے۔

کسی چیز کی تعریف میں اُس کی حدودِ صحت کا یقین کرنا، دوسری مماثل چیزوں سے فرق بیان کرنا، علیحدہ علیحدہ نام رکھنا، اس تمام کو آج کی دنیا کے فلسفیوں، سائنس دانوں، قانون دانوں اور دانش وروں نے مرتب نہیں کیا بلکہ یہ اِستعداد، میلانِ طبع اور علم و تحقیق کا یہ انداز بھی اسلامی دنیا سے آیا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ ایسے علماء و محققین، ائمہ، اسکالرز اور اکابرین سے بھری پڑی ہے جو علم کے ہر میدان میں ماہر، مشاق، متبحر ہوتے تھے۔علم (education) نے جدید دور میں ایک باقاعدہ مضمون (subject) اور سائنس کی شکل اختیار نہیں کی بلکہ آج سے کئی صدیاں قبل اسلامی دورِ حکومت کے اوائل میں مسلمانوں نے علم کو ایک سائنس کے طور پر تسلیم کر کے اس پر سیکڑوں کتب لکھی ہیں۔ اُس وقت ہی علم (knowledge) کا رجحان امت مسلمہ میں فروغ پا چکا تھا۔علم کے آفاقی دور کی بنیاد قرآن مجید اور صاحبِ قرآن ﷺ نے رکھ دی تھی۔ جب اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ کے الفاظ کے ساتھ قرآن مجید کی اترنے والی پہلی آیت ہی بیانِ علم پر مبنی ہے تو علم کی اہمیت، افادیت، فضیلت کے باب میں امتِ مسلمہ کے انتہاء درجہ کے ذوق، شوق اور شغف کا اندازہ باآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

پہلی وحی کے طور پر نازل ہونے والی پہلی پانچ آیات کا موضوع ہی علم ہے۔ علاوہ

ازیں قرآن حکیم میں جابجا متعدد آیات میں علم کی اہمیت وفضیلت آشکار کی گئی ہے، جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ اسی طرح حضور نبی اکرم ﷺ نے بھی اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کثیر ارشادات فرمائے اور اپنے عمل مبارک سے ثابت کیا۔ ہم اِس پر بھی سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ہم صرف دو ارشادات گرامی بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔

۱۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان اقدس ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ. (۱)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد وعورت) پر فرض ہے۔

۲۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ. (۲)

علم حاصل کرو خواہ وہ علم تمہیں چین میں جا کر ملے۔

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، اتباع التابعین اور سلف صالحین نے اپنی زندگیاں حصولِ علم کے شغف میں صرف کر دیں۔ یوں علم بڑھتا بھی گیا اور مرتب ومنظّم بھی ہوتا چلا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی اقسام (categories) بنتی چلی گئیں اور ساتھ ہی ان میں

---

(۱) ۱۔ الخوارزمي، جامع المسانيد للإمام أبي حنيفة، ۱:۸۳

۲۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ۱:۸۱، رقم: ۲۲۴

۳۔ أبو يعلى، المسند، ۵:۲۲۳، رقم: ۲۸۳۷

۴۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۲:۲۸۹، رقم: ۲۰۰۸

(۲) ۱۔ ربيع، المسند، ۱:۲۹، رقم:۱۸

۲۔ بزار، المسند، ۱:۱۷۵، رقم:۹۵

۳۔ ہندی، کنز العمال، ۱۰:۶۰، رقم:۲۸۶۹۷

تخصیص (specialization) بھی ہوتی چلی گئی۔ یہ پہلی پانچ ہجری صدیوں کا وہ دور تھا جب برطانیہ، فرانس، جرمنی اور یورپ کے دیگر ممالک علم سے مکمل طور پر تہی دامن تھے۔

واضح رہے کہ ہم یہاں اس علم سے مراد صرف قرآن و حدیث کا علم ہی نہیں لے رہے بلکہ ہماری مراد سائنس، ٹیکنالوجی، فلسفہ اور تمام عقلی و نقلی انسانی علوم ہیں۔ یورپ ان میں سے ہر قسم کے علم سے تہی دست تھا، جبکہ اسلام کا دامن اس وقت جملہ علوم کے ساتھ معمور تھا۔ بدقسمتی سے دورِ جدید میں اَہلِ اِسلام کا تعلق اسلاف کی اس عظمتِ علمی سے کٹا ہوا ہے۔ علم و آگہی کے اس سلسلے کو از سرِ نو جوڑنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

۳۔ مسلمانوں کے وقار کا راز علم اور کردار میں مخفی ہے

مسلمانوں نے دنیا پر بارہ سو سال حکومت کی ہے۔ اُس وقت ان کے پاس دو طاقتیں تھیں:

۱۔ طاقتِ علم

۲۔ طاقتِ کردار

بارہ صدیوں تک مسلمانوں کی حکمرانی تلوار کی طاقت سے نہیں تھی بلکہ اس کا سبب مسلمانوں کا علم سے گہرا شغف اور ان کا بلند کردار تھا۔ مغربی علوم اور مغربی سائنس کی تاریخ پر جو چاہے کتاب پڑھ لیں، اس دور کو یورپی بذاتِ خود تاریک دور (dark ages) کہتے نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف اُس وقت اسپین اور قرطبہ کے ہسپتالوں میں مسلمان ڈاکٹرز open heart سرجری میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ اور آب پاشی کے نظام میں ترقی کی بیش قدر منازل طے کر لی تھیں۔ یہ وہی علم (knowledge) ہے جو اسپین اور سسلی کے راستے یورپ میں پہنچا تھا۔

علم کا یہ آفتاب مکہ اور مدینہ سے طلوع ہوا۔ پھر اس کی کرنیں بصرہ، کوفہ، دمشق، مصر، بغداد، افریقہ، الجزائر اور تیونس سے ہوتی ہوئیں اسپین پر جلوہ افروز ہوئیں۔ پھر اس اجالے سے

قرطبہ، اندلس، سسلی اور یورپ کے دوسرے علاقے روشن ہوئے اور اسلامی علوم وفنون کے مرکز بن گئے۔ وہاں سے علم منتقل (transfer) ہو کر پھر یورپ میں داخل ہوا۔ یورپ سے انگلینڈ پھر امریکہ اور کینیڈا میں داخل ہوا۔ اُس وقت یہ سب ممالک جہالت کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قرونِ وسطی کے اِن اَدوار (medieval periods) میں اگر علم کے چراغ جلے ہیں تو وہ سرزمینِ مدینہ سے ہی روشن ہوئے ہیں۔ مسلمان علم وحکمت کی اُن مشعلوں کو لے کر قریہ قریہ، بستی بستی، نگر نگر، ایک ایک ملک اور مختلف خطوں میں اجالے بکھیرتے چلے گئے۔[1]

۴۔ آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

اوائل صدیوں میں دنیا بھر سے شمعِ علم کے پروانے اپنی تشنگی بجھانے کے لیے اسلام کے علمی مراکز کا رُخ کرتے تھے۔ ان دنوں بغداد، دمشق، مصر، سپین، نیشاپور، سمرقند، بخارا، ازبکستان، ترکمانستان اور دیگر وسطی ایشیائی ریاستیں (Central Asian States) علوم وفنون کے مراکز تھے۔ اب اس کے برعکس اسلامی دنیا سے لوگ طلبِ علم کے لیے مغربی ممالک کا رُخ کرتے ہیں۔

ہم یہاں مطلقاً علم کی بات کر رہے ہیں، دینی علم کے حوالے سے بات نہیں کر رہے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اسلامی دنیا طریقِ علم چھوڑ کر جہالت کے اندھیروں میں چلی گئی ہے اور اِسی جہالت نے اُسے تباہی، بربادی اور زوال کا شکار کر دیا ہے۔ لوگوں کی علمی اور شعوری حیثیت کی سطح اس چیز کی عکاس ہے کہ علم کی اہمیت ہمارے معاشروں میں بھلا کیا رہ گئی ہے؟

تاریخ گواہ ہے کہ جس معاشرے میں مال و دولت کی اہمیت بڑھ جائے اور علم کی وقعت کم ہو جائے تو وہ معاشرہ کبھی باوقار طریقے سے زندہ نہیں رہ سکتا۔ معاشروں کے اِحیاء اور ان کے جاہ وحشمت اور وقار کی بحالی کے لیے علم کا سفر پھر سے شروع کرنا پڑتا ہے۔

(۱) اِس موضوع پر تفصیلات جاننے کے لیے راقم کی کتاب - 'اِسلام اور جدید سائنس' ملاحظہ فرمائیں۔

۵۔ حواسِ خمسہ ظاہری اور عقل کا باہمی تعلق

آیئے! اب ہم ذریعہ عقل کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں کہ 'عقل' کو علم کے حصول کے باب میں کیا اہمیت و انفرادیت حاصل ہے اور عقل بذاتِ خود کیا حیثیت رکھتی ہے؟ کیا علم کے باب میں یہ مکمل خودمختار ہے یا یہ بھی کسی کی محتاج ہے؟ اگر علم کے باب میں عقل بھی کسی کی محتاج ہے تو اس کی یہ محتاجی کس قدر ہے؟

جب ہم ذرائع علم کی بات کرتے ہیں تو حواس نہ خود علم ہیں، نہ علم بناتے ہیں اور نہ ہی یہ اَز خود علم تک پہنچاتے ہیں۔ یہ محض ایک ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ یہ وسیلہ آگے چل کر ایک اور وسیلے تک پہنچاتا ہے۔

علم کے باب میں پہلا ذریعہ حواسِ خمسہ ہیں۔ اب اگر حواسِ خمسہ تنہا رہیں تو علم نہیں بنتا۔ حواس محض ادراک دیتے ہیں یعنی وہ وسیلۂ ادراک ہیں۔ حواسِ خمسہ میں ہم کسی چیز کو دیکھتے، چُھوتے، چکھتے، سُونگھتے اور سُنتے ہیں تو جو تاثر پیدا ہوتا ہے، اسے ادراک کہتے ہیں۔ حواسِ خمسہ ادراک کو آگے عقل کے کارخانے میں منتقل کر دیتے ہیں، جس کے بعد حواس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ علم کو تشکیل دینے میں عقل بھی واسطہ اور وسیلہ ہے۔ اس لیے جب حواسِ خمسہ ظاہری کی بات ہوتی ہے تو یہ تنہا علم تک نہیں پہنچاتے، حواس کے ساتھ پھر عقل کا ذکر ضروری ہوتا ہے۔ حواس اور عقل باہم مل کر ہمیں علم تک پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جسم کو پانچ حواس دیے ہیں اور ہر ایک حس کے ذریعے الگ الگ قسم کا ادراک ہے جو اُس کے دائرے میں آتا ہے۔

ہر ظاہر کا ایک باطن ہے

جب ہم کسی آواز کو سنتے ہیں تو اس سے دو چیزیں منتقل ہو رہی ہوتی ہیں:

۱۔ جو لفظ ادا کیا گیا، اس آواز کی ظاہری شکل وصورت سننے کے حاسہ کے ذریعے عقل کو منتقل کر رہے ہیں۔

۲۔ اُس لفظ کا کوئی مطلب بھی ہوگا یعنی وہ لفظ جس معنی پر دلالت کرتا ہے، وہ معنیٰ بھی عقل کو منتقل ہو رہا ہے۔

مثلاً اگر لفظ 'پانی' سنا، تو اس لفظ کی آواز بھی جا رہی ہے اور ساتھ میں لفظ کی ایک صورت بھی عقل کو منتقل ہو رہی ہے۔ جس طرح ہر لفظ کا ایک معنیٰ ہے اسی طرح لفظ پانی جس معنی پر دلالت کرتا ہے، وہ معنی بھی عقل کو منتقل ہو رہا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اسی طرح باقی حواس کا بھی یہی عمل ہے۔ ہر چیز کا جو احساس پیدا ہوتا ہے، اس میں ایک ظاہری صورت ہے اور ایک اس کا باطن اور معنیٰ ہے جس پر وہ دلالت کرتا ہے۔ حواس ظاہری صورت اور معنیٰ دونوں کو عقل میں منتقل کر دیتے ہیں۔

قلب کا بھی ایک ظاہر اور ایک باطن ہوتا ہے۔ اسی طرح دینی تعلیمات میں بھی ایک ظاہر کا پہلو ہے اور دوسرا باطن کا ہے۔ عبادت میں بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ مثلاً: ہم نماز پڑھتے ہیں۔ اس کا ظاہر یہ ہے کہ ہاتھ اٹھاتے ہیں، تکبیر تحریمہ کہتے ہیں، ہاتھ باندھتے ہیں، قرات و قیام اور رکوع وسجود کرتے ہیں، پھر تشہد اور آخر میں سلام پھیرتے ہیں۔ یہ سب ارکان نماز کی ظاہری صورت ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نماز کا ایک باطن بھی ہے۔ دنیا سے ہاتھ اٹھا کر اللہ سے لو لگ گئی، اللہ کی عبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی تواضع، انکساری اور بندگی کا اظہار کر رہے ہیں، دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت جاگزیں ہو رہی ہے اور اس وقت ہم اس کی رضا اور قرب کے طلب گار ہو رہے ہیں۔ قیام ہے تو ہم مالکِ کُل کے حضور کھڑے ہیں۔ سجود ہے تو اس کے در پر اپنی جبینِ نیاز جھکائے ہوئے ہیں۔ تشہد میں بیٹھے ہیں تو اس کے در پر طلب گار بن کر بیٹھے ہیں۔ پوری نماز کے ہر رکن، ہر واجب اور ہر عمل اور فعل کے اندر ظاہر کے ساتھ ایک باطن بھی پوشیدہ ہے۔

یہی کیفیت روزہ کی ہے جس کی باطنی صورت کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○[1]

(۱) البقرة، ۲: ۱۸۳

تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ○

یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کے لیے روزے کی حالت میں حلال چیز کو اس لئے چھوڑنا کہ تقویٰ حاصل ہو سکے۔ چنانچہ اگر تقویٰ حاصل نہ ہو تو پھر کھانا پینا چھوڑ دینا سودمند نہیں۔ گویا اگر باطن کے مقاصد پورے نہ ہوں تو ظاہری عمل بھی کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ اگر باطن سے توجہ ہٹ کر فقط ظاہر پر رہے تو پھر وہ عمل کبھی کامل نہیں ہوتا۔ تمام عبادات و معاملات اور احوال و اخلاق میں یہی اَمر کارفرما ہے۔

اسی طرح شریعت کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ دین کے ظاہری احکام فقہاء اور علماء سمجھاتے ہیں اور باطن کی تعلیمات کو صوفیاء اور اولیاء سکھاتے ہیں۔

قرآن مجید کا بھی ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ جب ہم سورۃ الفاتحۃ کی پہلی آیت - اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - کی تلاوت کرتے ہیں تو اس کے الفاظ، آیات، حروف اور صوت کا ایک ظاہر ہے اور اس کے معانی باطن ہیں۔ پھر معانی کے اندر اسرار و رموز اور معارف ہیں جو باطن الباطن ہیں۔

اسی طرح تعلیمات میں بھی مراتب اور مدارج ہیں۔ تعلیماتِ دین میں کچھ چیزیں ظاہر میں ہیں، ان کی ادائیگی ہر ایک پر واجب ہے۔ ان تعلیمات کے کچھ اَسرار و لطائف اور کچھ رموز و غوامض ہیں۔ انسان جیسے جیسے علم کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا چلا جاتا ہے، ویسے ویسے اس پر نئی نئی جہات آشکار ہوتی چلی جاتی ہیں۔

عالمِ بالا کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہر آسمان کی شانیں جدا جدا اور ان کی مخلوقات الگ الگ ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے واقعۂ معراج پر ارشاد فرمایا: میں پہلے آسمان پر پہنچا تو حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد دوسرے آسمان پر پہنچا تو وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ملے، حتیٰ کہ ساتویں آسمان پر پہنچا، پھر آگے عرشِ معلّٰی اور سدرۃ المنتہیٰ کا بیان فرمایا۔

یہ سب وہ چیزیں ہیں جو ہماری عقل اور ہمارے ادراک سے بالاتر ہیں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ ہر چیز تہ در تہ ہوتی ہے۔ کچھ چیزیں حواس سے معلوم ہوتی ہیں اور کچھ اشیاء حواس کے

ادراک سے بالا ہوتی ہیں۔ یاد رکھ لیں! عقل وہی کچھ جانے گی جو اُسے حواس سے معلوم ہوگا۔

۶۔ عقل کے حواسِ باطنی

حواس خمسہ کا ایک عمل (process) ہے۔ جب تک حواس ظاہری صورت اور باطنی معانی عقل کو نہیں پہنچاتے، اُس کا عمل (process) شروع ہی نہیں ہوتا۔ عقل کا کارخانہ اس وقت تک بند پڑا رہتا ہے جب تک حواس اسے خام مال مہیا نہ کریں۔ ہم کبھی تنہا حواس پر بھروسہ نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ کسی نتیجے پر پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ ہی تنہا عقل پر بھروسہ کر سکتے ہیں، اس لیے کہ عقل کا اپنا بھروسہ حواس پر ہے۔

عقل کے پانچ شعبے ہیں:

۱۔ حسِ مشترک

۲۔ حسِ خیال

۳۔ حسِ واہمہ (یہ وہم وہ نہیں ہے جس کا ذکر علم اور جہل کے مابین آیا تھا)

۴۔ حسِ حافظہ

۵۔ حسِ متصرّفہ/متخیّلہ/مفکّرہ

اب ہم ان شعبہ جات کے امور (functions) پر غور کرتے ہیں:

(۱) حسِ مشترک

جو چیز ہم نے دیکھی، سُنی یا چُھوئی اس کی ظاہری صورت اور اس کا ادراک حسِ مشترک میں جاتا ہے۔ گویا انسانی عقل کا یہ گوشہ حواسِ ظاہری کے تاثرات وصول کرتا ہے۔ حواس کے اولین ظاہری تاثرات اس حصہ عقل میں پہنچ کر جذب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جب ہم اپنی آنکھ سے کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو انسانی عقل کے اس حصے پر اس کی تصویر مرتسم ہو جاتی ہے۔

اسی لئے اسے لوح النفس بھی کہتے ہیں۔ حس مشترک کا کام ظاہری صورت اور تاثر کو وصول کرنا ہے۔

(۲) حسِ خیال

حسِ مشترک میں پہنچنے والی مدرکات اور محسوسات کی تصاویر اور اشکال کو ظاہری صورت میں اپنے اندر محفوظ کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم لفظ 'میں' بولتے ہیں تو اس لفظ کی ظاہری صورت یعنی 'میم'، 'ی' اور 'نون غنہ' ہے۔ چنانچہ اس کے ظاہر کا یہ تاثر حسِ مشترک پر منعکس ہوتا ہے۔ یہ تاثر ایک حصے میں بصورتِ تصویر حسِ خیال میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کا معنیٰ بھی عقل کے دوسرے حصے میں پہنچ جاتا ہے۔

(۳) حسِ واہمہ

حسِ واہمہ بھی وصول کرنے کا ایک دفتر ہے۔ جس طرح کسی لفظ، کسی شے اور ادراک کی ظاہری صورت حسِ مشترک میں وصول ہوئی تھی، اس طرح حسِ واہمہ اُس صورت کا معنیٰ و مفہوم وصول کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حسِ مشترک نے اُس صورت کو وصول (receive) کیا جب کہ حسِ خیال نے اسے محفوظ کر لیا۔ یہ اس کا اسٹور ہے۔ تیسرے شعبہ حسِ واہمہ نے اُس صورت کے معنیٰ کو وصول (receive) کیا۔

(۴) حسِ حافظہ

حسِ واہمہ نے جو معنیٰ وصول کیا تھا، اُسے حسِ حافظہ نے محفوظ کرلیا۔ یہ اُس شے کے معنیٰ کو اسٹور کرتا ہے، اس خوبی پر اسے حافظہ کہتے ہیں۔ ہر شے، ہر لفظ اور ہر آواز الغرض ہر شے کی صورت کو حسِ مشترک وصول (receive) کرتا ہے اور اُس صورت کے معنیٰ کو حسِ واہمہ وصول (receive) کرتا ہے۔ حسِ خیال اُس صورت اور حسِ حافظہ اس کے معنیٰ کو محفوظ کرتا ہے۔

عقل کے ان چاروں شعبوں کے عمل کرنے کے باوجود ابھی علم وجود میں نہیں آیا۔ ہر چیز، ہر آواز اور ہر شے کی ظاہری صورت حسِ مشترک میں وصول ہوئی اور وہ حسِ خیال میں محفوظ ہوگئی۔ اس سارے عمل سے ابھی علم نہیں بنا۔ جب ایک خانے نے وصول (receive) کیا اور دوسرے نے اسے محفوظ (store) کر لیا تو بھی علم نہیں بنا۔ اسی طرح ہر چیز کا جو معنیٰ تھا، وہ حسِ واہمہ نے وصول کر لیا، حسِ حافظہ نے معنیٰ کو حافظہ میں محفوظ کر لیا۔ یہ چار چیزیں الگ الگ خانوں میں چلی گئیں۔ اُن میں سے دو خانوں نے ظاہر اور باطن کو وصول کیا اور دو نے ظاہر و باطن کو اپنے معانی کے اعتبار سے محفوظ کر لیا۔ واضح رہے کہ ابھی تک علم مکمل نہیں ہوا۔

(۵) حسِ متصرّفہ

پانچواں شعبہ حسِ متصرّفہ ہے، جسے متخیلہ اور متفکرہ بھی کہتے ہیں۔ اس کا کام 'حسِ مشترک' میں آنے والی ظاہری صورت کو 'حسِ واہمہ' میں حاصل ہونے والے معنی سے اور 'حسِ خیال' میں محفوظ شکل وصورت کو 'حسِ حافظہ' میں محفوظ مفہوم کے ساتھ جوڑ دینا ہے۔ یوں انسان مختلف الفاظ سن کر ان کا مفہوم سمجھنے، مختلف رنگوں کو دیکھ کر ان میں تمیز کرنے اور مختلف اشیاء کے ذائقے چکھ کر ان کے درمیان فرق معلوم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اس طرح یہ پانچوں حصے باہم مل کر ایک خاص نکتے تک پہنچتے ہیں، جسے علم کہا جاتا ہے۔ اگر یہاں حسِ مشترک موجود نہ ہو تو پانچوں حواس بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔ اگر ان میں حسِ واہمہ درست نہ ہو تو ہم سب کچھ دیکھیں گے لیکن جان کچھ بھی نہ سکیں گے۔ کسی بھی چیز کی آواز تو سنائی دے گی مگر اس کا مفہوم سمجھ میں نہ آ سکے گا۔ کسی چیز کو ہاتھوں سے چھوا تو جا رہا ہوگا مگر نرم وسخت چیزوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکے گا۔ پھر جب اس تصور پر کچھ چیزیں بار بار کے تجربے و مشاہدے، سوچ بچار اور تفکر و تعقل سے شامل (add) ہوتی ہیں تو اس میں مزید پختگی آ جاتی ہے۔ نتیجتاً ادراک، علم میں بدل جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جب کسی شے کے بارے میں کوئی شک، وہم اور تردد نہیں رہتا تو وہ علم بن جاتا ہے۔

۷۔ حواسِ ظاہری اور حواسِ باطنی کی محدودیت

اب تک کی بیان کی گئی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ حواسِ خمسہ ظاہری علم تک رسائی کے لئے عقل کے مذکورہ پانچوں شعبہ جات کے محتاج ہوتے ہیں۔ جب تک حواسِ ظاہری کے مدرکات ان پانچوں شعبوں سے گزر کر ایک صحیح نتیجے تک نہ پہنچیں، اس وقت تک حواسِ ظاہری کے ذریعے محسوس کیے جانے والے تمام مادی حقائق علم کی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔ گویا حواسِ خمسہ ہماری کسی شے کو محسوس تو کرتے ہیں مگر اسے معلوم نہیں کر سکتے۔

اسی طرح عقل اور اس کے پانچوں شعبے مکمل طور پر حواسِ خمسہ ظاہری کے محتاج ہیں۔ اگر آنکھ دیکھنے، کان سننے، ناک سونگھنے، زبان چکھنے اور ہاتھ چھونے سے محروم ہو تو تمام عقلی شعبے مل کر بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جہاں حواس، عقل کے محتاج ہیں؛ وہیں خود عقل بھی اِن حواس کی محتاج ہے۔

حواس کے محتاج ہونے کی چند مثالیں

اگر کسی بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اس کی پرورش کا آغاز کسی ایسی جگہ پر کیا جائے جہاں کوئی آواز اس کے کان میں نہ پڑنے پائے تو وہ پچاس سال کی عمر تک پہنچ جانے کے بعد بھی نہ کچھ بول سکے گا اور نہ کچھ سمجھ سکے گا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی اپنی زبان سے بولتے ہیں، دراصل یہ ان آوازوں کا نتیجہ ہوتا ہے جو ہم کانوں سے سنتے ہیں اور جنہیں عقل نے حافظے میں محفوظ کر لیا ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے کان سے کچھ سن ہی نہیں سکا اور اس کی عقل الفاظ، حروف، لہجوں اور آوازوں کو محفوظ ہی نہ کر سکی تو جس طرح اس کا دماغ الفاظ کے معاملے میں سفید کاغذ کی طرح کورا رہا، اسی طرح اس شخص کو اپنی کیفیات، حاجات اور خواہشات کے بیان پر بھی قدرت حاصل نہ ہو سکی۔

اس طرح جو بچہ پیدائشی بہرا ہوتا ہے وہ خود بخود گونگا ہوتا ہے۔ اس کا یہ گونگا پن اس کی زبان کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نے کوئی لفظ سنا ہی نہیں تو وہ اپنے ما

فی الضمیر کو کیسے الفاظ کا جامہ پہنائے گا؟

اِسی طرح اگر ایک شخص کسی ایسی جگہ پر پیدا ہوا، جہاں پیدائش سے لے کر مرتے دم تک اس نے روٹی ہی نہیں دیکھی تو لفظ روٹی سن کر اس کا معنیٰ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ایک آدمی اگر اندھا پیدا ہوا تو اس کے لیے تمام رنگ ایک ہی طرح کے ہیں اور وہ سیاہ، سفید، نیلے اور پیلے رنگ میں تمیز ہی نہیں کر سکے گا، چونکہ اس کی آنکھ نے کوئی رنگ دیکھا ہی نہیں ہے۔ کسی میں حسِ شامہ پیدائشی طور پر نہیں ہے تو وہ خوش بو اور بدبو میں تمیز ہی نہیں کر سکے گا۔

اِسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بہروں، گونگوں اور خصوصی بچوں کے اسکولز ہوتے ہیں۔ جہاں انہیں خاص طریقوں اور ہاتھوں کے اشارے سے سکھایا جاتا ہے تاکہ ان کا دماغ کسی چیز کو سمجھے۔ علیٰ ہذا القیاس جو کچھ حواس نے اُسے مہیا کیا عقل نے وہی کچھ وصول (receive) کیا۔ چنانچہ یہ امر متحقق ہوگیا کہ انسانی عقل کی پرواز صرف وہیں تک ہے جہاں تک حواس کام کرتے ہیں۔

۸۔ عقل کے فرائض

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ عقل نے دی گئی معلومات کو صرف وصول کیا، محفوظ کیا اور ترتیب دیا۔ عقل اپنے ایک شعبے میں صورت کو وصول کر لیتی ہے اور ایک شعبے میں معنیٰ کو وصول کر لیتی ہے۔ اسی طرح ایک شعبۂ عقل صورت کو محفوظ کرتا ہے اور دوسرا معنیٰ کو محفوظ کرتا ہے۔ بعد میں محفوظ شدہ (preserved) صورت کو اس کے معنیٰ سے جوڑ کر کوئی حکم لگایا جاتا ہے یا کوئی فعل رُو بہ عمل ہوتا ہے۔ جیسے لفظ 'پانی' کی آواز جس چیز کو پانی کہا جاتا ہے اس کے تصور اور تاثر سے جوڑتی ہے۔ لفظ 'دودھ' کی آواز، جس شے کو دودھ کہا جا رہا ہے اس معنیٰ کے ساتھ جوڑتی ہے۔ یہ حسِ مشترک اور حسِ واہمہ کا عمل (function) ہے۔ حصہ خیال میں اس صورت کا معنیٰ اور حصہ حافظہ میں اس صورت کی ہئیت اگر محفوظ ہوگی تو کوئی فعل رُو بہ عمل ہوگا۔ اگر حسِ خیال کے ساتھ حسِ حافظہ کام نہ کرے تو جو چیز محفوظ ہے وہ منتشر اور مختلف ہو جائے گی۔

اگر آنکھ نے کسی چیز کو دیکھا ہی نہیں تو اس کی تصویر بھی عقل کو منتقل نہیں ہوگی۔ جس کو کبھی صورتاً و معنًا آنکھ نے نہیں دیکھا تو عقل اس شے کے بارے میں علم مہیا نہیں کر سکتی۔ کان نے جس آواز کو سنا ہی نہیں، عقل اس کے بارے میں کوئی تصور اور علم مہیا نہیں کر سکتی۔ چونکہ اس کو بنیادی طور پر خام مواد ہی نہیں ملا۔ ناک نے جس چیز کو سونگھا ہی نہیں، عقل اس کی خوشبو اور بدبو کے بارے میں کوئی تصور اور علم مہیا نہیں کر سکتی۔ زبان نے جس چیز کو چکھا ہی نہیں، عقل اس کے بارے میں ذائقے کا کوئی علم اور تصور مہیا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ہاتھوں نے جس چیز کو چھوا ہی نہیں، عقل اس کے نرم یا سخت ہونے کے بارے میں کوئی تاثر، تصور اور علم مہیا نہیں کر سکتی۔

یہ ساری چیزیں عقل کے اندر منظّم ہو رہی ہیں۔ یہ وہ مواد ہے جو حواسِ خمسہ نے بھیجا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو چیز محسوسات سے خارج ہے عقل اس کا ادراک نہیں کر سکتی اور وہ معقولات میں نہیں آ سکتی۔ گویا تمام معقولات کی بنیاد محسوسات پر ہے۔ عقل کے سارے تصورات اور معلومات کا سارا انحصار مدرکات پر ہے۔ جو کچھ حواس بھیجتے ہیں عقل اسی مواد کو باہم مربوط کرتی اور منظّم کر کے علم کی شکل دیتی ہے۔

۹۔ عقل کی ماہیت، نوعیت اور حیثیت

عقل سے مراد دماغ ہے لیکن عرفِ عام میں چونکہ لفظ 'عقل' ہی زیادہ استعمال ہوتا ہے، اِس لیے تشکیلِ علم کے باب میں ہم اپنی گفتگو کے دوران جہاں بھی دماغ کی صلاحیت کی بات کریں گے تو وہاں لفظ عقل مراد ہوگا۔ شیخ اکبر محی الدین بن عربی **في معرفة أسرار أهل الإلهام** (اہل الہام کے اسرار کی معرفت) کے باب میں کرتے ہیں:

وَهٰذَا مِنْ أَعْجَبِ الْأُمُوْرِ عِنْدَنَا أَنْ يَكُوْنَ الإِنْسَانُ يُقَلِّدُ فِكْرَهُ وَنَظَرَهُ وَهُوَ مُحْدَثٌ مِثْلُهُ. (۱)

(۱) ابن عربی، الفتوحات المکیة، ۳۱۶:۴

ہمارے نزدیک یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ انسان اپنے فکر ونظر کا مقلّد بنتا ہے حالانکہ عقل بھی اُسی طرح حادث ہے جیسے خود سارا اُس کا وجود ہے۔

یعنی انسان کے فکر ونظر میں جو بات آتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ بس وہی صحیح ہے۔ انسان لامحدود کو بھی اپنی محدود فکر ونظر سے سمجھنا چاہتا ہے اور وہ عقل کی بات پر اعتماد کرتا ہے۔ حالانکہ جس طرح اُس کے وجود کی حدود ہیں، اُسی طرح عقل کی بھی اپنی حدود ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک محدود وجود میں ایک لامحدود جوہرِ عقل رکھ دیا ہو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کے وجود کے اندر دماغ کے قوائے ذہنی بھی عقل کی خدمت کے لئے تشکیل دیے ہیں۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ اِن قوائے ذہنی کے ذریعے عقل مقدمات کو ترتیب دے کر علم کو متشکل کر سکے۔

چنانچہ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ عقل خود انہی قواء کی محتاج ہے، جس کا انحصار اُسی محدود جسم کے اپنے حواس کی معلومات پر ہے۔ بندہ اپنی محدود عقل کو لامحدود سمجھ کر اُس کے فیصلوں کا مقلّد اور پیروکار بننا چاہتا ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا ہے:

جَعَلَ الْعَقْلَ فَقِيْرًا إِلَيْهِ يَسْتَمِدُّ مِنْهُ مَعْرِفَةُ الْأَصْوَاتِ. وَلَيْسَ فِي قُوَّةِ الْعَقْلِ مِنْ حَيْثُ ذَاتِهٖ إِدْرَاكُ شَيْءٍ مِنْ هٰذَا مَا لَمْ يُوْصِلْهُ إِلَيْهِ السَّمْعُ. وَكَذَالِكَ الْقُوَّةُ الْبَصَرِيَّةُ. جَعَلَ اللهُ الْعَقْلَ فَقِيْرًا إِلَيْهَا. (۱)

اللہ تعالیٰ نے عقل کو حواس کا فقیر یعنی محتاج بنایا ہے۔ وہ ان سے آوازوں کی پہچان میں مدد لیتی ہے۔ بذاتِ خود عقل میں یہ طاقت اور قوت نہیں ہے کہ وہ کسی شے کا اِدراک کر سکے جب تک کہ سماعت اس تک کوئی پیغام نہ پہنچائے، یا قوتِ باصرہ اسے کوئی معلومات فراہم نہ کرے۔ گویا عقل کو اللہ تعالیٰ نے حواس کا محتاج بنایا ہے۔

یعنی اگر ہم ماحول میں سنائی دی جانے والی آوازوں پر ہی غور کریں تو بہت کچھ ذہن میں آئے گا۔ مثال کے طور پرندوں کی آواز اور ہوا کی سرسراہٹ کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس

(۱) ابن عربی، الفتوحات المکیة، ۴:۳۱۷-۳۱۸

طرح دروازے کھلنے کی آواز اور اس کی دستک کیسی ہے؟ پانی آبشار سے گرتا ہے تو اُس کی آواز کیسی ہوتی ہے؟ انسان کی چیخ و پکار کیسی ہے؟ پرندوں کی چہچہاہٹ کیسی ہے؟ بکری کی آواز کیسی ہے؟ گائے کی آواز کیسی ہے؟ اونٹ کیسی آواز نکالتا ہے؟ اُس کے متعلقہ وہ کہتے ہیں کہ اگر آواز کی ہی مثال دے دیں تو یہ ساری چیزیں حواس نے عقل کو مہیا کی ہیں اور پھر عقل نے اِن اِدراکات کو ترتیب دے کر اُسے علم کی شکل دی ہے۔

عقل کے اندر از خود کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ حسِ سامعہ جو اُسے پہنچائے گی عقل اسی پر فیصلہ کرے گی۔ یہی معاملہ بصارت کا ہے کہ جب آنکھ ادراک منتقل کرے گی تو عقل اُس پر مبصرات کا کوئی فیصلہ کرے گی کہ یہ سبز رنگ ہے، یہ پیلا ہے، یہ سفید ہے، یہ سیاہ ہے اور یہ فلاں فلاں رنگ ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی نے اسی طرح عقل کے حسِ مشترک، حافظہ، واہمہ اور حسِ خیال اور حسِ متصرفہ پانچوں حواس کا ذکر کرتے ہوئے عقل کو محدود اور حواس کا محتاج ثابت کیا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اِس پر کسی کی دو رائے نہیں ہے کہ عقل نہ صرف حواس کی محتاج ہے بلکہ اُس کی فرماں روائی اور علم حاصل کرنے کی قوت بھی محدود ہے۔

۱۰۔ عقل کا لغوی معنیٰ

غور طلب بات یہ ہے کہ عقل کا نام کس وجہ سے عقل رکھا گیا ہے۔ عام طور پر ہم عقل کا معنیٰ فہم سمجھتے ہیں۔ مگر علماء نے اس کے دیگر لغوی معانی بھی بیان کئے ہیں جن سے اس کی حقیقت مزید عیاں ہو جاتی ہے:

۱۔ امام ابو منصور الازہری تہذیب اللغة میں شیخ ابو سعید کا قول بیان کرتے ہیں:

إِذَا أَقَامَهُ عَلٰى إِحْدٰى رِجْلَيْهِ، كَمَا يُقَالُ: عَقَلَ فُلَانًا وَعَكَلَهُ.[1]

(۱) أبو منصور، تہذیب اللغة، ۱: ۱۶۱

اگر کسی کو ایک ٹانگ پر کھڑا کر دیا جائے تو اسے بھی عقل کہتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: اُس شخص نے اُسے عقل کر دیا یعنی ایک ٹانگ پر کھڑا کر دیا۔

سوال ہے کہ اس مثال میں لفظ عقل کا اطلاق کیوں کیا گیا؟ اِس سوال کا جواب ہمیں سیدنا علی المرتضٰی ﷺ کے ایک واقعے سے ملتا ہے۔ کسی نے سیدنا مولا علی المرتضی ﷺ سے پوچھا کہ انسان کتنی طاقت و اختیار رکھتا ہے اور کتنا بے بس ہے؟ انہوں نے فرمایا: اپنی ایک ٹانگ اٹھا لو۔ اُس نے اُٹھا لی۔ پھر فرمایا: اب دوسری ٹانگ بھی اُٹھا لو۔ اس نے عرض کیا: یہ ناممکن ہے۔ سیدنا علی ﷺ نے فرمایا: بس! بندہ اسی قدر مختار اور اسی قدر محتاج ہے۔

یعنی بندے کی اپنی استعداد اور صلاحیت اتنی ہے کہ صرف ایک ٹانگ پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ اگر انسان ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جائے تو وہ اپنی قوت اور صلاحیت میں محدود ہو جاتا ہے۔ اِس لیے محدود کے استعارے کے طور پر اِس کیفیت کو عقل کہا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دو ٹانگوں پر کھڑے ہونے کو عقل نہیں کہا۔ ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے سے بندے میں کمزوری آ جاتی ہے۔ اگر ایسا کر دیا اور کوئی سارا دن ایک ٹانگ پر کھڑا رہا تو کہیں گے:

هُوَ مَعْقُوْلٌ مُنْذُ الْيَوْمِ.

وہ شخص پورے دن سے معقول ہے، یعنی ایک ٹانگ پر کھڑا ہے۔

۲۔ صاحبِ قاموس امام مجد الدین فیروز آبادی اپنی تصنیف 'بصائر ذوی التمییز' میں عقل کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ عقل کا معنیٰ حماقت اور پاگل پن کی ضد ہے، لیکن اِس کا یہ معنی بھی ہے:

عَقَلَ يَعْقِلُهُ وَيَعْقُلُهُ أَمْسَكَهُ. (۱)

اگر کسی چیز کو روک دیا، باندھ دیا تو اُسے بھی عقل کہتے ہیں۔

اسی سے **عقل البعیر** اور **إعقال** بھی ہے۔ نکیل باندھنے والی چیز کو بھی عقل اور عقال

(۱) فیروز آبادی، بصائر ذوی التمییز، ۴:۸۵

کہا جاتا ہے۔ جب اونٹ کو بٹھانا چاہتے ہیں تو اس کی پنڈلی کے اگلے حصہ کو باندھ دیتے ہیں تو اُس کے لیے بھی عقل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ گویا عقلہ و اعتقلۃ سے مراد حیوان کی پنڈلی کے اگلے حصہ کو باندھ دینا ہے تا کہ وہ کہیں بھاگ نہ سکے، گویا اُسے پابند کر دیا گیا ہے۔

اس معنی کی رُو سے کسی کو باندھنا اور روک دینا بھی عقل کہلاتا ہے۔ یہاں باندھ دینا اور روک دینا اُس کی محدودیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب آپ عقل کو غیر محدود مانیں گے تو یہ بے عقلی کہلائے گی۔ ایسا کہنا عقل کی اپنی صلاحیت، قوت، استعداد اور صفت کے خلاف ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں عقل کو لامحدود علم کا حاصل کرنے والا سمجھنا، عقل کو لامحدود صلاحیت سمجھنا عقل مندی نہیں بلکہ کھلی حماقت ہے۔

۳۔ اِسی طرح عقل کا مفہوم یہ بھی ہے:

وَلَا يَنْفَعُ مَسْمُوْعٌ إِذَا لَمْ يَكُ مَطْبُوْعًا.(۱)

سنی سنائی بات اُس وقت تک نفع نہیں دے گی جب تک لکھی ہوئی نہ ہو۔

یعنی اگر ہمارے سامنے کوئی تحریر موجود ہو تو اُسے ہم پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر وہ تحریر آنکھوں کے سامنے نہ ہو تو اُسے نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔ یہ اشارہ اِس امر کی طرف ہے کہ حواس کے ادراک اور عقل کے ترتیبِ مقدمات کا عمل دونوں ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ اگر آپ اِنہیں آزاد کر دیں تو عقل کا اپنا معنیٰ ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ عقل، عقل ہی نہیں رہے گی۔

پس عقل کے اندر بنیادی طور پر اِمساک (روک دینا)، باندھ دینا، جوڑ دینا، ایک ٹانگ پر کھڑا کر دینا، محدود کر دینا اور تحریکیت (movement) کو ختم کر دینے کا معنیٰ پایا جاتا ہے۔ یہاں سے عقل اور حواس کی محدودیت متحقق (establish) ہوتی ہے۔

---

(۱) ۱۔ غزالی، إحياء علوم الدين، ۱:۸۶، ۳:۱۶
۲۔ ملا علی قاری، مرقاة المفاتيح، ۹:۲۶۱

۱۱۔ انسانی عقل اور مابعد الطبعیات سے متعلق سوالات

اب سوچیے کہ ہم بعض امور میں کتنی نادانی کرتے ہیں۔ جب ہم سمجھتے ہیں کہ عقل ہر چیز کے بارے میں رہ نمائی کرسکتی ہے۔ یہاں آ کر انسان دھوکہ کھاتا ہے۔ جب وہ ہر شے اور ہر حقیقت کا فیصلہ- خواہ اس کا تعلق عالمِ مادیات کے ساتھ ہے، عالمِ روحانیات کے ساتھ ہے یا عالم مابعد الطبیعیات کے ساتھ ہے-عقل کے تناظر میں دیکھتا ہے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ حواسِ خمسہ ظاہری اور عقل کے متحرک ہونے کے باوجود انسانی زندگی کی حقیقت سے متعلق اکثر سوالات تشنہ رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر کائنات کا آغاز کیسے ہوا اور اس کا اختتام کب اور کیسے ہوگا؟ انسان کی تخلیق کیسے ہوئی؟ اسے کس نے پیدا کیا؟ انسان کی زندگی کا کیا مقصد ہے؟ اس کائنات سے اس کا تعلق کیا ہے؟ اس میں زندگی گزارنے کے لئے کون سے قوانین وضوابط درکار ہیں؟ کون سی چیز اچھی اور کون سی بُری ہے؟ ظلم کیا ہے اور انصاف کیا ہے؟ مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے؟ آیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے یا ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے؟ مرنے کے بعد زندگی کی کیفیت کیا ہوگی؟ مرنے کے بعد کیا کوئی جواب طلبی بھی ہوگی یا نہیں؟ مرنے کے بعد روح اور جسم کا کوئی تعلق باقی رہے گا کہ نہیں؟ مرنے کے بعد روح کہاں جا کر ٹھہرتی ہے؟ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو مابعد الطبعیات سے تعلق رکھتی ہیں۔

چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

یہ وہ سوالات ہیں جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتے ہیں کہ اگر انسانی زندگی با مقصد ہے تو انسان کو ان تمام سوالوں کے تسلی بخش جواب چاہییں۔ یہ تمام سوالات ہمارے مدرکات، محسوسات اور حواسِ خمسہ کی صلاحیت سے بھی خارج اور ماورئ ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کے بارے میں حواس نے عقل کو کوئی مواد بھیجا ہی نہیں۔ اس لئے عقل کبھی بھی ان کے بارے میں درست فیصلہ نہ دے سکی ہے اور نہ ہی کبھی دے پائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں جا کر عقل ناکام، حیرت زدہ ہوکر تحیّر اور استعجاب میں گم ہو جاتی ہے اور لا أدری کہتی ہے یا بندے کو گمراہ کر دیتی ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کی ہدایت آ کر بندے کا دامن تھام لیتی ہے۔ علامہ محمد اقبالؔ نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل کو اس لیے نور کہا گیا ہے کیونکہ وہ روشنی دیتی ہے۔ عقل کبھی منزل نہیں ہوتی۔ عقل راستے میں عین اسی طرح کھڑی ہے، جیسے راستے میں حواسِ خمسہ کھڑے تھے۔ نہ تو حواسِ خمسہ خود منزل تک پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی عقل منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہے۔ جو انسان ایسے سوالات کا جواب عقل سے لینا چاہے گا تو وہ اُسے گم راہ کر دے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَتِلْکَ حُدُوْدُ اللهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ○[1]

یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدود ہیں جنہیں وہ علم والوں کے لیے بیان فرماتا ہے○

عقل ان امور پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اگر ہم اسے عقل کے ذریعے سوچنا اور جاننا چاہیں گے تو عقل خود بھی گم ہے اور ہمیں بھی گم کر دے گی۔ اس لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ حقیقت ناآشنا کفار اُس کی ذات و صفات کے بارے میں بحث کرتے ہیں:

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ○[2]

بغیر علم و دانش کے اور بغیر کسی ہدایت و دلیل کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے (جو آسمان سے اتری ہو)○

---

(۱) البقرة، ۲: ۲۳۰
(۲) الحج، ۲۲: ۸

یعنی ان کے پاس نہ تو علم ہے، نہ ذرائعِ علم ہیں اور نہ ہی ہدایت ہے۔

پتہ چلا کہ علم کے معروف ذرائع سے ہٹ کر بھی ایک اور ذریعہ ہے جہاں سے ہدایت ملتی ہے۔ اس کے بعد وہ درجہ ہے، جسے 'کتابِ منیر' اور 'علم بالوحی' کا نام دیا گیا ہے۔

باب نمبر 9

حصولِ علم کے باطنی ذرائع

پچھلے باب میں ہم یہ بحث مکمل کر چکے ہیں کہ عقل کا تمام تر انحصار حواسِ خمسہ پر ہے۔ حواسِ خمسہ اور عقل باہم مل کر علم کے مقام تک پہنچتے ہیں۔ نہ تنہا حواس علم دے سکتے ہیں اور نہ ہی اکیلی عقل علم کو مرتب کر سکتی ہے۔ یاد رہے کہ حواس ادراک مہیا کرتے ہیں۔ اگرچہ علم تک پہنچنے میں عقل کی اپنی صلاحیتیں کارفرما ہوتی ہیں لیکن اس کی تمام تر بنیاد حواسِ خمسہ کے مہیا کیے ہوئے مدرکات پر ہے۔ یہ مدرکات بنیادی طور پر عالم مادیات و حسیات سے متعلق ہیں۔ پچھلے باب کے آخر میں ان سوالات کے بیان پر بحث ختم ہوئی تھی کہ جو اُمور ہمارے مدرکات، محسوسات سے خارج اور ماوریٰ ہیں، ان تک رسائی سے عقل عاجز اور متحیر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو چونکہ اشرف المخلوقات بنایا ہے، لہٰذا اُسے علم کے حوالے سے مایوس نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ یہ منزل وہ ہے کہ جہاں سارے انسانی ذرائع بے بس ہو جاتے ہیں اور پھر ہدایت کے لیے وحی اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل کے عاجز و بے بس ہونے کے بعد ایک اور ذریعہ حضرتِ انسان کو عطا فرمایا ہے جو ان حواسِ خمسہ اور عقل سے بھی ماورا ہے۔ صوفیاء اُس ذریعے کو روحانی لطائفِ خمسہ کہتے ہیں۔ بعض نے انہیں لطائفِ سبعہ یعنی سات روحانی لطائف تک شمار کیا ہے۔ جہاں عقل اور حواسِ خمسہ جواب دے جاتے ہیں، وہاں اس علم کا راستہ کھلتا ہے۔

اس چشمۂ علم کے جواہر درج ذیل ہیں:

۱۔ لطیفۂ قلب

۲۔ لطیفۂ روح

۳۔ لطیفۂ خفی

۴۔ لطیفۂ اَخفیٰ

۵۔ لطیفۂ نفس

۶۔ لطیفۂ سِرّ

۷۔ لطیفۂ قالبیہ

۱۔ باطنی ذرائعِ علم کا قرآن وسنت سے اِثبات

اِس موضوع پر آنے سے قبل ہم شرعی دلیل کے ساتھ اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ کیا حواسِ خمسہ ظاہری، حواسِ خمسہ باطنی اور وحی کے علاوہ بھی کوئی اور ذریعہ انسان کے اندر موجود ہے جو اُسے حقیقت تک رسائی دے سکے۔

آیئے! اس سلسلہ میں شریعت سے رہنمائی لیتے ہیں، اس لئے کہ شرعی دلیل اس معاملے میں بنیادی شرط ہے کیونکہ صحت اور عدمِ صحت کا معیار شریعت پر ہے۔

(ا) وحی کی صورتیں

قرآن مجید میں واضح طور پر خالقِ کائنات نے وحی کے نزول کے تین طریقے بیان کیے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

وَمَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ.(۱)

اور ہر بشر کی (یہ) مجال نہیں کہ اللہ اس سے (براہِ راست) کلام کرے مگر یہ کہ وحی کے ذریعے (کسی کو شانِ نبوت سے سرفراز فرما دے) یا پردے کے پیچھے سے (بات کرے جیسے موسیٰ علیہ السلام سے طورِ سینا پر کی) یا کسی فرشتے کو فرستادہ بنا کر بھیجے اور وہ اُس کے اِذن سے جو اللہ چاہے وحی کرے (الغرض عالمِ بشریت کے لیے خطابِ اِلٰہی کا

(۱) الشوریٰ، ۴۲: ۵۱

واسطہ اور وسیلہ صرف نبی اور رسول ہی ہوگا)۔

یعنی اللہ تعالیٰ درج ذیل تین صورتوں کے ذریعے انبیاء سے کلام فرماتا ہے:

۱۔ براہِ راست کلام

۲۔ پردے کے پیچھے سے کلام

۳۔ فرشتے کے ذریعے

(i) براہِ راست کلام

اللہ تعالیٰ اپنے نبی یا رسول سے بغیر ذریعے اور واسطے کے براہِ راست کلام کرتا ہے۔ اس کی مثال حضور نبی اکرم ﷺ سے شبِ معراج مقام اَوْ اَدْنٰی پر اللہ تعالیٰ کا کلام فرمانا ہے۔ اس کے بارے ارشاد فرمایا ہے:

فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰیo[1]

پس (اُس خاص مقامِ قُرب و وصال پر) اُس (اللہ) نے اپنے عبد (محبوب) کی طرف جو (بھی) وحی فرمائیo

(ii) پردے کے پیچھے سے کلام

اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی یا رسول سے پردے کے پیچھے کلام کرنا وحی کی دوسری شکل ہے۔ جیسے کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا گیا تھا۔ قرآن حکیم فرماتا ہے:

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَكْلِيْمًاo[2]

اور اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) سے (بلاواسطہ) گفتگو (بھی) فرمائیo

---

(۱) النجم، ۵۳: ۱۰

(۲) النساء، ۴: ۱۶۴

حضرت موسیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ سے عرض کر رہے تھے کہ مولا! مجھے اپنا دیدار کرا دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے دیدار کی تجلی کا نظارہ کرایا اور اللہ نے حضرت موسیٰ ﷺ سے کلام کیا۔ اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ ﷺ سے یہ کلام حجاب کے پیچھے سے تھا۔

(iii) فرشتے کے ذریعے کلام

وحی کی تیسری شکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت جبرائیل ﷺ کو اپنے نبی یا رسول کی طرف پیغام رساں بنا کر بھیجتا ہے۔ وہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کے اِذن سے کلامِ الٰہی وحی فرماتا ہے۔

فرمایا:

اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ.[1]

یا کسی فرشتے کو فرستادہ بنا کر بھیجے اور وہ اُس کے اِذن سے جو اللہ چاہے وحی کرے (الغرض عالمِ بشریت کے لیے خطابِ اِلٰہی کا واسطہ اور وسیلہ صرف نبی اور رسول ہی ہوگا)۔

اَنبیاء اور رسولوں کے بعد اب عام انسان رہ گئے، اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں واضح نفی فرما دی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کلام نہیں کرتا۔ اگر اللہ کا کلام، اللہ کا خطاب، اللہ کا پیغام پہنچانا مقصود ہو تو کلامِ اِلٰہی کے پہنچنے کا واسطہ صرف اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔

(۲) وحی اور وجدان میں فرق

یاد رکھ لیں کہ وحی کوئی ایسا ملکہ نہیں ہے جو انسان کے اندر سے حواسِ خمسہ، وجدان، فطریات، تجربیات اور بدیہیات کی طرح پھوٹتا ہو۔ بعض اَہلِ مغرب اسے وجدان (intuition) کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں جبکہ وحی اور چیز ہے، وجدان کچھ اور کیفیت ہے۔ وجدان انسان کے باطن سے پھوٹتا ہے جبکہ وحی (revelation) اندر سے نہیں پھوٹتی۔

---

(۱) الشوری، ۴۲: ۵۱

قرآن مجید نے وحی کے بارے میں واضح کر دیا ہے:

اَوۡ یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَیُوۡحِیَ بِاِذۡنِہٖ مَا یَشَآءُ.(۱)

یا کسی فرشتے کو فرستادہ بنا کر بھیجے اور وہ اُس کے اِذن سے جو اللہ چاہے وحی کرے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی دلیلِ شرعی حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس اور آپ ﷺ کی احادیثِ صحیحہ ہیں۔ حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں:

إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَرَجَ حِيْنَ زَاغَتِ الشَّمْسُ، فَصَلَّى الظُّهْرَ، فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ عَلَى الْمِنْبَرِ، فَذَكَرَ السَّاعَةَ، وَذَكَرَ أَنَّ بَيْنَ يَدَيْهَا أُمُوْرًا عِظَامًا، ثُمَّ قَالَ: مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَسْأَلَ عَنْ شَيءٍ فَلْيَسْأَلْ عَنْهُ: فَوَاللهِ، لَا تَسْأَلُوْنِي عَنْ شَيءٍ إِلَّا أَخْبَرْتُكُمْ بِهٖ مَا دُمْتُ فِي مَقَامِي هٰذَا، قَالَ أَنَسٌ: فَأَكْثَرَ النَّاسُ الْبُكَاءَ، وَأَكْثَرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أَنْ يَقُوْلَ: سَلُوْنِي. فَقَالَ أَنَسٌ: فَقَامَ إِلَيْهِ رَجُلٌ فَقَالَ: أَيْنَ مَدْخَلِي يَا رَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: النَّارُ. فَقَامَ عَبْدُ اللهِ بْنُ حُذَافَةَ، فَقَالَ: مَنْ أَبِي يَا رَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: أَبُوْكَ حُذَافَةُ. قَالَ: ثُمَّ أَكْثَرَ أَنْ يَقُوْلَ: سَلُوْنِي، سَلُوْنِي. فَبَرَكَ عُمَرُ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ فَقَالَ: رَضِيْنَا بِاللهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا، وَبِمُحَمَّدٍ ﷺ رَسُوْلًا. قَالَ: فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ حِيْنَ قَالَ عُمَرُ ذٰلِكَ. ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ، لَقَدْ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ آنِفًا فِي عُرْضِ هٰذَا الْحَائِطِ، وَأَنَا أُصَلِّي، فَلَمْ أَرَ كَالْيَوْمِ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ.(۲)

() الشوری، ۴۲: ۵۱

(۲) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب ما يكره من كثرة السؤال وتكلف ما لا يعنيه، ۶: ۲۶۶۰، رقم: ۶۸۶۴

۲۔ بخاري، الصحيح، كتاب مواقيت الصلاة، باب وقت الظهر عند ←

جب آفتاب ڈھلا تو حضور نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور ظہر کی نماز پڑھائی پھر سلام پھیرنے کے بعد آپ ﷺ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور قیامت کا ذکر کیا اور پھر فرمایا: اس سے پہلے بڑے بڑے واقعات و حادثات ہیں، پھر فرمایا: جو شخص کسی بھی نوعیت کی کوئی بات پوچھنا چاہتا ہے تو وہ پوچھے، اللہ کی قسم! میں جب تک یہاں کھڑا ہوں تم جو بھی پوچھو گے اس کا جواب دوں گا۔ حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ جلال کے سبب بار بار یہ اعلان فرما رہے تھے کہ کوئی سوال کرو، مجھ سے (جو چاہو) پوچھ لو۔ حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ پھر ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! میرا ٹھکانہ کہاں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: دوزخ میں۔ پھر حضرت عبد اللہ بن حذافہ ؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرا باپ حذافہ ہے۔ حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ پھر آپ ﷺ بار بار فرماتے رہے مجھ سے سوال کرو، مجھ سے سوال کرو۔ چنانچہ حضرت عمر ؓ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرض گزار ہوئے: ہم اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد مصطفیٰ ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہیں (اور ہمیں کچھ نہیں پوچھنا)۔ راوی کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر ؓ نے یہ گزارش کی تو حضور نبی اکرم ﷺ خاموش ہو گئے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! ابھی ابھی اس دیوار کے سامنے مجھ پر جنت اور دوزخ پیش کی گئیں جبکہ میں نماز پڑھ رہا تھا تو آج کی طرح میں نے خیر اور شر کو کبھی نہیں دیکھا۔

..... الزوال، ۱:۲۰۰، رقم: ۲۰۰۱، ۲۲۷۸

۳۔ بخاري، الصحيح، كتاب العلم، باب حسن برك على ركبتيه عند الإمام أو المحدث، ۱:۴۷، رقم: ۹۳

۴۔ مسلم، الصحيح، كتاب الفضائل، باب توقيره ﷺ وترك إكثار سؤال عما لا ضرورة إليه، ۴:۱۸۳۲، رقم: ۲۳۵۹

۵۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳:۱۶۲، رقم: ۱۲۶۸۱

اِس حدیثِ مبارک میں خاتم المرسلین ﷺ نے قیامت تک آنے والے جو واقعات بیان فرمائے ان حقائق کا وحی سے تعلق نہیں ہے۔ اس موقع پر ایسا نہیں ہوا کہ جبریل امین وحی لے کر آئے اور آپ ﷺ ان کی اطلاع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بیان فرما رہے تھے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کا وحی جلی اتارنا (معاذ اللہ) حضور نبی اکرم ﷺ کے ماتحت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے وحی بھیجے، چاہے تو چالیس دن نازل نہ فرمائے۔ چاہے تو ایک ہفتہ بعد بھیجے اور چاہے تو اسی لمحے دوبارہ بھیج دے۔ وحی کا نازل فرمانا اللہ تعالیٰ کے امر کے تحت ہے۔ اللہ کا نبی اس امر کو چیلنج نہیں کرسکتا۔ اسی لئے فرمانِ ربانی ہے:

فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ.[1]

اللہ جب چاہتا ہے، جو چاہتا ہے وحی فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے چاہنے پر تو معاذ اللہ کوئی قید نہیں لگ سکتی۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس حدیث مبارک میں آقا ﷺ نے بغیر کسی پابندی یا بندش کے فرمایا کہ جو سوال کرنا چاہو، جس شے کی نسبت جو کچھ بھی تم پوچھو گے، میں اِسی جگہ تمہیں جواب دیتا رہوں گا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ جلال میں آکر فرماتے رہے کہ پوچھ لو! پوچھ لو! آپ ﷺ کی اسی کیفیت کو دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رونے لگے۔

اس موضوع پر اس حدیث کو متفق علیہ ہونے کے سبب منتخب کیا تاکہ کسی کو تردد نہ ہو اور کوئی حدیث کے ضعف اور صحت پر کلام بھی نہ کر سکے۔

یہاں بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ شاید اس موقع پر حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان اَحکامِ شریعت، اَحکامِ دین یا آخرت کے امور کے بارے میں ہوگا کہ اس بابت جو چاہو پوچھ لو کیونکہ بنیادی طور پر پیغمبر اسی لئے مبعوث ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے! یہاں پر یہ سوچنا غلط ہوگا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو حضور نبی اکرم ﷺ فرما دیتے کہ اُمورِ آخرت، اَحکامِ دین یا مسائلِ شریعت سے متعلق جو چاہو، وہ پوچھ لو۔ آقا ﷺ اس ضمن میں شرعی اَحکام کا تعین

(۱) الشوریٰ، ۴۲: ۵۱

فرما دیتے لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں فرمایا، بلکہ خاتم الانبیاء ﷺ نے واضح ارشاد فرمایا کہ کوئی بھی شخص جس چیز کے بارے میں جو پوچھنا چاہے، وہ پوچھ لے۔ آقا ﷺ کا یہ فرمان عموم پر تھا، اس کو مقید کرنا کہ احکام شریعت اور مسائل شریعت کی بات ہو رہی تھی، یہ ناجائز ہے۔ اسی حدیث میں اس پر دلیل بھی موجود ہے جو اس گمان کو رد کرتی نظر آتی ہے۔

آپ ﷺ کے سوال کرنے پر دو لوگ اٹھے۔ اُنہوں نے سوال کیے اور آپ ﷺ نے انہیں جواب دیے۔ اُن دونوں سوالوں کا تعلق شریعت کے احکام اور مسائل سے نہیں تھا۔ اگر صرف احکامِ شریعت کے بارے میں استفسار کرنے کی پابندی ہوتی تو آپ ﷺ فرما دیتے کہ تم شرعی مسائل کے علاوہ دوسرے سوالات کیوں پوچھ رہے ہو؟

ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مرنے کے بعد میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مرنے کے بعد تیرا ٹھکانہ جہنم میں ہوگا۔ آپ ﷺ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ غیر متعلقہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟ بلکہ براہ راست فرمایا: تمہارا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

اب اس ذریعۂ علم کا تعلق نہ تو قرآنی علوم سے ہے اور نہ ہی اس وحی سے جسے حضرت جبریل ﷺ لے کر آتے تھے۔ حقائق بتاتے ہیں کہ یہ کوئی اور ذریعۂ علم ہے جو حواس، عقل اور دماغ کے ذریعے نہیں آیا اور نہ ہی جبریل امین اور قرآن کے ذریعے آیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن حذافہ ﷺ نامی ایک اور صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ ان کے بارے میں لوگ طعنہ زنی کرتے تھے کہ تمہارا نسب غلط ہے، تم کسی اور کے بیٹے ہو۔ آپ ﷺ نے اس کے سوال کو بھی رد نہیں فرمایا بلکہ ارشاد فرمایا: تمہارا باپ حذافہ ہی ہے۔

اس بات کا علم بھی پردۂ غیب کی بات ہے۔ آپ ﷺ کے پاس یہ علم بھی نہ کوئی قرآنی آیت کے ذریعے آیا، نہ حواس کے ذریعے آیا اور نہ ہی عقل نے اسے ترتیب دیا۔ اس کا ذریعہ بھی کوئی اور ہے۔ اُس ذریعہ کو کشف اور الہام کہتے ہیں۔ پس یہ کشف اور الہام کے وجود کے اثبات پر دلیل ہے۔

اسی مقام پر ایک دوسرے ذریعۂ علم کی بات کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جنت اور دوزخ میرے اوپر آشکار کر دی گئیں۔

صحابی کا نسب بتانے کا مطلب یہ تھا کہ صرف جنت اور دوزخ کی حد تک نہیں بلکہ کل عالم مادیات و حسیات، روحانیات و طبیعیات و مابعد الطبیعیات، کائنات کے تمام حقائق اور موجودات آپ ﷺ پر آشکار کر دیے گئے ہیں۔ یہ ذریعۂ کشف ہے۔

۲۔ کشف، معجزہ اور کرامت

کسی کے ذہن میں آ سکتا ہے کہ یہ تو ایک معجزہ ہے۔ اِس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ایک معجزہ ہے لیکن اس واقعہ کو معجزہ کہنے سے اُس الگ ذریعۂ علم کے وجود کا نہ تو انکار ہوتا ہے اور نہ ہی اُس میں کوئی شک و شبہ آتا ہے۔

معجزہ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو پیغمبر ﷺ کی نبوت کی تصدیق میں ان کے وجودِ مسعود سے عادت کے خلافِ واقعہ رونما ہوتی ہے۔ ایک ہے کسی چیز کا عادت کے مطابق واقع ہونا، مثلاً ایک چیز دیوار کے پیچھے پڑی ہے، لہٰذا آنکھوں سے اوجھل ہے۔ یہ معاملہ تو حسبِ عادت ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص کو دیوار کے اُس پار دیکھنے کی صلاحیت حاصل ہو جائے تو یہ خرقِ عادت ہے۔ اسی طرح کسی جگہ پر پیدل چلے جائیں تو یہ عادت ہے اور اگر کوئی انسان چلے بغیر ہوا میں اڑ کر دوسرے مقام پر پہنچ جائے تو یہ خرقِ عادت ہے۔ ہر وہ چیز یا واقعہ جو ہماری زندگی کی عام عادت سے ہٹ کر صادر ہو کہ جس کے ذریعے وجوہات اور اثرات (cause and effect) کی دنیا چلتی ہے، اُسے خرقِ عادت کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ معجزاتِ نبوی صادر ہوئے: درخت کا زمین پھاڑ کر جڑوں سمیت آپ ﷺ کے پاس آ جانا، پتھروں کا کلمہ پڑھنا، مبارک انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہو جانا، تھوڑی مقدار میں کھجوریں ہزاروں کے لئے کافی ہو جانا، دودھ کے ایک پیالہ سے درجنوں افراد کا سیر ہو جانا اور دو افراد کے کھانے سے 1500 افراد کا شکم بھر جانا۔

یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو خلافِ عادت رونما ہوئیں اور ان کا رسول اللہ ﷺ سے صادر ہونا نبوت کی تصدیق کے طور پر ہوا ہے۔ جب لوگوں نے آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کیا تو یہ واقعات ان کی صداقت کی دلیل کے طور پر خلافِ عادت وقوع پذیر ہوئے۔ اس عمل کو معجزہ کہتے ہیں۔ معجزہ کا لفظ 'عجز' سے ماخوذ ہے، جس کا معنیٰ عقل کو عاجز کر دینا ہے، یعنی ایسا واقعہ رونما ہونا جسے عقل سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ضروری نہیں کہ ہر بار دعویٰ نبوت کی تصدیق کے لئے لازماً معجزہ دکھایا جائے۔ اگر اُسی طرح کا خرقِ عادت واقعہ غیر نبی، صالح مومن سے سرزد ہو تو اُسے کرامت کہا جاتا ہے۔

جملہ خوارق العادات واقعات معجزہ کی شان کے حامل تو یقیناً ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس چشمے سے کس کس علم نے جنم لیا؟ پس جن علوم نے ان واقعات سے جنم لیا، اُن میں کشف، اِلہام اور دیگر علوم شامل ہیں۔ ('کشف اور علم لدنی' پر مفصل بحث کے لیے باب نمبر 14 جب کہ 'کشف اور مرتبۂ علم محمدی ﷺ' کی تفصیلات کے لیے باب نمبر 15 ملاحظہ فرمایا جائے۔)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ زیر بحث حدیثِ مبارک میں حضور نبی اکرم ﷺ نے جو ابتدائے کائنات سے لے کر اختتامِ کائنات تک کی ساری خبریں دیں، وہ کس ذریعے سے دیں؟ یہاں ہماری بحث معجزہ سے نہیں بلکہ اس علم کی ماہیت، کیفیت اور حقیقت سے ہے کیونکہ بظاہر اس کا ذریعہ نہ تو وحیِ الٰہی سے ثابت ہے اور نہ ہی قرآن سے۔ ہم یہاں نفسِ معجزہ کے عنوان سے بحث نہیں کر رہے بلکہ اس ذریعے اور channel کی بات کر رہے ہیں جس کے ذریعے علم پھوٹ رہا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے کہ ایک دن حضور نبی اکرم ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہو گئے:

فَأَخْبَرَنَا عَنْ بَدْءِ الْخَلْقِ حَتّٰى دَخَلَ أَهْلُ الْجَنَّةِ مَنَازِلَهُمْ وَأَهْلُ النَّارِ

مَنَازِلَهُمْ. حَفِظَ ذَالِکَ مَنْ حَفِظَهٗ وَنَسِيَهٗ مَنْ نَسِيَهٗ.[1]

ایک روز ہمارے درمیان کھڑے ہوئے تو آپ نے مخلوق کی پیدائش کا ابتدا سے ذکر فرمانا شروع کیا یہاں تک کہ جنتی اپنے مقام پر پہنچ گئے اور دوزخی اپنے مقام پر۔ جس نے یاد رکھا سو اس نے یاد رکھا، اور جو اسے بھول گیا سو بھول گیا۔

اسی روایت کو حضرت حذیفہ ﷺ نے یوں بیان کیا ہے:

قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَقَامًا مَا تَرَکَ شَيْئًا يَکُوْنُ فِي مَقَامِهٖ ذَالِکَ إِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ إِلَّا حَدَّثَ بِهٖ. حَفِظَهٗ مَنْ حَفِظَهٗ وَنَسِيَهٗ مَنْ نَسِيَهٗ.[2]

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے کھڑے ہوئے اور آپ ﷺ نے اس وقت سے لے کر قیامت تک ہونے والی تمام چیزوں کو بیان کر دیا، جس نے ان کو یاد رکھا، اس نے یاد رکھا اور جس نے ان کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔

آپ ﷺ کائنات کی ابتدا سے لے کر انتہا تک سب کچھ بیان فرما رہے ہیں، حالانکہ یہ چیز حواس سے بھی معلوم نہیں ہوئی اور عقل بھی اسے ترتیب نہیں دے سکتی۔

کشف و کرامت کا صحابہ کرام ﷺ سے اِثبات

کرامت کے حوالے سے خود صحابہ کرام ﷺ سے بھی خرقِ عادت واقعات رونما ہوئے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ حضرت صدیق اکبر ﷺ نے وقتِ وصال اپنی بیٹی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ﷺ سے وارثت کے حوالے سے تین بہنوں کی بات کی جبکہ اس وقت فی الواقعہ وہ دو بہنیں تھیں۔

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی قول اللہ تعالی، ۳: ۱۱۶۶، رقم: ۳۰۲۰

(۲) مسلم، الصحیح، کتاب الفتن وأشرط الساعة، باب أخبار النبی ﷺ فیما یکون إلی قیام الساعة، ۴: ۲۲۱۷، رقم: ۲۸۹۱

ام المومنین ﷺ کے استفسار پر امیر المومنین نے فرمایا کہ تمہاری تیسری بہن ابھی تمہاری دوسری والدہ کے بطن میں ہے۔بطن کے اندر موجود بچے کی جنس کے متعلق معلوم ہو جانا یہ بھی ایک کشف ہے۔[1]

۲۔ حضرت عمر فاروق ﷺ کا مسجد نبوی کے منبر پر خطبہ جمعہ کے دوران ہزارہا میل دور کفار کے ساتھ برسرپیکار اسلامی فوج کے سپہ سالار حضرت ساریہ ﷺ کو پہاڑوں کے پیچھے سے دشمن کے حملے سے خبردار کرتے ہوئے کہنا:

يَا سَارِيَ الْجَبَلَ، يَا سَارِيَ الْجَبَلَ.[2]

اے ساریہ! پہاڑ کی اوٹ لے، اے ساریہ! پہاڑ کی اوٹ لے۔

یہ واقعہ بھی کشف کی ایک مثال تھا۔ اسی طرح ہر نبی کی امت میں ہر ولی سے کرامات

---

(۱) ۱۔ مالك، الموطأ، كتاب الأقضية، باب ما لا يجوز من النحل، ۲:۷۵۲، رقم:۱۴۳۸

۲۔ لالكائي، كرامات الأولياء:۱۱۶-۱۱۷، رقم:۶۲-۶۳

۳۔ طحاوي، شرح معاني الآثار، ۴:۸۸

۴۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۶:۱۶۹، رقم:۱۱۷۲۸، ۱۲۲۶۷

۵۔ ابن سعد، الطبقات الكبرى، ۳:۱۹۴

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، فضائل الصحابة، ۱:۲۶۹، رقم:۳۵۵

۲۔ لالكائي، شرح أصول اعتقاد أهل السنة، ۷:۱۳۳۰-۱۳۳۱، رقم:۲۵۳۷-۲۵۳۸

۳۔ آجري، الشريعة، ۴:۱۸۸۸، رقم:۱۳۶۰

۴۔ بيهقي، دلائل النبوة، ۶:۳۷۰

۵۔ بيهقي، الاعتقاد:۳۱۴

۶۔ أبو نعيم، دلائل النبوة، ۱:۵۷۹، رقم:۵۲۶

۷۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۴۴:۳۳۶

رونما ہوتی ہیں اور یہ کرامات درحقیقت اُس نبی کے معجزہ کا تسلسل ہوتا ہے۔ (’صحابہ کرام ﷺ اور اَولیاء عظام کے مکاشفات‘ پر تفصیلی کلام باب نمبر 16 میں ملاحظہ فرمائیں۔)

۳۔ باطنی ذرائعِ علم کا ماخذ

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس علم کی ماہیت، حقیقت، منبع اور سرچشمہ کیا ہے؟ اِسی کو کشف و اِلہام کہتے ہیں۔ یہ غیبی اُمور کا علم ہے۔ ان دلائل سے ثابت کرنا یہ مقصود ہے کہ حواس، عقل اور وحی کے درمیان کئی اور منابع بھی ہیں جن سے علم حاصل ہوتا ہے۔ اُن ذرائع علم میں سے کشف اور الہام دو ذرائع ہیں۔ انہی کے تحت اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ روحانی اور باطنی نوعیت کے جدا جدا صلاحیتوں کے حامل ذرائع روایت کئے گئے ہیں۔

یاد رہے کہ جس علم کو کشف اور الہام کا نام دیتے ہیں، اس کی مزید کئی اقسام ہیں جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے انسان کو روحانی اور باطنی نوعیت کے جدا جدا صلاحیتوں کے حامل ذرائع ودیعت کئے ہیں۔ یہ وہ دائرہ ہے جو صحابہ کرام، تابعین، اتباع التابعین، ابدال، صالحین، اولیاء، نجباء، نقباء، اقطاب اور غوث کو حاصل ہے۔ یہ چشمہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی بدرجہ اولی حاصل تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو اُن کے رتبے، مقام و مرتبہ اور انشراح کے مطابق جس قدر کشف ہوا، اتنی ہر چیز اُن کی آنکھوں کے سامنے آشکار ہوگئی۔

اِس کی کیفیت اور ماہیت پر درج ذیل حدیث مبارک بھی روشنی ڈالتی ہے اور اس سے یہ بات متحقق (establish) ہو جاتی ہے کہ یہ علم قرآنی وحی نہیں تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

أَتَانِي اللَّيْلَةَ رَبِّي تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِي أَحْسَنِ صُوْرَةٍ. فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، هَلْ تَدْرِي فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلٰی؟ قَالَ: قُلْتُ: لَا. قَالَ: فَوَضَعَ يَدَهُ بَيْنَ کَتِفَيَّ حَتّٰی وَجَدْتُ بَرْدَهَا بَيْنَ ثَدْيَيَّ أَوْ قَالَ: فِي نَحْرِي. فَعَلِمْتُ مَا

فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ.[1]

حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: آج رات میرا رب میرے پاس (اپنی شان کے لائق) نہایت حسین صورت میں آیا۔ اور فرمایا: یامحمد! کیا آپ جانتے ہیں کہ عالمِ بالا کے فرشتے کس بات میں بحث کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میں نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ قدرت میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھا اور میں نے اپنے سینے میں اس کی ٹھنڈک محسوس کی۔ (راوی کو شک ہے کہ حضور ﷺ نے بَيْنَ ثَدْيَيَّ فرمایا ہے یا فِي نَحْرِي۔) سو مجھے آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا علم عطا ہوگیا۔

اس حدیث مبارک سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ علم کے باب میں حضور نبی اکرم ﷺ کو کچھ خاص عطا کرنا چاہتا تھا اور اُس خاص عطا کو بایں طور عطا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی لاعلمی کی اس حالت کو ختم کر دیا اور امام الانبیاء ﷺ کو براہِ راست اپنے دستِ وہب کا فیض دیا۔ جب اُس کی ٹھنڈک سینۂ مبارک میں پہنچی تو اُس سے سارے حجابات رفع ہوگئے۔ مشرق اور مغرب میں جو کچھ بھی تھا آپ ﷺ وہ سب کچھ جان گئے۔ یاد رکھ لیں کہ آپ ﷺ کا خواب ہمارے خوابوں کی طرح خواب ہی میں ختم نہیں ہوگیا۔ ایسا نہیں تھا کہ خواب آیا اور آ کر چلا گیا۔ اب یہ حدیثِ صحیح دلیلِ شرعی ہوگئی کیونکہ حضور نبی اکرم ﷺ کا خواب وحی ہے اور بذاتِ خود دلیل شرعی تھا اور پھر آقا ﷺ کا اس کو بیان فرمانا، سند پر سند اور دلیل پر دلیل ہوگیا۔ یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ یہ بھی طریق ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور نبی اکرم ﷺ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر آپ ﷺ کے سینے میں براہِ راست علم کا فیض منتقل فرماتا ہے اور فیضانِ اُلوہیت سے سارے پردے

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۳۶۸، رقم: ۳۴۸۴
۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۲۴۳، رقم: ۲۲۱۶۲
۳۔ ترمذی نے 'السنن، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة صٓ، ۵: ۳۶۶، رقم: ۳۲۳۳' میں کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔
۴۔ طبراني، المعجم الكبير، ۲۰: ۱۰۹، رقم: ۲۱۶

اٹھا دیے جاتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ سے ہی یہ الفاظ یوں مروی ہیں:

فَوَضَعَ يَدَهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ فَوَجَدْتُ بَرْدَهَا بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَعَلِمْتُ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ. (۱)

اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ قدرت میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھا اور میں نے اپنے سینے میں اس کی ٹھنڈک محسوس کی اور میں وہ سب کچھ جان گیا جو کچھ مشرق و مغرب کے درمیان ہے۔

حضرت معاذ بن جبل ﷺ سے مروی روایت کے الفاظ ہیں:

فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، قُلْتُ: لَبَّيْكَ رَبِّ. قَالَ: فِيمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلٰى؟ قُلْتُ: لَا أَدْرِي رَبِّ. قَالَهَا ثَلَاثًا. قَالَ: فَرَأَيْتُهُ وَضَعَ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَ أَنَامِلِهِ بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَتَجَلّٰى لِي كُلُّ شَيْءٍ وَعَرَفْتُ. (۲)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد! میں نے عرض کیا: اے میرے رب! میں حاضر ہوں۔ فرمایا: عالمِ بالا کے فرشتے کس بات میں بحث کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: میں نہیں جانتا۔ تین مرتبہ یہی کہا۔ پھر فرمایا: میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ قدرت (اپنی شان کے مطابق) میرے شانوں کے درمیان رکھا تو میں نے اُس کے پوروں

---

(۱) ترمذی نے 'السنن، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة صٓ، ۵:۳۶۷، رقم: ۳۲۳۴)' میں کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔

(۲) ترمذی نے 'السنن، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة صٓ، ۵:۳۶۸، رقم:۳۲۳۵)' میں کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: میں نے امام محمد بن اسماعیل بخاری (صاحب الصحیح) سے اِس حدیث کے بارے میں پوچھا تو اُنہوں نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

کی ٹھنڈک اپنے سینے کے درمیان محسوس کی۔ پھر میرے لیے (مَا کَانَ و مَا یَکُوْنُ کی) ہر چیز روشن ہوگئی اور میں نے ہر شے کی حقیقت کو جان لیا۔

ہر چیز میرے اوپر روشن ہوگئی اور میں نے ہر ہر شے کو پہچان لیا۔ یہ کشف ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت ابراہیم ﷺ کے لیے فرمایا ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ○[1]

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم (ﷺ) کو آسمانوں اور زمین کی تمام بادشاہتیں (یعنی عجائباتِ خلق) دکھائیں اور (یہ) اس لیے کہ وہ عین الیقین والوں میں ہوجائے○

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم ﷺ کو عالمِ ناسوت سے عالم ملکوت تک کے سارے پردے اٹھا کر مشاہدہ کرا دیا۔

۴۔ کشف کا کمال

کشف کا مطلب، حجاب کا اُٹھ جانا ہے۔ مستقبل سے پردے اٹھ گئے اور ان کے لیے مستقبل بھی حال کی مانند عیاں ہوگیا۔ اسی طرح ماضی پر جو پردہ تھا، جب وہ بھی اٹھا تو ماضی بھی حال کی طرح واضح نظر آنے لگا۔ ماضی اور مستقبل کے سب زمانے ایک حال میں آ کر سما گئے اور زمین و آسمان ہاتھ کی ہتھیلی کی مانند سامنے دکھائی دینے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو ایسا کشف عطا فرما دیا کہ زمین و آسمان اور اول سے آخر تک ساری کائنات آپ ﷺ پر منکشف ہوگئی۔ پردے اٹھنے کے بعد آپ ﷺ ہر شے کو دیکھنے والے بن گئے۔ یہ امر بھی واضح رہے کہ آقائے دو جہاں ﷺ سے یہ پردے اٹھا کر دوبارہ نہیں ڈالے گئے، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رفعِ حجابات ہوا۔

---

(۱) الأنعام، ۶:۷۵

پس ان آیاتِ قرآنیہ اور احادیث مبارکہ سے یہ امر متحقق (establish) ہوا کہ حواسِ خمسہ، عقل، اور وحی قرآنی کے علاوہ کچھ اور ذرائع بھی ہیں جن سے علم کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ یہ وہی ذرائع ہیں جنہیں کشف، الہام اور دیگر علوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

باب نمبر 10

حصولِ علم اور قلب

اللہ تعالیٰ نے انسان میں ظاہری حواسِ خمسہ، باطنی حواسِ خمسہ، عقل (دماغ) اور اِکتسابِ علم باطنی کے ذرائع سے ماوراء کچھ اور روحانی ذرائع، وسائل اور وسائط بھی ودیعت کیے ہیں۔ انسان کو ان ذرائع کے ذریعے وہ انکشافات، الہامات اور معارف نصیب ہوتے ہیں جو عام طور پر ظاہری حواسِ خمسہ اور عقلی حواسِ خمسہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

گزشتہ باب میں ہم شرعی دلائل سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ عقل، حواس اور قرآن مجید کی وحیِ جلی کے علاوہ کوئی اور ذریعہ (source) بھی ہے، جس سے انسان پر حقائق، موجودات اور معلومات منکشف ہوتی ہیں۔ احادیث مبارکہ کے حوالے سے ہم نے جتنے واقعات بیان کیے ہیں ان سے صرف یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے علاوہ بھی کئی اور وسائل، ذرائع اور منابع ہیں، جہاں سے علم پھوٹتا اور بندے کو معارف عطا ہوتے ہیں۔

۱۔ انسانی شخصیت کے بنیادی جواہر

انسان کے وجود اور شخصیت کے اندر بنیادی طور پر تین جواہر پائے جاتے ہیں:

۱۔ نفس

۲۔ قلب

۳۔ روح

علم بنیادی طور پر ان تین جواہر سے جنم نہیں لیتا۔ اس کائنات میں جن امور کا انسان کو علم حاصل ہے یا حسب ضرورت اسے حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اسے حاصل ہوتا رہے گا، لیکن وحی الٰہی اور آسمانی کتب روایت کے ذریعے جو علم انبیاء کرام علیہم السلام نے انسانیت کو دیا ہے وہ کوئی

غیر نبی انسان کبھی حواس، عقل یعنی دماغ سے حاصل نہیں کر سکتا۔ مذکورہ تین بنیادی جواہر میں سے ہم پہلے قلب پر بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

۲۔ دل اور قلب میں فرق

عام طور پر جب ہم قلب کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اُس سے مراد جسم میں دھڑکنے والے مشت برابر گوشت کے لوتھڑے کو لیتے ہیں۔ انسانی جسم کے اس عضو کے چار خانے یعنی چار chambers ہوتے ہیں۔ اوپر والے دو حصوں کو auricles کہتے ہیں جب کہ نچلے دو حصوں کو ventricles کہتے ہیں۔ دل کے اپنے عضلات (cardiac muscles)، tissues اور valves ہیں۔ پورے جسم کا گدلا خون وریدوں (veins) کے ذریعے قلب کے دائیں auricle میں داخل ہوتا ہے اور وہاں سے پمپ ہو کر دائیں ventricle میں جاتا ہے۔ پھر وہاں سے پمپ ہو کر پھیپھڑوں میں چلا جاتا ہے جہاں خون کی صفائی ہوتی ہے اور اسے آکسیجن ملتی ہے۔ پھیپھڑوں سے صاف ستھرا خون آکسیجن لے کر دوسری جانب کے بائیں auricle میں آجاتا ہے۔ وہاں سے پمپ ہو کر نیچے بائیں ventricle میں جاتا ہے اور ادھر سے پمپ ہو کر شریانوں (arteries) کے ذریعے پورے جسم کو صاف خون فراہم کر دیا جاتا ہے۔ اس دل کے ہر ایک حصے کا اپنا اپنا عمل ہے۔ عین اُسی طرح جیسے دماغ کی بھی اپنی ایک دنیا ہے۔

علم کے باب میں ہم جس قلب کی بات کر رہے ہیں وہ خون پمپ کرنے والا دل نہیں، بلکہ وہ قلب القلب ہے۔ وہ قلب ایک روحانی جوہر ہے۔ دھڑکنے والا دل تو صرف قلب القلب کا مقام ہے۔ اُس قلب القلب کا تعلق علمِ اَنوارِ الٰہیہ کے ساتھ ہوتا ہے، جس کا تعلق ایمان میں تصدیق کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور تکذیب کے ساتھ بھی۔

۳۔ ایمان کی بنیاد تصدیق بالقلب ہے

اگر قلب کا تعلق ایمان سے نہ ہوتا اور قلب کی تصدیق اس سے متعلق نہ ہوتی تو

شرائط ایمان میں **إقرار باللسان** (زبان کے اقرار) کے ساتھ **تصدیق بالقلب** کبھی نہ ہوتی، بلکہ **تصدیق بالعقل** ہوتی۔ ایمانیات میں **إقرار باللسان** کے بعد **تصدیق بالقلب** ہے حالانکہ عقل کا لفظ بھی قرآن میں مستعمل ہے، لیکن عقل کا لفظ یہاں استعمال نہیں کیا اس لئے کہ **تصدیق بالعقل** سے ایمان نہیں بنتا۔ قابلِ غور بات ہے کہ ایمان کے باب میں عقل کی تصدیق کیوں مذکور نہیں؟ اِس لیے کہ ایمان تو اُن حقائق پر لایا جا رہا ہے جنہیں عقل جانتی ہی نہیں ہے۔ وہ ایسے حالات میں بھلا اس کی تصدیق کیسے کرے گی۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لاَ رَیْبَ ۛ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَo الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ.(۱)

اِس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (یہ) پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہےo جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

یہاں کہا جا رہا ہے کہ اس کتاب میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے جبکہ عقل کا تو سارا عمل (process) ہی شک سے شروع ہوتا ہے۔ ہدایت اس وقت ملے گی جب شک کی جڑ ہی کاٹ دی جائے گی۔

قرآن مجید نے تو ذہنی تصدیق کی بات ہی نہیں کی بلکہ ایمان کے لیے تصدیقِ قلبی کو ضروری قرار دیا ہے۔ ایمان کی تعریف میں **إقرار باللسان** کے بعد **تصدیق بالقلب** کے الفاظ آتے ہیں۔ یعنی زبان سے اس ہستی پر، اس کی صفات پر، حیات بعد الموت پر، عالم آخرت پر اور جو اللہ کے رسول ﷺ لے کر آئے ہیں، ان تمام چیزوں کے اقرار کے بعد دل سے اس کی تصدیق کرنا لازم ہے۔ ایمان کی اولین شرط یہی ہے کہ ان سب پر بغیر دیکھے ایمان لاؤ۔

عقل کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر دیکھا نہ ہو تو وہ ایسی کوئی چیز وصول (receive) ہی نہیں کر سکتی۔ عقل تو اس صورتِ حال میں علم کو تشکیل ہی نہیں دے سکتی تو وہ تصدیق کہاں سے کرے گی؟ جہاں علم تشکیل پاتا ہے، وہاں تصدیق کا مرحلہ تو آخری ہوتا ہے۔ تصور سے علم تک پہنچنے کے سارے عمل کا انحصار دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے اور چھونے یعنی ظاہری حواسِ خمسہ پر ہے۔

---

(۱) البقرة، ۲: ۲

ان حواس نے جو کچھ فراہم کیا عقل نے اُسے مانا اور تصدیق تک پہنچا دیا۔ یہاں ایمان لانے کی جو بات ہو رہی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ، جو خالقِ کائنات ہے، اُس کی صفات پر، اللہ کی وحی پر، آخرت پر، مرنے کے بعد جی اٹھنے پر، حساب و کتاب پر، جزا و سزا پر، جنت اور دوزخ پر؛ الغرض وہ سارے حقائق جن پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے وہ تو حواسِ خمسہ کے دائرے میں ہی نہیں آتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ عقل کے دائرہ کار میں ہی نہیں آتے۔

پس ایمان کی تعریف ہی سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ دل ہی تصدیق یا تکذیب کرتا ہے۔ اگر وہ تصدیق کر دے تو بندہ مومن ہو جاتا ہے اور تکذیب کر دے یا جھٹلا دے تو بندہ کافر بن جاتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ تصدیق یا تکذیب کرنے والا سینے میں موجود وہ دِل نہیں ہے جو گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جسے ہم طبی نقطہ نظر سے دل (heart) کہتے ہیں۔ تصدیق یا تکذیب کرنا تو اس دل کا کام ہی نہیں ہے۔ اس کا کام تو خون کو پمپ کرنا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ قلب کے اندر کوئی اور قلب بھی موجود ہے۔

انسانی سینے میں موجود عضو جسے ہم انگریزی میں heart کہتے ہیں، اردو میں ہم اِسے 'دل' کہیں گے اور عربی میں اس کے لیے لفظ 'قلب' استعمال کریں گے۔ جیسے دماغ کے لیے لفظ عقل کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ مفاہیم عرف عام میں ہیں۔ جسمانی دل سے تو پورے جسم کو آکسیجن، خون کی فراہمی اور پورے نظام نے قائم ہونا ہوتا ہے۔ دل کو عرفِ عام میں 'قلب' کہہ دیا جاتا ہے، مگر حقیقت میں یہ قلب وہ نہیں ہے جس کے علم و معرفت اور روحانیت کی دنیا میں چرچے ہیں۔

۴۔ قلب کیا ہے؟

قلب کا لفظی معنیٰ 'ہر وقت تبدیل ہونے والا' ہے۔ جو ہمہ وقت ایک حال ہی میں رہے وہ قلب نہیں بلکہ وہ تو ایک پتھر ٹھہرا۔ اسی لیے قلب کہا جاتا ہے کہ اِس کا حال ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ اِس کی کیفیات و احوال چونکہ دائماً بدلتے رہتے ہیں تو اِس کے الٹ پُلٹ ہونے اور ہر وقت بدلتے رہنے کی وجہ سے عربی میں اس کا نام قلب رکھا گیا ہے۔

قلب پر کبھی نفس و شیطان کی طرف سے خیالات کا ورود ہوتا ہے، کبھی ملائکہ کی طرف سے خواطر کا نزول ہوتا ہے، کبھی رحمٰن کی طرف سے خواطر و تجلیات کی برسات ہوتی ہے۔ کبھی یہ پتھر کی طرح سخت ہوتا ہے اور کبھی یہ موم سے بھی نرم ہو جاتا ہے۔ کبھی اِس میں خشیت اور خشوع وخضوع کی کیفیات طاری ہوتی ہیں تو کبھی اِس میں فسق و فجور گھس جاتا ہے۔ کبھی یہ قلب خشیتِ الٰہی سے لرزنے لگتا ہے اور کبھی بے مروت اور متکبر بن جاتا ہے۔ کبھی اس میں کسی کے لیے رغبت پیدا ہوتی ہے اور کبھی کسی کے لئے نفرت در آتی ہے۔ ان سارے احوال و تجلیات کے ساتھ اِس کی کیفیات بھی بدلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اصل قلب گوشت کے اس لوتھڑے کا نام نہیں ہے جو سینہ میں دھڑکتا ہے۔ جس طرح عقل ایک قوت ہے اور اس قوت کے پانچ حواس ہیں، اسی طرح قلب بھی ایک قوت ہے:

فَالْقَلْبُ: هُوَ الْقُوَّةُ الَّتِي وَرَاءَ طَوْرِ الْعَقْلِ.

عقل کی حد سے آگے ایک قوت ہے جس کو قلب کہا جاتا ہے۔

یعنی جب بات عقل سے آگے نکل جائے تو ایک نئی قوت اُس کا ادراک کرتی ہے، اُس قوت کو قلب کہتے ہیں اور اُس قوت کی جگہ یہ دل ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ. (۱)

بے شک اس میں یقیناً انتباہ اور تذکّر ہے اس شخص کے لیے جو صاحبِ دل ہے (یعنی غفلت سے دوری اور قلبی بیداری رکھتا ہے)۔

قرآن مجید نے یہ نہیں فرمایا: اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ عَقْلٌ کہ جس کے پاس عقل ہو اُس کے لیے اس میں نصیحت ہے۔ گویا نصیحت جس چیز کی طرف متوجہ کر رہی ہے، عقل اُس کا احاطہ و اِدراک ہی نہیں کر سکتی۔ وہ عقل کی صلاحیت سے ماورا ہے اور یہاں سے ہی اگلا ذریعۂ علم شروع ہو جاتا ہے۔

---

(۱) ق، ۵۰:۳۷

حواسِ خمسہ یعنی آنکھیں، کان، ناک، ہاتھ اور زبان اپنی محدود صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہوئے کسی چیز کا بذاتِ خود کوئی امتیاز نہیں کر سکتے۔ یہ حواس تو آواز، صورت اور اُس کے معانی کو بھیجتے ہیں۔ اُس کے بعد سارا کام عقل کے کارخانے میں تشکیل پاتا ہے۔ جس طرح ان حواس کی محدود صلاحیت ہے اور وہ اپنی مقررہ حد سے آگے کام نہیں کر سکتے، عین اسی طرح عقل کی صلاحیت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ صرف اُنہی کے بھیجے ہوئے مقدمات کو مرتب اور منظّم کر کے علم کو تشکیل دیتے ہیں۔ اب جو چیزیں حواس میں نہیں آئیں گی وہ عقل میں بھی نہ سما پائیں گی۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ عقل میں صرف وہی کچھ آتا ہے جو حواس کے دائرے میں سما سکتا ہے۔

اب جن چیزوں کی طرف قرآن نے وحی اور ایمان کہہ کر متوجہ کیا ہے، وہ چیزیں دراصل وہ حقائق ہیں جو حواس اور عقل کے دائرے میں نہیں آتے۔ اِنہیں سمجھنے کے لئے بھی لازماً کوئی ذریعۂ علم ہوگا اور وہ ذریعہ عقل سے آگے کی کوئی اور چیز ہوگی۔ یہ بات ہم ثابت کر چکے کہ وہ ذریعہ یہ گوشت کا بنا ہوا عضو نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا یہ دائرۂ کار ہی نہیں ہے۔ لا محالہ یہ وہی قلب ہوگا جسے قلب القلب کہتے ہیں۔ اِسی لیے قرآن مجید نے کہا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ.(۱)

بے شک اس میں یقیناً انتباہ اور تذکّر ہے اس شخص کے لیے جو صاحبِ دل ہے (یعنی غفلت سے دوری اور قلبی بیداری رکھتا ہے)۔

یعنی اِس نصیحت کا فائدہ اُسی کو پہنچے گا جس کے پاس قلب ہے۔ غور طلب بات ہے کہ گوشت پوست والا دل تو ہر ایک کے پاس ہے۔ اِس میں تو امتیاز ہے ہی نہیں۔ عقل بھی ہر ایک کے پاس ہے۔ اگر یہاں صرف یہی گوشت والا عضو ہی مراد ہوتا تو یہ ہر ایک کے پاس موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کو قرآن میں پھر یہ فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟

پتہ چلا کہ یہ 'قلب' کوئی اور چیز ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ عقل کا دائرہ جہاں ختم ہو

(۱) ق، ۵۰: ۳۷

جاتا ہے، اس سے آگے قلب شروع ہوتا ہے۔ قلب ایک ایسا جوہر ہے جس کی حالت ہر وقت متغیر رہتی ہے۔ کبھی یہ حضرتِ الٰہیہ کے قریب جاتا ہے اور کبھی اس کے بعید۔ کبھی اس میں روشنی آتی ہے تو کبھی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ کبھی اس میں قبض آتی ہے تو کبھی بسط۔ کبھی اس کے اوپر مختلف خواطر آتے ہیں اور کبھی تجلیاتِ ربّانی کا ورود ہوتا ہے۔

۵۔ قرآن مجید میں قلب کا ذکر

جس طرح عقل حواس سے معلومات لے کر علم کو ترتیب دیتی ہے اسی طرح قلب بھی بعض ذرائع سے معلومات لے کر انہیں ترتیب دیتا ہے اور اسے علم و فہم میں تبدیل کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے قلب کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ اس کی نصیحت اسی کو فائدہ دے گی جس کے پاس دل ہوگا۔ قرآن مجید میں قلب کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے۔ چند آیات کا تذکرہ ذیل میں درج ہے:

۱۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ.(۱)

اللہ نے (ان کے اپنے اِنتخاب کے نتیجے میں) ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگا دی ہے۔

یہاں حواس پر مہر لگانے کا ذکر بھی کیا اور جب حواس کا ذکر ہو جائے تو اس کے اندر عقلِ دماغی خود بخود آ جاتی ہے۔ یہاں دلوں پر مہر لگانے کی بات بھی کی، یعنی اُس دل میں جس فہم، معرفت اور تصدیق نے داخل ہونا تھا، اس کا داخلہ ہی بند کر دیا۔

۲۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ○(۲)

---

(۱) البقرة، ۲: ۷

(۲) الشعراء، ۲۶: ۸۹

مگر وہی شخص (نفع مند ہوگا) جو اللہ کی بارگاہ میں سلامتی والے بے عیب دل کے ساتھ حاضر ہوا○

قیامت کے دن انسان کو یہ دنیوی مال، دولت اور اولاد سمیت کوئی بھی چیز نفع نہیں پہنچائے گی۔ روزِ محشر اُسی کو سلامتی حاصل ہوگی جو قلبِ سلیم کے ساتھ اللہ کے حضور پیش ہوگا۔ یہاں جسم میں پائے جانے والے گوشت پوست کے دل کی صحت سے متعلق بات نہیں ہو رہی بلکہ یہ سلامتیِ قلب کا ذکر ہے۔ یہ سلامتی کچھ اور معاملہ ہے، جس کا ذکر اگلے مقام پر کچھ یوں کیا گیا ہے:

۳۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ○[1]

بے شک اس میں یقیناً انتباہ اور تذکّر ہے اس شخص کے لیے جو صاحبِ دل ہے (یعنی غفلت سے دوری اور قلبی بیداری رکھتا ہے) یا کان لگا کر سُنتا ہے (یعنی توجہ کو یکسو اور غیر سے منقطع رکھتا ہے) اور وہ (باطنی) مشاہدہ میں ہے (یعنی حسن و جمالِ الوہیّت کی تجلّیات میں گم رہتا ہے)○

۴۔ اسی طرح آگے قرآن مجید کہتا ہے:

وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ○[2]

اور جو شخص اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے (یعنی ان جانداروں، یادگاروں، مقامات، احکام اور مناسک وغیرہ کی تعظیم جو اللہ اور اللہ والوں کے ساتھ کسی اچھی نسبت یا تعلق کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں) تو یہ (تعظیم) دلوں کے تقویٰ میں سے ہے (یہ تعظیم وہی لوگ بجا لاتے ہیں جن کے دلوں کو تقویٰ نصیب ہوگیا ہو)○

عضوی و جسمانی 'دل' کا تو فجور و تقویٰ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تو فریضہ

---

(۱) ق، ۵۰: ۳۷

(۲) الحج، ۲۲: ۳۲

(function) ہی کچھ اور ہے۔ اس لیے فرمایا کہ یہ دلوں کا تقویٰ ہے۔ یہاں لفظ 'نفس، 'نفوس'، 'عقل' اور 'عقول' بھی استعمال ہوسکتا تھا۔ دونوں قرآنی لفظ ہیں۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ○ (۱)

پھر کیا وہ عقل نہیں رکھتے○

مگر تقویٰ کو عقل کے بجائے دل سے نسبت دی ہے۔

۵۔ ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے:

اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا○ (۲)

یا ان کے دلوں پر تالے (لگے ہوئے) ہیں○

۶۔ پھر فرمایا:

كَلَّا بَلْ سكته رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ. (۳)

(ایسا) ہرگز نہیں بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان اعمالِ (بد) کا زنگ چڑھ گیا ہے۔

دلوں پر گناہوں اور اعمالِ سیئہ کا زنگ چڑھنے سے مراد قلب القلب ہے۔ اس سے عضوِ جسمانی ہرگز مراد نہیں ہے کہ جس پر کوئی زنگ چڑھے۔

حضور نبی اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے:

إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ صِقَالَةً، وَإِنَّ صِقَالَةَ الْقُلُوبِ ذِكْرُ اللهِ، وَمَا مِنْ شَيْءٍ أَنْجٰى مِنْ عَذَابِ اللهِ مِنْ ذِكْرِ اللهِ: قَالُوْا: وَلَا الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ؟ قَالَ: وَلَوْ

(۱) یٰسین، ۳۶: ۶۸

(۲) محمد، ۴۷: ۲۴

(۳) المطففین، ۸۳: ۱۴

أَنْ تَضْرِبَ بِسَيْفِكَ حَتّٰى يَنْقَطِعَ.[1]

ہر چیز کو چمکانے والی کوئی چیز ہوتی ہے اور دلوں کو چمکانے والی شے اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اللہ کے ذکر سے بڑھ کر کوئی چیز عذاب الٰہی سے نجات نہیں دلاسکتی۔ صحابہ نے عرض کیا: جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (نہیں) اگرچہ تم اپنی تلوار چلاتے رہو یہاں تک کہ وہ ٹوٹ جائے۔ (یعنی ذکر عذاب الٰہی سے جہاد سے بڑھ کر نجات دلانے والا ہے)۔

دل پر زنگ اور سیاہی آ جانے کے متعلق بھی حضور ﷺ نے متعدد مقامات پر اظہار فرمایا ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا أَذْنَبَ كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِي قَلْبِهِ. فَإِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ، صُقِلَ قَلْبُهُ. فَإِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰى تَغْلَفَ قَلْبُهُ. فَذٰلِكَ الرَّانُ الَّذِي ذَكَرَهُ اللهُ فِي كِتَابِهِ ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ○﴾[2][3].

---

(۱) ۱۔ بیہقی، شعب الإیمان، ۱:۳۹۶، رقم:۵۲۲
۲۔ منذری، الترغیب والترہیب، ۲:۲۵۴، رقم:۲۲۹۵
۳۔ ابن القیم، الوابل الصیب، ۱:۶۰
۴۔ مناوی، فیض القدیر، ۲:۵۱۱

(۲) المطففین، ۸۳:۱۴

(۳) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲:۲۹۷، رقم:۷۹۳۹
۲۔ ترمذی، السنن، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة ویل للمطففین، ۵:۴۳۴، رقم:۳۳۳۴
۳۔ ابن ماجه، السنن، کتاب الزهد، باب ذکر الذنوب، ۲: ۱۴۱۸، رقم: ۴۲۴۴
۴۔ نسائی، السنن الکبری، ۶:۱۱۰ رقم: ۱۰۲۵۱، ۱۱۶۵۸ ←

مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نشان بن جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کرلے اور (گناہ سے) ہٹ جائے اور استغفار کرے تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے۔ (لیکن) اگر وہ ڈٹا رہے اور زیادہ (گناہ) کرے تو یہ نشان بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے (پورے) دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور یہی وہ 'الرَان' (زنگ) ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن مجید) میں فرمایا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝﴾ '(ایسا) ہرگز نہیں بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان اَعمالِ (بد) کا زنگ چڑھ گیا ہے جو وہ کیا کرتے تھے (اس لیے آیتیں ان کے دل پر اثر نہیں کرتیں)۝'۔

ایک روایت میں حضرت انس بن مالک ﷺ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ لِلْقُلُوْبِ صَدَأً كَصَدَإِ الْحَدِيْدِ وَجَلَاؤُهَا الْإِسْتِغْفَارُ.(۱)

لوہے کی طرح دلوں کا بھی ایک زنگ ہے اور اس کا صیقل (یعنی صفائی اور چمک) استغفار ہے۔

شیخ عبد القادر جیلانی فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان اقدس ہے:

إِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ لَتَصْدَأُ، وَإِنَّ جَلَاءَهَا قِرَاءَةُ الْقُرْآنِ، وَذِكْرُ الْمَوْتِ، وَحُضُوْرُ مَجَالِسِ الذِّكْرِ.(۲)

۵۔ نسائی، عمل اليوم والليلة، ۱:۳۱۷، رقم:۴۱۸

۶۔ ابن حبان، الصحيح، ۷:۲۷، رقم:۲۷۸۷

۷۔ حاكم، المستدرك، ۲:۵۶۲، رقم/۳۹۰۸

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الصغير، ۱:۳۰۷، رقم:۵۰۹

۲۔ طبرانی، المعجم الأوسط، ۷:۷۴، رقم:۶۸۹۴

۳۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۱:۴۴۱، رقم:۶۴۹

(۲) عبد القادر الجيلانی، الفتح الرباني:۲۵۱

بے شک یہ قلوب بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں اور بے شک ان کی جلاء اور چمک قرآن مجید کا پڑھنا، موت کو یاد کرنا اور مجالس ذکر و وعظ میں حاضر ہونا ہے۔

۷۔ ایک اور جگہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ.[1]

لیکن (چاہتا ہوں کہ) میرے دل کو بھی خوب سکون نصیب ہو جائے۔

اِس آیت کریمہ میں حضرت ابراہیم ﷺ کے اُس واقعے کا ذکر ہے جب انہوں نے کہا تھا کہ میرے مولا! مجھے دکھا دے تو مردہ کیسے زندہ کرتا ہے؟ میں دل کا اطمینان چاہتا ہوں۔

۸۔ قرآن مجید نے دلوں کے ایک اطمینان کو اس طرح بھی ذکر فرمایا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ○[2]

جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے○

۹۔ وحی کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ○[3]

اِسے روح الامین (جبریل ﷺ) لے کر اترا ہے○ آپ کے قلبِ (انور) پر تا کہ آپ (نافرمانوں کو) ڈر سنانے والوں میں سے ہو جائیں○

قرآن حکیم کی مذکورہ تمام آیات اس لیے بطور حوالہ پیش کی ہیں تا کہ یہ چیز ذہن نشین ہو جائے اور کسی قسم کا کوئی شک نہ رہے کہ قلب ایک منفرد جوہر ہے۔ 'عقل' کا لفظ بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ اگر مذکورہ آیات میں مراد 'عقل' تھی تو ہر جگہ لفظ 'عقل' ہی استعمال کیا جاتا،

---

(۱) البقرة، ۲: ۲۶۰

(۲) الرعد، ۱۳: ۲۸

(۳) الشعراء، ۲۶: ۱۹۳-۱۹۴

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر اسی لفظ کو مختلف پیرائے میں استعمال بھی کیا ہے۔

۱۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد فرمایا:

يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ م بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ.(۱)

اللہ کا کلام (تورات) سنتے پھر اسے سمجھنے کے بعد (خود) بدل دیتے۔

۲۔ پھر ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے:

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ○(۲)

حالانکہ تم (اللہ کی) کتاب (بھی) پڑھتے ہو، تو کیا تم نہیں سوچتے؟○

۳۔ اس طرح قرآن مجید نے جگہ جگہ عقل وشعور سے کام لینے کا ذکر فرمایا ہے:

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ○(۳)

تاکہ تم عقل وشعور سے کام لو○

۴۔ سورۃ الملک میں فرمایا:

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ○(۴)

اور کہیں گے: اگر ہم (حق کو) سنتے یا سمجھتے ہوتے تو ہم (آج) اہلِ جہنم میں (شامل) نہ ہوتے○

۵۔ پھر فرمایا گیا:

---

(۱) البقرة، ۲: ۷۵

(۲) البقرة، ۲: ۴۴

(۳) البقرة، ۲: ۷۳

(۴) الملك، ۶۷: ۱۰

وَ تِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ○[1]

اور یہ مثالیں ہیں ہم انہیں لوگوں (کے سمجھانے) کے لیے بیان کرتے ہیں اور انہیں اہلِ علم کے سوا کوئی نہیں سمجھتا○

۶۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ○[2]

اور ہواؤں کے رُخ بدلنے میں اور اس بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان (حکمِ الٰہی کا) پابند (ہو کر چلتا) ہے (ان میں) عقلمندوں کے لیے (قدرتِ الٰہی کی بہت سی) نشانیاں ہیں○

یہ آیات بطورِ نمونہ ہم نے پیش کر دیں کہ 'عقل' کوئی ایسا لفظ نہیں ہے کہ قرآن مجید میں مستعمل نہیں ہوا۔ یہ قرآن مجید میں استعمال ہوتا ہے اور اسی حقیقی نوعیت (sense) میں استعمال ہوتا ہے، مگر قرآن مجید میں موجود اور استعمال ہو کر بھی ان مقامات پر اس کی جگہ 'قلب' کے لفظ کو لایا گیا ہے۔ ان تمام چیزوں سے بنیادی طور پر یہ نقطہ نظر مضبوط (develop) ہوتا ہے کہ اس جسمانی عضو سے ہٹ کر 'قلب' ایک منفرد جوہر اور حقیقت ہے جو بہت سارے علوم کا ذریعہ بنتا ہے۔

۶۔ قلب کے اَحوال و کیفیات

قلب کی اِسی منفرد اور علیحدہ حقیقت کی بناء پر اس کی مختلف کیفیات ہیں:

۱۔ قلبِ میّت

---

(۱) العنکبوت، ۲۹: ۴۳

(۲) البقرۃ، ۲: ۱۶۴

۲۔ قلبِ مریض

۳۔ قلبِ حی

۴۔ قلبِ سلیم

۵۔ قلبِ شہید

قلب کی یہ کیفیات اس کے ذاکر یا غافل ہونے کی بناء پر ترتیب پاتی ہیں۔

قرآن مجید نے فرمایا ہے:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا. (۱)

اور تو اس شخص کی اطاعت (بھی) نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے۔

یعنی اَہلِ ایمان کو اُن کی پیروی کرنے کا حکم ہے جن کے قلب ذاکر ہیں اور اُن کی پیروی سے روکا گیا ہے جن کے دل غافل ہیں۔ قلب کبھی غفلت کی کیفیت میں ہوتا ہے اور کبھی تذکّر کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ اگر اس میں کفر ہے تو وہ دلِ مردہ ہے۔ اگر اس میں ایمان آ جائے تو وہ دلِ زندہ ہے۔ اگر اس میں فسق و فجور ہے تو وہ قلبِ ضعیف اور قلبِ بیمار ہے۔ کبھی وہ زندہ دل ہو کر قلبِ سلیم بن جاتا ہے۔ کہیں یہ قلبِ عارف ہے تو کہیں قلبِ ذاکر ہے۔ جیسے جیسے قلب کی حالتیں بدلتی جاتی ہیں ویسے ویسے اس کا عنوان بھی تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کا تعلق پھر عالمِ نور کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔

دراصل قلب ایک ایسا میدانِ جنگ ہے جہاں ایک طرف روح اپنے آسمانی اور ملاء اَعلیٰ کے نورانی لشکروں کے ساتھ اس کے حال کو سنوارنا چاہتی ہے جب کہ اس کے برعکس نفس اپنے جسمانی، ظلماتی اور خواہشات کے لشکروں کے ساتھ اس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس دوران قلب جب نفس کے زیرِ اثر ہو جاتا ہے تو حیوانوں کی طرح قلبِ ظلماتی اور قلبِ بہیمی ہو جاتا

(۱) الکہف، ۱۸: ۲۸

ہے۔ پھر کبھی درمیان میں غیر جانب دار (neutral) ہو جائے تو قلبِ جسمانی ہو جاتا ہے۔ کبھی روح کا غلبہ ہو جائے تو قلبِ ملکوتی ہو جاتا ہے۔ اگر اس سے بھی بلند تر ہو جائے تو قلبِ جبروتی اور لاہوتی ہو جاتا ہے اور پھر ملاء اعلیٰ سے بڑھ کر حضرتِ صمدیت کے ساتھ اس کا تعلق جڑ جائے تو وہ قلبِ ربانی ہو جاتا ہے۔

مذکورہ سب حالتیں قلب کے مختلف عنوانات ہیں۔ جیسے جیسے حالت بدلتی جاتی ہے ویسے ویسے اُس کا عنوان بھی تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا. (1)

بھلا وہ شخص جو مُردہ (یعنی ایمان سے محروم) تھا پھر ہم نے اسے (ہدایت کی بدولت) زندہ کیا اور ہم نے اس کے لیے (ایمان و معرفت کا) نور پیدا فرما دیا (اب) وہ اس کے ذریعے (بقیہ) لوگوں میں (بھی روشنی پھیلانے کے لیے) چلتا ہے اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ (وہ جہالت اور گمراہی کے) اندھیروں میں (اس طرح گھِرا) پڑا ہے کہ اس سے نکل ہی نہیں سکتا۔

یہاں مردہ سے مراد وہ موت نہیں ہے جس کے بعد تدفین کر دی جاتی ہے۔ قرآن مجید استعارہ میں بات کر رہا ہے۔ طبی نقطۂ نظر (medical point of view) سے تو وہ زندہ ہیں مگر قرآن انہیں مردہ اِس لیے کہہ رہا ہے کہ ان کے دل جہالت اور کفر کی ظلمت کے باعث مر چکے ہیں۔ یہ وہ موت و حیات ہے جس کا تعلق اُس 'قلب' کے ساتھ ہے جو اِس وقت زیرِ بحث ہے۔ آیت مبارکہ کی رُو سے وہ لوگ جو مردہ تھے اور جن کے دلوں میں کفر تھا، انہیں ایمان کی توفیق بخشی گئی تو ان کا دل زندہ ہوگیا۔ پھر ترقی دیتے ہوئے ان کے قلوب کو نور سے بھر دیا گیا۔ جب ایمان کے ذریعے قلب کے زندہ ہونے اور پھر اُسے نور عطا کیا جانا متحقق ہوگیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے قلب میں نور ہوتا ہے اور کسی کے دل میں تاریکی ہوتی ہے۔

---

(1) الأنعام، ۶:۱۲۲

مومن منور قلب لے کر لوگوں میں چلتا ہے اور اپنے قلب کا نور لوگوں میں بانٹ کر اُن کے دلوں میں روشنیاں بکھیرتا ہوا ظلمتوں کو دور کرتا چلا جاتا ہے۔ پس صاحبِ ایمان شخص وہ ہے جو کفر کی ظلمتوں سے نکل کر قلبِ زندہ کا حامل ہو جائے۔ ایسے شخص کو ایمان کے نور کے باعث قلبِ نورانی نصیب ہوتا ہے اور پھر وہ صرف نور والا ہی نہیں رہتا بلکہ لوگوں میں بھی نور کی خیرات بانٹنے والا بن جاتا ہے۔ ایسے خوش نصیب کو اس شخص کے برابر کیسے سمجھ لیا جائے جو ابھی تک خود اندھیروں میں بھٹک رہا ہو! گویا نورِ قلب رکھنے والے اور ظلمتِ قلب رکھنے والے ہرگز برابر نہیں ہو سکتے اور قلب ہی وہ برتن ہے جس میں یہ نور آتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○ (۱)

اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اُس کے رسولِ (مکرّم ﷺ) پر ایمان لے آؤ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصّے عطا فرمائے گا اور تمہارے لیے نور پیدا فرما دے گا جس میں تم (دنیا اور آخرت میں) چلا کرو گے اور تمہاری مغفرت فرما دے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے○

یہ نور اس کے جسم پر نمودار نہیں ہوگا بلکہ اس کا محل تو قلبِ مومن ہے۔ یہ اجالا تو اُس کے قلب کو محلِ نور بنا دے گا۔ گویا یہ الگ قلب ہے جس میں نور کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اس میں رحمت کے دو حصے ملیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنا نور عطا فرمائے گا۔ یہ وہی نور ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں یوں فرمایا گیا ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ. (۲)

اللہ ایمان والوں کا کارساز ہے وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔

(۱) الحدید، ۵۷: ۲۸

(۲) البقرۃ، ۲: ۲۵۷

۷۔ نورِ الٰہی کے دو چشمے: قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ

اللہ تعالیٰ نے عالمِ خَلق میں اپنے نور کا ایک چشمہ وجودِ محمد ﷺ میں رکھا ہے اور ایک چشمہ قرآن کی شکل میں اُمتِ مسلمہ کو عطا فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں کہیں حضور نبی اکرم ﷺ کو نور سے تعبیر کیا اور کہیں قرآن مجید کو نور قرار دیا گیا ہے۔ ذیل میں چند مقاماتِ کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ ارشاد فرمایا:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ○[1]

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور (یعنی حضرت محمد ﷺ) آ گیا ہے اور ایک روشن کتاب (یعنی قرآن مجید)○

۲۔ دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ○[2]

پس تم اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) پر اور اُس نور پر ایمان لاؤ جسے ہم نے نازل فرمایا ہے، اور اللہ اُن کاموں سے خوب آگاہ ہے جو تم کرتے ہو○

۳۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا○[3]

اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے (ذاتِ محمدی کی صورت میں ذاتِ حق جل مجدہٗ کی سب سے زیادہ مضبوط، کامل اور واضح) دلیلِ قاطع آ گئی

---

(۱) المائدۃ، ۵:۱۵

(۲) التغابن، ۶۴:۸

(۳) النساء، ۴:۱۷۴

ہے اور ہم نے تمہاری طرف (اسی کے ساتھ قرآن کی صورت میں) واضح اور روشن نُور (بھی) اتار دیا ہےo

قرآن مجید نے حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس اور کلامِ الٰہی دونوں کو نور کہا ہے۔ وہی نور مومن کے قلب میں منتقل ہوتا ہے اور یہی نور عالمِ بالا اور ملاء اعلیٰ کے اَسرار و رموز اور مغیبات اور معارف کی دنیا سے جڑ جاتا ہے۔ یہاں اس کے قلب پر اَسرار و رُموز اور علوم اِلقاء ہونے لگتے ہیں۔ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ قلب کے اندر حکمت، علوم اور معرفت کا چشمہ پھوٹ رہا ہے۔

۸۔ مومن کا سینہ چراغ دان، جبکہ مومن کا قلب چراغ ہے

اسی کیفیت کے حوالے سے اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّاشَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌo(۱)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال (جو نورِ محمدی کی شکل میں دنیا میں روشن ہے) اُس طاق (نما سینۂ اَقدس) جیسی ہے جس میں چراغِ (نبوت روشن) ہے؛ (وہ) چراغ (قلبِ محمدی کے) فانوس میں رکھا ہے۔ (یہ) فانوس (نورِ الٰہی کے پَرتو سے اس قدر منور ہے) گویا ایک درخشندہ ستارہ ہے (یہ چراغِ نبوت) جو زیتون کے مبارک درخت سے (یعنی عالم قدس کے بابرکت رابطہ وحی سے یا انبیاء و رُسل ہی کے مبارک شجرۂ نبوت سے) روشن ہوا ہے نہ (فقط) شرقی ہے اور نہ غربی

(۱) النور، ۲۴: ۳۵

(بلکہ اپنے فیضِ نور کی وسعت میں عالم گیر ہے)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تیل (خود ہی) چمک رہا ہے اگرچہ ابھی اسے (وحیِ ربّانی اور معجزاتِ آسمانی کی) آگ نے چھوا بھی نہیں۔ (وہ) نور کے اوپر نور ہے (یعنی نورِ وجود پر نورِ نبوت گویا وہ ذات دوہرے نور کا پیکر ہے)۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور (کی معرفت) تک پہنچا دیتا ہے، اور اللہ لوگوں (کی ہدایت) کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے، اور اللہ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے○

اس آیت کریمہ کی دو تفاسیر ہیں۔ دونوں تفاسیر صحابہ کرام، تابعین، اتباع التابعین ﷺ سے منسوب ہیں اور ائمہ تفسیر کے ہاں سیکڑوں کتب میں موجود ہیں۔

۱۔ پہلی تفسیر کے مطابق چراغ دان سے مراد حضور نبی اکرم ﷺ کا وجودِ اقدس ہے۔

۲۔ دوسری تفسیر کے مطابق اس سے مراد قلبِ مومن ہے۔

انسان کے سینے کی شکل چراغ دان کی طرح ہوتی ہے۔ پہلے زمانوں میں گھر بنتے تھے تو گھر کے دروازے کے دائیں بائیں چراغوں کے رکھنے کے لیے محراب بنے ہوتے تھے۔ انسانی جسم میں اس کا شیشہ پسلیوں کا ڈھانچہ ہے جس کے اندر دل کا مقام ہے۔ اس سے اوپر گردن کے ساتھ جو حصہ ملتا ہے، اس کی شکل دیکھیں تو وہ چراغ دان کی مانند ہے۔ آیت کریمہ میں شیشہ سے مراد قلب ہے اور اُس دل کے اندر چراغ روشن ہے۔ جیسے بلب شیشے کا بنا ہوا ہوتا ہے، بلب کو دیکھیں تو اس کا شیشہ نہیں جل رہا ہوتا، وہ تو محض ایک cover ہے۔ اُس کے اندر تار جل کر روشن ہو رہی ہوتی ہے۔ وہاں سے روشنی پھوٹتی ہے؛ یعنی اندر تار ہے اور اسے cover کرنے کے لیے شفاف (transparent) وجود چاہیے۔ اسی لیے تو شیشے کا بنایا گیا ہے تاکہ اُس میں سے شعاعیں نکل کر باہر روشنی بکھیریں۔

اِسی طرح جب مومن کے دل میں نورِ الٰہی آ جاتا ہے تو پھر قلب کی حیثیت شیشے کی طرح شفاف ہو جاتی ہے اور اس کے اندر نورِ الٰہی کا چراغ جل رہا ہوتا ہے۔ اُس نورِ ربانی کی شعاعیں جب نکلتی ہیں تو دل کی دیواریں اس کے راستے میں حائل نہیں ہوتیں اور وہ نور اَطراف و

اَکناف میں پھیل جاتا ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں مزید بیان کیا گیا کہ وہ چراغ زیتون کے درخت سے روشن ہو رہا ہے اور وہ کسی سمت کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جس کے اندر یہ چراغ روشن ہو جائے تو پھر اس کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اگر آگ نہ بھی چھوئے تو تب بھی لگتا ہے کہ یہ زیتون کا تیل بھڑک اٹھے گا، یعنی جب یہ نورِ حق دل کے اندر روشن ہو جاتا ہے تو اسے براہ راست ملاء اعلیٰ سے علوم و معارف ملنے لگتے ہیں؛ پھر وہ کتابوں، لائبریریوں، مدرسوں کی محتاجی کے بغیر علوم و معارف کے سمندر بہا دیتا ہے۔ نورِ الٰہی کے طفیل قلب مومن سے براہ راست علم جنم لیتا ہے۔ یہ صرف مثال ہے وگرنہ اس سے مراد زیتون کا اصل درخت ہے، نہ تیل ہے اور نہ ہی اُسے آگ کا چھونا ہے۔

ایسے نور کا حامل مردِ مومن - جس کا قلب نورِ حق کا چراغ بن گیا ہو - جس سے ملاء اعلیٰ کا نور علم و معرفت کی شکل میں چشمہ بن کر پھوٹ رہا ہو اور اگر ایسا مردِ مومن کتابوں اور نصابات کو پڑھ لے تو مزید نُوْرٌ عَلٰی نُوْر ہوجاتا ہے۔ جملہ علوم اس کے قلب میں جمع ہوجاتے ہیں اور اس طرح گویا وہ دوہرے نور کا پیکر بن جاتا ہے۔

۹۔ قلبِ مومن پر علوم و معارف کی بارشوں کا نزول

ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا.[1]

اس نے آسمان کی جانب سے پانی اتارا تو وادیاں اپنی (اپنی) گنجائش کے مطابق بہہ نکلیں، پھر سیلاب کی رَو نے ابھرا ہوا جھاگ اٹھا لیا۔

اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کو حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے مختلف مثالیں بیان فرماتا

(۱) الرعد، ۱۳:۱۷

ہے وگرنہ اُس بے نیاز ذات کو دریاؤں اور وادیوں سے کیا واسطہ اور سروکار ہے؟ روز مرہ کی اشیاء کی مثال بیان کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کو بارش، دریاؤں اور وادیوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ سمجھانے کے لیے تشبیہات اور استعارات کا استعمال کر رہا ہے۔ انسان ایسی مثالیں چونکہ آنکھوں سے روز دیکھتا ہے اور جس چیز کو ہر روز دیکھتا ہو تو اسے مثال سے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ اس آیت کریمہ میں وادیوں سے مراد دلوں کی وادیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا۔ اس برسات سے مراد علوم و معارف، اَنوارِ تجلیاتِ اِلٰہیہ اور اللہ کے علم کی عطاؤں کی بارش ہے، جن کا احاطہ یا ادراک نہ حواس کر سکے تھے اور نہ ہی عقل کر سکی تھی۔ اب وہ علوم قلوب کے برتنوں میں اترنے تھے۔ جیسا کہ حضرت سہل بن سعد ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِنّ لِلّٰهِ تَعَالٰى فِي الْأَرْضِ أَوَانِيَ، أَلاَ وَهِيَ الْقُلُوْبُ، فَأَحَبُّهَا إِلَى اللهِ أَرَقُّهَا وَأَصْفَاهَا وَأَصْلَبُهَا. (۱)

بے شک زمین پر اللہ تعالیٰ کے کچھ برتن ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ! وہ (اللہ کے عبادت گزار بندوں کے) دل ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ قلوب وہ ہیں جو بہت نرم، بہت صاف اور بہت مضبوط و مستحکم ہوں۔

عتبہ خولانی سے مرفوع روایت میں ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

إِنَّ لِلّٰهِ آنِيَةً مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ، وَآنِيَةُ رَبِّكُمْ قُلُوْبُ عِبَادِهِ الصَّالِحِيْنَ، وَأَحَبُّهَا إِلَيْهِ أَلْيَنُهَا وَأَرَقُّهَا. (۲)

بے شک زمین پر اللہ تعالیٰ کے کچھ برتن ہیں۔ اور تمہارے رب کے برتن اس کے صالح وعبادت گزار بندوں کے دل ہوتے ہیں؛ اور ان میں سے بھی اُسے زیادہ محبوب وہ قلوب ہوتے ہیں جو بہت نرم اور بہت صاف و شفاف ہوں۔

(۱) حکیم ترمذی، نوادر الأصول، ۴:۱۰۰

(۲) طبرانی، مسند الشامیین، ۲:۱۹، رقم:۸۴۰

ان تفصیلات سے یہ بھی واضح ہوا کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ ہر دل میں ایک جیسی وسعت ہوتی ہے، کسی دل کی وادی تنگ اور کسی کی وسیع وعریض ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو اس کے دل کی وادی کی وسعت کے مطابق اپنے فیض کا پانی عطا فرماتا ہے۔ جس کسی نے اپنے دلوں کو جتنا صاف کر لیا، اللہ نے اس کے دلوں کی وادی کو اتنا ہی وسیع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے دلوں کی وادی کو جتنا گہرا بنا دیا، اس میں اتنا ہی پانی سمونے کی گنجائش ہوگی۔

۱۰۔ علمِ حق اور علمِ باطل میں فرق

یہ مشاہدۂ عام ہے کہ جب وادیاں بھر جاتی ہیں تو پانی کے تیزی سے آنے سے پانی کے اوپر جھاگ آ جاتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ پانی کے اندر موجود گدلا پن ہوتا ہے جو جھاگ بن کر اوپر آ جاتا ہے۔ گویا اوپر نظر آنے والی یہ جھاگ دراصل صاف پانی نہیں ہوتا۔ دین کا خالی نام لینے والوں کا شور وغوغا اور دعوے بھی اس جھاگ کی مانند ہوتے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، کیونکہ یہ آلودہ جھاگ بے کار شے ہے۔

علم کے باب میں بھی ایک جھاگ ہے اور ایک اصل پانی ہے۔ وہ اصل فیض ربانی کا پانی ہے جو ملاء اعلیٰ سے اترا، جس نے وادی کو بھرا اور جو میل کچیل، غلاظت تھی وہ جھاگ بن کر پانی کی سطح کے اوپر آ گئی۔ اب یہ تعین کرنا ہے کہ کتنے ہیں جو علم کے نام پر جھاگ لیے پھرتے ہیں اور کتنے وہ ہیں جن کے قلوب کی وادیاں صاف اور شفاف پانی سے لبریز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنہیں فیض عطا کرنا ہوتا ہے تو ان کی جھاگ پانی میں بہہ جاتی ہے۔

سورۃ الرعد کی اسی مذکورہ آیت میں مزید ارشاد فرمایا:

وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ.[1]

اور جن چیزوں کو آگ میں تپاتے ہیں، زیور یا دوسرا سامان بنانے کے لیے اس پر بھی ویسا ہی جھاگ اٹھتا ہے۔

---

(۱) الرعد، ۱۳:۱۷

جس طرح آسمان سے اترنے والی بارش کے پانی کی مانند ملاء اعلیٰ سے اترنے والا نورِ علم بھی اندر کی میل کچیل کو جھاگ بنا کر اوپر ابھار دیتا ہے، اسی طرح سونے، چاندی، تانبے کو اگر آگ پر رکھ دیں تو ان کے اندر جو ملاوٹ ہوتی ہے وہ بھی جھاگ کی شکل میں اوپر آجاتی ہے۔ یہ جھاگ دراصل علمِ باطل ہے۔ اس کے برعکس جو صاف و شفاف پانی ہے، وہ ملاء اعلیٰ سے بشکلِ نور اترا ہے اور اس سے مراد علمِ حق ہے۔ اس لئے کہ آیت کا اگلا حصہ اس پر دلالت کر رہا ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ.(۱)

اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثالیں بیان فرماتا ہے۔

بشر کے اندر قلب کے ساتھ ساتھ نفس بھی ہے۔ یہ نفس ترقی پا کر مختلف مدارج طے کر کے نفسِ ملہمہ تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ ہر نفس کی اپنی کچھ نہ کچھ خاصیت چلتی رہتی ہے اور اس کے خواص بدلتے رہتے ہیں۔ ہر ایک سے جھاگ نکلتا ہے مگر جو اَولیاء، عرفاء اور اہل اللہ ہوتے ہیں ان کے جھاگ کو اللہ تعالیٰ کے فیض کا پانی اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ اس طرح پانی کی سطح اور گہرائی صاف و شفاف ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو اہل اللہ نہیں ہوتے، جن کی حفاظت اللہ کا علم اور نورِ الٰہی نہیں کر رہا ہوتا، وہاں جھاگ اوپر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ہم میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو علم کا نام لیتے ہیں مگر ان کے پاس علم نہیں بلکہ اس کی جھاگ ہوتی ہے۔ یہ جھاگ کسی کام کی نہیں ہوتی، وہ صرف مناظرے، مجادلے، جھگڑے، فتویٰ بازی، فتنہ پروری، جنگ و جدال اور امت میں ایک انتشار کا نام ہے۔ وہ سب کچھ ایک رعب و دبدبہ بنانے اور صرف ذاتی نفس پرستی کے لئے ہے، جبکہ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے جس کی جھاگ اتر جاتی ہے، پانی صاف و شفاف ہو جاتا ہے تو وہ دعوے نہیں کرتا بلکہ وہ لوگوں کے لئے نفع بخش ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

---

(۱) الرعد، ۱۳:۱۷

۱۱۔ تزکیۂ قلب کی اہمیت

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر پانی ذخیرہ کرنے والے مقامات کی تہوں کی بروقت صفائی نہ ہو تو مٹی، ریت اور کنکریاں جمتے جمتے ان کی سطح اوپر آ جاتی ہے یعنی ان میں پانی سمونے کی گنجائش (capacity) کم رہ جاتی ہے۔ اسی طرح دلوں کی وادی کی اگر صفائی (تصفیہ) نہ ہو تو اَعمالِ سیئہ، گناہوں اور حرص و شہوت کی کثافت کے باعث دل کی وسعت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ بعد ازاں دل کے ظرف میں تھوڑے علم کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر تطہیر ہوتی رہے، نفوس کا تصفیہ اور قلوب کا تزکیہ ہوتا رہے تو قلب کی وادی گہری ہوتی چلی جائے گی۔ اس طرح قلب کا ظرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جیسے جیسے قلب کا ظرف بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے اس میں انوارِ الٰہیہ سموتے چلے جاتے ہیں اور علوم و معارف کا نزول ہوتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات تو برتن دیکھتی ہے کہ بندے نے صفاءِ قلب کے لئے کتنی محنت کی اور اپنے دل کی وادی کو کتنا وسیع و عریض اور گہرا کیا ہے؟ اگر کوئی اس درجے تک پہنچ گیا تو اس پر انوار اور علوم و معارف کی بارش ہوگی۔ اُسے یہ بارش اس قدر فائدہ دے گی جس قدر اس کے ظرف میں گنجائش ہوگی۔ اب ایک وہ ہیں جن کے دل اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان پر انوارِ الٰہیہ اور علوم ربانیہ کی برسات کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی یاد سے عاری وہ دل سنگ کی طرح سنگین ہوتے ہیں۔ بارش تو ہر جگہ ہوتی ہے مگر پتھر پر تو پانی ٹھہرتا نہیں بلکہ بہہ جاتا ہے۔ چنانچہ جو دل پتھروں کی طرح ہوتے ہیں وہاں تو بارش کا ہونا اور نہ ہونا ایک جیسا ہے۔ وہاں بارش ہوئی بھی تو پانی ٹھہرنے کے بجائے بہہ جائے گا۔

۱۲۔ صحبتِ صالحہ کے قلب پر اثرات

کئی دل تعفن زدہ زمین کی طرح ہوتے ہیں، جن کے اندر غلاظت ہوتی ہے۔ جب بارش کا پانی اُن پر پڑے گا تو اس سے مزید تعفن اور بدبو پھوٹے گی۔ اس طرح ایک روحانی

تعفن ہوتا ہے۔ جن کے اندر حرص، کبر، شہوت، گناہ اور غفلت وغیرہ جیسی باطنی اور روحانی غلاظتیں ہیں، ایسے لوگوں کے باطن سے یہ تعفن جب پھوٹے گا تو اس کی اپنی بربادی تو ہے ہی لیکن ساتھ بیٹھنے والے کا ایمان بھی برباد ہو جائے گا۔ اُس کی صحبت ومجلس میں بیٹھنے والے کو اس کا تعفن برباد کر دے گا۔ یہ صحبتوں کی تاثیر ہوتی ہے۔ ہمیں بیٹھنے سے پہلے سو بار سوچنا چاہیے کہ کس مجلس میں بیٹھنا ہے اور کس مجلس میں نہیں بیٹھنا۔

یاد رکھیں! جس کی زندگی میں غفلت دیکھیں خواہ وہ بظاہر کتنا بڑا عالم ہو، اس سے علم سیکھنے کے لیے نہ بیٹھیں۔ جس شخص کو نمازوں کا تارک دیکھیں، جس کے مزاج میں غفلت اور رخصت دیکھیں، جو عزیمت کی طرف آنے کے بجائے رخصتوں کو تلاش کرتا ہے، ایسے شخص کی صحبت کے اثرات برے ہوں گے۔ یہ اثرات ہمارے ایمان کی قوت اور روشنی کو کم کر دیں گے، تزکیہ نہیں رہے گا اور غیر شعوری طور پر اخلاق رفتہ رفتہ خراب ہوتے چلے جائیں گے۔

اِسی لیے ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ جب استاد پکڑو، یعنی جس کی صحبت میں بیٹھ کر رشد و ہدایت اور علم ومعرفت لینا چاہتے ہو تو پہلے اسے دیکھو کہ وہ دین و ایمان اور تقویٰ میں کتنا پختہ ہے؟ اس کے اندر عبادت گزاری اور دین کا تمکن کتنا ہے اور اس کا باطن کس قدر روشن ہے۔

امام سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے کہ علماء تین (طرح کے) ہیں:

عَالِمٌ بِاللهِ وَبِأَمْرِ اللهِ، فَعَلَامَتُهُ أَنْ يَخْشَى اللهَ وَيَقِفُ عِنْدَ حُدُوْدِ اللهِ، وَعَالِمٌ بِاللهِ دُوْنَ أَوَامِرِ اللهِ، فَعَلَامَتُهُ أَنْ يَخْشَى اللهَ وَلَا يَقِفُ عِنْدَ حُدُوْدِهِ، وَعَالِمٌ بِأَوَامِرِ اللهِ دُوْنَ اللهِ فَعَلَامَتُهُ أَنْ لَا يَقِفُ عِنْدَ حُدُوْدِ اللهِ وَلَا يَخْشَى اللهَ وَهُوَ مِمَّنْ تُسَعَّرُ بِهِمُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (۱)

(پہلی قسم میں وہ عالم شامل ہے) جو اللہ تعالیٰ اور اس کے امر (احکام الٰہیہ) کو جاننے والا ہے۔ ایسے عالم کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اس کی حدود کا

(۱) شعرانی، الطبقات الکبری:۷۶

احترام بھی کرتا ہے، (دوسری قسم میں وہ عالم شامل ہے) جو معرفت الٰہیہ تو رکھتا ہے لیکن اس کے اوامر کا اسے (کما حقہ) علم نہیں۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے لیکن اس کی حدود کی پروا نہیں کرتا، (تیسری قسم میں وہ عالم شامل ہے) جو اللہ تعالیٰ کے اوامر کا علم تو رکھتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے بے خبر ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ نہ تو وہ حدود الٰہیہ کا احترام کرتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور یہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر روزِ قیامت جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی۔

لہٰذا دیکھنا چاہیے کہ علم کس سے لے رہے ہیں اور کس سے اَخذ فیض کر رہے ہیں۔

(۱) سہل پسندی ایک زہرِ قاتل ہے

اللہ تعالیٰ نے دین میں رخصت بھی رکھی ہے اور عزیمت بھی رکھی ہے۔ اس ضمن میں کچھ لوگ رخصتوں کے طالب ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ یہ سوچتے ہیں کہ اس میں یہ آسانی ہے، اُس میں وہ آسانی ہے اور یہ رخصت ہے۔ جو رخصتوں کے طالب ہوں گے اس کا مطلب ہے کہ ان کے اندر تقویٰ کی پختگی نہیں، جس کی بنا پر وہ آسانیاں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ جس شخص کے مزاج میں آسانی تلاش کرنا اور دین پر عمل کے اندر عزیمت، مشقت، اجتہاد، جہاد اور کاوش کا رجحان زیادہ نہیں ہے تو اس کے علم، اس کے کلام اور اس کی صحبت سے بھی ایسے ہی اثرات مرتب ہوں گے۔ لہٰذا استاد بنانے یا شیخ منتخب کرنے سے پہلے یہ دیکھو کہ اس کے اندر علم و معرفت اور قرآن و سنت کی رغبت کتنی ہے اور اس کے اخلاق کیسے ہیں؟ طیبات و صالحات اور حسنات ہیں یا نہیں؟ مجاہدہ اور ریاضات کتنی ہے؟ اللہ کی قربت اور صفاء قلب کی کیفیت کیا ہے؟ یہ سب کچھ اس کے کلام، گفتگو، مزاج اور اس کی طبیعت سے معلوم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ رخصتوں کی تلاش کرنے والے عالم بھی ملیں گے اور راہِ عزیمت اختیار کرنے والے علماء کرام بھی نظر آئیں گے۔ یہ فیصلہ بندے نے خود کرنا ہے کہ وہ کسے پسند کرتا ہے اور کس کی صحبت میں بیٹھنے کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔

ارشاد فرمایا گیا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا.[1]

اور جو لوگ ہمارے حق میں جہاد (یعنی مجاہدہ) کرتے ہیں تو ہم یقیناً انہیں اپنی (طرف سَیر اور وصول کی) راہیں دکھا دیتے ہیں۔

علم باللہ کے راستے ہوں یا معرفتِ اسرارِ الٰہیہ کے راستے، یہ دریچے انہی پر کھلیں گے جو مجاہدہ کریں گے اور مجاہدہ وہی کریں گے جن کی طبیعت میں سخت کوشی ہوگی۔ جس کی طبیعت سہل پسند ہوگی وہ کبھی مجاہدہ کی طرف نہیں جائے گا۔ اِسی لیے حضرت یحییٰ بن ابی کثیر فرماتے ہیں:

لَا يُسْتَطَاعُ الْعِلْمُ بِرَاحَةِ الْجِسْمِ.[2]

علم آرام طلبی سے حاصل نہیں ہوتا۔

(۲) خود احتسابی کا ایک شان دار پیمانہ

یہ ایک ایسا ایک قرینہ اور معیار ہے کہ ہر شخص اپنا مواخذہ اور محاسبہ کر سکتا ہے۔ اگر کوئی علم، عمل ہمیں سہولتوں، تن آسانیوں اور رخصتوں کی طرف لے جا رہا ہے تو سمجھ لیں کہ اس کے آگے اندھیرا، تباہی اور ہلاکت ہے۔ اگر کوئی علم ہمارے اندر مزید شوقِ الٰہی، شوقِ آخرت ذوقِ عبادت، ذوقِ تہجد، ذوقِ مناجات و ذوقِ تلاوت بڑھا رہا ہے اور اخلاقِ حسنہ کی تڑپ و طلب پیدا کر رہا ہے، طبیعت میں جود وسخا پیدا ہو رہی ہے اور بخل ختم ہو رہا ہے تو سمجھیں کہ مجھے یہ صحبت، یہ علم اور یہ کتاب خیر کی طرف لے جا رہی ہے۔

اس کے برعکس اگر دیکھیں کہ دن بدن تقویٰ کی کیفیت کم تر اور طبیعت سہولت کی

---

(۱) العنكبوت، ۲۹: ۶۹

(۲) مسلم، الصحيح، كتاب المساجد، باب أوقات الصلاة الخمس، ۱: ۴۲۸، رقم: ۶۱۲

طرف مائل ہوتی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر نماز قضا ہو جاتی ہے، پرواہ نہیں ہوتی کہ پڑھ لیں گے۔ اسی طرح تلاوت اور نوافل کا معمول چھوٹ رہا ہے، تقویٰ و طہارت اور وضو کے ساتھ رہنے کی عادت چھوٹ رہی ہے، طبیعت کے اندر اَعمالِ صالحہ کی رغبت کم ہو رہی ہے تو سمجھیں کہ یہ صحبت، یہ علم اور یہ کتاب ہمیں شر کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ ہمارے پاس خود احتسابی کا ایک پیمانہ ہے۔ لہٰذا یہ دیکھیں کہ یہ چیز کہاں سے آ رہی ہے جس کی وجہ سے ہمارے مزاج میں مذکورہ خیر یا شر پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ صحبت میں خرابی ہے اور ہمیں خود اس خرابی کی تشخیص کرنی چاہیے تاکہ اس کا بروقت تدارک ممکن ہو سکے۔

باب نمبر 11

حصولِ علم اور اِلہام

اِلہام، حصولِ علم کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ علومِ اِلہامی، کشف اور علمِ لدنی قطعی طور پر مسلم ہیں اور ان کی حقیقت سے کسی طور بھی انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن بدقسمتی سے آج جہالت کے سبب ان علوم کے وجود کا انکار ہونے لگا ہے۔ نام نہاد علماء کا ایک طبقہ بڑی شد و مد کے ساتھ ان علوم کا کھلے عام انکار کرتا دکھائی دیتا ہے۔

دوسری طرف اسلام کی تاریخ میں ہمیں جا بجا اِلہام، کشف اور علمِ لدنی کے مظاہر اور کمالات نظر آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو طبقہ ان علوم کے انکار کی طرف گیا ہے اُس کا سبب کیا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ وہ ان علوم کے بارے روزِ روشن کی طرح عیاں دلائل ہونے کے باوجود اس طرف متوجہ نہیں ہوتا؟ 'حصولِ علم اور الہام' کے موضوع پر اس کے اثبات میں دلائل دینے سے قبل منکرینِ الہام کا ایک علمی و فکری تجزیہ کرتے ہیں تاکہ اُن کی طرف سے اس ضمن میں کئے جانے والے اعتراضات کا کما حقہٗ سدباب کیا جا سکے۔

ا۔ الہام و کشف کے انکار کا سبب: علمی مزاج میں اختلاف

حصولِ علم کے باب میں اہم ترین ذریعۂ علم 'الہام و کشف' ہے، اس کے انکار میں دراصل علمی مزاج کا فرق کارفرما ہے۔ علمائے امت کا علمی مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ بعض افراد کو 'علمی مزاج' کی یہ اصطلاح نئی معلوم ہوگی اور وہ کہیں گے کہ کیا علم کا بھی کوئی مزاج ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب بلاشبہ اثبات میں ہے۔ جیسے لوگوں کی طبیعتیں جدا جدا ہوتی ہیں، کسی شخص میں غصہ زیادہ ہوتا ہے اور کسی کا مزاج قدرے ٹھنڈا ہوتا ہے، کسی میں تحمل، بردباری اور برداشت پائی جاتی ہے اور کسی میں غصہ اور عدمِ برداشت کا پہلو غالب دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح کسی کے مزاج میں صبر اور کسی کی طبیعت میں عجلت زیادہ پائی جاتی ہے۔ یوں

سب کے مزاج الگ الگ اور جدا جدا ہوتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں انسان کی طبیعت اور مزاج کے فرق کو واضح کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

انسان علم کو استعمال کرنے کے جو طریقے اور نتائج اخذ کرتا ہے ان پر بھی یہ طبیعتیں اور مزاج اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر کسی ایک صورتِ حال پر دو یا چار مفتیان سے فتویٰ طلب کیا جائے تو عین ممکن ہے کہ اس مسئلے اور حکم کی معرفت، استنباط اور اخذِ نتیجہ ایک دوسرے کے ساتھ مماثل اور ملتا جلتا ہو مگر کسی مفتی کے فتویٰ میں شدت اور سختی ہوگی، کسی کے فتویٰ میں اعتدال ہوگا اور کسی کے فتویٰ میں تساہل (بہت ہی سہولت) کا مظاہرہ ہوگا۔ گویا عام طور پر مختلف فتاویٰ میں تین چیزیں لازمی دکھائی دیتی ہیں:

۱۔ شدت

۲۔ اعتدال

۳۔ تساہل

(۱) فنونِ علم میں مزاج کا تضاد کارفرما ہے

مزاج کا تضاد حتیٰ کہ اصول الحدیث میں بھی پایا جاتا ہے۔ جب علمِ اسماء الرجال میں مختلف علماء و محققین حدیث کی اسناد اور مختلف رُوات پر حتمی حکم لگاتے ہیں اور رجال پر جرح و تعدیل کے حوالے سے بحث کرتے ہیں تو ان امور میں بھی کئی محدث حکم لگانے میں انتہائی شدید (سخت) ہیں، کئی ایک کو متساہل تصور کیا جاتا ہے کہ وہ ذرا تساہل سے کام لیتے ہیں یعنی ان میں زیادہ وسعت ہے۔ اگر کوئی حدیث مرتبہ حسن پر پہنچتی ہے تو وہ اسے درست یا صحیح الاسناد کہہ دیں گے جب کہ متشدد محدث کو جب کسی حدیث کے راوی میں کوئی ضعف یا کمزوری نظر آتی ہے جو اُسے مرتبۂ حسن سے نیچے لے جاتی یا زیادہ سے زیادہ ضعیف تک لے جاتی ہے تو وہ اسے ببانگِ دُہل موضوع اور باطل کہہ دیں گے۔ اگر ان کے مزاج میں اعتدال ہوگا تو وہ تمام اہل علم کی آراء اور ان پر ہونے والی جرح و تعدیل کو یک جا کر کے بغور مشاہدہ کریں گے کہ جرح

مجمل ہے، مفصل ہے، تعدیل کیسی ہے، یا خطا، نسیان اور اختلاط ہے تو کس زمانے کا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھیں گے کہ حدیث پہلے روایت ہوئی ہے، یا بعد میں یا کہ بہت نیچے تک جا کر روایت ہوئی ہے۔ وہ ان سب حقائق کو مدِ نظر رکھ کر اعتدال پر مبنی ایک رائے قائم کریں گے۔ گویا کئی محدثین اور اصولیین جرح و تعدیل میں بھی اسی علمی مزاج کے مطابق حکم لگاتے نظر آتے ہیں۔

علامہ ذہبی اور ابن الجوزی کو قول قائم کرنے یا حکم وضع کرنے میں شدید تصور کیا جاتا ہے۔ امام حاکم جب حکم وضع کرتے ہیں تو انہیں قدرے متساہل یا نرم خیال تصور کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں درمیان میں کئی ایسے محدثین بھی ہیں کہ وہ حکم لگانے میں معتدل تصور کئے جاتے ہیں۔ سمجھانا مقصود یہ ہے کہ علم کا بذاتِ خود مزاج نہیں ہوتا بلکہ مزاج دراصل صاحبِ علم کا اپنا ہوتا ہے جو اظہارِ علم کے طریقوں اور مظاہر پر اثر انداز ہوتا ہے۔

یہ چیزیں پاکستان اور بھارت میں تو پوری شدت سے دکھائی دیتی ہیں۔ کسی خاص موضوع پر جب فتووں کی برسات ہوتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فتویٰ دینے والوں میں بھی کئی اعتدال پر ہوتے ہیں، لہٰذا وہ محتاط انداز سے کام لیتے ہیں۔ کئی مفتیان حضرات غیر محتاط ہوتے ہیں، مخالف کو کافر سے کم قرار دینے پر ان کی تشفی ہی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے مخالف کو علی الاعلان مرتد، کافر اور خارج از اسلام کہتے ہیں۔ اسی طرح کئی حضرات کی طبیعت کو کسی بات پر مخالفین کو بدعتی اور مشرک قرار دیے بغیر تسکین حاصل نہیں ہوتی۔ کئی مفتیان حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں تساہُل ہوتا ہے تو وہ اعتدال سے بھی پیچھے رہ جاتے ہیں اور ان کے اس تساہل کے سبب شرعی حکم میں بھی کمزوری آ جاتی ہے۔

الغرض یہ طبیعتیں اور کیفیات علم کے ہر میدان میں پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹرز کے ہاں بھی ایسا ہوتا ہے۔ ایک مریض جب مختلف ڈاکٹرز کے پاس جاتا ہے تو ایک ڈاکٹر تو دس، بارہ دوائیوں پر مشتمل نسخہ لکھ دے گا اور مریض کو تاکید کرے گا کہ آپ یہ سب ادویات لیں۔ اس قسم کے ڈاکٹرز اپنے میدان میں سخت مزاج کے حامل ہوتے ہیں۔ کچھ ڈاکٹرز ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ کوئی مرض ہی نہیں ہے، بس یہ ایک گولی لے لو اور کچھ لینے کی ضرورت ہی نہیں

ہے۔ اس قسم کے ڈاکٹرز متساہل قرار دیے جاتے ہیں۔ ماہر ڈاکٹرز ہمیشہ معتدل ہوں گے۔ وہ اپنی تشخیص کے بعد مریض کو مناسب سا نسخہ دیں گے۔ ان کا دیا ہوا نسخہ زیادہ بھاری بھی نہیں ہوتا، بیماری کو نظر انداز بھی نہیں کرتا اور امراض کا بھی شافی خاتمہ کرتا ہے۔

(۲) فروعی اختلاف پر کسی فردِ واحد کا فتویٰ عینِ اِسلام یا علم قطعی نہیں ہوتا

یہ چند مثالیں اگر پیشِ نظر رہیں تو با آسانی معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی مسئلہ انسانی طبیعتوں اور مزاجوں کا ہے۔ یہی مزاج جب دینی علوم، مسئلہ اور دین کے بارے میں رائے و فتویٰ پر پہنچتا ہے تو ساری توجہ علم اور نفسِ مسئلہ سے ہٹ جاتی ہے۔ کوئی مفتی ہو یا عالمِ دین یا صاحبِ قول، اس کی رائے میں اس کا مزاج ضرور شامل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ کسی مسئلے پر اسی پائے کے کئی اجل مفتیان اور علماء کی آراء اور فتاویٰ مختلف ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم کسی ایک کے فتوے کو عینِ مسلک، عینِ عقیدہ اور عینِ دین سمجھ لیتے ہیں اور اس نکتے پر ذرا برابر دائیں بائیں یا اوپر نیچے ہونے کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ گمان کرتے ہیں کہ جیسے ہم بنیادی عقیدہ سے ہٹ کر دینِ اسلام کی حدود سے نکل رہے ہیں۔

ان علماء کے پیروکار چونکہ صاحبانِ علم نہیں ہوتے، لہٰذا ان لوگوں کی جہالت، لاعلمی اور بے خبری کے سبب انتشار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں فتویٰ دینے والا لوگوں کی سادگی اور اپنے اوپر اندھے اعتماد کا غلط استعمال کرتا ہے۔ ایک عالم یا مفتی کے فتوے کے اندر مزاج اور ماحول سمیت کئی عوامل شامل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات مفتی ایسے ماحول میں رہ رہا ہوتا ہے کہ حالات کے تقاضے اس کے مزاج، دینی امور اور فتویٰ دینے کے معاملات میں شدت پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اُس نے شدت نہ دکھائی تو شاید دین کی کئی حکمتوں اور تقاضوں کو نظر انداز کر دے گا۔ لہٰذا وہ اس شدت سے اپنے کئی ماحولیاتی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور معاشرہ کے حالات، اعمال، احوال اور طبیعتوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتا ہے۔ ان

عوامل کو دیکھتے ہوئے یہ اس کی اپنی حکمت عملی ہوتی ہے کہ وہ ان حقائق کو مدِ نظر رکھ کر سخت فتویٰ دیتا ہے تا کہ اس کی سختی کے پیش نظر عامۃ الناس ان امور سے اجتناب کریں۔

فتوؤں کے درمیان یہ فرق کرنا بہت ضروری ہوتا ہے کہ مفتیان نے کس حکمتِ عملی کے پیش نظر اپنے فتویٰ میں گنجائش چھوڑ دی تھی۔ خواہ وہ ایک انتہائی نرم حد تھی، انتہائی سخت یا پھر ایک اعتدال کی حد تھی۔ اگر اس نے کئی چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کا تدارک کرنے کے لیے یا بعض آنے والے دینی، اعتقادی اور عملی نقصانات سے لوگوں کو بچانے کے لیے سخت مؤقف کو اختیار کرتے ہوئے اعتقادی فتوے میں شدت رکھ دی تو یاد رکھ لیں کہ وہی فتویٰ ہمیشہ کے لیے اسی شدت کے ساتھ جائز نہیں ہوگا۔ اس فتویٰ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ حکمِ شریعت ہوگیا ہے۔ واضح رہے کہ وہ فتویٰ حکمِ شریعت نہیں ہے۔ کسی معاملے میں فتویٰ کے مرحلہ پر پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ احکامِ شریعت کے تین اعلیٰ مصادر قرآن وسنت اور اجماع کے مراحل سے ہم نیچے آ چکے ہیں۔ بعد ازاں قیاس اور اجتہاد آتے ہیں۔ اجتہاد کے درجے پر آ گئے تو اُس کے تحت بارہ چودہ فروع بنتی ہیں۔ جب قیاس سے نیچے آئیں گے تو استحسان آئے گا۔ کبھی کوئی فتویٰ استحسان پر مبنی ہوگا، پھر کبھی کوئی فتویٰ استحسانِ ضرورت پر اور کبھی استحسانِ قیاسی پر مبنی ہوگا۔ اس ضمن میں کبھی استصلاح، کبھی مصالحِ مرسلہ اور مصالحِ عامہ آئیں گے۔ کبھی عرف و عادت اور کبھی ضرورت و حاجت آئے گی اور کبھی عمومِ بلویٰ آئے گا۔

ہمارے ہاں عموماً جب کوئی مفتی نئی صورتِ حال پر فتویٰ دیتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس مسئلہ پر قرآن مجید کی نص، حکمِ قرآنی یا کوئی حدیث کی صریح نص وارد ہو چکی ہے اور اس پر آگے یا پیچھے ہٹنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ ایک فتویٰ جب نصِ قرآنی اور نصِ حدیث سے ثابت ہے پھر تو وہ قرآنی و نبوی احکامات کے مطابق ہے لیکن اگر 'اجماع' کی بنیاد پر بھی فتویٰ دیا جائے تو علماء اس میں بہت ساری چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

(۳) لفظ 'اجماع' کی غلط فہمی اور درست تصریح

ایک اور نکتہ قابلِ غور ہے کہ ہمارے ہاں 'اجماعِ امت' کی اصطلاح کا استعمال عام

ہے۔'اجماع' کے حوالے سے بھی چند چیزوں کو ذہن میں رکھنا ہوگا کیونکہ اگر کوئی فتویٰ 'اجماع' کی بنیاد پر دیا جائے تو لازمی نہیں کہ وہ بھی حرفِ آخر ہو۔ ہم اگر فقہ کی کسی کتاب میں 'عَلَیْہِ الإجماع' (اس مسئلہ پر اجماع ہے) لکھا ہوا دیکھتے ہیں تو اس سے قطعاً یہ مراد نہیں ہوتی کہ یہ اجماعِ امت ہے۔ اگر ایک شہر سے تعلق رکھنے والے کتبِ فقہ کے مصنفین، علماء اور اسناد اور متون کے حامل اکابر علماء ایک مسئلہ پر مجتمع ہو جاتے اور ان کا اتفاق رائے ہوتا تو وہ **علیہ الاجماع** کہتے تھے۔ مثلاً فقہ حنفی کی کتب کے کثیر فقہاء اور علماء سمرقند میں قیام پذیر تھے۔ اگر سمرقند کا ایک حنفی عالم لکھتا ہے 'علیہ الاجماع' تو اغلب یہ ہوگا کہ اس سے مراد ہے: **علیہ إجماع أهل العلم من سمرقند**؛ یا **علیہ إجماع علماء سمرقند** یعنی اس مسئلہ پر سمرقند کے علماء کا اجماع ہے۔

علماء 'سمرقند' کے علمی مسائل پر 'بخارا' کے علماء سے اکثر اختلافات رہتے تھے۔ اگر بخارا کے علماء کا کسی دینی مسئلہ پر اجماع ہے تو وہ اپنے علاقے کے علماء کے ایک موقف ہونے کی بناء پر **علیہ الاجماع** لکھیں گے۔ اگرچہ بخارا اور سمرقند دونوں شہر ایک ہی خطے میں واقع تھے۔ عین ممکن ہے کہ اس مسئلہ پر اہل سمرقند کا اختلاف ہو مگر وہ بدستور **علیہ الاجماع** لکھ دیں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت نہ ٹیلی فون تھے، نہ انٹرنیٹ تھا، نہ ای میلز تھیں، نہ سوشل میڈیا تھا اور نہ ہی دور دراز کے شہروں کے آپس میں تیز ذرائع نقل وحمل تھے۔ انہیں اس بات کا علم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس مسئلے پر دوسرے شہر والوں کی کیا رائے ہے کیونکہ کبھی ان کے قضیات (قضایا) ایک دوسرے پر پیش ہوئے اور نہ ہی ان کی ایک دوسرے کے علمی موقف سے آگاہی ہوتی تھی۔

اس دور میں متعدد علماء اور فقہا بصرہ، نیشاپور، بغداد، کوفہ اور حجاز میں بھی موجود تھے۔ اس ضمن میں قریبی شہروں کے بارے میں بھی اجماع کا اطلاق نہیں ہو رہا۔ کہاں ایک خطے میں واقع دو شہر اور کہاں کوفہ، بغداد، بصرہ، دمشق، حلب اور حجاز اور دیگر دور افتادہ شہر۔ اگر قریب والوں کو ایک دوسرے کے علمی مؤقف سے آگاہی نہیں ہوتی تھی تو دور بسنے والے کس طرح ایک دوسرے کے علمی مؤقف کو جان سکتے ہیں!

لہٰذا کسی مسئلے پر کسی ایک کتاب میں 'عَلَیْہِ الإجماع' کے الفاظ دیکھ کر یہ کہنا کہ دیکھو فلاں کتاب میں لکھا ہے کہ اس مسئلے پر سب کا اجماع ہے؛ درست طرزِ عمل نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں تحقیق کرنا ہوگی کہ وہ اجماع کہاں کا ہے؟ کیا یہ مسئلہ کسی دوسرے شہر میں وہاں کے فقہاء کے سامنے پیش ہوا ہے اور انہوں نے اس مسئلے پر اپنی رائے دی یا نہیں؟ اگر انہوں نے اس پر رائے دی ہے تو کیا دی ہے؟ کیا وہ خبر دوسرے شہر کے علماء کرام تک پہنچی بھی ہے یا نہیں؟ اگر وہ خبر ان تک پہنچی ہے تو کیا اس پر وہ خاموش رہے، اقرار کیا یا ردّ کیا؟ اس حوالے سے ان سب چیزوں کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔

(۴) ہر اجماع، اجماعِ قطعی نہیں ہوتا

یاد رہے محض 'اجماع' کا لفظ لکھ دینے سے 'اجماع' نہیں بن جاتا۔ اس لیے اکثر اجماع 'ظنی' اور 'علاقائی' ہوتے ہیں، جبکہ 'اجماعِ قطعی' بہت کم ہوتے ہیں۔ اُس زمانے میں ذرائع نقل وحمل محدود ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی زیادہ معلومات دستیاب نہ ہوتی تھیں۔ جس مفتی کی طبیعت میں شدت ہوگی، وہ کسی مسئلہ پر محض 'اجماع' کا لفظ ہی لکھا دیکھ کر اسے 'اجماعِ امت' بنا ڈالے گا اور اس علاقائی اجماع کو اجماعِ امت بنانے پر اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کرے گا۔ بعض لوگوں کے گلے بھی بہت طاقت ور ہوتے ہیں، آوازیں بھی بلا کی ہوتی ہیں اور وہ ان کا بھرپور استعمال کرنا بھی بخوبی جانتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کھاتے پیتے بھی بہت ہیں اور ان کے جسم میں طاقت و توانائی بھی کثرت سے ہوتی ہے ۔ اس طرح ان کے گلوں، جثوں اور ان کے مزاج کا زور باہم اکٹھا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ یہ ساری توانائیاں یک جا کر کے معاملے کی شدت کو بڑھاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف باقی رہ گئے غریب بے چارے پیروکار، وہ اس عالم کی بات سن کر مفت میں مارے جاتے ہیں۔ وہ بے چارے سمجھتے ہیں کہ جتنی بھی شدت آ رہی ہے وہ سارے کا سارا دینِ الٰہی ہے۔

(۵) مفتی صاحبان کا فتویٰ کس درجہ میں آتا ہے؟

'اجماع' کے لفظ کی بنیاد پر دیے گئے فتویٰ کے بارے اصول کے ذکر کے بعد اب ہم احکامِ شریعت کے چوتھے ذریعے (source) یعنی قیاس یا اجتہاد کی بناء پر دیے گئے فتویٰ کی حیثیت پر بحث کرتے ہیں۔ اجتہاد اجتماعی ہوتو اجماع ہے اور اگر انفرادی ہوتو قیاس ہے۔ اجتہاد اور قیاس سے نیچے فروعات ہیں۔ بعض اوقات جب نئی صورتِ حال (situation) میں نیا مسئلہ آئے تو اس پر مفتی استنباط اور استخراج کر کے دلائل کا موازنہ کرتے ہوئے فتویٰ دیتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ موازنہ کرنے والا مفتی نہ تو 'اَصحابِ تخریج' میں سے ہے اور نہ ہی 'اصحابِ ترجیح' میں سے بلکہ وہ 'مقلدین' میں سے ہے۔ لہٰذا مفتی کے 'مقلد' ہونے کی حیثیت کو بھی اس کے فتوی میں پیش نظر رکھنا ہوگا۔

امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل وغیرہ **مجتہد فی الشرع** ہیں کہ جنہوں نے اجتہاد کے اصول وضع کیے اور پھر ان اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کیا۔

اس کے بعد دوسرا طبقہ **مجتہد فی المذہب** کا ہے۔ اس طبقہ میں مذہبِ حنفی میں امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زُفر وغیرہ اور مذہبِ شافعی میں امام مزنی وغیرہ یا اَصحابِ امام مالک اور اَصحابِ امام احمد بن حنبل شامل ہیں جو کسی مذہب کے بانی نہ تھے بلکہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے شاگرد تھے لیکن کئی فروعی مسائل میں اپنے امام سے اختلاف کر کے ذاتی اجتہاد کی بنا پر مسائل کا استخراج بھی کرتے تھے اور اس اجتہاد کی بنیاد اپنے امام کے وضع کردہ اصولوں کو بناتے تھے۔ انہوں نے مجتہدین فی الشرع کے مذاہب کی تدوین کی اور اسے تحریر کیا۔ نیز یہ ادلہ سے استخراجِ احکام بھی کرتے ہیں۔

ان کے بعد **مجتہد فی المسائل** آتے ہیں۔ یہ مذہب کے اصول و مبادی میں نہیں بلکہ بعض فروعی مسائل میں امام کے اجتہاد سے اختلاف کرتے ہیں مثلاً مذہب حنفی میں طحاوی، سرخسی اور بزدوی وغیرہ اور مذہب شافعی میں غزالی وغیرہ مجتہد فی المسائل ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے پر صاحبِ مذہب کی رائے نہ ہوتو پھر مسائل میں اجتہاد کرنے

والے کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ یہ لوگ مجتہدین فی المسائل کہلاتے ہیں اور ان میں حسبِ اصول اِستنباطِ اَحکام و مسائل کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اِن سے مراد بڑے بڑے اَصحابِ متون حضرات ہیں جن کی فقہ کی کتابیں مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ آج کے مفتی 'مجتہد فی الشرع'، 'مجتہد فی المذہب' اور 'مجتہد فی المسائل' میں سے نہیں ہیں۔ کئی اونچے درجے کے اصحابِ متون ایسے ہیں جو مجتہد فی المسائل میں آتے ہیں مگر بے شمار اَصحابِ متون مجتہد فی المسائل میں بھی نہیں ہیں۔

مجتہد فی المسائل کے بعد 'اصحاب التخریج' کا درجہ ہے۔

اس کے بعد 'اصحاب الترجیح' آتے ہیں۔

'اَصحابِ ترجیح و تصحیح' کے بعد ممیّزین یعنی 'اَصحاب التمییز' آتے ہیں اور ان کے نیچے محض مقلدین رہ جاتے ہیں۔

گویا مجتہد کی اقسام میں یہ مذکورہ طبقات ہیں۔

عام مفتی جو فتویٰ دیتے ہیں اور اس دور میں جو علماء ہیں وہ تو اَصحابِ ترجیح اور اَصحابِ تخریج میں سے بھی نہیں ہیں۔ وہ حضرات تو اپنی علمی اہلیت میں محض مقلّد ہیں۔ اگر انہوں نے کسی نئی صورتِ حال پر فتویٰ دیا ہے، تو ان کا فتویٰ تو فقہ کے احکام کے کسی درجے پر آتا ہی نہیں کہ کوئی اسے عینِ دین سمجھ لے۔ ہاں! جس شخص کو کسی فتویٰ کی ضرورت ہے تو وہ فتویٰ اس کی رہنمائی میں تو ضرور اہمیت رکھتا ہے۔ جو کسی مسئلہ پر پریشان ہے اسے تو اسی فتویٰ سے رہنمائی مل رہی ہے، اس کے لیے جائز ہے کہ صحیح مفتی اور صاحبِ علم کے فتویٰ پر عمل کرے۔ اگر کوئی غلطی کوتاہی ہوئی بھی تو وہ مفتی پکڑا جائے گا اور اس پر عمل کرنے والا بچ جائے گا، کیونکہ اس نے تو صرف فتویٰ پر عمل کیا ہے، لیکن مفتی صاحب کا وہ خاص مسئلہ ہر ایک کے لئے حکمِ شرعی کا درجہ نہیں رکھتا کہ ہر کوئی اس پر عمل کرنے کا پابند ہوگا۔

سمجھانا مقصود یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں حتیٰ کہ افریقہ کے ممالک میں رہنے والے جنوب ایشیائی نژاد کے ہاں یہ رجحان عام ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ 'سنا ہے ان کے خلاف

فتویٰ ہو گیا ہے۔' یعنی سادہ لوگ کہتے ہیں کہ 'فلاں کے خلاف فتویٰ آ گیا ہے۔' قابلِ غور بات ہے کہ جس کے خلاف فتویٰ ہوا ہے وہ بھی ایک عالم ہے اور ایسا بھی ممکن ہے کہ فتویٰ دینے والا اس سے بھی کم درجے کا عالم ہو، مگر فتویٰ کا لفظ ایسے استعمال کرتے ہیں جیسے ان پر ایٹم بم چل گیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ ہماری سماجی خرابیاں ہیں اور ہمارے علمی رجحان میں ایک بہت بڑا بگاڑ ہے۔ یہ خرابیاں باقی لوگ استعمال کریں تو اتنی نقصان دہ نہیں ہوتیں مگر جب اہلِ دین اور علماء اس کا بے دریغ استعمال کریں تو چونکہ ان کی نسبت اور تعلق دین کے ساتھ ہو جاتی ہے تو وہ بہت زیادہ بگاڑ کا باعث بنتی ہیں۔ بعض لوگ فتویٰ ہونے پر یوں تصور کرتے ہیں جیسے معاذ اللہ قرآن مجید کی کوئی آیت اس کے خلاف اتر گئی یا پھر کوئی حدیثِ نبوی اس کے خلاف صادر ہو گئی ہے۔ نہیں! نہیں! ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

(۶) کسی ایک عالم یا بعض علماء کے فتویٰ سے اِختلاف کفر نہیں ہے

مختلف علماء کے فتاویٰ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پہلے ایک دوسرے کے فتوؤں سے اختلاف بھی ہوتے تھے مگر کوئی کسی کی تکفیر، تفسیق اور تذلیل نہیں کرتا تھا۔ فتوؤں کے ہتھیار سے ایک دوسرے کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کیا جاتا تھا۔ کسی کا فتویٰ اس کا نقطہ نظر ہوتا ہے، لہٰذا کسی کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرنے والا کافر یا اہلِ سنت سے خارج کیسے ہو گیا؟ ایک عالم کا فتویٰ نہ تو کسی عقیدے کے اصول میں ہے اور نہ ہی فروع میں ہے، لہٰذا اس سے اختلاف کفر نہیں ہے۔ وہ فتویٰ ایک نفسِ مسئلہ پر ہے، دوسرا مفتی اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس کے خلاف فتویٰ بھی دے سکتا ہے۔ اب دونوں علماء میں سے کسی کے پاس قوی دلائل ہوں گے اور کسی کے پاس کمزور دلائل ہوں گے مگر فتویٰ کی جو حجیت ہے، وہ یہ مفتی دے یا وہ مفتی، دونوں کے پاس برابر ہے۔ اس ضمن میں یہ گنجائش اور وسعت ہے کہ کوئی اِس کے فتویٰ کو مان لے اور کوئی اِس کے بالمقابل دوسرے مفتی کا فتویٰ مان لے۔

۲۔ علومِ کشفیہ، علومِ لدنیہ اور علومِ اِلہامیہ قطعی طور پر مسلّم ہیں

علم کے باب میں طبیعتوں کے مزاج، شہروں کے حالات، ماحول کے معاملات اور دیگر کئی احوال کس طرح سے اثرانداز ہوتے ہیں؟ ان تمام کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ طبیعتوں اور مزاج کے اسی اختلاف کی وجہ سے اور آج جہالت کے سبب علومِ اِلہامی، کشف اور علوم لدنیہ کے وجود کا انکار ہونے لگا ہے۔ آج کل جاہل اَفراد خود کو عالم کہلاتے ہیں اور علم سے تہی دست خود کو صاحبانِ علم کہلاتے ہیں۔ یہ نام نہاد 'علماء' بغیر مطالعہ کے بڑی شد و مد کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ افسوس! جہالت کے کلچر کا نام ہم نے علم رکھ دیا ہے۔ یہ رجحان چونکہ علمی بنیادوں (knowledge based culture) پر استوار نہیں ہے، لہٰذا کچھ لوگ کسی بھی شے کا بغیر جانے اور بغیر پڑھے انکار کر دیتے ہیں۔

علومِ اِلہامی، کشف اور علم لدنی کے اثبات پر ایسے علماء کا حوالہ دیتا ہوں جو اپنے علمی مزاج کے اعتبار سے شدت کی انتہا کی طرف ہیں کیونکہ ان کا علمی مزاج ہی ایسا ہے۔ مختلف معاملات و مسائل کے انکار کرنے اور ان پر شدت اختیار کرنے میں یہ علماء ہزار/ بارہ سو سال کی علمی تاریخ میں سرفہرست ہیں۔ یہ ایسے علماء ہیں کہ ان کے مسلک، مکتبِ فکر، مشرب اور ذوقِ علمی کی پیروی کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر فلاں فلاں علماء نے اسے تسلیم کیا ہے تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں اور اگر انہوں نے انکار کیا ہے تو ہم بھی ان کی پیروی میں انکار کرتے ہیں۔ بتانا مقصود یہ ہے کہ اب علومِ الہامی کے اثبات میں جن علماء کے حوالہ جات بیان کیے جائیں گے وہ اپنے مسلک و مکتبِ فکر میں اس مقام کے حامل ہیں کہ ان کی پیروی اور تقلید کی جاتی ہے۔

شدتِ مزاج کی شہرت رکھنے والے ان علماء میں سرِ فہرست درج ذیل تین ہیں:

۱۔ علامہ ابن تیمیہ

۲۔ علامہ ابن القیم

۳۔ علامہ شوکانی

ان علماء نے بھی علوم لدنیہ، الہام اور کشف کا انکار نہیں کیا بلکہ وہ بھی اس کے قائل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخِ اسلام میں کسی بھی دور میں ایسا نہیں ہوا کہ چند ائمہ یا علماء نے بھی اس کا انکار کیا ہو۔ اس لئے کہ اگر اِن علوم کا انکار ہوتا تو مذکورہ علماء کی طرف سے ضرور ہوا ہوتا۔ معلوم ہوا کہ علومِ کشفیہ، علومِ لدنیہ اور علومِ الہامیہ قطعی طور پر مسلّم علوم ہیں۔

مذکورہ علماء ایک خاص علمی مزاج رکھتے ہیں۔ ان سے بڑا کوئی اور شدید مزاج رکھنے والا علم کے باب میں نہیں ہے۔ اگر کوئی ایک آدھ نام عرب دنیا میں ماضی قریب کے زمانے میں کسی کے ذہن میں آئے تو میرے نزدیک وہ صاحب کوئی محقق اور عالم نہیں کہ ان کو بطورِ حجت، بطور سند اور بطور حوالہ پیش کیا جائے۔ کئی نام بعض دیگر امور کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں مگر علمی اعتبار سے ان کا کوئی استناد نہیں ہوتا کہ ایسے آدمی کی سند دی جا سکے۔

باطنی و روحانی امور اور کشفیات و کرامات پر مذکورہ علماء سے بڑھ کر شدت رکھنے اور انکار کرنے کا رجحان کسی اور کا نہیں ہے۔ اِن تینوں میں علامہ شوکانی قدرے معتدل ہیں۔ علامہ ابن القیم ان کے مقابلے میں تھوڑا سخت ہیں اور ان کے بعد ان کے شیخ علامہ ابن تیمیہ ان علمی ابواب میں سب سے زیادہ سخت ہیں۔ ان کے شاگردوں نے پھر ان کی سخت روش کو اختیار (adopt) نہیں کیا بلکہ وہ اعتدال پر آ گئے۔ اس لئے کہ انہوں نے اس معاملہ پر پوری امت کے ایک علمی تسلسل کو دیکھا اور قدرے اعتدال پر رہے۔ یہاں صرف ان تین علماء جو کہ مزاجِ علمی کے اعتبار سے انتہائی شدت (extreme side) کی طرف نظر آتے ہیں، ان سے اس موضوع پر چند حوالہ جات ذکر کیے جائیں گے۔

(ا) علامہ شوکانی کا 'الہام' پر نقطہ نظر

علامہ شوکانی نے 'اصول الفقہ' میں اپنی کتاب **إرشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الأصول**' میں '**الفائدة السادسة** کے تحت **دلالة الإلهام**' کا باب قائم کیا ہے۔ اس باب

میں وہ دلائل دیتے ہوئے امام زرکشی کی اصول الفقہ پر تصنیف 'البحر المحیط' کو بطور حوالہ پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے 'البحر المحیط' میں بیان کیا ہے:

وَقَدِ اخْتَارَ جَمَاعَةٌ مِنَ الْمُتَأَخِّرِيْنَ اعْتِمَادَ الْإِلْهَامِ.(۱)

متاخرین کی کثیر جماعت نے اِلہام پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

علامہ شوکانی کی بیان کردہ علامہ زرکشی کی یہ عبارت اس امر کی غماز ہے کہ متقدمین میں یہ بحث ہی نہیں تھی۔ متقدمین میں تو ویسے ہی الہام کی چیزیں پہلے سے ہی بیان ہوتی تھیں۔ صحابہ کرام ﷺ، تابعین، اتباع التابعین اور سلف صالحین میں الہام کا بغیر بحث کیے تذکرہ کیا جاتا تھا۔ اس لیے علامہ زرکشی نے متاخرین کا لفظ لکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ متقدمین میں اس پر بحث ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ سب کچھ ان کے علم میں تھا اور ان کے ہاں انکار ہی نہیں تھا۔ جب یہ چیز زیرِ بحث ہی نہیں تھی تو مطلب یہ ہوا کہ اس پر سب کا اتفاق تھا۔

دوسری بات مذکورہ عبارت سے یہ ثابت ہوئی کہ الہام کے حجت ہونے، اس کے درست ہونے اور اس کے ذریعۂ علم ہونے اور اس کے صحیح ہونے پر جماعت کا عقیدہ ہے جو انہوں نے اختیار کیا۔

علامہ شوکانی، علامہ زرکشی کی مزید عبارت نقل کرتے ہیں کہ 'ائمہ اپنی مختلف تفسیروں میں امام فخر الدین رازی کو بطور حوالہ پیش (quote) کرتے ہیں'۔ گویا انہوں نے الہام پر دلائل دیتے ہوئے امام رازی کو بطور حوالہ پیش کیا ہے۔

(۲) اِمام ابن الصلاح کا 'الہام' پر نقطہ نظر

امام ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمٰن الشافعی بن الصلاح ایک بڑے عظیم محدث تھے جو اصول الحدیث کی بہت نام ور کتاب 'مقدمۃ ابن الصلاح' کے مصنف ہیں۔ ان کے بعد اصول

(۱) ۱۔ زرکشی، البحر المحیط في أصول الفقه، ۴:۴۰۰
۲۔ شوکانی، إرشاد الفحول، ۱: ۴۱۵

الحدیث پر لکھی گئی تقریباً 80% کتب اسی مقدمہ پر بنیاد (base) کرتی ہیں۔ امام نووی نے مقدمہ ابن الصلاح کا خلاصہ 'ارشاد طلاب الحقائق' کے نام سے تحریر کیا، پھر اسی کا خلاصہ التقریب تحریر کیا ہے۔ امام سیوطی نے اس پر التدریب شرح لکھی ہے۔ گویا مقدمہ ابن الصلاح کی کوئی شرح کرتا گیا، کوئی خلاصہ کرتا گیا اور کوئی خلاصہ کی مزید شرح کرتا گیا۔ امام زین الدین العراقی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی مقدمہ ابن الصلاح پر لکھا ہے۔ المختصر یہ کہ یہ کتاب متن کا درجہ رکھتی ہے۔ اندازہ کریں کہ اتنی بڑی معتمد شخصیت کی کتاب 'فتاویٰ ابن الصلاح' ہے۔ اس میں وہ الہام کے بارے میں لکھتے ہیں:

وَأَمَّا الْإِلْهَامُ فَهُوَ خَاطِرُ حَقٍّ مِنَ الْحَقِّ تَعَالٰی.[1]

الہام سچائی کا الہام ہے جو کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ سے ہوتا ہے۔

یعنی اس کی علامت یہ ہے کہ اس سے انشراحِ صدر نصیب ہو جاتا ہے اور اسے معارضہ لاحق نہیں ہوتا۔

امام ابن الصلاح نے اِنشراحِ صدر اور اِلہام کو جوڑتے ہوئے کہا ہے کہ یہ خاطر ہے۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ خاطر کیا چیز ہے؟

(i) خاطر کیا ہے؟

خاطر ایک تجلّی ہے جو آواز اور خطاب کی شکل میں قلب پر وارد ہوتی ہے۔ امام عبد الرزاق الکاشانی اپنی کتاب 'معجم اصطلاحات الصوفیة' میں فرماتے ہیں:

خاطر ایک تجلّی ہے جو قلب پر وارد ہوتی ہے۔ یہ خاطرِ ربانی بھی ہوتی ہے، خاطرِ ملکی بھی ہوتی ہے، خاطرِ نفسانی بھی ہوتی ہے اور خاطرِ شیطانی بھی ہوتی ہے۔[2]

---

(۱) ۱۔ ابن الصلاح، الفتاویٰ: ۱۹۶
۲۔ شوکانی، إرشاد الفحول، ۱: ۴۱۵

(۲) کاشانی، معجم اصطلاحات الصوفیة: ۱۷۷

یعنی خاطر ایک خیال کی صورت میں دل پر وارد ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ شیطان کی طرف سے بھی وارد ہوتا ہے، اس صورت میں اُسے خاطرِ شیطانی کہیں گے۔ اگر یہ نفس کی طرف سے وارد ہو تو اسے خاطر نفسی یا خاطر نفسانی کہتے ہیں۔ ملائکہ کی طرف سے وارد ہو تو خاطر ملکی کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں فرشتہ وہ چیز قلب میں القا کرتا ہے۔ ہاں اس کی پہچان کرنا پڑتی ہے۔ طبیعت پر مرتب ہونے والے اثرات سے تعین ہوتا ہے کہ یہ خاطر کون سا ہے۔ قرآن مجید نے سورۃ الناس میں خود اس حقیقت کو منکشف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ○ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ○ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ○[1]

وسوسہ انداز (شیطان) کے شر سے جو (اللہ کے ذکر کے اثر سے) پیچھے ہٹ کر چھپ جانے والا ہے○ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے○ خواہ وہ (وسوسہ انداز شیطان) جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے○

لفظ الْجِنَّة میں شیاطین کی طرف اشارہ ہے جو نفس اور صدور میں وسوسہ ڈالتے ہیں۔ یہ بھی انہی خواطر میں سے ہیں۔ اسی طرح خاطرِ ربّانی حق (اللہ) کی طرف سے آتا ہے۔ گویا یہ حق کی طرف سے حق کا القا ہے۔ جب یہ الہام کہلانے کے لیے حق کی طرف سے ہوا تو خاطرِ نفسانی بھی پیچھے رہ گیا اور اس میں سے خاطرِ شیطانی بھی نکل گیا۔ شیطان اور نفس کے اِلقا یا خاطر کو اصطلاحی معنیٰ میں الہام نہیں کہیں گے۔ لغوی معنیٰ میں اس کے لیے 'الہام' کہا جا سکتا ہے۔ گویا خاطرِ ربانی سے شرحِ صدر ہوتا ہے اور جب شرحِ صدر ہوتا ہے تو اسے قرآن مجید نے اسے یوں بیان کیا:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ.[2]

بھلا، اللہ نے جس شخص کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیا ہو تو وہ اپنے رب کی طرف

(۱) الناس، ۱۱۴: ۴-۶

(۲) الزمر، ۳۹: ۲۲

سے نور پر (فائز) ہوجاتا ہے۔

اس سے حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اِنشراحِ صدر، قلب میں ایک نور لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے تو وہ اللہ کی طرف سے نور پر ہوتا ہے۔ اُسے ایک نور مل جاتا ہے۔

(ii) ہاجز کیا ہے؟

اسی طرح ایک خیال ایسا بھی ہے جو نفس پر وارد ہوتا ہے اُسے **ھاجز** کہتے ہیں۔ **ھاجز** کے مختلف درجات و مراتب ہوتے ہیں:

۱۔ **ارادہ**: عملی طور پر اگر وہ خیال پہلی بار آئے تو یہ ارادہ ہے، یعنی آدمی ایک عمل کی طرف آگے بڑھے اور وہ نفس میں قائم و متحقق ہو جائے تو اِسے ارادہ کہتے ہیں۔

۲۔ **داعیہ**: اگر اُس میں تردد آجائے تو اسے داعیہ (بلانے والا) کہتے ہیں کیونکہ اس میں تشکیک ہوتی ہے اور کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر کی حالت پائی جاتی ہے۔

۳۔ **ہمت**: اگر پھر تردد کے ساتھ تیسری بار خیال آئے تو اسے 'ہمت' کہتے ہیں۔ اس لیے عام طور پر لفظ ہمت، ارادے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

پھر جوں جوں یہ آتا چلا جا رہا ہے توں توں اس کا مطلب ہے کہ وہ پختگی کی طرف آ رہا ہے۔ اگر بار بار پلٹ کر وہی آ رہا ہے تو مطلب ہے کہ وہ ہمارے نفس میں اپنے قدم جما رہا ہے۔

۴۔ **عزم**: چوتھی بار آئے تو اسے عزم کہتے ہیں۔ اس مرحلہ پر یہ دل کی طرف متوجہ ہو کر اس بندے کو کسی فعل کے کرنے پر تیار کرنے لگتا ہے۔

۵۔ **قصد**: پانچویں مرحلے پر وہ بندے کو کام کرنے پر تیار کرنے لگتا ہے تو اسے قصد کہتے ہیں۔

۶۔ نیت

اس حوالے سے دیکھا جائے تو ارادہ اس کا پہلا مرحلہ تھا جبکہ قصد اس کا آخری درجہ ہے۔ اگر یہاں وہ طے کر لے، اس میں پختگی آ جائے اور وہ کام کرنے لگے یا کرنے کے قریب پہنچ جائے تو اس کیفیت کو نیت کہتے ہیں۔ اس طرح 'ہاجز' جو نفس پر وارد ہوتا ہے، وہ ارادے سے چلتا ہوا نیت تک پہنچتا ہے۔

(iii) علم ہمیشہ اِرتقاء پذیر رہتا ہے

علم میں ہمیشہ ارتقاء ہوتا ہے۔ آدمی پہلے بچہ ہوتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے۔ پھر جیسے جیسے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے اس میں پختگی، وسعت، گہرائی اور گیرائی آتی چلی جاتی ہے۔ اِسی دوران اُس کا مطالعہ بڑھتا ہے، معارف بڑھتے ہیں، تحقیق بڑھتی ہے اور پھر اس میں ثقاہت آتی جاتی ہے۔ اس طرح علم میں مرحلہ وار اور تدریجاً ترقی وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے۔ بعض اوقات لوگ خالصتاً خارجی عوامل کو مدِ نظر رکھ کر صرف کتابوں سے استفادہ کر کے لکھتے ہیں۔ یعنی ایک آدمی نے کیلے کے ذائقے کو کتابوں سے پڑھ کر جوں کا توں لکھ دیا اور ایک آدمی نے کیلا کھا کر اسے محسوس کرتے ہوئے تحریر کیا۔ ایک آدمی نے صرف شربتِ روح افزا سن کر لکھ دیا اور دوسرے آدمی نے خود شربتِ روح افزا پی کر اس کے بارے میں لکھا ہے۔ ایک لکھاری سن کر لکھتا ہے جبکہ دوسرا دیکھ کر لکھتا ہے تو دونوں میں فرق ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ علم کے تین درجات ہیں:

۱۔ علم الیقین

۲۔ عین الیقین

۳۔ حق الیقین

اس ضمن میں دلائل کے ساتھ پہلے مفصل تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ یہ بھی پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام اور حتیٰ کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے علم میں بھی ارتقاء ہوتا رہتا تھا۔ اللہ

تعالیٰ آپ ﷺ کو علم دیتا اور مسلسل بڑھاتا چلا جاتا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا ہے کہ جو علم زندگی کے آخری وقت میں تھا وہی درجہ اور وسعتِ علم ان کے چالیس سال پہلے بھی ہو۔ ہر چیز میں ارتقاء، توسیع، تدریج اور تدرج ہے۔

اِسی بناء پر الہام اور علمِ لدنی کے باب میں کئی کتابوں میں خلط ملط ملے گا۔ لہٰذا مذکورہ نکتہ کو ذہن نشین کرلیں کہ الہام اور علم لدنی کو ایک ہی درجہ (category) میں تحریر کیا گیا ہو تو جان لیں کہ وہ کسی مصنف کی نوجوانی کی تحریر ہے۔ علماء دین عمر بھر لکھتے تھے۔ انہوں نے کئی رسائل جوانی کی عمر میں لکھے، کئی پچاس برس کو پہنچے تو تحریر کیے اور کئی اس کے بعد کے عرصے میں اور کئی عمر کے آخری حصے میں لکھے۔ جیسے جیسے ان کے علم میں ارتقاء ہوتا گیا ویسے ویسے ان کی آراء بھی تبدیل ہوتی رہیں۔

جیسا کہ شریعت میں ناسخ و منسوخ ہے۔ بعض احکامات اوائل میں آئے، مگر بعد میں حالات بدل گئے تو وہ احکام منسوخ ہوگئے۔ اب ہمیں ناسخ آیات کا ذکر بھی ملتا ہے اور منسوخ آیات کا بھی۔ ناسخ پر عمل کرنے کا حکم ہے جب کہ منسوخ کو چھوڑ دینے کا۔ ناسخ اور منسوخ میں زمانی ترتیب ہوتی ہے۔ علم کے ارتقاء میں بھی زمانی ترتیب اِسی طرح اثر انداز ہوتی ہے۔

(iv) اِلہام کے لیے تقویٰ شرطِ اوّل ہے

علامہ شوکانی امام ابوعلی التمیمی کی 'التذکرة فی أصول الدین' کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ الہام (اِضطراراً) کے طریق پر علوم اور معارف ملتے ہیں۔ اسے بیان کرنے کے بعد وہ اس طرح کی تمام آیات بیان کرتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا. (۱)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے (تو) وہ تمہارے لیے حق و باطل میں فرق کرنے والی حجت (و ہدایت) مقرر فرما دے گا۔

(۱) الأنفال، ۸: ۲۹

یعنی الہام کے طریق پر ایسے علم کے حصول کے لیے تقویٰ شرطِ اول ہے۔ الہام ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا مورد نفس ہے اور یہ ایک القا ہے۔[1]

یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ صاحبِ تقویٰ کا الہام صحیح ہوگا۔ اس لئے کہ ایک فاسق یا کافر کو بھی ایسا محسوس ہوسکتا ہے۔ یہ نفس کا تزکیہ اور نفس کی ریاضت ہے۔ کشف میں بھی ایسی چیز ہے مگر علمِ لدنی میں ایسا نہیں ہے۔

ذیل میں شیخ اکبر کی کتاب 'الفتوحات المکیة' سے الہام کے بارے میں آیات اور حوالے درج کیے جا رہے ہیں۔ یہ وہ شخصیت ہیں جن کی بات ایسے موضوعات میں سب سے زیادہ معتمد اور معتبر ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○[2]

اور انسانی جان کی قَسم اور اسے ہمہ پہلو توازن و درستگی دینے والے کی قَسم ○ پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دی ○

قرآن مجید کی اس نص سے یہ بات طے ہوگئی کہ الہام نفس پر ہوتا ہے، قلب پر نہیں۔ قلب پر خاطر ہوتا ہے جو کشف ہے۔ کشف، علم لدنی اور مکاشفہ قلب کو ہوتا ہے جبکہ الہام نفس پر آتا ہے۔ نفس کا جب تصفیہ ہو جاتا ہے اور وہ ایک ایسا ظرف اور برتن بن جاتا ہے کہ جو الہام اور القاء کو وصول کرنے کے قابل ہو، تو مذکورہ آیتِ مبارکہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس نفس کے اندر اُس کے فجور کا بھی الہام فرمایا اور اُس کے تقویٰ کا بھی الہام کیا ہے۔

اس مقام پر دو چیزیں ذہن میں رکھ لیں کہ الہام ایک ایسا ذریعۂ علم (source of knowledge) ہے کہ جس میں فجور بھی ہوسکتا ہے اور تقویٰ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ دونوں ہی نفس

---

(۱) شوکانی، إرشاد الفحول، ۱: ۴۱۵

(۲) الشمس، ۹۱: ۷-۸

پر وارد ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں فاعل کی ضمیر کو واضح نہیں فرمایا، یعنی اپنی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ الہام کے فاعل کو مخدوف اور چھپا کر رکھا ہے۔ اس آیت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ الہام کس نے کیا؟ یہ نکتہ توجہ طلب ہے۔ یہ نفس محلِ اِلہام ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اِس ضمیر کو مخفی رکھا کہ الہام کس نے کیا؟ لہٰذا تلاش کرنا پڑے گا کہ الہام کون کر رہا ہے؟ اِس کا مطلب یہ ہے کہ فجور و برائی کا مُلہم کوئی اور ہے اور تقویٰ کا مُلہم کوئی اور ہے۔ قرآن مجید نے یہ بات بیان کر دی تو پھر اُسے تلاش کرنا ہوگا۔

فجور کا الہام شیطان کی طرف سے اور تقویٰ کا الہام فرشتوں کی طرف سے ہوتا ہے

جب نفس کے اندر فجور اور برائی کا الہام ہو رہا ہے تو یہ نفس، نفسِ امّارہ ہے۔ جس کے بارے میں فرمایا:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ.[1]

بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے۔

گویا یہ نفسِ امّارہ ہے اور اُس کے اندر الہام ہو رہا ہے۔ نفس اُس کا امر دیتا ہے اور وہ بندے کو برائی، کبر، حسد اور دیگر ساری خرابیوں پر تیار کرتا ہے۔ نفسِ امارہ پر الہام کون کرتا ہے، اِس کی وضاحت ایک حدیث مبارک سے ہوتی ہے۔ آقائے دو جہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ لِلْمَلَكِ لَمَّةً، وَلِلشَّيْطَانِ لَمَّةً.[2]

---

(۱) یوسف، ۱۲:۵۳

(۲) ۱۔ بزار، المسند، ۵:۳۹۴ رقم:۲۰۲۷
۲۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۹:۱۰۱ رقم:۸۵۳۲
۳۔ أحمد بن حنبل، الزهد، ۱:۱۵۷
۴۔ طبری، جامع البیان، ۳:۸۸، ۸۹

بے شک (انسان کے نفس کے ساتھ) فرشتے کا بھی رابطہ اور اثر ہے اور اُس پر شیطان کا بھی رابطہ اور اثر ہوتا ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

إِنَّ لِلْمَلَكِ لَمَّةً بِقَلْبِ ابْنِ آدَمَ وَلِلشَّيْطَانِ لَمَّةً.(۱)

انسان کے قلب کے ساتھ فرشتے کا بھی رابطہ اور اثر ہے۔ اور اُس پر شیطان کا بھی اثر ہوتا ہے۔

حدیث مبارک نے تصریح کر دی ہے کہ بندے کے نفس میں شیطان بھی الہام کرتا رہتا ہے اور جب موقع ملے تو فرشتہ بھی الہام کرتا ہے۔ شیطان جب بھی الہام کرے گا تو وہ گناہ، معصیت، فسق و فجور، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور شریعت سے دور لے جانے کا کرے گا۔ وہ برے خیالات اور بدتصورات ڈال کر ذہن سازی کرے گا۔ وہ یہ سب کچھ نفس کی زمین پر تیار کر رہا ہے اور نفس ہی اُس کا محل ہے۔ جب انسان کے خیالات برے ہو کر اسے نماز اور تقویٰ چھوڑنے کی طرف لے جائیں، دین سے ہٹا کر بری صحبت اور گناہ کی طرف لے جائیں، جیسے جیسے برائی کا خیال بڑھتا چلا جائے گا سمجھ لیں کہ حضور ﷺ کے مذکورہ فرمان کے مصداق شیطان نے اُس کے نفس کی سرزمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ شیطان کی صورت میں وہاں قبضہ مافیا آ گیا ہے۔ شیاطین وہاں اب اپنے خیالات القا کر رہے ہیں۔ پس واضح ہوگیا کہ نفس میں شیطان فجور کا الہام اور القا کرتا ہے۔

تقویٰ کا الہام کون کرتا ہے؟ مذکورہ حدیث مبارک میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے الہام

۵۔ ابن العربی، الفتوحات المکیة، ۱:۳۲۷

۶۔ قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۷:۱۸۶

۷۔ ثعالبی، تفسیر ثعالبی، ۲:۷۶

(۱) ۱۔ ابن القیم، مدارج السالکین، ۱:۴۶

۲۔ ابن تیمیة، مجموع الفتاوی، ۱۵:۹۷

کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا بلکہ اس کا سبب فرشتوں کو قرار دیا کہ تقویٰ کا الہام فرشتے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے اس پر ملائکہ مقرر کیے ہوئے ہیں۔

۳۔ علم لدنی کیا ہے؟

ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تقویٰ کا الہام فرشتوں کی طرف سے ہوتا ہے تو پھر اللہ کی طرف سے کیا آتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے 'علمِ لدنی' آتا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ بغیر ریاضت اور مجاہدہ کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو علم عطا ہونا۔ امام القاشانی لکھتے ہیں:

يُرَادُ بِهِ الْعِلْمُ الْحَاصِلُ مِنْ غَيْرِ كَسْبٍ، وَلَا تَعَمُّلَ لِلْعَبْدِ فِيْهِ. سُمِّيَ لَدُنِّيًّا لِكَوْنِهٖ إِنَّمَا يُحْصَلُ مِنْ لَدُنْ رَبِّنَا، لَا مِنْ كَسْبِنَا. (۱)

اِس سے مراد وہ علم ہے جو بغیر ریاضت و مجاہدہ کے حاصل ہو اور انسان کو اس کے لیے تگ و دو نہ کرنا پڑے۔ اسے لدنی اِسی لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتا ہے اور ہماری محنت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

قرآن مجید میں اس کی واضح مثال واقعہ موسیٰ و خضر علیہما السلام ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ○ (۲)

تو دونوں نے (وہاں) ہمارے بندوں میں سے ایک (خاص) بندے (خضر علیہ السلام) کو پا لیا جسے ہم نے اپنی بارگاہ سے (خصوصی) رحمت عطا کی تھی اور ہم نے اسے علمِ لدنی (یعنی اَسرار و معارف کا اِلہامی علم) سکھایا تھا ○

(۱) القاشانی، لطائف الإعلام فی إشارات أہل الأعلام:۳۲۳
(۲) الکہف، ۱۸: ۶۵

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے علمِ لدنی کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ یہاں فاعل کی ضمیر کو مخفی نہیں رکھا بلکہ صاف کھول کر بیان کر دیا ہے، جبکہ جہاں فجور اور تقویٰ کی نفس میں الہام کی بات کی وہاں فاعل کی ضمیر کو مخفی رکھا اور فرمایا:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا○[1]

پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دی○

'علمِ لدنی' میں فاعل کو اس لئے مخفی نہ رکھا تاکہ کوئی اِس کا واسطہ نہ تلاش کرتا پھرے کہ مخفی و غیبی علم تو ملا مگر کس ذریعے سے ملا؟ کیا کسی فرشتے کے ذریعے ملا؟ کیا کسی روح کے ذریعے ملا، یا جوہرِ عقل کے ذریعے ملا؟ کتابوں کے ذریعے ملا یا صحبتوں کے ذریعے ملا؟ کہیں بندہ اُن ذرائع کو تلاش نہ کرتا پھرے کہ صاحبِ علم لدنی کو یہ علم کس ذریعے سے ملا تاکہ میں بھی اُس ذریعے کو اختیار کروں اور اس علم کا حامل بن جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ علمِ لدنی کے ذریعے کو تلاش کرو گے تو ذرائع نہیں ملیں گے بلکہ علمِ لدنی وہ علم ہے جو بغیر ذرائع اور وسائط کے براہِ راست ہم کسی کے دل میں عطا کر دیتے ہیں۔

(۱) اِلہام اور علمِ لدنی میں فرق

خاطر اور الہام عارضی ہوتا ہے، یہ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ مستمراً اور دائماً باقی نہیں رہتا۔ اس کے برعکس علم لدنی مستقل قائم رہتا ہے۔

الہام اور علم لدنی میں ایک فرق یہ ہے کہ اِلہام فرشتے کے ذریعے ہوتا ہے۔ دوسری طرف علمِ لدنی کسی چینل یا مادی ذریعے سے نہیں آتا، یہ روح کے چینل سے بھی نہیں آتا بلکہ علمِ لدنی بغیر واسطے کے براہِ راست مردِ عارف، مردِ مومن کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ وہبِ خالص ہوتا ہے اور اس میں فرشتہ بھی دخیل (involve) نہیں ہوتا یعنی اللہ اور بندے کے قلب کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ

---

(۱) الشمس، ۹۱:۸

فرمایا گیا ہے:

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًاo[1]

اور ہم نے اسے علمِ لدنی (یعنی اَسرار و معارف کا اِلہامی علم) سکھایا تھاo

(۲) خیر من جانبِ اللہ نصیب ہوتی ہے، جب کہ شر اپنے نفس سے جنم لیتا ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے حصول کے کچھ آداب سکھائے ہیں، ہر چیز اصلاً حقیقت میں تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے (کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللهِ) مگر اس قدر واضح رہنمائی کے باوجود ہم غور و فکر نہیں کرتے۔

فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًاo[2]

پس اس قوم کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں آتےo

ہر شے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی تو ہے مگر اللہ تعالیٰ نے آدابِ بندگی سکھاتے ہوئے سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا ہے:

مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ.[3]

(اے انسان اپنی تربیت یوں کر کہ) جب تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ اللہ کی طرف سے ہے (اسے اپنے حسنِ تدبیر کی طرف منسوب نہ کر)۔ اور جب تجھے کوئی برائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ تیری اپنی طرف سے ہے (یعنی اسے اپنی خرابیِ نفس کی

(۱) الکهف، ۱۸: ۶۵
(۲) النساء، ۴: ۷۸
(۳) النساء، ۴: ۷۹

طرف منسوب کر)۔

یعنی اگر کوئی اچھائی ملے، الہامِ حق ملے، معرفت ملے، نیکی کی توفیق ملے، تقویٰ کی توفیق ملے تو وہ اللہ کی طرف سے جان اور اُس کی نسبت حق تعالیٰ ہی کی طرف کرو۔ اس کے برعکس اگر برائی کی چیز ہو تو اسے اپنے اندر کی کوتاہی، کمی اور خرابی میں تلاش کرو کیونکہ برائی نے وہاں سے ہی جنم لیا ہے، لہٰذا اُسے اپنی طرف منسوب کرو۔ اگر اچھائی ملے اور نیکی صادر ہو تو اپنے اندر منسوب نہ کرو کیونکہ یہ عمل تمہارے اندر تکبر پیدا کر دے گا اور نیکی بھی بدی میں تبدیل ہو جائے گی۔ آدابِ بندگی بجا لائے کا یہی طریقہ ہے۔

۴۔ علم لدنی کا سلسلہ بدستور قائم ہے

اللہ تعالیٰ کی طرف سے علمِ لدنی کا اِجراء جاری و ساری ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ط وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ○ (۱)

ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں ان (طالبانِ دنیا) کی بھی اور ان (طالبانِ آخرت) کی بھی (اے حبیبِ مکرّم! یہ سب کچھ) آپ کے رب کی عطا سے ہے۔

یعنی ہم مومنوں کو رزق اور دیگر نعمتوں میں سے جو کچھ دے رہے ہیں اور کافروں کو بھی جو کچھ دے رہے ہیں، اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کو بھی، اَہلِ خیر کو بھی اور اَہلِ شر کو بھی جو کچھ مل رہا ہے؛ وہ سب آپ کے ربّ کی عطا ہے۔

معلوم ہوا کہ جو الہام کسی کو نصیب ہوئے، خواطرِ ملکیہ نصیب ہوئے، خواطرِ ربانیہ نصیب ہوئے، الہامِ حق نصیب ہوئے، کشف نصیب ہوئے، مکاشفات نصیب ہوئے، کرامات نصیب ہوئیں اور علمِ لدنی نصیب ہوا وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ مزید فرمایا:

(۱) الإسراء، ۱۷: ۲۰

وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًاo[1]

اور آپ کے رب کی عطا (کسی کے لیے) ممنوع اور بند نہیں ہےo

یعنی آپ کے ربّ کی جانب سے نبوت کے سوا بقیہ تمام عطاؤں کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ صرف نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہے کیونکہ حضور نبی اکرم ﷺ کو خاتم النبیین کے منصب پر فائز فرمایا گیا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ.[2]

محمد (ﷺ) تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور سب انبیاء کے آخر میں (سلسلۂ نبوت ختم کرنے والے) ہیں۔

مالکِ کون و مکاں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو خاتم المرسلین بناتے ہوئے نبوت و رسالت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس اَمر کے لیے حکم فرمایا کہ یہ دروازہ بند کر دیا، پس وہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا؛ اور اللہ تعالیٰ نے جن نعمتوں کی عطا جاری رکھی ہے اور اُس کے بند ہو جانے کا واضح حکم نہیں آیا، اس کے لئے فرمایا:

وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًاo[3]

اور آپ کے رب کی عطا (کسی کے لیے) ممنوع اور بند نہیں ہےo

اللہ تعالیٰ کی وہ عطائیں نہ تو بند ہوئی ہیں اور نہ ہی قیامت تک بند ہوں گی۔ اب علم اور معارف کے یہ سارے راستے اُسی طرح کھلے رہیں گے، جیسا کہ پہلے کھلے تھے۔ اللہ تعالیٰ جس زمانے کے جس بندے کو چاہے گا، وہ عطا فرمائے گا۔ عین اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ نے کسی بھی زمانے کے لوگوں پر حواسِ خمسہ بند نہیں کیے۔ یہ نہیں ہوا کہ پہلے زمانے کے لوگ دیکھتے تھے

(۱) الإسراء، ۱۷: ۲۰
(۲) الأحزاب، ۳۳: ۴۰
(۳) الإسراء، ۱۷: ۲۰

اور اب اندھے ہو گئے ہیں۔ نہیں! اللہ اب بھی آنکھیں دیتا ہے۔ پہلے زمانے کے لوگ سنتے تھے، کیا اب بہرے ہیں؟ نہیں! انسان جیسے پہلے سنتے تھے ویسے ہی اب بھی سنتے ہیں۔ جیسے کل قوتِ سامعہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ تھی، یہ سب آج بھی بدستور موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح پہلے دماغ کی حسِ مشترک، حسِ خیال، حسِ واہمہ، حسِ حافظہ، حسِ متصرفہ دی تھی اور دماغ کے جو قویٰ دیے تھے وہ آج بھی لوگوں کو ملتے ہیں۔ اِسی طرح روحانی ذرائع اور نفس پر ورود و کیفیات کا سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ کیا **فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا** میں جو کچھ فرمایا گیا، اس کی بندش ہوگئی؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اب نفس پر تقویٰ اور فجور کا الہام نہیں ہوتا؟ نہیں! ایسا نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اِسے کسی زمانے کے ساتھ محدود نہیں کیا بلکہ ایسا اب بھی ہوتا ہے۔ اِسی طرح جن چیزوں سے مکاشفہ ہوتا تھا، وہ اب بھی ہوتا ہے اور اسی طرح ہوتا رہے گا۔ مالکِ ارض و سماوات اپنے بندوں کو علمِ لدنی عطا کرتا تھا، کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ اس کے بند ہونے پر قرآن کی نص نہیں آئی۔ اُس کا مطلب ہے کہ وہ سب **وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا** کے کلیہ کے تحت آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ عطا اور نعمت بند نہیں ہوئی۔ یہ جیسے جاری تھی، ویسے ہی جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی۔

۵۔ علمِ فرقانی کا حصول تقویٰ کے ذریعے ممکن ہے

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی اِن عطاؤں کے حصول کے ذرائع اور عمومی اُصول بھی بیان کر دیے ہیں تاکہ اہل ایمان اگر ان اصولوں پر عمل پیرا رہیں گے تو ان پر قیامت تک عطاؤں کا سلسلہ بھی قائم و دائم رہے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا. (۱)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے (تو) وہ تمہارے لیے حق و باطل میں فرق کرنے والی حجت (و ہدایت) مقرر فرما دے گا۔

---

(۱) الأنفال، ۸:۲۹

اس آیت مبارکہ میں لفظِ 'فرقان' کے ذریعے اُس علم کے عطا کیے جانے کا ذکر ہے جس کا تعلق نہ تو ظاہری حواس سے ہے، نہ عقل کے حواسِ باطنی سے ہے، نہ بدیہیات اور فطریات سے ہے اور نہ ہی تجربیات سے ہے۔ اِس کا تعلق صرف اور صرف تقویٰ سے ہے۔ اندازہ کریں کہ نہ نصاب پڑھا جا رہا ہے، نہ کتاب ہے اور نہ ہی استاد ہے، مگر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ایک علم وہ بھی ہے کہ اگر تقویٰ اختیار کرو گے تو اُس ذریعے (channel) سے تم اُس علم تک پہنچو گے۔ یہ وہ علم ہے جس کے ذریعے حق و باطل میں فرق کرنے والی صلاحیت انسان کو ودیعت کر دی جاتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ علمِ فرقانی عطا فرما دیتا ہے۔

امام زرکشی اور علامہ شوکانی دونوں نے بیان کیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ أي ما تفرقون به بين الحق والباطل.[1]

﴿اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے (تو) وہ تمہارے لیے حق و باطل میں فرق کرنے والی حجت (و ہدایت) مقرر فرما دے گا۔﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ایسا علم عطا کر دے گا کہ جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔

اس ضمن میں ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔ اُصول الحدیث میں علل الحدیث ایک مکمل علم ہے۔ علل سے مراد مخفی علتیں ہیں۔ یعنی سند میں کہیں کوئی مخفی چیز واقع ہوتی ہے، جو علتِ قادحہ ہوتی ہے یا کوئی سبب ہوتا ہے جو اُس حدیث کی سند کو متاثر کرتا ہے۔ یہ علت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ مخفی ہوتی ہے۔ عام دیکھنے والے کو اس کا پتہ نہیں چلتا بلکہ صرف مُتفنِّن ہی جانتا ہے۔

ایک بار ایک شخص حدیث کے اجل امام ابن ابی حاتم رازی کے پاس آیا اور پوچھا کہ آپ مرتبۂ حدیث بیان کرتے ہیں تو کیسے پتہ چلتا ہے کہ اِس میں ضعف ہے، اِس سند میں علت اور کمزوری ہے؟ اِس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہوتی ہے؟

(۱) ۱۔ زرکشی، البحر المحيط في أصول الفقه، ۴:۴۰۱
۲۔ شوکانی، إرشاد الفحول، ۱:۴۱۵

قابلِ غور بات ہے کہ ائمہ اصول الحدیث کی بات ہو رہی ہے۔ ہر چیز کا جواب یہ نہیں ہوتا کہ کس نے کہا ہے؟ یہ کوئی اصول نہیں ہے کہ ہر چیز کو 'کس نے کہا ہے' سے تلاش کیا جائے بلکہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی تلاش مروجہ ذرائع علم سے ناممکن ہوتی ہے۔

امام ابن ابی حاتم رازی نے اونچے درجے کے چند نام ور ومعتمد ائمہ اصول حدیث کے نام لیے اور کہا کہ ان کو بتائے بغیر تم جا کر کوئی حدیث الگ الگ سند سے ان کے سامنے بیان کرو اور اس پر اُن کا جواب لو۔ اگر اس حدیث پر چاروں کا جواب مختلف آئے تو پھر تمہارا سوال درست ہوگا کہ میرے پاس کسی سند میں علت کی دلیل کیا ہوتی ہے؟ پھر تلاش کرنا پڑے گا کہ اِس میں کیا علت ہے، پھر اِس کے لیے میں دلائل مہیا کروں گا۔ اگر چاروں کا جواب ایک آئے اور سنتے ہی وہ تمہیں بتا دیں تو پھر میرے جواب کو مان لینا۔

جب چاروں ائمہ کا جواب اس پیش کی گئی حدیث کے سند پر ایک جیسا آیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ وہ ملکہ ہے جو اللہ تعالیٰ انسان کے باطن کو عطا کر دیتا ہے۔ جب کسی علم پر کسی کو تبحر اور مہارت ملتی ہے تو اُس فن کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ علمی ملکہ اتنا پختہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کے اندر قدرت اور بصیرت عطا کر کے حجابات اٹھا دیتا ہے۔ خالقِ کائنات اسے اُس فن پر اتنا تمکن عطا کر دیتا ہے کہ پھر وہ سند کو سن کر اُس علم کے تبحر اور گہرائی کی وجہ سے فوری بتا دیتا ہے کہ اِس میں کمزوری ہے یا یہ چیز دلیل کے لحاظ سے صحت مند نظر نہیں آتی ہے۔

اس شخص نے کہا کہ یہ ملکہ کیسے حاصل ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ ملکہ اسی طرح حاصل ہوتا ہے جیسے کسی سنار کے پاس جاؤ تو بعض اوقات وہ سونے کی رنگت دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ اِس میں اتنے فی صد ملاوٹ ہے۔ بعد ازاں جب بھٹی میں جا کر چیک کریں گے تو سونے کا معیار وہی نکلے گا جو اس زرگر نے بتایا تھا۔ گویا اللہ تعالیٰ اُسے وہ ملکہ عطا کر دیتا ہے کہ اُس کی آنکھ میں بصیرت آجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ سب چیزیں الہام کرتا ہے۔ اِسی طرح اِس میں ریاضات بھی ہیں، مجاہدات بھی ہیں، کثرتِ مطالعہ بھی ہے، طویل عمر کا صرف کرنا بھی ہے، اللہ

تعالیٰ کی عطا کی ہوئی عقلی اور دماغی صلاحیتیں بھی ہیں، اُس میں ایک قلبی اور روحانی استعداد بھی ہے، ذہانت بھی ہے، فطانت بھی ہے، بصیرت بھی ہے، فراست بھی ہے اور دیگر بہت ساری چیزیں علم اور مطالعہ کے ساتھ بھی حاصل ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر آپ بعض اوقات کوئی شعر سنتے ہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ غالبؔ کا شعر ہے۔ دوسرا آدمی سن کر کہتا ہے کہ یہ غالب کا نہیں ہوسکتا، یہ تو میر تقی میرؔ کا لگتا ہے۔ کوئی کہہ دیتا ہے کہ یہ علامہ اقبالؔ کا ہے لیکن عین اسی لمحے کوئی اور کہتا ہے کہ یہ کلام علامہ اقبالؔ کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اِس کا یہ مطلب یہ ہوا کہ اُس نے علامہ اقبالؔ کی شاعری میں محنت کر کے اتنا ملکہ، اتنی پختگی اور اتنا تبحر پیدا کیا ہے کہ اسے حکیم الامت کا شعری اسلوب اور اُن کے شعر کا مزاج سمجھ آ گیا ہے۔ اسے میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا مزاجِ شعری سمجھ آ گیا ہے اور اس نے خواجہ میر دردؔ اور مومنؔ کا شعری آہنگ پوری طرح سے سمجھ لیا ہے۔

اسی طرح آدمی اردو کی ایک تحریر پڑھ کر کہتا ہے کہ یہ اقتباس سرسید، ڈپٹی نذیر احمد یا شبلی نعمانی یا اردو ادب کے عناصرِ خمسہ میں سے کسی ایک کا لگتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اردو کی ایک غزل پڑھ کر آدمی فوری طور پر بتا دیتا ہے کہ یہ کسی دبستانِ دہلی کے غزل گو کی تخلیق ہے یا دبستانِ لکھنؤ کے سخن ور کا کمال ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو ادب میں ملکہ پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اُس کے اندر امتیاز کرنے کی ایک صلاحیت آ گئی ہے۔ ایسا ہر فن میں ہوتا ہے۔

ایک ماہر طبیب یا ڈاکٹر آپ کی آنکھ یا چہرہ دیکھ کر بتا دیتا ہے آپ کو کیا مرض لاحق ہے۔ بعد ازاں آپ ٹیسٹ کرواتے ہیں تو واقعی وہی بیماری نکل آتی ہے۔ یعنی ہر فن اور ہر ہنر کے میدان میں ایک روحانی ملکہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اُس میدان میں کثرتِ مطالعہ، کثرتِ ریاضت اور کثرتِ مجاہدہ کے نتیجے میں بندے کو عطا فرما دیتا ہے۔

اس لئے فرمایا کہ اگر تقویٰ اختیار کرو اور تمہارا تقویٰ بڑھتا چلا جائے اور تم اتنے پرہیز گار بن جاؤ کہ تم حرام سے بھی بچو، شبہات سے بھی بچو اور شبہات میں پڑنے کے امکانات سے بھی بچو تو پھر وہ ایک ایسا نور عطا کر دیتا ہے اور تمہارے اندر ایک ایسا ترازو قائم کر دیتا ہے،

تمہیں علم وفہم، حکمت اور بصیرت وفراست کے ساتھ وہ مقام دے گا کہ تم بات سنتے ہی کہہ اٹھو گے کہ یہ درست ہے اور یہ غلط ہے۔

ہم نے کئی بار اپنی زندگی میں ایسے دیکھا ہے کہ ایک چیز کو پڑھا تو کہا یہ بات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ہی ہوسکتی ہے کسی اور کی نہیں۔ یہ تحریر امام سیوطی کی ہوسکتی ہے، یہ پیراگراف حافظ ابن حجر عسقلانی کا ہوسکتا ہے، یہ قسطلانی کا ہوسکتا ہے، یہ بات علامہ ابن تیمیہ کی ہی ہوسکتی ہے، یہ بات ابن القیم تحریر کر سکتے ہیں، یہ عبارت امام غزالی یا امام سُلمی کی ہوسکتی ہے یا پھر قشیری کی ہوسکتی ہے، یہ قاضی عیاض کی ہوسکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جب آدمی پڑھتا رہتا ہے اور اُس میں پختگی آتی رہتی ہے تو اسے یہ ملکہ نصیب ہوتا ہے۔ سو معلوم ہوا کہ تقویٰ ایک ایسے علم کے ملکہ تک پہنچاتا ہے کہ بندے کو مرتبۂ فرقان نصیب ہو جاتا ہے۔

۶۔ اِلتباس سے نکلنے کا راستہ تقویٰ ہے

اللہ تعالیٰ نے تقویٰ سے حاصل ہونے والی اسی طرح کی ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا○[1]

اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لیے (دنیا و آخرت کے رنج وغم سے) نکلنے کی راہ پیدا فرما دیتا ہے○

جو شخص تقویٰ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اُسے تقویٰ کے نتیجے میں بالآخر مقامِ مخرج عطا کر دیتا ہے۔ مخرج سے مراد وہ مقام ہے کہ جب دلائل بندے کے لئے التباس پیدا کر دیں، مختلف کتب، فتاویٰ اور دلائل و براہین پڑھ کر مطالعہ کرنے والے کو التباس پیدا ہو جائے کہ کس بات پر حکم دوں؟ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ اگر اُس التباس سے صاحبِ علم نکل جائے اور بالکل سفید دن کے اجالے کی طرح نتیجے پر پہنچ جائے تو اُسے مخرج کہتے ہیں۔ صاحبِ علم

(۱) الطلاق، ۲:۶۵

گرداب میں نہیں پھنستا۔ کتابیں تو دوسرے لوگ بھی پڑھتے ہیں اور وہ بھی پڑھتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی علماء کے دلائل پڑھتے ہیں اور وہ بھی پڑھتا ہے۔ دوسرے لوگ تو التباس اور ابہام کی گرداب میں پھنس کر اپنی منزل کو نہیں پا سکتے جبکہ اسے مخرج مل جاتا ہے۔

استاد اور کتابیں 'مخرج' اور 'فرقان' کے مقام تک نہیں پہنچاتیں۔ کتابیں اور استاد تو وہاں تک پہنچنے کا فقط ایک ذریعہ ہیں۔ ریاضت اور مشقت بھی خود سے (It self) یہ مقام نہیں دیتی، وہ بھی صرف ایک ذریعہ ہے۔ بلاشبہ اُس ذریعہ کو اختیار (Adopt) کرنا پڑتا ہے مگر پھر ایک مقام آتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی وھب ہوتی ہے کہ جسے مخرج عطا کرے وہ اس التباس سے نکل جاتا ہے۔ اسی وقت بات کو سنتے ہی بغیر ابہام، التباس اور تشکیک کے کھری بات بتا دیتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ انہوں نے یہ بات کہاں سے کہہ دی۔ دوسرے لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ اس موضوع پر کتابیں تو ہم نے بھی پڑھی تھیں، یہ سب کچھ تو ہم نے بھی دیکھا تھا اور ہر چیز کا بغور جائزہ بھی لیا تھا مگر حقیقت یہ ہوتی ہے کہ انہیں مقامِ مخرج نصیب نہیں ہوا تھا۔

اگر کسی کو مقامِ مخرج اور فرقان نہ ملا ہو تو اسے دوسروں سے جھگڑا کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ یہ فیصلہ تو اللہ نے کرنا ہے، آپ نے اور میں نے تو کرنا نہیں ہے۔ کوئی کتابوں میں ساری زندگی گزارتا ہے، علوم وفنون پڑھتا پڑھاتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ وہ سارا کچھ کر کے بھی بحران میں مبتلا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کئی ایک کو مخرج کے ذریعے بحرانوں سے نکال کر فرقان عطا کر دیتا ہے۔ ایک شخص بحران میں مبتلا ہے تو اس کے برعکس دوسرا فرقان پر فائز ہے۔ ایک بے چارہ ہر وقت تلاطم میں گھرا ہوا ہے اور لاکھ جتن کرنے کے باوجود موجوں سے نکل نہیں پا رہا جب کہ دوسرا وہ ہے کہ شکوک وشبہات اور التباس اُس کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عطا ہے جو بطریقِ تقویٰ ملتی ہے۔

جو لوگ دعویٰ کریں کہ بغیر تقویٰ کے ہمیں یہ مل گیا ہے تو یہ ذہن میں رکھ لیں کہ انہیں جو کچھ ملا ہے وہ نہ فرقان ہوگا، نہ مخرج ہوگا اور نہ ہی وہ علمِ اِلٰہی ہوگا۔ اس لئے کہ کفار کو بھی

بعض اوقات ایسی چیز ہواجز کے ذریعے القا ہوسکتی ہیں۔ خواطرِ نفسانی، خواطرِ شیطانی اور حتیٰ کہ کشف بھی اس ذریعے سے ہوسکتا ہے۔ یہ مقام انہیں ریاضت کے سبب ملا ہے، فرقان ومخرج کی وجہ سے نہیں۔ ریاضت کوئی بھی کرسکتا ہے۔ اگر کوئی شب و روز محنت کرے، ریاضت اٹھائے تو پہلوان بن جائے گا۔ اگر کوئی دبلا پتلا شخص بھی ہر روز کسرت کرے اور خوراک کھائے تو اس کے بھی پٹھے بن ہی جائیں گے۔ اگر کوئی بھی باقاعدگی سے اور باضابطہ انداز میں وزن اٹھائے تو آہستہ آہستہ تن ساز (body builder) بن جائے گا۔ اگر روزانہ کبڈی کھیلیں، کُشتی لڑیں اور پانچ دس میل کی دوڑ لگائیں گے تو آپ بھی ایک دن اچھے پہلوان بن جائیں گے۔

یاد رکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ایک ہے۔ جس طرح جسم پر ریاضت کی جائے تو جسم طاقت ور ہو جاتا ہے۔ کہاں ایک دھان پان اور کم زور جسم کا مالک آدمی اور کہاں بھولو پہلوان، رستم زماں گاما پہلوان کا ٹھوس اور کسرتی جُثہ، دونوں کے درمیان فرق واضح دکھائی دے گا۔ جس طرح کسرت سے جسم اور طاقت میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے، اُسی طرح روحانی ریاضت میں بھی کوئی کم زور رہ جاتا ہے اور کوئی رستم زماں بن جاتا ہے۔

اگر روح اور نفوس کے تزکیہ کی ریاضت کی جائے، قلب کے تصفیہ اور اسے منور کرنے کی ریاضت کی جائے، روح کو پردوں سے نکال کر طاقت ور کرنے کی ریاضت کی جائے تو جیسے جسم میں طاقت بڑھتی ہے ویسے ہی روحانی طاقت بھی بڑھتی ہے۔ جو لوگ روح کی طاقت میں رستم زمان ہوتے ہیں، وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں۔ جب تقویٰ کے ساتھ ساتھ روحانی طاقت بھی بڑھتی ہے تو اولیاء اللہ بنتے ہیں۔ اگر تقویٰ منہا (minus) کر دیں اور روحانی ریاضات کرتے رہیں تو روح کا کشف بھی آ سکتا ہے خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ ہندو جوگیوں، یہودیوں اور مسیحیوں میں بھی کئی محنت اور ریاضت کرتے کرتے کشف کے حامل ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی سے نا انصافی نہیں کرتا۔ ایسا تو نہیں ہے کہ اگر مسلمان پہلوان ریاضت کرے تو رستم بن جائے، غیر مسلم پہلوانی کرے تو محض کلمہ گو نہ ہونے کی وجہ سے رستم نہیں بنے گا۔ یہ تو اللہ کا نظامِ عدل ہے کہ جتنی محنت کرو گے اُس کا اتنا ہی پھل پاؤ گے۔ اگر کوئی روح پر

محنت کرے تو وہ بھی طاقت ور ہو جائے گی اور اُس کے بھی کشف ہوں گے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر ریاضت کے ساتھ ایمان اور تقویٰ بھی مل جائے تو ولایت بن جاتی ہے، پھر وہ ادراکات اور مکاشفات صحیح ہوتے چلے جاتے ہیں اور قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے۔ اگر ریاضت کے ساتھ ایمان اور تقویٰ نہ ہو تو یہ ریاضت جسمانی ریاضت کی طرح نتیجہ دیتی ہے مگر ایمان اور تقویٰ سے محروم بندہ ولی اور اللہ کا دوست ہرگز نہیں بن سکتا۔

۷۔ حصولِ معرفت تقویٰ ہی کے مرہونِ منت ہے

تقویٰ کے ذریعے بندہ مومن نہ صرف 'فرقان' اور 'مخرج' کے مقام کا حامل ہو جاتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اُسے علمِ خاص یعنی معرفت کی دولت بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ.(۱)

اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور اللہ تمہیں (معاملات کی) تعلیم دیتا ہے۔

یعنی اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں علم عطا کر دے گا۔ تقویٰ کے ذریعے کون سا علم اللہ تعالیٰ عطا کرے گا؟ آیئے اس کا جائزہ لیتے ہیں:

گزشتہ صفحات پر ہم علم کے ذرائع پر بحث کر چکے ہیں کہ پہلا علم وہ تھا جو حواسِ ظاہری کے ذریعے ملا تھا، یعنی حواسِ ظاہری استعمال کرو تو علم بذریعہ عقل ترتیب پائے گا۔ کتاب پڑھو تو علم ملے گا۔ استاد کے پاس بیٹھو گے تو علم ملے گا۔ سکول جاؤ گے تو علم ملے گا۔ یہ سب علم کے ذرائع و وسائلِ معروفہ تھے یعنی ایسے ذرائع جنہیں ہر کوئی جانتا ہے۔

ہم اب معروف ذرائع سے ہٹ کر مختصراً خفیہ ذرائع کی طرف ایک نظر ڈالتے ہیں کہ مخفی ذرائع علم کون سے ہیں؟ علامہ ابن القیم نے اپنی تصنیف 'مدراج السالکین' میں علم کے دو الگ درجات بیان کیے ہیں:

---

(۱) البقرة، ۲:۲۸۲

پہلا درجہ علم جلی کا ہے۔ وہ علم جو ظاہری ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے اسے علمِ جلی کہتے ہیں۔ خواہ وہ علم زبان سے حاصل ہو یا آنکھ سے ملے، کان سے ملے، تجربہ سے ملے یا وجدانیات سے ملے یا استنباط و استخراج اور استدلال یا دیگر دلائل سے ملے۔

علامہ ابن القیم علم کی **دوسری قسم علمِ خفی** بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے علمِ خفی کا دوسرا نام معرفت رکھا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ معرفت علم خفی ہے، اس تعریف کی رو سے ذرائع اور عقل نکل گئے ہیں۔ یہ علم حواسِ خمسہ سے نہیں آتا بلکہ قلب کے ذریعے آتا ہے۔

(ا) لطائفِ خمسہ

علامہ ابن القیم بیان کرتے ہیں کہ دل سے اشرف مقام روح کا ہے۔ وہ علم پھر روح کے واسطے سے آتا ہے۔ پھر بیان کرتے ہیں کہ روح سے بھی اونچا مقام 'سِر' کا ہے اور وہ علم سِر کے ذریعے سے آتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

> إِنَّ الْقَلْبَ أَشْرَفُ مَا فِي الْبَدَنِ، وَالرُّوْحُ أَشْرَفُ مِنَ الْقَلْبِ، وَالسِّرُّ أَلْطَفُ مِنَ الرُّوْحِ.(۱)
>
> بدن کے تمام اعضاء میں قلب سب سے افضل ہے، روح قلب سے بلند مقام کی حامل ہے جب کہ سِر روح سے بھی لطیف تر شے ہے۔

وہ اُس بحث کو لطائف کے تحت بیان کرتے ہیں کہ علم خفی کے تین ذرائع ہیں۔ پہلے **'قلب'**، پھر اُس سے اوپر والے درجے میں **'روح'** ہے، اس کے انکشافات قلب سے اونچے ہیں، اِن سب سے اوپر **'سِر'** ہوتا ہے۔ علامہ ابن القیم مزید کہتے ہیں کہ سِر سے بھی اوپر اور اشرف ایک مقام ہے جسے 'سِر السّر' کہتے ہیں یعنی اُسے 'خفیٰ' اور 'اَخفیٰ' کہتے ہیں۔ اِس طرح وہ لطائفِ خمسہ کے بعد وہ علم کا درجہ ثالثہ یعنی **'علمِ لدنی'** کو بیان کرتے ہیں۔

---

(۱) ابن القیم، مدراج السالکین، ۲: ۴۷۳

(۲) علومِ خفی سے انکار ممکن نہیں ہے

کیا اب بھی کوئی علومِ خفی، لطائف خمسہ اور الہام کا انکار کر سکے گا؟ اگر انکار کرنا ہے تو پھر انکار کرنے والے کو علامہ ابن القیم اور علامہ شوکانی کو بھی علمی سطح پر ردّ کرنا ہوگا کیونکہ اِن پر زیادہ تر اعتماد کیا جاتا ہے، پورا فتاویٰ ابن تیمیہ بھی رد کرنا ہوگا۔ جان لیں کہ الہام، علوم لدنیہ اور کشف یہ علوم نہ تو زمانے کے ساتھ متعین ہیں اور نہ کسی صدی کے ساتھ مختص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تو صرف نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہوا ہے۔ اب نہ تو کوئی نبی ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی رسول۔ جب کوئی نبی نہیں ہوسکتا تو کوئی صحابی بھی نہیں بن سکتا۔ صحابی کا درجہ تو ایمان کی آنکھ سے حضور نبی اکرم ﷺ کا دیدار کرنے سے حاصل ہونا تھا۔ کوئی تابعی بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اُس نے صحابی کو دیکھ کر ہونا تھا۔ کوئی تبع تابعی بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسا بھی تابعی کو دیکھ کر ہونا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس لاکھ زمانہ بدلے مگر یہ ذرائعِ علم بند نہیں ہو سکتے۔ اِس لیے کہتے ہیں کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو وہ تمہیں علم عطا کر دے گا۔

تقویٰ ایک ذریعہ ہے۔ تقویٰ کسی کتاب کا نام نہیں ہے اور نہ ہی کسی مدرسہ کا نام ہے۔ اگر کوئی اپنے مدرسہ کا نام جامعہ التقویٰ رکھ لے تو اُس کی اپنی مرضی ہے، مگر یہ کسی استاد کا نام نہیں ہے اور نہ ہی کسی ظاہری ذریعے کا نام ہے۔ تقویٰ تو پرہیزگاری کا نام ہے، ایک روحانی ریاضت اور مجاہدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تمہیں تقویٰ کے نتیجے میں علم عطا ہوگا اور یہ علم تمہیں مخرج دے گا، التباس اور بحرانوں سے نکال دے گا اور بڑے سکون سے تمہاری کشتیِ علم کنارے لگا کر تمہیں مقامِ فرقان تک پہنچائے گا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں وہ شعور عطا فرمائے گا کہ کسی معاملہ پر فوراً ہی کہہ اٹھو گے کہ ہاں یہ درست ہے اور یہ درست نہیں ہے۔ صاحبِ فرقان کتابیں بعد میں پڑھے گا لیکن بات سنتے ہی صحیح جواب دے دے گا۔ وہ کتابیں بعد میں اٹھائے گا مگر اُس کو دلائل پہلے مل جائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے اندر 'فرقان' کی ایک آنکھ کھول دی ہے اور اُس کے اندر ایک مرتبۂ مخرج رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ کے مصداق اسے وہ خاص علم عطا کر دیا ہے۔

۸۔ اِلہام کا ماخذ کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ الہام اور علم لدنی کی صورت میں علم کہاں سے ترقی پاتا ہے؟ الہام کے ان سارے مراتب میں کہاں سے درجہ بہ درجہ اضافہ ہوتا ہے؟

اس کے جواب میں علامہ شوکانی 'ارشاد الفحول (ص:۴۱۵)' میں شیخ شہاب الدین سہروردی کو بطور حوالہ پیش کرتے ہیں کہ یہ الہام جس کا ذکر اوپر تمام آیات میں ہوا، اِس کی قرآن مجید میں کوئی بنیاد بھی تو ہوگی؟ لہٰذا غور کریں تو درج ذیل آیتِ مبارکہ ہمیں اس حوالے سے رہنمائی دیتی ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ.[1]

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تم انہیں دودھ پلاتی رہو۔

یہاں لفظ أوحٰی بمعنیٰ الہام ہے۔

اِس سے آگے بڑھ کر ایک اور استدلال نقل کرتے ہیں اور یہ استدلالات درحقیقت اس باب میں قرآن مجید کے اصول ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ.[2]

اور آپ کے ربّ نے شہد کی مکھی کے دل میں (خیال) ڈال دیا۔

واضح رہے کہ آیت مبارکہ میں مذکور اَوْحٰی سے وحیِ نبوت مراد نہیں ہے۔ یہ لغوی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے جس میں الہام کے معنی کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب شہد کی مکھی کو کچھ القا کیا تو اُسے الہام کا نام دیا۔ اگر اولیاء اللہ، عرفاء اور مردِ مومن کے ساتھ الہام

---

(۱) القصص، ۲۸:۷

(۲) النحل، ۱۶:۶۸

کا لفظ آ گیا تو کون سا کفر صادر ہوگیا؟ یہ وہ بنیادی اساس ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات یعنی حیوانوں، پرندوں اور انسانوں میں بھی رکھی ہے۔ مگر جب نفس امّارہ رہتا ہے تو الہام نہیں ہوتا۔ الہام اُسی وقت ہوتا ہے جب نفس پاک ہوتا ہے اور برائی سے نفرت اور ملامت کرنے لگتا ہے۔ برائی کے ارتکاب پر مذمت و ملامت کرنے والا نفس لوّامہ کہلاتا ہے۔ پھر اُس سے آگے بڑھ کر تقویٰ اور نیکی پر جم جاتا ہے تو نفسِ ملہمہ کہلاتا ہے۔ اس تیسرے درجے میں نفس بندے کے قلب میں نیکی کو الہام کرنے لگتا ہے، یا فرشتہ نفس میں الہام کرنے لگتا ہے۔ اگر فرشتہ الہام کرے تو نفسِ مُلْهَمَه کہیں گے (یعنی ھا پر زبر ہوگی کہ جس نفس میں نیکی کا الہام کیا جائے)؛ اور اگر نفس نیکی کے خیالات قلب میں الہام کرنے والا بن جائے یعنی الہام کا فاعل بنے تو نفس مُلْهِمَه کہیں گے یعنی ھا کے نیچے زیر ہوگی۔ یہ دونوں اعراب آئے ہیں اور دونوں کے معنی جدا جدا ہیں۔ کبھی نفس فرشتوں سے اِلہام حاصل کرتا ہے اور کبھی نیکی کا اِلہام قلب کو منتقل کرتا ہے۔ گویا ملہَمہ بھی ہوتا ہے اور ملہِمہ بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد جب نیکی نفس کو مستقر بنا لیتی ہے اور اس میں جم جاتی ہے اور نفس کو نیکی پر اطمینان ہو جاتا ہے تو نفسِ مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ مطمئن ہو جانے کے بعد وہ نفس اللہ کی رضا کے ساتھ جڑ جاتا ہے اور ہر حال میں راضی برضا رہنے لگتا ہے تو اُسے 'راضية' کہتے ہیں۔ پھر جب اللہ اُس کے ساتھ ہر حال میں راضی ہو جاتا ہے تو 'مرضية' کہتے ہیں۔ آخر میں جب وہ کمال کے مقام پر پہنچ کر ہر نقص سے مبرا ہو جاتا ہے اور کامل بن جاتا ہے تو پھر نفسِ کاملہ کو خطاب ہوتا ہے:

فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ○ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ○[1]

پس تو میرے (کامل) بندوں میں شامل ہو جا○ اور میری جنتِ (قربت و دیدار) میں داخل ہو جا○

پس نفس کے درجے جیسے جیسے بلند ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے الہامِ خیر کو وصول

(۱) الفجر، ۸۹: ۲۹-۳۰

کرنے کی طاقت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اُس کے الہامات بڑھ جاتے ہیں۔[1] پھر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بعض اوقات ملائکہ کلام کرنے لگتے ہیں یا ملائکہ اُس بندے کی زبان سے بولتے ہیں۔ اُسے محدَّث اور مکلَّم کہتے ہیں۔

(۱) نفس کی ساتوں اَقسام پر تفصیلی بحث اگلے باب میں آ رہی ہے۔

سیدہ عائشہ ﷺ روایت کرتی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

قَدْ كَانَ يَكُوْنُ فِي الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ مُحَدَّثُوْنَ فَإِنْ يَكُنْ فِي أُمَّتِي مِنْهُمْ أَحَدٌ، فَإِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ مِنْهُمْ.

وقَالَ ابْنُ وَهْبٍ: تَفْسِيْرُ 'مُحَدَّثُوْنَ' مُلْهَمُوْنَ.[1]

تم سے پہلی اُمتوں میں محدَّث ہوتے تھے۔ اُن جیسا اگر کوئی ایک بھی میری اُمت میں ہوا تو وہ عمر بن خطاب ہوگا۔

ابن وہب نے کہا ہے کہ محدَّث اس شخص کو کہتے ہیں جس پر الہام کیا جاتا ہو۔

گویا الہام کا مرتبہ بڑھتے بڑھتے تحدیث تک چلا جاتا ہے کہ ملائکہ اُس بندے سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ وہ وحیِ نبوت نہیں ہوتی بلکہ وہ الہام ہی کے دائرے میں رہتا ہے۔ کیونکہ غیر نبی کو وحی نہیں ہوسکتی، اب صرف الہام ہوتے ہیں۔

یہ حدیث 'صحیح بخاری' میں بھی آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ ﷺ سے روایت ہے کہ

---

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر، ۴:۱۸۶۴، رقم:۲۳۹۸

۲۔ ترمذی، السنن، كتاب المناقب، باب في مناقب عمر بن الخطاب، ۵:۶۲۲، رقم:۳۶۹۳

۳۔ نسائی، السنن الكبرى، ۵:۳۹، رقم:۸۱۱۹

۴۔ ابن حبان، الصحيح، ۱۵:۳۱۷، رقم:۶۸۹۴

۵۔ حاكم، المستدرك، ۳:۹۲، رقم:۴۴۹۹

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَقَدْ كَانَ فِيمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمِ نَاسٌ مُحَدَّثُونَ، فَإِنْ يَكُ فِي أُمَّتِي أَحَدٌ فَإِنَّهُ عُمَرُ. (۱)

تم سے پہلی امتوں میں ایسے لوگ بھی ہوا کرتے تھے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کلام فرماتا تھا، میری اُمت میں اگر کوئی ایسا ہے تو وہ عمر ہے۔

ایک روایت میں حضرت ابوہریرہ ؓ سے یہ الفاظ مروی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لَقَدْ كَانَ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ رِجَالٌ يُكَلَّمُونَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا أَنْبِيَاءَ، فَإِنْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِي مِنْهُمْ أَحَدٌ فَعُمَرُ. (۲)

تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ بھی ہوا کرتے تھے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کلام فرماتا تھا حالانکہ وہ نبی نہ تھے۔ اگر اُن جیسا میری اُمت کے اندر کوئی ہے تو وہ عمر ہے۔

اِس پر حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

حضور نبی اکرم ﷺ کی امت تو اشرف الامم اور افضل الامم ہے۔ اگر پہلی امتوں میں مکلّم اور محدّث تھے یعنی ملائکہ جن سے کلام کرتے تھے یا ملائکہ جن کی زبان سے بولتے تھے اور اگر پہلی امتوں کو یہ شرف ملا ہے تو امت محمدی کا درجہ تو ان سے کہیں

---

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب الأنبیاء، باب أم حسبت أن أصحاب الکهف والرقیم، ۳:۱۲۷۹، رقم:۳۲۸۲

(۲) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب فضائل الصحابة، باب مناقب عمر بن الخطاب ؓ، ۳:۱۳۴۹، رقم:۳۴۸۶

۲۔ ابن أبي عاصم، السنة، ۲:۵۸۳، رقم:۱۲۶۱

بلند ہے۔ گویا قیامت تک امت محمدی میں بھی یہ مقام تحدیث اور تکلیم رہے گا کہ ملائکہ جن لوگوں سے کلام کریں گے یا ان کی زبان پر ملائکہ بولیں گے[1]۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی امت میں وہ لوگ محدّث ومکلّم ہوں گے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ کہنا تاکید کے لیے ہے کہ اگر ایک بھی ہوا تو عمر تو ضرور ہوں گے۔

ایسا اِس وجہ سے نہیں فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا بلکہ وہ تو عمرِ فاروق کا درجہ بیان فرمایا ہے، وگرنہ قیامت تک امتِ محمدی میں سے افراد محدث کے مقام پر فائز ہوتے رہیں گے۔[2]

(۱) غیر نبی سے فرشتوں کے کلام کے متعلق تفصیلات آئندہ ابواب میں آ رہی ہیں۔

(۲) ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، ۷:۵۰-۵۱

باب نمبر 12

حصولِ علم اور مراتبِ نفس

گزشتہ ابواب میں ہم اس بات کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ ذرائع علم بہت سے ہیں: نفس بھی ذریعۂ علم ہے، قلب بھی ذریعہ علم ہے اور روح بھی ذریعہ علم ہے۔ علاوہ ازیں اونچے درجے کے مزید لطائف بھی ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسان کو وہ علوم عطا کرتا ہے جو عام طور پر معروف ذرائع سے حاصل نہیں ہوتے۔ اِلہام اِنہی مخفی ذرائع میں سے ایک ذریعۂ علم ہے جس کے بارے میں بھی ہم اب تک تفصیلی مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس باب میں ہم بطریقِ اِلہام میسر آنے والے علم پر مزید بحث کریں گے۔

۱۔ الہام قلب میں کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے؟

قدماء کی طرف سے صدیوں قبل لکھی گئی کتابوں سے بعض اوقات اِلہام کے معنیٰ سمجھنے میں ابہام پیدا ہوا ہے۔ بعض اوقات ان کے ہاں الہام، کشف اور علمِ لدنی سمیت کئی چیزوں کے بارے میں ایسے لگتا ہے کہ جیسے یہ سب ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ لوگ دراصل ایسے متکلمین و محققین ہیں جو ان علوم کے ماہر اور متخصص نہیں تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے اِن تمام اصطلاحات کو مترادف قرار دے دیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ عملاً اس میدان کے ماہر نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے الہام کا مورد قلب کو قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر علامہ شریف جرجانی نے لکھا:

اَلْإِلْهَامُ مَا وَقَعَ فِي الْقَلْبِ.[1]

اِلہام وہ ہے جو دل میں واقع ہوتا ہے۔

دیگر کئی علماء اور محققین نے بھی یہی لکھا ہے۔ ایسا لکھنا غلطی نہیں ہے، بلکہ انہوں نے

(۱) جرجانی، التعریفات: ۵۱

اجمالاً بات کر دی اور تفصیل میں نہیں گئے۔ الہام قرآن مجید کی نص سے ثابت ہے اور اس کا وقوع اصلاً نفس میں ہی ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر الہام نفس میں واقع ہوتا ہے تو اس کا مورد 'قلب' کیوں لکھا گیا ہے؟ اَصلاً اِلہام کا مورد نفس ہے جبکہ کشف اور علمِ لدنی کا مورد قلب ہے۔

یہ بڑی لطیف بات ہے کہ نفس تزکیہ کے مراحل طے کرتا ہوا ایک مقام پر آ کر قلب کی جگہ لے لیتا ہے، گویا قلب کی مانند ہو جاتا ہے۔ نفس ایک جوہر ہے، اُس کا ایک لطیفہ ہے جو لطیفۂ نفس کہلاتا ہے۔ وہ کبھی روحانی ترقی پا کر لطیفہ قلب کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہاں اُس کی روحانی ترقی ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ نفس ہی ہوتا ہے لیکن تزکیہ کے ساتھ ساتھ اُس کے خصائل بھی بدل جاتے ہیں۔

۲۔ نفس درجہ بدرجہ کیسے ترقی پاتا ہے؟

یہ بات ذہن میں رہے کہ نفس بذاتِ خود مادی وجود نہیں ہے۔ یہ وجود میں روح کی طرح کا ایک جوہر ہے، اس کی موجودگی ایک روحانی چیز ہے جیسے عقل اور قلب ہے۔ یہاں قلب سے مراد قلب القلب ہے۔ اسی طرح عقل اور شے ہے جب کہ دماغ اور چیز ہے۔ دماغ کا مادی اور جسمانی وجود ہے، اُس کے اپنے خانے ہیں جبکہ عقل دراصل ایک جوہر ہے۔ متقدم علماء نے نفس اور روح پر بڑی بحثیں کی ہیں اور انہیں ایک ہی چیز قرار دیا ہے مگر محدثین اور صوفیاء نفس اور روح دونوں کو الگ الگ مانتے ہیں۔ اس باب میں ہمارا اعتماد صوفیاء اور اولیاء کی تعریف پر ہے، کیونکہ نفس، قلب اور روح اُن کا موضوع ہے۔ یہ فقہاء یا متکلمین کا موضوع (subject) ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر جب کیمسٹری کی بات ہو تو کیمیا کے ماہر (specialist) کی بات زیادہ معتبر ہوگی، بجائے اُس کے جو فزکس یا بیالوجی کا ماہر ہے۔ جب بیالوجی کی بات آئے گی تو اسی کے ماہر کی بات مانیں گے بجائے اس کے جو طبیعیات (physics) کا ماہر ہے۔ الغرض جب ایک فن کا ماہر اور متخصص اپنے شعبہ کے بارے میں بات کرے گا تو اس کی رائے زیادہ قابل قبول، وقیع اور مستند ہوگی۔

شیخ عبد القادر جیلانی نے سات نفوس کے علم کو بیان کیا ہے۔ پھر شیخ اکبر نے بھی انہیں بیان کیا ہے۔ بعد ازاں جس نے بھی لکھا ہے وہ انہی ذرائع کی بنیاد پر آگے لکھتے چلے گئے ہیں۔ اب ہم درجہ بدرجہ نفس کی ان اقسام کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) نفسِ اَمّارہ

یہ سات اقسامِ نفس میں سب سے پہلا نفس ہے۔ یہ سب سے زیادہ گناہوں کی طرف مائل کرنے والا اور دنیوی رغبتوں کی جانب کھینچ لے کر جانے والا ہے۔ یہی نفس فواحش و منکرات، لذات وشہوات اور جملہ بدکاریوں کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کی نسبت قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ. (۱)

بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے۔

نفسِ امارہ کی صفات

نفس امارہ کی صفات میں بخل، کنجوسی، حرص، طمع، لالچ، بدی، حماقت، شہوات پرستی، بغض وکینہ، حسد وعناد، جہالت وغفلت، سستی و کاہلی، غصہ، غیض وغضب، غیبت وچغلی اور عیب جوئی وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے کسی ایک صفت کا پایا جانا بھی نفسِ امارہ پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں قرآن مجید سے بطور نمونہ نفس امارہ کی چند صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌم بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ. (۲)

تو کیا (ہوا) جب بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس وہ (احکام) لایا جنہیں تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے تو تم (وہیں) اکڑ گئے۔

---

(۱) یوسف، ۱۲: ۵۳

(۲) البقرة، ۲: ۸۷

یہاں نفس امارہ کی نمایاں صفت 'تکبر' بیان کی گئی ہے اور حق کا انکار واقع ہونا بھی اسی نفس کے باعث بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ.[1]

اور کون ہے جو ابراہیم (علیہ السلام) کے دین سے رُوگرداں ہو سوائے اس کے جس نے خود کو مبتلائے حماقت کر رکھا ہو۔

یہاں نفس کی جہالت و حماقت کی صفت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ نفس کی شہوات پرستی کی کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ○[2]

لوگوں کے لیے ان خواہشات کی محبت (خوب) آراستہ کر دی گئی ہے (جن میں) عورتیں اور اولاد اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان کیے ہوئے خوبصورت گھوڑے اور مویشی اور کھیتی (شامل ہیں)، یہ (سب) دنیوی زندگی کا سامان ہے، اور اللہ کے پاس بہتر ٹھکانا ہے○

نفسِ امارہ رکھنے والے شخص کا دل تصوف کی اصطلاح میں 'قلب بہیمی' یعنی حیوانی دل کہلاتا ہے۔ اس شخص کی طبیعت اور مزاج میں حیوانی قوتوں کا غلبہ ہوتا ہے۔ ایسے دل کو شیطانی وسوسے اور منفی خیالات اپنی سواری بنا لیتے ہیں۔ بعض اوقات اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ بیرونی اسباب اور اثرات کے بغیر ہی خود بخود دل و دماغ میں شیطانی وسوسے پیدا ہونے لگتے

(۱) البقرة، ۲: ۱۳۰
(۲) آل عمران، ۳: ۱۴

ہیں۔ کبھی ان وسوسوں کا زور اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ شخص انہیں وسوسوں کی بجائے کھلے خیالات کے طور پر ذہن میں تسلیم کرنے لگتا ہے۔ انہی پر اس کی رائے قائم ہو جاتی ہے۔ بالآخر یہ وسوسے اعتقادات میں بھی شکوک پیدا کرنے لگتے ہیں اور وہ شخص اس راہ پر بڑھتا بڑھتا ذہنی اور طبعی طور پر ان میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اس کی طبیعت اعتدال سے خالی ہو کر سراپا نفسِ امارہ بن جاتی ہے۔ روحانی اعتبار سے صوفیاء کرام نے نفسِ امارہ کا رنگ نیلا (blue) قرار دیا ہے۔

(۲) نفسِ لوّامہ

یہ دوسرا نفس ہے. انسان جب نفس امّارہ کے دائرے سے نکلتا ہے تو لوّامہ کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ اس مقام پر دل میں نور پیدا ہوتا ہے جو باطنی طور پر ہدایت کا باعث بنتا ہے۔ جب نفس لوامہ کا حامل انسان کسی گناہ یا زیادتی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اس کا نفس اسے فوری طور پر ملامت کرنے لگتا ہے، اسی وجہ سے اسے لوّامہ (سخت ملامت کرنے والا) کہتے ہیں۔ یہ اچھا نفس ہے۔ یہ نہ صرف نیکی اور بدی میں امتیاز کرتا ہے بلکہ اپنے داخلی نور کے باعث بدی سے نفرت بھی پیدا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس نفس کی قسم کھائی ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ○ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ○[1]

میں قسم کھاتا ہوں روزِ قیامت کی○ اور میں قسم کھاتا ہوں (برائیوں پر) ملامت کرنے والے نفس کی○

یہ نفس صالحین کو نصیب ہوتا ہے۔ علماء بھی اسی نفس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ درج ذیل آیت کریمہ میں بھی اسی نفس کی طرف اشارہ ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى○[2]

---

(۱) القیامة، ۷۵:۱-۲

(۲) النازعات، ۷۹:۴۰-۴۱

اور جو شخص اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اُس نے (اپنے) نفس کو (بری) خواہشات وشہوات سے باز رکھا○ تو بے شک جنت ہی (اُس کا) ٹھکانا ہوگا○

اسی طرح قرآن مجید میں حضرت یوسف ﷺ کے واقعے میں یہ فرمان الٰہی توجہ طلب ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف ﷺ نے فرمایا تھا:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ.(۱)

اور میں اپنے نفس کی برأت (کا دعویٰ) نہیں کرتا، بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم فرما دے۔

نفس کا برائیوں سے بچ جانا دراصل اس کا 'اماریت' سے خلاصی پا جانا ہے۔

نفسِ لوامہ کی صفات

نفس لوامہ کی صفات میں حلال کی رغبت، لوگوں کے لئے نفع بخشی، دوسروں کا بوجھ اٹھانا، لغویات سے گریز کرنا اور پسندیدہ اخلاق شامل ہیں۔ ان کے ساتھ یہ بھی علم رہے کہ اس درجہ پر فائز ہونے کے باوجود نفس لوامہ میں بعض رذائل اور ناپسندیدہ صفات بھی موجود رہتی ہیں۔ اس لئے اس کا تزکیہ نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ اس کی صفات میں مکروفریب، ہوا و ہوس، خود بینی، خود پسندی، تکبر، اعتراض، قہر و جبر اور نفسانی خواہشات بھی شامل ہیں۔

نفسِ لوامہ رکھنے والا شخص کا دل تصوف کی اصطلاح میں 'قلب انسانی' کہلاتا ہے، اس نفس کی مثال ایک سرکش گھوڑے کی سی ہے۔ یہ بنیادی طور پر ناپاک تو نہیں ہے مگر سرکش ضرور ہے۔ اسے لگام کے ذریعے قابو میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی گھوڑے کو لگام دی ہو تو سوار کی مرضی جدھر چاہے لے جائے اور اگر لگام نہ ہو تو گھوڑے کی مرضی جدھر اٹھا کر سوار کو پھینک دے۔ 'قلب انسانی' کیسے وجود میں آتا ہے؟ اسے آسانی سے یوں سمجھ لیجئے کہ جس شخص میں ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے کہ اس شخص کی طبیعت میں اعتدال آ جائے تو اس کی کسی

(۱) یوسف، ۱۲: ۵۳

کے لئے محبت اور چاہت یا اس کی رضا مندی اور ناراضگی کی سب حالتیں حق اور صداقت پر مبنی ہو جاتی ہیں۔ نہ تو اس کا باطن مکمل طور پر نور میں بدل جاتا ہے اور نہ خالص ظلمات اور تاریکیاں برقرار رہتی ہیں بلکہ وہ دونوں کے درمیانی منزل پر قائم ہو جاتا ہے۔ وہ دوزخ سے ڈرتا ہے اور جنت کی تمنا بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے اعمال کو اسی خوف وطلب کے مطابق ڈھالتا ہے تو ایسے شخص کا دل قلب انسانی اور نفس، نفسِ لوامہ کہلاتا ہے۔ اس نفس کا رنگ زرد (yellow) ہوتا ہے۔

(۳) نفسِ ملہَمہ

یہی نفس جب تیسرے درجے پر فائز (upgrade) ہوتا ہے تو نفسِ ملہَمہ قرار پاتا ہے۔ گزشتہ باب میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں اسے مُلْھَمَہ بھی کہتے ہیں اور مُلْھِمَہ بھی۔ یہ ایسا نفس ہے جس پر الہام کیا جائے۔ نیک چیزوں کا الہام فرشتے کرتے ہیں اور بری چیز کا الہام شیطان کرتا ہے۔ چونکہ اس پر الہام کیا جاتا ہے تو یہ مُلْھَمْ ہوگیا (یعنی جس پر الہام کیا جائے)۔ اس مقام پر خیر کا الہام غالب ہوتا ہے۔ کبھی اس کے اندر اتنی طاقت آ جاتی ہے کہ یہ الہام وصول کر کے اپنا الہام قلب پر کرتا ہے۔ نیکی کا خیال جو اس نے بطریقِ الہام ملائکہ سے وصول کیا تھا، قلب کو منتقل کرے تو پھر یہ مُلْھِمَہ (الہام کرنے والا) بھی ہوگیا۔ چنانچہ یہ مُلْھِمْ بھی ہے اور مُلْھَمْ بھی۔ یہاں دونوں شانیں یک جا ہیں۔

نفس بھی قلب پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور روح بھی قلب پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ نفس انسانی وجود کے اندر عالمِ ناسوت یعنی مادی دنیا کی شہوتوں، برائیوں اور حرص و ہوس کا نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے اثرات دل پر پڑیں اور وہ میرے ساتھ ہو جائے۔ چنانچہ اگر دِل نفس کے زیر اثر آ جائے تو دل ڈگمگاتا اور متزلزل ہوتا رہتا ہے۔ اس کی حالت ہر وقت بدلتی رہتی ہے۔ اسی لیے اسے قلب کہتے ہیں۔ قلب کا معنیٰ تبدیل ہونے اور بدلتے رہنے کے ہیں۔ اس کے برعکس روح عالمِ لاہوت، عالمِ جبروت اور عالمِ ملکوت کی نمائندہ ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ دل پر ملکوتی احوال کا رنگ چڑھے۔ چنانچہ جب قلب، روح کے زیر اثر آ جائے تو انسان ملکوتی اوصاف کا حامل ہو جاتا ہے۔ جتنا تزکیہ و تصفیہ، عبادات، زہد و

ورع، ریاضات ومجاہدات اور مشقت ہوگی نفس اتنا ہی صاف ستھرا ہوتا چلا جائے گا۔

نفسِ ملہمہ کی صفات

نفسِ ملہمہ کی نمایاں صفات میں سے قناعت، سخاوت، علم، تواضع و اِنکساری، توبہ، صبر، تحمل و برداشت اور خلوص ہیں۔ گویا اس مقام پر نفس کی صفات میں فضائلِ اخلاق اور خصائلِ حسنہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔

جوں جوں نفس اپنے تزکیہ کے ذریعے پاک صاف ہوتا چلا جاتا ہے اس میں رذائل کا معمولی سا ذرہ اور برائی کا خفیف سا نکتہ بھی زیادہ واضح ہو کر کھٹکتا ہے۔ اس لئے اہل حق کا رتبہ جتنا بڑھتا چلا جاتا ہے وہ اسی قدر صفائے باطن پر مزید توجہ کرتے ہیں۔

نفسِ مُلْھَمَہ کا رنگ سرخ (red) ہے۔ دیکھا جائے تو یہ وہی نفس ہے جو ابتدا میں نفسِ امارہ تھا مگر صفائی ہوتی چلی گئی تو اس کی صفات بھی تبدیل ہوتی چلی گئیں۔

چنانچہ نفسِ مُلْہِمَہ کے مقام پر نفس کے اندر قناعت، حلم، تواضع و انکساری، سخاوت، صبر و تحمل اور اخلاص؛ الغرض تمام صفاتِ محمودہ اور خصائلِ حمیدہ غالب آتے چلے جاتے ہیں۔ جب نفس اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کے اوپر ملائکہ الہام کرنے لگتے ہیں، حالانکہ جب یہ امّارہ تھا تو اُس پر شیاطین الہام کرتے تھے۔ لوّامہ کے مقام پر اس کی آنکھ کھل گئی اور اسے سمجھ آنے لگی، طبیعت برائی سے اکتا کر ملامت کرنے لگی۔ یہی نفس اب اتنا پاکیزہ ہوگیا کہ ملائکہ اسے الہام کرنے لگے اور اب نفس کا محل بدل گیا۔

اگلے مقام تک پہنچنے سے قبل اس کے اندر ملکوتی خوبیاں آچکی ہوتی ہیں۔ نفس ملہمہ اپنی شفافیت، نورانیت، اجلے پن اور نیک خصلتوں میں عالم ملکوت کی سی فضا کا حامل ہو جاتا ہے، جس سے ملائکہ مانوس ہوتے ہیں۔ وہ مومن کے نفسِ ملہمہ کے مقام کو اپنا وطن خیال کرنے لگتے ہیں۔

(۴) نفسِ مطمئنہ

نفسِ ملہمہ سے آگے نفسِ مطمئنہ کا مقام ہے۔ اس کے بارے ارشاد فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ○[1]

اے اطمینان پا جانے والے نفس○

جب نفس اس مقام پر پہنچتا ہے تو وہ قلب کی جگہ لے لیتا ہے، یعنی اُس کا مرتبہ قلب کا ہو جاتا ہے۔ دل کا جو روحانی مقام تھا وہ نفسِ مطمئنہ کو مل جاتا ہے اور قلب ترقی کر کے مقامِ روح پر چلا جاتا ہے۔ یہ لطائف کی معراج ہوتی ہے۔

نفسِ مطمئنہ کے مقام پر ملکوتی اور جبروتی انوار کا اثر و رسوخ ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر کسبی ریاضات و مجاہدات بھی داخل ہوتے ہیں اور وہبِ الٰہیہ بھی، لیکن یہاں ریاضت سے بڑھ کر وہب کا نزول زیادہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر نفس کے اندر عفو و درگزر آ جاتا ہے اور نفس بخشش، عطا، سخاوت، توکل، شکرمندی، عبادت گزاری، تحمل، برداشت اور بردباری کا محل بن جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے امر پر راضی رہتا ہے۔ نفسِ مطمئنہ کا رنگ سفید (white) ہے۔

پہلے نفس اپنے اندر ہی ارتقاء پذیر تھا۔ جب یہ قلب کے مقام پر فائز ہوتا ہے تو اسے نیکی و تقویٰ پر استقرار، استقامت اور اطمینان مل جاتا ہے۔ اس پر الہامات کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں، جن کی ابتدا نفسِ ملہمہ کی حالت میں اِلہاماتِ صالحہ کی شکل میں ہو چکی تھی۔

پہلے مراحل میں فجور کا الہام ہوتا تھا، مگر اب تقویٰ کا الہام ہوتا ہے۔ اب نفسِ مطمئنہ کے مقام پر اسے استقرار ملتا ہے تو عالم ملکوت میں الہامات کے دروازے کھل جاتے ہیں اور بہت سے علوم و معارف اسے بطریقِ الہام ملنے لگتے ہیں۔ یہ مقامِ ولایت ہے، یہاں پہنچ کر وہ ولی اللہ کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔

---

(۱) الفجر، ۸۹: ۲۷

یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ قلب پر کس طرح الہام ہوتا ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ 'قلب پر الہام ہوتا ہے' یہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ جسے وہ قلب کہہ رہے ہیں، درحقیقت وہ نفس تھا۔ اب وہ نفس خود مقامِ قلب پر آچکا ہے۔ اب خواہ اسے یہ کہہ لیں کہ الہام نفس پر ہو رہا ہے، خواہ یہ کہہ دیں کہ الہام قلب پر ہوا، اب وہ ایک ہی چیز ہو جاتی ہے۔ وہ اب قلب کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کا نفس، نفسِ مطمئنہ ہوگیا ہے۔ جیسے قرآن مجید کہتا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ○[1]

جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے○

یہ اطمینان دراصل نفس مطمئنہ کا اطمینان ہے۔ 'نفس مطمئنہ' ولایت صغریٰ کا مقام ہے۔ اس کے تحقق سے 'فنا فی الرسول ﷺ' کا مقام نصیب ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت اس طرح ہے کہ جب کسی شخص میں عطاء الٰہی سے خلقی و وہبی طور پر یا ریاضات و مجاہدات سے کسبی طور پر ملکوتی قوت کا زور ہوتا ہے تو اس کے مقابلے میں بہیمی قوت بالکل زیر ہو جاتی ہے۔ قلب کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ذکر الٰہی سے اطمینان پاجاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ○[2]

جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں، جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے○

نفس جب 'قلب' کے مقام پر آتا ہے تو قلب پہلے ہی ذاکر یعنی یاد الٰہی میں شاغل ہوتا ہے کیونکہ وہ امارہ کے دائرہ سے نکل کر 'لوامہ' اور 'ملہمہ' کے مقامات سے بھی ترقی کر چکا ہے۔ سو جیسے جیسے قلب یادِ الٰہی سے سیراب ہوتا ہے اس کا تمام تر اطمینان 'نفس' کی مستقل

(۱) الرعد، ۱۳: ۲۸
(۲) الرعد، ۱۳: ۲۸

حالت بنتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نفس بھی 'قلب' میں تبدیل ہو کر 'نفس مطمئنہ' ہو جاتا ہے اور جہاں تک قلب کا تعلق ہے تو اسے 'مقامِ روح' مل جاتا ہے۔

قلب کے روح بن جانے سے اسے تزکیہ نفس کے لئے غیر معمولی مجاہدات و ریاضات کی حاجت نہیں رہتی۔ وہ معمول کی طاعات و عبادات سے بھی اپنا تزکیہ و مقام بحال اور برقرار رکھ سکتا ہے، البتہ وہ اگلے درجات کے لئے ریاضات جاری رکھتا ہے۔

روح چونکہ 'امر الٰہی سے ہے'[1]، اس لئے قلب، روح بن کر ہمہ وقت امر الٰہی کے تابع اور اس سے فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔ اب اسے 'قبض' کے بغیر ہی 'بسط' کی کیفیت میسر آ جاتی ہے۔ وہ قلق و اضطراب کے بغیر ہی الفت و محبت کے چشموں سے سیراب ہوتا رہتا ہے اور بے ہوش ہوئے بغیر حالت 'وجد' سے بہرہ یاب ہوتا ہے، جب اس کا قلب ترقی کر کے 'مقامِ روح' پر آتا ہے تو اس کی 'روح' ترقی کر کے مقام 'سر' پر فائز ہو جاتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہوا کہ نفس قلب بن جاتا ہے، قلب روح بن جاتی ہے اور روح سر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے باعث اس پر عالم غیب کے علوم و معارف اور اسرار کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اسے مروج اور متداول طریقوں سے ہٹ کر علوم و معارف، اسرار و رموز اور حقائق و لطائف کا ادراک اور حصول ہونے لگتا ہے۔ یہ کتابوں کی مدد سے، نہ ظاہری فہم و فراست اور تعلق و تدبر کے طریقہ سے، نہ کشف کے طور پر اور نہ ہاتف غیبی کی آواز سے بلکہ اس کی روح اَز خود مقامِ سر سے اسرار و معارف کو اس کے دل میں منتقل کرتی رہتی ہے۔ یہ انوار و اسرار کا ایک غیر مرئی اور غیر محسوس دروازہ ہے جس کے کھل جانے سے وہ شخص 'علوم لدنیہ' کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں وہ بھی عین 'صراط مستقیم' کے مطابق ہوتے ہیں۔ اعمال خود بخود صالح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کلمات مبارک ہوتے ہیں اور دعوات مستجاب ہوتی ہیں۔ یہی ولایتِ صغریٰ ہے۔ صرف یہاں خوارقِ عادات کی صورت میں کرامات کا ظہور نہیں ہوتا مگر وہ شخص صاحبِ کرامت ہوتا ہے۔

---

(۱) الإسراء، ۱۷:۸۵

نفسِ مطمئنہ کی صفات

اس کی صفات میں عفو و درگزر، بخشش و عطاء، توکل، حلم و بردباری، عبادت گزاری، شکر اور رضا خاص طور پر نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

(۵) نفسِ راضیہ

یہ پانچواں نفس ہے۔ بعض مشائخ وصوفیاء نے نفسِ مطمئنہ کے بعد بقیہ نفوس کا الگ سے ذکر نہیں کیا۔ ان کے نزدیک راضیہ، مرضیہ اور صافیہ و کاملہ سب نفسِ مطمئنہ کی ہی اعلیٰ حالتیں اور صفات ہیں۔ چونکہ ان کے خواص اور احوال سابقہ نفوس کی طرح بدلتے چلے جاتے ہیں، اس لئے انہیں بھی الگ اقسامِ نفس کے طور پر شمار کیا گیا ہے۔ یوں تو بعض صوفیاء نے نفس کی مختلف اقسام کی بجائے مطلقاً 'نفس' کو ایک ہی مانا ہے۔ انہوں نے اس کی حقیقت و ماہیت پر گفتگو کی ہے اور اسی کی صفات و احوال پر کلام کیا ہے حتیٰ کہ انہوں نے نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کو بھی اسی ایک ہی نفس کی مختلف بری اور اچھی حالتوں یا خصلتوں سے تعبیر کیا ہے۔ انہیں الگ اقسام نہیں سمجھا۔ ہمارے خیال میں بات دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے، صرف فہم و اظہار کے طریقے الگ الگ ہیں۔ اگر انہیں نفس کی مختلف حالتیں تصور کر لیا جائے تب بھی اس کے خواص و احوال اور اثرات و کیفیات تو بدل گئیں۔ وہ اب پہلے کی مانند نہ رہیں، ان کے احکام بھی بدل گئے اور ان کے حاملین کے درجات و مراتب بھی تبدیل ہوگئے۔ اس لئے جن صوفیاء نے انہیں الگ اقسام قرار دیا ہے ان کے بیان سے بات میں زیادہ نظم اور سمجھنے میں زیادہ سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ ورنہ یہ مسئلہ بحث و اختلاف کا موضوع نہیں بننا چاہیے۔ کوئی ان 'سات ناموں' کو اقسامِ نفس سمجھے، مراتب و مقاماتِ نفس سمجھے یا صفات و احوالِ نفس؛ حقیقت تو ایک ہی ہے۔

اب ہم دوبارہ اصل مقصود کی طرف آتے ہیں اور وہ ہے 'نفس راضیہ'۔ یہ وہ نفس ہے جس میں باری تعالیٰ کے جملہ فیصلوں پر اور اس کی مشیت کے تمام احکام پر راضی برضا اور خوش ہونے کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ظاہری طور پر معاملات موافق ہوں یا مخالف، خواہ نقصان ہو یا

نفع، سکھ نمایاں ہو رہا ہو یا تکلیف کا پہلو واضح ہو مگر یہ نفس اسے امرِ الٰہی سمجھ کر نہ صرف قبول کر لیتا ہے بلکہ اپنے اندر مسرت و فرحت کی کیفیت کو بدستور قائم رکھتا ہے۔ پس اس کے ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے راضی رہنے کے باعث اسے 'نفس مرضیہ' کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا ذکر نفس مطمئنہ کے ساتھ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً○[1]

تو اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ آ کہ تو اس کی رضا کا طالب بھی ہو اور اس کی رضا کا مطلوب بھی (گویا اس کی رضا تیری مطلوب ہو اور تیری رضا اس کی مطلوب)○

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب بارگاہ الٰہی میں بیٹے کے لئے دعا کی تو ساتھ ہی عرض کیا:

یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا○[2]

جو (آسمانی نعمت میں) میرا (بھی) وارث بنے اور یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد (کے سلسلۂ نبوت) کا (بھی) وارث ہو اور اے میرے رب! تو (بھی) اسے اپنی رضا کا حامل بنا لے○

نفسِ راضیہ کی صفات

اس کی نمایاں صفات ذکر و فکر، زہد و ورع، ریاضت و مجاہدہ، تقوی و پرہیزگاری، عشق الٰہی، ترکِ ماسوی اللہ، وفا اور کرامات ہیں۔

(۶) نفسِ مرضیہ

یہ چھٹا نفس ہے اور یہی نفس کا سب سے کامل درجہ ہے۔ جب نفس انسانی ہر حال میں اللہ سے راضی رہنے لگتا ہے اور اس کے مقام رضا میں لغزش یا تزلزل نہیں آتا تو مقام کی

---

(۱) الفجر، ۸۹: ۲۸

(۲) مریم، ۱۹: ۶

یہی استقامت اسے 'مرضیہ' کے درجہ پر فائز کر دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے اب اللہ اس سے اس قدر راضی ہے کہ وہ جو کہے گا وہی کر دیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ بندہ کے نفس کو اللہ سے راضی ہونے کی توفیق بھی اس وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ اللہ سے راضی ہو جاتا ہے۔ گویا نفس کا اللہ سے راضی ہونا 'مقام راضیہ' ہے اور اللہ کا اس نفس انسان سے راضی ہونا 'مقام مرضیہ' ہے اور یہ دونوں باہم لازم وملزوم ہیں۔ 'مرضیہ' کا بیان بیعت رضوان میں شامل صحابہ کرام ﷺ کی شان میں آیا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ.(۱)

بے شک اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ (حدیبیہ میں) درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔

اسی طرح رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ میں مقام مرضیہ اور مقام راضیہ دونوں کا ذکر اکٹھا ہے۔ اس آیت کریمہ میں جہاں نفسِ مطمئنہ کو خطاب فرمایا گیا ہے اس ترتیب سے دونوں مقامات کا ذکر ہے کہ مرضیہ، راضیہ کے بعد آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُo ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃًo(۲)

اے اطمینان پا جانے والے نفسo تو اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ آ کہ تو اس کی رضا کا طالب بھی ہو اور اس کی رضا کا مطلوب بھی (گویا اس کی رضا تیری مطلوب ہو اور تیری رضا اس کی مطلوب)o

سیدنا اسماعیل ﷺ کے مقام مرضیہ کا بیان قرآن مجید میں یوں آیا ہے:

وَکَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَکَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّاo(۳)

---

(۱) الفتح، ۴۸:۱۸

(۲) الفجر، ۸۹:۲۷-۲۸

(۳) مریم، ۱۹:۵۵

اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اپنے رب کے حضور مقامِ مرضیّہ پر (فائز) تھے (یعنی ان کا رب ان سے راضی تھا)o

نفسِ مرضیہ کی صفات

اس کی صفات میں سے نرمی، لطف و کرم، جملہ اخلاق حسنہ، قربِ الٰہی اور متابعت محمدی ﷺ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ پچھلے پاکیزہ خواص و صفات جو پہلے مبارک نفوس کے ذریعے حاصل ہوئے تھے اگلے مقام میں نہ صرف برقرار رہیں گے بلکہ ان میں دوام اور ترقی پیدا ہو جائے گی۔

(۷) نفسِ کاملہ (صافیہ)

یہ ساتواں نفس ہے اور یہی کاملیت کا آخری مقام ہے۔ درج ذیل آیات کریمہ میں اسی مقامِ نفس کی طرف اشارہ ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُo ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةًo فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْo وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْo[1]

اے اطمینان پا جانے والے نفسo تو اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ آ کہ تو اس کی رضا کا طالب بھی ہو اور اس کی رضا کا مطلوب بھی (گویا اس کی رضا تیری مطلوب ہو اور تیری رضا اس کی مطلوب)o پس تو میرے (کامل) بندوں میں شامل ہو جاo اور میری جنتِ (قربت و دیدار) میں داخل ہو جاo

عِبٰدِيْ (میرے [کامل] بندوں) میں داخل ہونے کا حکم نفس کو شانِ کاملیت سے سرفراز کر رہا ہے اور جَنَّتِيْ (میری جنت) میں بسیرا کرنے کا حکم اسے اعلیٰ مقام سے بہرہ یاب کر رہا ہے۔

---

(۱) الفجر، ۸۹:۲۷-۳۰

جنت کی اقسام و درجات

ان آیات میں جنت کا ذکر ہوا تو جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرتے چلیں کہ سیدنا غوث الاعظم عبد القادر جیلانی نے فرمایا ہے کہ جنت کی درج ذیل اقسام اور درجات ہیں:

(i) جنت الماوی

یہ عالم ملک کی جنت ہے۔ جب نفس حضور الٰہی کی طرف رجوع کرتا ہے تو طریق شریعت کا سفر طے کرنے کے بعد یہ جنت نصیب ہوتی ہے اس کا مقام 'سدرہ المنتہیٰ' کے پاس ہے ارشاد ہے:

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰىo عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰىo عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰىo[1]

اور بے شک انہوں نے تو اُس (جلوۂ حق) کو دوسری مرتبہ (پھر) دیکھا (اور تم ایک بار دیکھنے پر ہی جھگڑ رہے ہو)o سِدرۃ المنتھیٰ کے قریبo اسی کے پاس جنت الماْویٰ ہےo

(ii) جنت النعیم

یہ عالم ملکوت کی جنت ہے جو نفس کو سفر طریقت مکمل کرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ یہ مقامِ اَبرار ہے جس کے لئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍo عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَo تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِo یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍo خِتٰمُهٗ مِسْکٌ ط وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَo[2]

بے شک نیکوکار (راحت و مسرت سے) نعمتوں والی جنت میں ہوں گےo تختوں پر

(۱) النجم، ۵۳:۱۳-۱۵
(۲) المطففین، ۸۳: ۲۲-۲۶

بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گےo آپ ان کے چہروں سے ہی نعمت و راحت کی رونق اور شگفتگی معلوم کر لیں گےo انہیں سر بہ مہر بڑی لذیذ شرابِ طہور پلائی جائے گیo اس کی مُہر کستوری کی ہو گی، اور (یہی وہ شراب ہے) جس کے حصول میں شائقین کو جلد کوشش کر کے سبقت لینی چاہیے (کوئی شرابِ نعمت کا طالب و شائق ہے، کوئی شرابِ قربت کا اور کوئی شرابِ دیدار کا، ہر کسی کو اس کے شوق کے مطابق پلائی جائے گی)o

اسی طرح ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًاo عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًاo يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًاo وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًاo اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًاo اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا o فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا o وَ جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا o مُّتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًاo وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًاo وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَاْ o قَوَارِيْرَاْ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًاo وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًاo عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًاo وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًاo وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا o عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًاo اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًاo[1]

(۱) الدھر، ۷۶:۵–۲۲

بے شک مخلص اِطاعت گزار (شرابِ طہور کے) ایسے جام پئیں گے جس میں (خوشبو، رنگت اور لذت بڑھانے کے لیے) کافور کی آمیزش ہوگیo (کافور جنت کا) ایک چشمہ ہے جس سے (خاص) بندگانِ خدا (یعنی اَولیاء اللہ) پیا کریں گے (اور) جہاں چاہیں گے (دوسروں کو پلانے کے لیے) اسے چھوٹی چھوٹی نہروں کی شکل میں بہا کر (بھی) لے جائیں گےo (یہ بندگانِ خاص وہ ہیں) جو (اپنی) نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی خوب پھیل جانے والی ہےo اور (اپنا) کھانا اللہ کی محبت میں (خود اس کی طلب و حاجت ہونے کے باوُجود اِیثاراً) محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو کھلا دیتے ہیںo (اور کہتے ہیں کہ) ہم تو محض اللہ کی رضا کے لیے تمہیں کھلا رہے ہیں، نہ تم سے کسی بدلہ کے خواستگار ہیں اور نہ شکرگزاری کے (خواہشمند) ہیںo ہمیں تو اپنے ربّ سے اُس دن کا خوف رہتا ہے جو (چہروں کو) نہایت سیاہ (اور) بدنما کر دینے والا ہےo پس اللہ انہیں (خوفِ اِلٰہی کے سبب سے) اس دن کی سختی سے بچا لے گا اور انہیں (چہروں پر) رونق و تازگی اور (دلوں میں) سرور و مسرّت بخشے گاo اور اِس بات کے عوض کہ انہوں نے صبر کیا ہے (رہنے کو) جنت اور (پہننے کو) ریشمی پوشاک عطا کرے گاo یہ لوگ اس میں تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، نہ وہاں دھوپ کی تپش پائیں گے اور نہ سردی کی شدّتo اور (جنت کے درختوں کے) سائے ان پر جھک رہے ہوں گے اور ان کے (میووں کے) گچھے جھک کر لٹک رہے ہوں گےo اور (خُدام) ان کے گرد چاندی کے برتن اور (صاف ستھرے) شیشے کے گلاس لیے پھرتے ہوں گےo (اور) شیشے بھی چاندی کے (بنے) ہوں گے جنہیں انہوں نے (ہر ایک کی طلب کے مطابق) ٹھیک ٹھیک اندازہ سے بھرا ہوگاo اور انہیں وہاں (شرابِ طہور کے) ایسے جام پلائے جائیں گے جن میں زنجبیل کی آمیزش ہوگیo (زنجبیل) اس (جنت) میں ایک ایسا چشمہ ہے جس کا نام 'سلسبیل' رکھا گیا ہےo اور ان کے اِرد گرد ایسے (معصوم) بچے گھومتے رہیں گے، جو ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے، جب

آپ انہیں دیکھیں گے تو انہیں بکھرے ہوئے موتی گمان کریں گےo اور جب آپ (بہشت پر) نظر ڈالیں گے تو وہاں (کثرت سے) نعمتیں اور (ہر طرف) بڑی سلطنت دیکھیں گےo ان (کے جسموں) پر باریک ریشم کے سبز اور دبیز اطلس کے کپڑے ہوں گے، اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا ربّ انہیں پاکیزہ شراب پلائے گاo بے شک یہ تمہارا صلہ ہوگا اور تمہاری محنت مقبول ہوچکیo

(iii) جنت الفردوس

یہ عالم جبروت کی جنت ہے جو نفس کو سفر معرفت مکمل کرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًاo خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًاo[1]

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے فردوس کے باغات کی مہمانی ہوگیo وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے وہاں سے (اپنا ٹھکانا) کبھی بدلنا نہ چاہیں گےo

اہل فردوس کی صفات حسنہ کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں آیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَo الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَo وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَo وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَo وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَo اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَo فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَo وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَo وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَo اُولٰٓئِكَ هُمُ

(۱) الکہف: ۱۸: ۱۰۷-۱۰۸

الْوٰرِثُوْنَo الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَo[1]

بے شک ایمان والے مراد پا گئےo جو لوگ اپنی نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیںo اور جو بیہودہ باتوں سے (ہر وقت) کنارہ کش رہتے ہیںo اور جو (ہمیشہ) زکوٰۃ ادا (کر کے اپنی جان و مال کو پاک) کرتے رہتے ہیںo اور جو (دائماً) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے رہتے ہیںo سوائے اپنی بیویوں کے یا ان باندیوں کے جو ان کے ہاتھوں کی مملوک ہیں، بے شک (احکامِ شریعت کے مطابق ان کے پاس جانے سے) ان پر کوئی ملامت نہیںo پھر جو شخص ان (حلال عورتوں) کے سوا کسی اور کا خواہش مند ہوا تو ایسے لوگ ہی حد سے تجاوز کرنے والے (سرکش) ہیںo اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیںo اور جو اپنی نمازوں کی (مداومت کے ساتھ) حفاظت کرنے والے ہیںo یہی لوگ (جنت کے) وارث ہیںo یہ لوگ جنت کے سب سے اعلیٰ باغات (جہاں تمام نعمتوں، راحتوں اور قربِ الٰہی کی لذتوں کی کثرت ہو گی ان) کی وراثت (بھی) پائیں گے، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گےo

(iv) جنت القربۃ

یہ سب جنتوں سے بلند عالمِ لاہوت کی منزل ہے جو نفس کو سفرِ حقیقت مکمل کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔ یہ صرف مقربین یعنی اَہلِ قربت کو عطا ہوتی ہے۔ عابدین و زاہدین دنیا سے جنت کی طرف سفر کرتے ہیں اور عارفین و عاشقین جنت سے قربت کی طرف سفر کرتے ہیں۔

اس منزل کا اشارہ ان آیاتِ قرآنی میں ہے:

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍo عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَo[2]

---

(۱) المؤمنون، ۲۳:۱-۱۱

(۲) المطففین، ۸۳:۲۷-۲۸

اور اس (شراب) میں آبِ تسنیم کی آمیزش ہو گیo (یہ تسنیم) ایک چشمہ ہے جہاں سے صرف اہلِ قربت پیتے ہیںo

یہ تو پینے والے ہی بہتر جانتے ہیں کہ یہ 'چشمہ قربت' ہے یا 'چشم محبت' اور اس کا پینا جام سے ہوتا ہے یا نظروں سے کیونکہ یہ 'لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ' کا مقام ہے۔ اور یہاں تک پہنچنے والے تو نعماتِ جنت میں سے کسی چیز کے بھی طالب نہیں ہوتے، صرف دیدارِ یار کے اور بار بار اسی جلوۂ زیبا کے مشتاق ہوتے ہیں۔ سو انہیں ہر بار ان کی طلب عطا کی جاتی رہے گی۔

ارشاد ربانی کے مطابق عالم آخرت میں لوگوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا جائے گا:

پہلا طبقہ:

اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ[1] (اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ)[2]

یہ جنتی لوگ ہوں گے جو اپنے حسب حال و اعمال جنت کے مختلف درجات میں جائیں گے۔ کوئی جنت الماویٰ میں، کوئی جنت النعیم میں اور کوئی جنت الفردوس میں۔

دوسرا طبقہ:

اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ[3] (اَصْحٰبُ الشِّمَالِ)[4]

یہ اپنے اپنے حسب حال و اعمال دوزخ کے مختلف درجات میں جائیں گے۔

تیسرا طبقہ:

السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ[5] اور الْمُقَرَّبُوْنَ[6]

(۱) الواقعة، ۵۶:۸
(۲) الواقعة، ۵۶:۲۷
(۳) الواقعة، ۵۶:۹
(۴) الواقعة، ۵۶:۴۱
(۵) الواقعة، ۵۶:۱۰
(۶) الواقعة، ۵۶:۱۱

یہ اہل قربت ہوں گے جو جنت کے مذکورہ بالا درجات بھی پائیں گے مگر ان سب درجات سے بلند و بالا خاص مقام قربت سے نوازے جائیں گے۔ یہ ان کا 'مقامِ راحت' ہوگا۔ گویا جنت النعیم اور جنت الفردوس ان کی قیام گاہ ہوگی اور 'مقام قربت' ان کی آرام گاہ۔ جنت ان کا محل ہوگا اور قربت ان کی سیرگاہ ہوگی۔ باغِ جنت میں رہا کریں گے اور باغِ قربت میں پھرا کریں گے۔ کھانا جنت سے کھائیں گے اور مے خانۂ قربت سے بھر بھر کے جام پئیں گے۔ کیونکہ عام جنت میں حسنِ محجوب حجاب میں ہوگا اور خاص قربت میں بے حجاب۔ اِس لیے اہل قربت کے لئے تین نعمتوں کا ذکر ہے:

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ○ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ○[1]

پھر اگر وہ (وفات پانے والا) مقرّبین میں سے تھا○ تو (اس کے لیے) سرور و فرحت اور روحانی رزق و استراحت اور نعمتوں بھری جنت ہے○

اَہلِ قربت کو رَوح، رَیحان اور جنتِ نعیم تین نعمتیں بیک وقت عطا ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ کے الفاظ میں اسی آخری مقام یعنی 'منزلِ قربت و راحت' کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

نفسِ کاملہ صافیہ کی صفات

نفسِ کاملہ کا ذکر کرتے ہوئے جنت کی اقسام بیان کر چکنے کے بعد اب اس نفس کی صفات کا ذکر کریں گے کہ اس نفس کی صفات میں گوشہ نشینی، خلوت و عزلت، عبادت، مفارقت عن الغیر، خاموشی (صمت وسکوت)، سچائی، مددگاری، ایفائے عہد، طاعت و فرمانبرداری، حق اور نسبتِ عہدیت اور نسبتِ محمدیت دونوں میں کمال درجہ پایا جانا ہے۔

۳۔ نفس کی صفات کیسے تبدیل ہوتی ہیں؟

نفس کی صفات کی تبدیلی کی مثال شیشے سے بھی لی جا سکتی ہے۔ مٹی اس کا بنیادی عنصر

(۱) الواقعہ، ۵۶:۸۸-۸۹

ہوتا ہے۔ مٹی سے کثافت نکال کر اس کا تزکیہ اور صفائی کی جاتی ہے۔ اُس مٹی کو اجلا کر کے چمکایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ شیشے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب کہاں وہ مٹی کہ اگر آنکھوں کے سامنے آجائے تو نظر آنا بند ہو جائے اور کہاں شیشے (glasses) کی یہ شکل کہ اس کے ذریعے سے پہلے جو کم نظر آتا تھا وہ بھی بہتر اور واضح طور پر نظر آنے لگ گیا۔ دراصل اس کی اصل حالت میں کثافت غالب تھی جس کی وجہ سے جو نظر آتا تھا وہ بھی بند ہو گیا تھا۔ اب آلائش سے پاک ایک خالص شکل میں جب شیشہ بن گیا تو اب اس پر لطافت غالب آ گئی۔

اس کی دوسری مثال چینی کے برتنوں کی ہے۔ یہ برتن بھی بنیادی طور پر مٹی ہی کے بنے ہوتے ہیں، لیکن جب یہ فرانس کے ڈنر سیٹ یا ٹی سیٹ ہوتے ہیں تو ان پر نظر بھی نہیں ٹھہرتی۔ حالانکہ بنیادی طور پر یہ وہی مٹی ہے جو اگر کھانے پر پڑ جائے تو مرغوب کھانا بھی ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ یہ سارا معاملہ تزکیہ و تصفیہ کا ہے۔

یہی معاملہ سونا، تیل اور دیگر معدنیات کا ہے کہ مٹی میں سے نکلنے کے بعد تطہیری عمل کے بعد یہ معدنیات خالص ہوتی ہیں۔ جن ممالک میں معدنی تیل پایا جاتا ہے، وہاں آئل ریفائنریز لگی ہوتی ہیں۔ قابلِ غور بات ہے کہ یہ refinery کیا ہے؟ یہی تو تزکیہ اور مجاہدہ ہے۔ ہم صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں، اس پر گرد وغیرہ پڑتے پڑتے وہ میلا ہو جائے گا اور اُسے پہننے کو جی نہیں چاہے گا۔ پھر اسے دھوتے یا dry clean کراتے ہیں۔ یہ dry cleaning بھی تزکیہ اور تصفیہ کا عمل ہے۔

یہ تمام مثالیں یہ ثابت کرنے کے لیے دی ہیں کہ سارا معاملہ تزکیہ اور تصفیہ کا ہے۔ نفسِ امّارہ سے لے کر نفسِ مطمئنہ، راضیہ، مرضیہ اور کاملہ تک جانا سارا یہی عمل ہے۔ جب مٹی اٹھائی تو کیچڑ بنایا، پھر وہاں سے شروع کیا تو clay بنی اور وہ clay بناتے بناتے برتن بنے اور پھر وہ کھانے کے میز پر جا کر ڈنر سیٹ بن کر چمکا۔ جب اصل مٹی تھی تو وہ حقیر اور بے وقعت تھی، اب اُسی مٹی پر ہزار ہا روپے خرچ کر کے گھر لایا جا رہا ہے۔ اُس مٹی کی حالت میں ایک ذرہ بھی اپنے کھانے میں ڈالنے کو تیار نہیں تھے، مگر اب اِسی مٹی کی بنی ہوئی پلیٹ میں سالن ڈال

کر فخریہ انداز سے کھا رہے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اُس کی اصلیت تو وہی ہے مگر یہ تزکیہ اور تصفیہ کا عمل ہے، جس کے باعث وہ چیز اس مقام پر جا پہنچی کہ اس کی ماہیت ہی تبدیل ہوگئی۔ یہی فرق عام انسانوں، اللہ کے نبیوں اور ولیوں کا ہوتا ہے۔ پتھروں میں بھی یہی چیز دکھائی دیتی ہے۔ عام پتھر سڑکوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ لوگ انہیں سر راہ چلتے ہوئے ٹھوکر لگا کر گزر جاتے ہیں۔ لیکن کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جو عقیق، مرجان، یاقوت اور زمرد کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انہیں مہنگے داموں خرید کر انگوٹھیوں میں نگینے کے طور پر جڑوایا جاتا ہے۔ اگر اس سے مزید آگے بڑھیں تو ہیرا بھی پتھر ہی ہے، جو انتہائی بیش قیمت ہے۔ انہی مثالوں سے اطلاق کریں تو پتھر نفسِ امّارہ ہے اور ہیرا نفسِ مطمئنہ، نفس راضیہ، مرضیہ اور کاملہ کی مثال ہے۔

نسبت بدلنے سے تقدس میں بھی فرق آتا ہے۔ سڑکوں پر لگے ہوئے بھی پتھر ہیں اور جس سے حرمِ کعبہ اور حرمِ نبوی تعمیر ہوا ہے وہ بھی پتھر ہی ہیں؛ مگر نسبت کے ساتھ ان کا درجہ بھی تبدیل ہوگیا۔ اصل بات یہ ہے کہ تصفیہ اور تزکیہ سے چیزوں کی حالت، ماہیت اور کیفیت بدل جاتی ہے۔ بندے کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ کس چیز سے بنی ہوئی ہے۔ نفسِ امّارہ سے لے کر نفسِ مطمئنہ تک اور مطمئنہ سے آگے راضیہ، مرضیہ اور کاملہ تک اتنی تبدیلی اور انقلاب بپا ہو چکا ہوتا ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ وہی نفس ہے جو کل تک نفسِ امّارہ تھا۔ قدرت کے نظام کی ہر شے میں یہی قانون رائج ہے۔

۴۔ اَحوال کا بدلنا: ایک مثال سے وضاحت

نفس کی صفات کے ساتھ ساتھ بندے کے احوال بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ احوال کے بدلنے کی بڑی دل چسپ مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح چار موسم بنائے ہیں اور ہر موسم کی اپنی تاثیر رکھی ہے، اسی طرح ہر نفس کی بھی اپنی تاثیر ہے۔

نفسِ امّارہ: اس کی مثال مئی سے شروع ہو کر ستمبر تک کے گرمی کے موسم کی ہے۔

نفسِ امّارہ شدید گرمیوں کا موسم ہے۔ شدت کے لحاظ سے ایسے لگتا ہے کہ جیسے یہ آگ سے بنا ہوا ہے۔

نفسِ لوّامہ: جب گرمیاں ختم ہوتی ہیں تو اکتوبر اور نومبر کے درمیان پت جھڑ کا موسم آتا ہے، جسے ہم خزاں کہتے ہیں۔ نفسِ لوّامہ خزاں کا موسم ہے۔

نفسِ ملہمہ: خزاں کے بعد سردیوں کا موسم آتا ہے جس میں ٹھنڈک بڑھتی ہے۔ نفسِ ملہمہ ٹھنڈک اور سردیوں کا موسم ہے۔

نفسِ مطمئنہ: سردیاں ختم ہوتی ہیں تو مارچ، اپریل میں بہار کا موسم آجاتا ہے۔ نفسِ مطمئنہ بہار کا موسم ہے۔ اس موسم میں نئے پتے نکلتے ہیں، پھول کھلتے ہیں اور ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دکھائی دیتی ہے۔

اب جیسے ہر موسم کی اپنی اپنی تاثیرات اور کیفیات ہیں، عین اسی طرح نفسِ امّارہ انسان کے من میں گرمیوں کا موسم ہے۔ نفسِ لوّامہ انسان کے اندر پت جھڑ کا زمانہ ہے۔ نفسِ ملہمہ انسان کے من کی زندگی میں سردیوں کا اور نفسِ مطمئنہ انسان کے اندر میں بہار کا موسم ہے۔

۵۔ لطائفِ روحانیہ کیا ہیں؟

جب نفسِ مطمئنہ قلب کا مقام سنبھالتا ہے تو پھر اس میں مختلف روحانی دروازے کھل جاتے ہیں، جنہیں تصوف کی اصطلاح میں لطائف کہتے ہیں۔ ان لطائف کی درج ذیل اقسام ہیں:

۱۔ لطیفۂ نفسیّہ (لطیفۂ نفس)

۲۔ لطیفۂ قلبیّہ (لطیفۂ قلب)

۳۔ لطیفۂ روحیّہ (لطیفۂ روح)

۴۔ لطیفۂ سرّیّہ (لطیفۂ سِر)

۵۔ لطیفۂ خفیّہ (لطیفۂ خفی)

۶۔ لطیفۂ اخفیّہ (لطیفۂ اَخفی)

۷۔ لطیفۂ عقلیّہ (لطیفۂ عقلی)

کئی عرفاء لطیفۂ عقلیہ کو شمار کرتے ہوئے لطائفِ سبعہ کہتے ہیں۔ کئی لطائفِ خمسہ کہتے ہیں اور لطیفۂ عقل اور لطیفۂ نفس کو شامل نہیں کرتے۔ اگر لطیفۂ نفس کو شامل کر لیں تو لطائفِ ستہ کہتے ہیں۔ ہر جوہر کی اپنی حقیقت اور دائرہ کار ہے، تقسیم جیسے مرضی کر لیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آیئے! ان لطائف پر اختصار سے روشنی ڈالتے ہیں:

(۱) لطیفۂ نفس

جب تک نفسِ امّارہ ہوتا ہے اور لطیفہ نہیں بنا ہوتا، اس کے اندر عالمِ ناسوت (مادّی دنیا) کا مزاج ہوتا ہے۔ جب وہ تزکیہ، تصفیہ، تجلیہ کے ذریعے صفائی اور اُجلے پن کا حامل ہو اور غلاظت و کثافت سے پاک ہو کر ترقی کر کے لطیفۂ نفسیہ بن جائے تو اسے عالمِ ملکوت (آسمانی دنیا جہاں فرشتے رہتے ہیں) کا فیض ملنے لگ جاتا ہے۔

(۲) لطیفۂ قلب

اس مرحلے پر وہ ترقی کر کے کثافتوں اور غلاظتوں سے مزکی (purify) ہو کر عالمِ ملکوت سے مل جاتا ہے۔ اسے وہاں سے فیض ملتا ہے اور اس مقام پر عالم عرش کی نیکیاں، خصائل اور انوار لطیفۂ قلب کو مزید مزین کرتے ہیں۔ روایات میں آیا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان اقدس ہے:

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللهِ.[1]

---

(۱) ۱۔ ابن عربی، التفسیر، ۱:۲۵۱؛ ۲:۲۶۲

۲۔ ملا علی القاری، مرقاۃ المفاتیح، ۱:۱۲۰

قلبِ مومن عرشِ الٰہی کی مانند ہو جاتا ہے (یعنی اس پر انوارِ الٰہیہ کا نزول ہوتا ہے)۔

نفس نے جب قلب کی جگہ لے لی تو نفس، قلب میں بدل گیا اور قلب، روح میں تبدیل ہوگیا۔ اب اسے عالمِ جبروت کا فیض ملتا ہے۔ اسے مثالی دنیا میں عالمِ عرش کا فیض کہتے ہیں کیونکہ عرش کا فیض اس سے جڑ جاتا ہے۔

(۳) لطیفۂ روح

جب لطیفۂ قلب ترقی کر کے لطیفۂ روح کے مقام پر پہنچتا ہے تو بندے پر کرسی کے فیض والا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس کا ذکر آیت الکرسی میں یوں کیا گیا ہے:

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ.[1]

اس کی کرسی (سلطنت و قدرت) تمام آسمانوں اور زمین پر محیط ہے۔

صوفیاء کے ہاں عالمِ مثال یعنی مثالی زبان میں اسے استعارتاً کرسی کا فیض کہتے ہیں اور یہ عالمِ لاہوت ہے۔

(۴) لطیفۂ سِر

بندے پر جب لطیفۂ سِر کھلتا ہے تو وہ لوح کے فیض کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے یعنی بندے کو لوح کے فیض کو حاصل کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ لوح مرتبۂ علم ہے۔

(۵) لطیفۂ خفی

لطیفۂ سر پر مزید ترقی کرتے ہوئے جب لطیفۂ خفی کھلتا ہے تو قلم کا فیض ملتا ہے۔ قلم علمِ الٰہی کا مرتبہ ہے۔ یہاں اُس میں قلم کا فیض لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

---

(۱) البقرۃ، ۲:۲۵۵

(۶) لطیفۂ اخفیہ

لطیفۂ اخفیہ کو دوسری زبان میں لطیفہ اَخفیٰ کہتے ہیں جو صوفیا کے ہاں تصوف کی جدید اصطلاح ہے۔ جب یہ لطیفہ کھل جاتا ہے تو وہ جملہ تجلیات الٰہیہ کا فیض لینے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس کی طبیعت میں مکمل اعتدال آ جاتا ہے۔ کوئی بھی دوسری چیز اس پر غالب نہیں رہتی۔ لطیفۂ اَخفیٰ کے حامل پر اس کے احوال اور اعمال کے مطابق مراتب کھلتے چلے جاتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ.[1]

ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لیے (مخصوص) ہیں اور پلید مرد پلید عورتوں کے لیے ہیں، اور (اسی طرح) پاک و طیب عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے (مخصوص) ہیں اور پاک و طیب مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے ہیں (سو تم رسول اللہ ﷺ کی پاکیزگی و طہارت کو دیکھ کر خود سوچ لیتے کہ اللہ نے ان کے لیے زوجہ بھی کس قدر پاکیزہ و طیب بنائی ہوگی)۔

یعنی پاک لوگوں کے لیے پاک خصائل و انعامات آ جاتے ہیں۔ اس لطیفہ کے حامل جتنے طیب اور پاکیزہ ہوتے چلے جاتے ہیں اتنی ہی ان کی صفات و کیفیات پاک سے پاک تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اُس مقام میں بندہ جو بھی عمل کرتا ہے اُس کا اثر اسے مزید آگے پہنچاتا ہے۔ اس لئے فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ○[2]

تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا○ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی

---

(۱) النور، ۲۴: ۲۶

(۲) الزلزال، ۹۹: ۷-۸

ہوگی وہ اسے (بھی) دیکھ لے گاo

۶۔ حسبِ حال تجلیاتِ الٰہیہ کا ظہور

اللہ تعالیٰ کی تجلیات ہر ایک پر اس کے حسبِ حال ہوتی ہیں۔ وہ جہنم میں رہنے والے جہنمیوں پر بھی تجلّی فرمائے گا، مگر وہ تجلّی اُس کے 'ھُوَ' کی شان کی ہوگی۔ ھُوَ اسمِ اشارہ بعید ہے اور اس میں بُعد یعنی دوری ہوگی۔ وہاں بُعد سے مراد ہے: 'دور رہو میری رحمت سے'، 'تم محروم ہو'۔

قرآن مجید نے فرمایا ہے:

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى.[1]

وہی اللہ ہے جو پیدا فرمانے والا ہے، عدم سے وجود میں لانے والا (یعنی ایجاد فرمانے والا) ہے، صورت عطا فرمانے والا ہے۔ (الغرض) سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اُن پر ھُوَ کی تجلّی فرمائے گا، مگر چونکہ وہ اللہ کی تجلّی کے اہل نہیں تھے، ان کے اندر اُسے قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد نہیں تھی، لہٰذا:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَo[2]

حق یہ ہے کہ بے شک اس دن انہیں اپنے رب کے دیدار سے (محروم کرنے کے لیے) پسِ پردہ کر دیا جائے گاo

دوزخیوں پر بھی ھُوَ کی شان کی تجلّی ہوگی، مگر اُن پر حجاب آ جائے گا۔ وہ ھُوَ کی تجلّی بھی دیکھ نہیں سکیں گے اور نہ ہی ھُوِیَّتْ کی تجلّی سہہ سکیں گے۔

---

(۱) الحشر، ۵۹: ۲۴

(۲) المطففین، ۸۳: ۱۵

اس کے برعکس جو جنت میں ہوں گے ان پر اللہ تبارک و تعالیٰ اِنّیّت کی تجلی فرمائے گا۔ اس میں شانِ قرب کا اشارہ ہے۔ قرآن مجید کے اس فرمان میں اس عظیم شانِ قرب کا اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ جنتیوں کو ارشاد فرمائے گا:

اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ.(۱)

بے شک میں ہی اللہ ہوں۔

یہ فرما کر ان کے پردے ہٹا دیے جائیں گے اور اِس تجلی سے اکتساب کرنے والوں کی حالت یہ ہوگی:

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌo اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌo(۲)

بہت سے چہرے اُس دن شگفتہ و تروتازہ ہوں گےo اور (بلا حجاب) اپنے رب (کے حسن و جمال) کو تک رہے ہوں گےo

اُس دن ان کے چہروں پر تجلّی اِنّیّتِ الٰہی سے رونق آئے گی اور وہ اپنے رب کے چہرے کو تک رہے ہوں گے۔ اِس میں قرب ہے اور عنایت ہے۔ جو شخص جیسے عمل کرتا ہے ویسے ہی اس کے اندر اُس عمل کی تاثیر آتی ہے اور وہ تاثیر اسے ایک خاص مقام یا ایک حالت تک پہنچاتی ہے۔ یہ ظاہری اعمال کی طرح باطنی اعمال کا ایک عمل (process) ہے جو متواتر چلتا رہتا ہے۔

۷۔ اِلہام پر قرآنی دلائل

الہام کے متعلق ان ضروری معلومات اور مراتبِ نفس کی حقیقت کو جاننے کے بعد آیئے اب قرآن مجید سے 'اِلہام' پر مزید دلائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کے علاوہ غیر انبیاء کے لئے الہام ایک ایسا ذریعۂ علم ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے

(۱) القصص، ۲۸:۳۰

(۲) القیامۃ، ۷۵:۲۲-۲۳

میں قرآن مجید کی نصِ صریح ہے اور اس کا ہم گزشتہ صفحات پر تفصیلی مطالعہ کر آئے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا○[1]

اور انسانی جان کی قَسم اور اسے ہمہ پہلو توازن و درستگی دینے والے کی قَسم○ پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دی○

(۱) حضرت مریم علیہا السلام کے واقعہ سے اِلہام پر اِستدلال

قرآن مجید میں حضرت مریم علیہا السلام کے بیان شدہ واقعہ کے حوالے سے بھی الہام پر استدلال موجود ہے کہ فرشتوں کا غیر نبی کو بھی نبی کی طرح ندا دینا اور انہیں پکارنا قرآن مجید سے ثابت ہے۔

سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

هُنَالِکَ دَعَا زَکَرِيَّا رَبَّهٗ ج قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْکَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ج اِنَّکَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ○[2]

اسی جگہ زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی، عرض کیا: میرے مولا! مجھے اپنی جناب سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو ہی دعا کا سننے والا ہے○

اس سے قبل کی آیات مبارکہ میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے پاس عبادت گاہ میں داخل ہوتے تو وہ ان کے پاس بے موسمی پھل موجود پاتے۔ انہوں نے پوچھا: اے مریم! تمہارے پاس یہ چیزیں کہاں سے آتی ہیں؟ جواب دیا: میرے پاس یہ چیزیں اللہ کی طرف سے آتی ہیں۔ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

(۱) الشمس، ۹۱: ۷-۸

(۲) آل عمران، ۳: ۳۸

حضرت مریم ؑ حضرت زکریا ؑ کے زیر تربیت تھیں اور وہی ان کے کفیل تھے۔ جس حجرہ میں حضرت مریم ؑ مقیم تھیں، اس کا دروازہ اکثر مقفل رہتا تھا۔ حضرت زکریا ؑ نے قدرت کی طرف سے پردۂ غیب سے عطا کئے گئے پھل دیکھ کر وہیں کھڑے ہوکر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو التجا کی اس کا ذکر مذکورہ بالا آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی عمر مبارک نوے (۹۰) سال ہو چکی تھی اور وہ ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاد کے منتظر تھے۔ حضرت مریم ؑ کے پاس بے موسم پھل دیکھ کر سوچا کہ میرے لیے اولاد کا کوئی موسم یعنی موقع تو نہیں لیکن اگر حضرت مریم ؑ کو بے موسم پھل مل سکتے ہیں تو مجھے بھی بڑھاپے میں اولاد کی نعمت عطا ہو جائے تو کچھ عجب نہیں۔

معلوم ہوا کہ صالحین، مقربین اور اہل اللہ کی عبادت گاہوں اور ان کی قیام گاہوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و تجلیات نازل ہوتی ہیں۔ وہاں جا کر خالقِ دو جہاں سے دعا کرنا اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی سنت ہے۔ حالانکہ زکریا ؑ کا درجہ حضرت سیدہ مریم ؑ سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ حضرت زکریا ؑ نبی ہیں مگر حضرت مریم ؑ ولیہ ہیں۔ نبی عمل کرے تو اسے نبی کی سنت کہتے ہیں اور اُس کا شریعت میں درجہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اس عمل کو سنت بنانا تھا اس لیے اللہ کے نبی سے اپنے ولی کی جگہ پر دعا کروائی۔

ابھی وہ حجرے میں کھڑے نماز پڑھ ہی رہے تھے (یا دعا کر رہے تھے) کہ انہیں فرشتوں نے آواز دی، جس کا ذکر قرآن حکیم نے یوں فرمایا ہے:

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ لا اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا ۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا. (۱)

ابھی وہ حجرے میں کھڑے نماز ہی پڑھ رہے تھے (یا دعا ہی کر رہے تھے) کہ انہیں فرشتوں نے آواز دی: بے شک اللہ آپ کو (فرزند) یحییٰ (ؑ) کی بشارت دیتا ہے جو کلمۃ اللہ (یعنی عیسیٰ ؑ) کی تصدیق کرنے والا ہوگا اور سردار ہوگا۔

(۱) آل عمران، ۳: ۳۹

مذکورہ بالا آیت کریمہ میں فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کے امر سے اللہ کے نبی کو ندا دینا وحیِ نبوت ہے یعنی یہ وحی کا درجہ ہے۔ علم کا یہ ذریعہ (source) انبیاء علیہم السلام تک محدود ہے، مگر فرشتوں نے غیر نبی کو بھی ندا دی ہے۔

آیئے چند آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ سورہ آل عمران میں ہی فرمایا گیا:

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ○[1]

اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ نے تمہیں منتخب کر لیا ہے اور تمہیں پاکیزگی عطا کی ہے اور تمہیں آج سارے جہان کی عورتوں پر برگزیدہ کر دیا ہے○

یہاں فرشتوں نے اُسی طرح سے حضرت مریم علیہا السلام کو پکارا، جس طرح حضرت زکریا علیہ السلام کو پکارا تھا۔ اسے وحیِ نبوت نہیں کہہ سکتے کیونکہ حضرت مریم علیہا السلام نبی نہیں ہیں۔

قابلِ غور بات ہے کہ انہیں بھی فرشتوں نے پکارا اور اللہ کا پیغام دیا مگر یہ وحی نہیں بلکہ الہام ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ غیر نبی سے بھی ملائکہ خطاب کرتے ہیں۔

جب عالمِ پست کی عالمِ بالا کے ساتھ نسبت جُڑ جاتی ہے تو نیچے اور اوپر دونوں فضائیں ایک ہی ماحول میں سما جاتی ہیں۔ نفس اور قلب کی فضا اور عالم ملکوت و جبروت کی فضا ایک جیسی ہو جاتی ہے۔ جیسے انوار و تجلیات الٰہیہ کا نزول اوپر ہو رہا ہوتا ہے ویسے ہی قلب اور روح پر بھی ہونے لگتا ہے۔ جب یہ مناسبت اور مماثلت نصیب ہوتی ہے تو عالمِ پست کو الہام وصول کرنے کی صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے، جو کہ پہلے نہیں تھی۔ ایسے میں ملائکہ القا اور الہام کرتے ہیں کیونکہ اب وہ کسی غیر سے کلام نہیں کر رہے ہوتے۔

۲۔ سورۂ آل عمران میں ہی فرمایا گیا:

---

(۱) آل عمران، ۳: ۴۲

يٰـمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ○[1]

اے مریم! تم اپنے رب کی بڑی عاجزی سے بندگی بجا لاتی رہو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کیا کرو○

کیا حضرت مریم ﷺ کو یہ فرمان وحیِ نبوت ہے؟ نہیں! مگر کلام اسی طرز کا ہے۔ اصل میں یہ ملائکہ کی طرف سے الہام ہے۔

۳۔ پھر فرمایا:

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰـمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ○[2]

جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تمہیں اپنے پاس سے ایک کلمہ (خاص) کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم (ﷺ) ہوگا وہ دنیا اور آخرت (دونوں) میں قدر و منزلت والا ہوگا اور اللہ کے خاص قربت یافتہ بندوں میں سے ہوگا○

یہاں بھی ملائکہ نے حضرت مریم ﷺ کو خطاب کیا ہے اور اس سے قبل اسی سورہ کی آیت نمبر ۳۹ میں ملائکہ نے حضرت زکریا ﷺ کو خطاب کیا تھا۔

ملاحظہ کریں کہ حضرت زکریا ﷺ اور حضرت مریم ﷺ دونوں شخصیات کو ایک ہی طرح کے کلمات بشارت کیے گئے مگر حضرت زکریا ﷺ کی بشارت وحی نبوت تھی جبکہ حضرت مریم ﷺ کی بشارت بشکل الہام عطا کی گئی۔

۴۔ فرشتوں کے اس پیغام پر حضرت مریم ﷺ نے کہا:

رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ.[3]

(۱) آل عمران، ۳: ۴۳
(۲) آل عمران، ۳: ۴۵
(۳) آل عمران، ۳: ۴۷

اے میرے رب! میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا درآنحالیکہ مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔

یہاں الہام کی اقسام میں سے 'خاطرِ قلبی' کا ذکر ہو رہا ہے۔ قلب کے اوپر خاطرِ ربانی اور خاطرِ ملکی دونوں ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم ﷺ کو جواب دیا:

كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ○ وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ○[1]

اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے۔ جب کسی کام (کے کرنے) کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس سے فقط اتنا فرماتا ہے کہ 'ہو جا' وہ ہو جاتا ہے○ اور اللہ اسے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل (سب کچھ) سکھائے گا○

یہ سارا کلام جو اس مقام پر آیا ہے، الہام ہے۔

۵۔ اس سے قبل کی آیات میں اس طرح فرمایا گیا:

فَنَادٰهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا○[2]

پھر ان کے نیچے کی جانب سے (جبرائیل نے یا خود عیسیٰ ﷺ نے) انہیں آواز دی کہ تو رنجیدہ نہ ہو بے شک تمہارے رب نے تمہارے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے (یا تمہارے نیچے ایک عظیم المرتبہ انسان کو پیدا کر کے لٹا دیا ہے)○

۶۔ پھر فرمایا گیا:

وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ○ فَكُلِىْ

---

(۱) آل عمران، ۳: ۴۷-۴۸

(۲) مریم، ۱۹: ۲۴

وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ عَیْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ○[1]

اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ وہ تم پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گرا دے گا ○ سو تم کھاؤ اور پیو اور (اپنے حسین و جمیل فرزند کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی کرو، پھر اگر تم کسی بھی انسان کو دیکھو تو (اشارے سے) کہہ دینا کہ میں نے (خدائے) رحمٰن کے لیے (خاموشی کے) روزہ کی نذر مانی ہوئی ہے سو میں آج کسی انسان سے قطعاً گفتگو نہیں کروں گی ○

اللہ تعالیٰ یہ سارے کلمات حضرت مریم ﷺ سے ارشاد فرما رہا ہے۔ یہ مخاطبہ حق ہے یا بذریعہ ملائکہ اِلہامِ قلبی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نفسِ مطمئنہ قلب ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ وحیِ نبوت ہرگز نہیں ہے۔

قرآن مجید کی ایسی تمام آیات کریمہ واضح کر رہی ہیں کہ اولیاء اللہ کے قلوب پر علمِ مخاطبات اور الہامات کا نزول ہوتا ہے۔ اگر مذکورہ بالا آیات کو وحی تصور کر لیا پھر تو معاذ اللہ ان کا نبی ہونا بھی تسلیم کرنا پڑے گا اور انکار کرنے والے کافر ہو جائیں گے، حالانکہ درحقیقت وہ تو ولیہ تھیں۔ لہٰذا جب یہ مخاطبہ خاتم الانبیاء ﷺ سے پہلے کی امتوں میں موجود رہا تو آقائے دو جہاں ﷺ کی امت میں بطریقِ اولیٰ ہے۔

(۲) حضرت موسٰی علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کے واقعہ سے اِلہام پر اِستدلال

سورۃ القصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کے باب میں بھی یہی فرمایا گیا ہے:

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَلَا

(۱) مریم، ۱۹: ۲۵-۲۶

تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ○[1]

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تم انہیں دودھ پلاتی رہو پھر جب تمہیں ان پر (قتل کر دیے جانے کا) اندیشہ ہو جائے تو انہیں دریا میں ڈال دینا اور نہ تم (اس صورتحال سے) خوفزدہ ہونا اور نہ رنجیدہ ہونا بے شک ہم انہیں تمہاری طرف واپس لوٹانے والے ہیں اور انہیں رسولوں میں (شامل) کرنے والے ہیں○

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بھی نبی نہیں بلکہ اللہ کی ولیہ ہیں۔ مگر قرآن بیان کرتا ہے کہ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی۔ محض خیالات ہمارے دلوں میں بھی بہت سارے آتے ہیں۔ کیا خیال آنے سے کوئی ہوش مند انسان اپنے بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں پھینک سکتا ہے؟ یاد رہے کہ یہ خیال نہیں تھا۔ اسے خیال کہنا تو معاذ اللہ قرآن کی بات پر بہت بڑی جسارت ہے۔ اصل میں یہ الہام ہے جو مالکِ کون و مکاں اپنے اولیاء کو کرتا ہے۔ اسی الہام کے باعث حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اتنی استقامت، یقین اور معرفت نصیب ہوئی جس کے نتیجے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دیا۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کہ ساتھ میں انہیں یہ فرمایا گیا تھا کہ 'تم (اس صورتحال سے) خوفزدہ ہونا اور نہ رنجیدہ ہونا، بے شک ہم انہیں تمہاری طرف واپس لوٹانے والے ہیں اور انہیں رسولوں میں (شامل) کرنے والے ہیں'۔ چنانچہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے محل سے آپ کی والدہ کی طرف لوٹا دیا گیا۔ دریا میں پھینکنے سے پہلے کے واقعات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بتا دیے گئے تھے۔ یہ الہامِ ولایت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں گزرنے والے صدمے کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے بیان کیا ہے:

وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فٰرِغًا ؕ اِنْ کَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِهَا لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ○[2]

(۱) القصص، ۲۸: ۷

(۲) القصص، ۲۸: ۱۰

اور موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا دل (صبر سے) خالی ہوگیا، قریب تھا کہ وہ (اپنی بے قراری کے باعث) اس راز کو ظاہر کردیتیں اگر ہم ان کے دل پر صبر وسکون کی قوّت نہ اتارتے تاکہ وہ (وعدۂ الٰہی پر) یقین رکھنے والوں میں سے رہیں○

یعنی اللہ کا انعام اور کلام سن کر انہیں جو فہم و بصیرت اور معرفت حاصل ہوئی تھی، اس کے باعث وہ بے قرار نہیں ہوئی تھیں۔

(۳) اُمتِ محمدیہ اور اِلہام

قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ○[1]

بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ (اِس پر مضبوطی سے) قائم ہوگئے، تو اُن پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم خوف نہ کرو اور نہ غم کرو اور تم جنت کی خوشیاں مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا○

اس آیت کریمہ میں جن خوشیوں اور قلبی اطمینان کا ذکر کیا ہے، یہ فرشتوں کے الہام کے باعث ہوتا ہے۔ یہاں حضور نبی اکرم ﷺ کی اُمت کی بات کر رہے ہیں کہ فرشتے ان پر اترتے ہیں اور وہ القاء اور الہام کرتے ہوئے کہتے ہیں: خوف زدہ نہ ہونا، غم نہ کھانا اور تمہیں مبارک ہو! فرشتے خوشخبریاں دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہیں وہ کچھ ملے گا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے:

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ○[2]

(۱) فصلت، ۴۱: ۳۰

(۲) فصلت، ۴۱: ۳۱

ہم دنیا کی زندگی میں (بھی) تمہارے دوست اور مدد گار ہیں اور آخرت میں (بھی)، اور تمہارے لیے وہاں ہر وہ نعمت ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے وہاں وہ تمام چیزیں (حاضر) ہیں جو تم طلب کرو○

قرآن حکیم میں بیان کیا گیا یہ سارا کلام وہ ہے جو ملائکہ اَہلِ ایمان، مومنین، اولیاء اور صالحین کے دلوں پر کرتے ہیں۔ یہ قطعاً وحیِ نبوت نہیں ہے بلکہ یہ نفس مطمئنہ قلب پر ہونے والا الہام ہے۔ یہ عالم لاہوت سے اترنے والے علومِ غیبیہ اور مکاشفات ہیں جو اللہ تعالیٰ الہام کے ذریعے اپنے اولیاء اور صالحین کو عطا فرماتا ہے۔

باب نمبر 13

اِلہام اور اُس کے مقامات

الہام ایک ایسا علم ہے جو القاء کیا جاتا ہے، جب کہ نفس ایک ایسا محل ہے جہاں الہام نازل ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ وہ الہام نیک بھی ہوسکتا ہے اور بد بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو اچھے اور نیک اِلہامات کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اس کے برعکس برے الہامات اور گم راہ کن خیالات کا القاء شیاطین کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں قوتیں غیر مرئی ہوتی ہیں مگر اپنا وجود رکھتی ہیں۔

۱۔ ملائکہ کا نزول صرف اَنبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ہی مخصوص نہیں

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اُمور کی انجام دہی اور اپنی مخلوق تک پیغام رسانی کے لیے تخلیق فرمایا ہے، لہٰذا ان کا نزول صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ان کا نزول دیگر پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ گزشتہ باب کے آخر میں کچھ واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کے پاس فرشتہ جو پیغام لے کر آتا ہے اُسے وحی کہتے ہیں، جبکہ دیگر کے لیے اسے الہام سے تعبیر کریں گے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ○ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ○[1]

(۱) حم السجدۃ، ۴۱:۳۰-۳۱

بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ (اِس پر مضبوطی سے) قائم ہوگئے، تو اُن پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم خوف نہ کرو اور نہ غم کرو اور تم جنت کی خوشیاں مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا○ ہم دنیا کی زندگی میں (بھی) تمہارے دوست اور مدد گار ہیں اور آخرت میں (بھی)، اور تمہارے لیے وہاں ہر وہ نعمت ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے وہاں وہ تمام چیزیں (حاضر) ہیں جو تم طلب کرو○

ان آیات کریمہ میں ملائکہ کے ذریعہ الہام کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نظریہ متحقق (establish) ہوتا ہے کہ فرشتے صرف اللہ تعالیٰ کے نبی پر ہی نازل نہیں ہوتے، بلکہ غیر نبی پر بھی اترتے ہیں، مگر دونوں ہستیوں پر نازل ہونے کا انداز جُدا جُدا ہوتا ہے۔ نبی پر فرشتہ اللہ تعالیٰ کی وحی لے کر حاضر ہوتے ہیں اور اس وحی میں شک و شبہ اور کسی تاویل و تعبیر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی غلطی اور خطا کا کوئی امکان ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نبی کا قلب معصوم ہوتا ہے، جبکہ اولیاء کے دل اگرچہ محفوظ ہوتے ہیں مگر وہ کلیتًا خطا اور غلطی کے امکان سے خالی نہیں ہوتے، ان سے تعبیر و تاویل اور فہم میں بھی غلطی یا تسامح ہوسکتا ہے۔

یہ خیال کرنا کہ ملائکہ صرف نبی پر ہی اُترتے ہیں، یہ کم علمی اور بے خبری ہے۔ لیلۃ القدر میں تو عام مومنین تک کے لیے فرمایا گیا ہے:

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ○[1]

اس (رات) میں فرشتے اور روح الامین (جبرائیل) اپنے رب کے حکم سے (خیر و برکت کے) ہر امر کے ساتھ اترتے ہیں○

اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت حضور نبی اکرم ﷺ کی اُمت کے عام مومنین کے لیے بھی ہے۔ جیسا کہ احادیث میں وارد ہوتا ہے:

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

(۱) القدر، ۹۷:۴

يَتَعَاقَبُوْنَ فِيْكُمْ مَـلَائِكَةٌ بِاللَّيْلِ، وَمَـلَائِكَةٌ بِالنَّهَارِ، وَيَجْتَمِعُوْنَ فِي صَلَاةِ الْعَصْرِ، وَصَلَاةِ الْفَجْرِ، ثُمَّ يَعْرُجُ الَّذِيْنَ بَاتُوْا فِيْكُمْ، فَيَسْأَلُهُمْ – وَهُوَ أَعْلَمُ بِهِمْ – كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِي؟ فَيَقُوْلُوْنَ: تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ، وَأَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ.(۱)

رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے تمہارے پاس باری باری آتے ہیں اور نمازِ عصر اور نمازِ فجر کے وقت اکٹھے ہوتے ہیں۔ پھر جنہوں نے تمہارے ساتھ رات گزاری تھی وہ آسمان کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے دریافت فرماتا ہے: – حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے – تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ وہ عرض کرتے ہیں: ہم نے اُنہیں نماز پڑھتے چھوڑا اور جب ہم اُن کے پاس گئے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے ایسے بھی ہیں جو کائنات میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور مجالسِ ذکر کو ڈھونڈتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

إِنَّ لِلّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى مَـلَائِكَةً سَيَّارَةً فُضَلَا، يَتَتَبَّعُوْنَ مَجَالِسَ الذِّكْرِ، فَإِذَا وَجَدُوْا مَجْلِسًا فِيْهِ ذِكْرٌ، قَعَدُوْا مَعَهُمْ، وَحَفَّ بَعْضُهُمْ بَعْضًا بِأَجْنِحَتِهِمْ، حَتّٰى يَمْلَئُوْا مَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ السَّمَاءِ الدُّنْيَا. فَإِذَا تَفَرَّقُوْا عَرَجُوْا وَصَعِدُوْا إِلَى السَّمَاءِ.(۲)

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب التوحید، باب کلام الرب مع جبریل ونداء الله الملائکة، ۶: ۲۷۲۱، رقم: ۷۰۴۸

۲۔ مالك، الموطأ، ۱: ۱۷۰، رقم: ۴۱۱

۳۔ نسائي، السنن الکبری، ۱: ۱۷۵، رقم: ۴۵۹

۴۔ أبو عوانة، المسند، ۱: ۳۱۵، رقم: ۱۱۱۹

(۲) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب الذکر والدعا والتوبة والاستغفار، باب فضل ⟵

بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو گشت کرتے رہتے ہیں اور (متعین کردہ فرشتوں سے) زائد ہیں۔ وہ مجالسِ ذکر کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ جب وہ ذکر کی کوئی مجلس دیکھتے ہیں تو ان (ذاکرین) کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے پروں سے ایک دوسرے کو (اوپر تلے) ڈھانپ لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ زمین سے لے کر آسمانِ دنیا تک کی جگہ (ان کے نورانی وجود سے) بھر جاتی ہے۔ پھر جب ذاکرین مجلس سے اٹھ جاتے ہیں تو یہ فرشتے بھی آسمان کی طرف واپس چلے جاتے ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتہ نازل فرماتا ہے، جو اُنہیں اپنے رب کی طرف سے پیغامِ محبت پہنچاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ رَجُـلًا زَارَ أَخًا لَهُ فِي قَرْيَةٍ أُخْرٰى. فَأَرْصَدَ اللهُ لَهُ عَلٰى مَدْرَجَتِهٖ مَلَكاً. فَلَمَّا أَتٰى عَلَيْهِ قَالَ: أَيْنَ تُرِيْدُ؟ قَالَ: أُرِيْدُ أَخًا لِي فِي هٰذِهِ الْقَرْيَةِ. قَالَ: هَلْ لَكَ عَلَيْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا؟ قَالَ: لَا. غَيْرَ أَنِّي أَحْبَبْتُهُ فِي اللهِ عَزَّوَجَلَّ. قَالَ: فَإِنِّي رَسُوْلُ اللهِ إِلَيْكَ بِأَنَّ اللهَ قَدْ أَحَبَّكَ كَمَا أَحْبَبْتَهُ فِيْهِ.[1]

ایک شخص اپنے بھائی سے ملنے کے لیے دوسری بستی میں گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے

..... مجالس الذکر، ۴:۲۰۶۹، رقم:۲۶۸۹

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲:۲۵۲، ۳۸۲، رقم:۷۴۲۰، ۸۹۶۰

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب البر والصلة والآداب، باب في فضل الحب في الله، ۴:۱۹۸۸، رقم:۲۵۶۷

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲:۴۰۸، رقم:۹۲۸۰، ۹۹۵۹، ۱۰۶۰۸

۳۔ ابن حبان، الصحيح، ۲:۳۳۱، ۳۳۷، رقم: ۵۷۲، ۵۷۶

۴۔ أبو يعلى، المعجم، ۱:۲۱۱، رقم: ۲۵۴

۵۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۶:۴۸۸، رقم: ۹۰۰۴

راستے میں ایک فرشتے کو بھیج دیا، جب وہ شخص اس فرشتے کے پاس سے گزرا تو فرشتے نے پوچھا: کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ اس شخص نے کہا: اس بستی میں میرا ایک (دینی) بھائی ہے اس سے ملنے کا ارادہ ہے۔ فرشتے نے پوچھا: کیا تمہارا اس پر کوئی احسان ہے جس کی تکمیل مقصود ہے؟ اس نے کہا: اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ مجھے اس سے صرف اللہ تعالیٰ کے لیے محبت ہے، تب اس فرشتہ نے کہا: میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام لایا ہوں کہ جس طرح تم اس شخص سے محض اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرتے ہو اللہ تعالیٰ بھی تم سے اسی طرح محبت کرتا ہے۔

۴۔ مسلمان بھائی کے لیے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو مقرر فرما دیتا ہے، جو اُس کے لیے دعا کرتا ہے۔ حضرت اُم درداء ﷺ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے:

دَعْوَةُ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ لِأَخِيْهِ، بِظَهْرِ الْغَيْبِ مُسْتَجَابَةٌ. عِنْدَ رَأْسِهٖ مَلَکٌ مُوَکَّلٌ. کُلَّمَا دَعَا لِأَخِيْهِ بِخَيْرٍ، قَالَ الْمَلَکُ الْمُوَکَّلُ بِهٖ: آمِيْنَ. وَلَکَ بِمِثْلٍ. (۱)

مسلمان کی اپنے بھائی کے لیے اس کی عدم موجودگی میں کی جانے والی دعا مقبول ہوتی ہے۔ اس کے سر کے پاس ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے جب بھی وہ اپنے اس بھائی کے لیے نیک دعا کرتا ہے، تو فرشتہ کہتا ہے: آمین۔ تجھے بھی ایسے ہی نصیب ہو (جیسے کہ تو نے اپنے بھائی کے لیے دعا کی ہے)۔

۵۔ اسی طرح مسلمان بھائی کی حاجت روائی کے لیے کوشش اور جد و جہد کرنے والے پر

---

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل الدعاء للمسلمين بظهر الغيب، ۴:۲۰۹۴، رقم: ۲۷۳۳

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۶:۴۵۲، رقم: ۲۷۵۹۹

۳۔ بيهقي، السنن الکبری، ۳:۳۵۳، رقم: ۶۲۲۴

فرشتے سایہ فگن ہوتے ہیں اور اُس کے بخشش و رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ ﷺ دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ مَشٰى فِي حَاجَةِ أَخِيْهِ الْمُسْلِمِ حَتّٰى يُتِمَّهَا لَهُ أَظَلَّهُ اللهُ ﷻ بِخَمْسَةِ آلَافٍ. وَفِي رِوَايَةٍ: بِخَمْسَةٍ وَسَبْعِيْنَ أَلْفَ مَلَكٍ يَدْعُوْنَ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ صَبَاحًا حَتّٰى يُمْسِيَ، وَإِن كَانَ مَسَاءً حَتّٰى يُصْبِحَ، وَلَا يَرْفَعُ قَدَمًا إِلَّا كُتِبَتْ لَهُ بِهَا حَسَنَةٌ وَلَا يَضَعُ قَدَمًا إِلَّا حَطَّ اللهُ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً. (۱)

جو شخص اپنے (کسی مسلمان) بھائی کے کام کے سلسلہ میں چل پڑے یہاں تک کہ اسے پورا کر دے تو اللہ ﷻ اس پر پانچ ہزار، اور ایک روایت میں ہے کہ پچھتر ہزار فرشتوں کا سایہ فرما دیتا ہے۔ وہ اس کے لیے اگر دن ہو تو رات ہونے تک اور رات ہو تو دن ہونے تک دعائیں کرتے رہتے ہیں، اور اس پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں۔ اُس کے اٹھنے والے ہر قدم کے بدلے اس کے لیے نیکی لکھ دی جاتی ہے۔ اس کے (اپنے مسلمان بھائی کی مشکل کو حل کرنے کے لیے) اُٹھنے والے ہر قدم کے بدلے اللہ تعالیٰ اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔

۶۔ احادیث صحیحہ میں حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ اگر آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کے ذکر پر قائم جائے یعنی ہمہ وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ راستوں میں چلے اور فرشتے دائیں بائیں اس سے مصافحہ کرنے کے لیے کھڑے ہوں۔

حضرت حنظلہ اُسیدی ﷺ - جو رسول اللہ ﷺ کے کاتبوں میں سے تھے - بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق ﷺ کی مجھ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا: اے حنظلہ!

---

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الأوسط، ۴:۳۴۷، رقم: ۴۳۹۶
۲۔ بیهقی، شعب الإیمان، ۶:۱۱۹، رقم: ۷۶۶۹
۳۔ منذری، الترغیب والترهیب، ۴:۱۶۵، رقم: ۵۲۷۴
۴۔ هیثمی، مجمع الزوائد، ۲:۲۹۹

تم کیسے ہو؟ میں نے کہا: حنظلہ منافق ہوگیا ہے۔ حضرت ابو بکر ﷺ نے کہا: سبحان اللہ! تم کیسی بات کر رہے ہو؟ میں نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، آپ ﷺ ہمیں جنت اور دوزخ کی نصیحت کرتے ہیں حتیٰ کہ (ہماری یہ کیفیت ہوجاتی ہے) گویا جنت اور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پھر جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس سے اُٹھ کر اپنے اہل وعیال اور دوسرے معاملات میں مشغول ہوتے ہیں تو بہت ساری چیزیں بھول جاتے ہیں۔ حضرت ابو بکر ﷺ نے کہا: بہ خدا! اس قسم کا معاملہ تو ہمیں بھی پیش آتا ہے۔ پھر میں اور حضرت ابو بکر ﷺ دونوں حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! حنظلہ منافق ہوگیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم آپ کے پاس حاضر ہوتے ہیں، آپ ہمیں جنت اور جہنم کی نصیحت کرتے ہیں، اس وقت ہمارا حال یہ ہو جاتا ہے کہ گویا ہم اپنی آنکھوں سے جنت اور جہنم کو دیکھتے ہیں اور جب ہم آپ کے پاس سے اُٹھ کر اپنے اہل وعیال اور زمینوں میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم بہت ساری باتیں بھول جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ، إِنْ لَوْ تَدُوْمُوْنَ عَلٰى مَا تَكُوْنُوْنَ عِنْدِي وَفِي الذِّكْرِ لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلٰى فُرُشِكُمْ وَفِي طُرُقِكُمْ، وَلٰكِنْ يَا حَنْظَلَةُ، سَاعَةً وَسَاعَةً ثَلَاثَ مَرَّاتٍ.[1]

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب التوبة، باب فضل دوام الذكر والفكر في أمور الآخرة والمراقبة وجواز ترك ذلك في بعض الأوقات والاشتغال بالدنيا، ۴:۲۱۰۶، رقم:۲۷۵۰

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴:۱۷۸، رقم:۱۷۶۴۶

۳۔ ترمذی، السنن، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع، باب ۵۹، ۴:۶۶۶، رقم:۲۵۱۴

۴۔ ابن ماجه، السنن، كتاب الزهد، باب المداومة على العمل، ۲:۱۴۱۶، رقم:۴۲۳۹

اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! تم میرے پاس ذکر و فکر کی جس کیفیت میں ہوتے ہو اگر تمہاری وہی کیفیت ہمیشہ برقرار رہے تو تمہارے بستروں اور راستوں پر بھی فرشتے تم سے مصافحہ کریں۔ لیکن اے حنظلہ! یہ کیفیت ساعت در ساعت بدلتی رہتی ہے۔ ایسا آپ ﷺ نے تین بار فرمایا۔

۷۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں کیا ہوگیا ہے کہ جب ہم آپ کی بارگاہِ اقدس میں ہوتے ہیں تو ہمارے دل نرم ہوتے ہیں ہم دنیا سے بے رغبت اور آخرت کے طلب گار ہو جاتے ہیں، لیکن جب آپ کی بارگاہ سے اُٹھ کر اپنے گھر والوں میں گھل مل جاتے ہیں تو ہمارے دل تبدیل ہو جاتے ہیں؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَوْ أَنَّكُمْ تَكُوْنُوْنَ إِذَا خَرَجْتُمْ مِنْ عِنْدِي كُنْتُمْ عَلٰى حَالِكُمْ ذَالِکَ لَزَارَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ فِي بُيُوْتِكُمْ.(۱)

اگر تم اسی حالت میں رہو جس طرح میرے پاس سے اٹھ کر جاتے ہو تو فرشتے تمہارے گھروں میں تمہاری زیارت کریں۔

۸۔ پھر عید الفطر کے دن فرشتے راستوں میں کھڑے ہو کر مسلمانوں کو بخشش کی نوید سناتے ہیں۔

---

(۱) ۱۔ ترمذی، السنن، کتاب صفة الجنة، باب ما جاء فی صفة الجنة ونعیمها، ۴:۶۷۲، رقم: ۲۵۲۶
۲۔ ابن حبان، الصحیح، ۱۶:۳۹۶، رقم: ۳۷۸۷
۳۔ طیالسی، المسند، ۱:۳۳۷، رقم: ۲۵۸۳
۴۔ عبد بن حمید، المسند، ۱: ۴۱۵، رقم: ۱۴۲۰
۵۔ بیهقی، شعب الإیمان، ۵:۴۰۹، رقم: ۷۱۰۱
۶۔ ابن المبارك، الزهد، ۱:۳۸۰، رقم: ۱۰۷۵

حضرت سعید بن اوس انصاری ﷺ اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِذَا كَانَ يَوْمُ الْفِطْرِ وَقَفَتِ الْمَلَائِكَةُ عَلٰى أَبْوَابِ الطُّرُقِ، فَنَادَوْا: أُغْدُوا، يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ، إِلٰى رَبٍّ كَرِيْمٍ. يَمُنُّ بِالْخَيْرِ ثُمَّ يُثِيْبُ عَلَيْهِ الْجَزِيْلَ. لَقَدْ أُمِرْتُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ فَقُمْتُمْ، وَأُمِرْتُمْ بِصِيَامِ النَّهَارِ فَصُمْتُمْ، وَأَطَعْتُمْ رَبَّكُمْ. فَاقْبِضُوا جَوَائِزَكُمْ. فَإِذَا صَلَّوْا، نَادَى مُنَادٍ: أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ قَدْ غَفَرَ لَكُمْ، فَارْجِعُوا رَاشِدِيْنَ إِلٰى رِحَالِكُمْ، فَهُوَ يَوْمُ الْجَائِزَةِ. وَيُسَمَّى ذٰلِكَ الْيَوْمُ فِي السَّمَاءِ يَوْمَ الْجَائِزَةِ.[1]

جب عید الفطر کا دن آتا ہے تو فرشتے راستوں کے کناروں پر کھڑے ہو کر پکارتے ہیں: اے گروہِ مسلمین! کرم والے رب کی بارگاہ کی طرف چلو! وہی تمہیں نیکی کی توفیق عطا فرما کر احسان فرماتا ہے۔ پھر اس نیکی پر بہت بڑا ثواب عطا فرماتا ہے۔ تمہیں راتوں کو قیام کا حکم دیا گیا تو تم نے قیام کیا، دن کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا تو تم نے روزے بھی رکھے، تم نے اپنے پروردگار کی اطاعت و فرماں برداری کی۔ لہٰذا اب جزائیں سمیٹ لو۔ پھر جب لوگ نماز پڑھتے ہیں تو ایک ندا دینے والا ندا دیتا ہے: سن لو! تمہارے رب نے تمہیں بخش دیا ہے، خیرات و برکات سمیٹتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ کیونکہ یہ انعام و اکرام کا دن ہے۔ آسمانوں میں اس دن کا نام یوم الجائزہ (انعام کا دن) ہے۔

الغرض احادیث مبارکہ سے واضح ہو گیا کہ فرشتے صرف وحی نبوت لے کر نہیں آتے، بلکہ مومنین پر فرشتوں کے اُترنے کی ہزارہا شکلیں ہو سکتی ہیں۔ سلسلہ نبوت تو اختتام پذیر ہو گیا

---

(۱) ۱۔ طبراني، المعجم الكبير، ۱:۲۲۶، رقم: ۶۱۷

۲۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۲:۱۵۳

۳۔ عسقلاني، الإصابة في تمييز الصحابة، ۱:۱۶۱، رقم: ۳۶۲

ہے، بلا شک و شبہ اب کسی شخص پر وحی نازل نہیں ہوگی؛ لیکن ملائکہ مومنین پر بشارات، نیک خیالات، نیک پیغامات اور نیک الہامات کے ساتھ اُترتے رہیں گے۔

۲۔ اِلہام کے نزول کی صورتیں

اِس باب کے آغاز میں مذکور سورۂ فصلت (حم السجدۃ) کی آیات کریمہ میں ملائکہ کی جانب سے مومن کے لیے خوش خبری کا ذکر ہے۔ یہ خوش خبریاں مختلف اشکال میں اترتی ہیں۔ اس کا انحصار مراتب کے لحاظ سے الگ الگ شکل میں ہوتا ہے۔ یہ سارے الہامات الفاظ اور حروف کی شکل میں نہیں ہوتے بلکہ معانی کی صورت یا عالمِ مثال کی شکل میں اترتے ہیں جن کی پھر تعبیر یا تاویل کی جاتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی کے اندر ادراک کی صلاحیت کامل نہ ہو تو وہ غلطی کر سکتا ہے۔ بعض لوگوں پر الہام کی کیفیت اتنی عیاں ہوتی ہے کہ وہ اسے الفاظ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بطور خاص ان سے خطاب کیا گیا ہے۔ الہام میں ان الفاظ کا سننا دراصل سننا نہیں ہوتا بلکہ وہ مثالی شکل میں الہام ہوتا ہے۔

یہ الہام ما بعد الطبیعاتی (metaphysical shape)، تمثیلی اور اشارے و کنائے اور معانی کی شکل میں ہوتا ہے مگر وہ اتنا عیاں اور نمایاں ہوتا ہے کہ بندہ فرق ہی نہیں کر سکتا کہ یہ معنًا اترا ہے یا لفظًا اترا ہے۔ لہٰذا وہ اپنا ذہن الفاظ اور صوت کی طرف کر لیتا ہے۔ درحقیقت یہ اس کے اپنے قلب کی صلاحیت اور فہم کی استعداد میں کمزوری ہوتی ہے۔ اگر اس مرتبے سے وہ بلند ہو جائے تو وہ امتیاز کر لیتا ہے کہ یہ الفاظ، حروف اور صوت (آواز) نہیں تھی بلکہ معانی اور عالمِ مثال کی چیزیں تھیں۔ یہ الہام ہوتا ہے۔

جن و انس غلط تصورات و خیالات، غلط عقائد و اَفکار اور غلط حوادث و خواطر وغیرہ بھی بتدریج (gradually) نفوس میں اِلقاء کرتے ہیں جو بالآخر (ultimately) بندے کو بُری راہ اور غلط عقیدے پر ڈالتے اور بہکاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان اپنے معاشرے اور غلط معاشرتی ماحول سے متاثر ہو کر بھی گم راہ ہو جاتا ہے۔ اسے ہم مجموعی طور پر دنیا کا نام دیتے ہیں۔ یہ ایک الگ ذریعہ ہے، جب کہ ایک ذریعہ نفس امّارہ کا بھی ہے جو برائی کا امر دیتا ہے

اور القاء بھی کرتا ہے۔

اِسی طرح اللہ تعالیٰ کی یاد سے صرفِ نظر کرنے والے شخص پر شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے، یہ شیطان سوتے، جاگتے، اُٹھتے، بیٹھتے اور چلتے پھرتے اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اُس کے اندر مسلسل جھوٹے خیالات، جھوٹے تصورات، جھوٹے اَفکار اور جھوٹا علم الہام کرتا رہتا ہے۔ شیطان اُس کے اندر فسق و فجور کا خیال اور رغبت ڈالتا ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ○[1]

اور جو شخص (خدائے) رحمان کی یاد سے صرفِ نظر کر لے تو ہم اُس کے لیے ایک شیطان مسلّط کر دیتے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ جڑا رہتا ہے○

(۱) انسان نیکی یا بدی کے راستے کا انتخاب خود کرتا ہے

انسان پر شیطان مسلط ہونے کے باوجود کوئی بھی شخص اپنی ذات کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا کہ 'میرا تو مقدر ہی ایسا ہے۔' ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔ اس کیفیت پر اِنشاء اللہ خاں کیا خوب طنز کرتے ہیں:

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
فعلِ بد خود ہی کریں لعنت کریں شیطان پر

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ نیکی یا بدی کا راستہ انسان خود منتخب کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ اِلٰہی ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ○[2]

---

(۱) الزخرف، ۴۳:۳۶
(۲) البلد، ۹۰:۱۰

اور ہم نے اسے (خیر و شر کے) دو نمایاں راستے (بھی) دکھا دیے○

دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا○[1]

پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دی○

یعنی اس کے اندر صلاحیت و استعداد رکھ دی ہے کہ وہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکے۔ اُسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو چاہے راستہ اختیار کرے، وہ اپنے ہر قول و فعل کا خود ذمہ دار ہے۔ جو شخص اپنی مرضی یا کوتاہی سے اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے تو دنیا کی لذتیں اس کی نظر میں اہم ہو جاتی ہیں اور وہ نفس کی شہوتوں کو فوقیت دینے لگتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی لذت، نیک اعمال اور فرائض کی ادائیگی کی طرف نہیں جاتا۔ وہ چند روزہ دنیوی لذت کے لیے آخرت کو بھول جاتا ہے اور اللہ کے وعدے پر مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ وہ شیطان کے دنیا داری کے وعدے پر یقین کرتا ہے۔ یہ سب کچھ چونکہ بندہ خود اختیار کرتا ہے، اس لیے اُسے اپنے اعمال کا ذمہ دار خود ٹھہرایا گیا ہے۔ اسی لیے اس کے اعمال پر جزا بھی ہے اور سزا بھی ہے۔

اگر کسی عمل میں اُس کی اپنی مرضی شامل نہ ہو تو اسے سزا دینا جائز نہ ہوگا۔ یاد رہے کہ خالقِ دو جہاں کی ذات کبھی کسی پر ظلم نہیں فرماتی۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی یاد سے منہ پھیر کر بری راہ پر چل پڑتا ہے تو اس غلط انتخاب پر قدرت دخل اندازی نہیں کرتی۔ ایک آدمی اگر بے احتیاطی کے باعث خراب اور مضرِ صحت خوراک کھانے کے نتیجے میں بیمار ہوگیا ہے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ بیماری میرے مقدر میں لکھی ہوئی تھی، کیونکہ اس نے مضر غذا کھا کر اپنی صحت خود برباد کی ہے۔

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ

(۱) الشمس، ۹۱:۸

مَّسْنُوْنٍ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ○[1]

اور (وہ واقعہ یاد کیجیے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں سن رسیدہ (اور) سیاہ بودار، بجنے والے گارے سے ایک بشری پیکر پیدا کرنے والا ہوں○ پھر جب میں اس کی (ظاہری) تشکیل کو کامل طور پر درست حالت میں لا چکوں اور اس پیکر (بشری کے باطن) میں اپنی (نورانی) روح پھونک دوں تو تم اس کے لیے سجدہ میں گر پڑنا○

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں تخلیقِ آدم علیہ السلام سے قبل ملائکہ سے فرمایا کہ جب میں اُس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اُس بشر کے پیکرِ جسدی کو نہ دیکھنا، جو بظاہر سن رسیدہ ہوگا اور بدبو دار گارے سے تشکیل دیا جائے گا، بلکہ اُس کے اندر موجود میری پھونکی گئی روح کو دیکھنا اور جب میری روح کا چراغ اُس کے اندر جل پڑے تو تم اس کے لیے سجدہ ریز ہوجانا۔ اُس کی تعظیم بجا لانا دراصل مجھے سجدہ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ احترام اُس پیکرِ بشری کے لیے نہیں تھا بلکہ اُس کے وجودِ روحانی کے لیے تھا۔ چنانچہ ملائکہ نے جوں ہی اللہ تبارک و تعالیٰ کی پھونکی ہوئی روح کے چراغ کو جسدِ آدم میں چمکتے دیکھا تو سب سجدہ ریز ہو گئے۔ ابلیس چونکہ ناری تھا، لہٰذا اُس نے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ تو نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ اس نے کہا: یہ مٹی اور گارے سے بنا ہوا ہے، میں اسے سجدہ کیوں کروں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہاں سے نکل جاؤ! تم پر قیامت تک کے لیے لعنت ہے۔ وہ اُس مقام پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آدمی کو گمراہ کرنے کا عہد ان الفاظ میں کرتا ہے:

رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ○[2]

اے پروردگار! اس سبب سے جو تو نے مجھے گمراہ کیا میں (بھی) یقیناً ان کے لیے زمین میں (گناہوں اور نافرمانیوں کو) خوب آراستہ و خوشنما بنا دوں گا اور ان سب کو

(۱) الحجر، ۱۵:۲۸-۲۹

(۲) الحجر، ۱۵: ۳۹

ضرور گمراہ کر کے رہوں گاo

یہ شیطانی سوچ ہے کہ بندہ برے کام تو خود کرتا ہے اور پھر اسے تقدیر کا لکھا کہہ کر اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرار دیتا ہے۔ یہ شیطانی عمل ہے کہ وہ تکبر و رعونت کے باعث اپنی خرابیاں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر رہا ہے۔ چنانچہ جب کوئی بندہ برائی کر کے اسے اپنے مقدر کی طرف منسوب کر دے تو سمجھیں کہ وہ شیطان کا رفیق ہے۔ ابلیس نے یہ بات اس میں القاء کی ہے۔ شیطان نے حضرت آدم ﷺ کو سجدہ سے انکار خود کیا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اُسے سجدہ کرنے سے روکنا ہوتا تو وہ فرشتوں کو بھی روک دیتا۔ تمام فرشتے سمجھ گئے اور سجدہ ریز ہو گئے، مگر یہ اکیلا ڈٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اسے اپنی صفائی کا موقع بھی دیا، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَo[1]

(اللہ نے) ارشاد فرمایا: اے ابلیس! تجھے کیا ہوگیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہواo

اُس نے جواب دیا:

لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍo[2]

میں ہرگز ایسا نہیں (ہوسکتا) کہ بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سِن رسیدہ (اور) سیاہ بودار، بجنے والے گارے سے تخلیق کیا ہےo

گویا اس نے اپنی آزادیِ رائے کے حق کو استعمال کیا۔ اس سارے مکالمہ کو قرآن مجید میں ذکر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انسان اپنا راستہ خود اپنی مرضی سے اختیار کرتا ہے۔ اگر نیک راستے پر جائے گا تو فرشتوں کا پیروکار ہو گا اور اگر بُرے راستے کو اختیار کرے گا تو شیطان کے بہکاوے میں آئے گا، لہٰذا اگر شیطان کسی کو بہکائے گا تو اُس کا ذمہ دار وہ خود ہے کہ اُس نے

---

(۱) الحجر، ۱۵: ۳۲

(۲) الحجر، ۱۵: ۳۳

رحمٰن سے ناتا توڑ کر شیطان کی دوستی اختیار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو بندوں کو نیکی اور بدی کے دونوں راستے بتا دیے ہیں۔ نیکی کے راستے پر چلے گا تو فرشتے مدد گار ہوں گے اور برائی کے راستے پر چلے گا تو شیطان نے پہلے ہی برائیاں مزین کر کے انسانوں کو گم راہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے:

اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ○[1]

سوائے تیرے ان برگزیدہ بندوں کے جو (میرے اور نفس کے فریبوں سے) خلاصی پا چکے ہیں○

شیطان خود اقرار کر رہا ہے کہ ایسے بھی ہیں جو میرے دام میں نہیں پھنسیں گے، وہ میرے داؤ کو مسترد کر دیں گے، یعنی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے نیکی اور بدی کے دونوں راستوں میں سے نیکی کے راستے کو منتخب کریں گے تو ان پر میرا داؤ نہیں چل سکے گا۔ جس طرح نیکی کے لیے فہم اور رغبت ہے، اسی طرح بدی کے فہم اور رغبت کا سامان بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک اور صالح بندوں کی استعانت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اِنَّ عِبَادِیْ لَيْسَ لَکَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِيْنَ○[2]

بے شک میرے (اخلاص یافتہ) بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا سوائے ان بھٹکے ہوؤں کے جنہوں نے تیری راہ اختیار کی○

یعنی جنہوں نے خود اپنی مرضی اور منشا سے عارضی لذتوں کو ترجیح دے کر بری راہ اختیار کی ہے، انہی پر تیرا داؤ چلے گا تو وہ بہک جائیں گے۔ جنہوں نے شیطان کے داؤ سے خود کو بچایا، وہ لوگ خوش بخت ہیں، جنت کی دائمی نعمتیں انہی لوگوں کی منتظر ہوں گی۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

---

(۱) الحجر، ۱۵: ۴۰

(۲) الحجر، ۱۵: ۴۲

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ○[1]

بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں رہیں گے○

(۲) شیطان کے مکر وفریب

یہ امر ذہن نشین رہے کہ شیطان اور اس کا پورا قبیلہ بندے کو گم راہ کرنے کے لیے تمام تر حربے استعمال کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں اس کے حربوں کا مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے۔ ذیل میں ان میں سے کچھ حربوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ.[2]

بے شک وہ (خود) اور اس کا قبیلہ تمہیں (ایسی ایسی جگہوں سے) دیکھتا (رہتا) ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔

قرآن مجید کی اس آیت سے شیطان کا دیکھنا ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ○[3]

خواہ وہ (وسوسہ انداز شیطان) جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے○

یعنی بعض انسان بھی شیاطین کی رفاقت میں رہ رہ کر انسانی پیکر میں مکمل شیطان بن چکے ہوتے ہیں۔

۳۔ سورۃ الاعراف میں ان شیاطین کا ذکر کیا گیا ہے جو ایمان نہ لانے والوں کو اپنا دوست بنا کر اُنہیں کفر پر مجتمع رکھتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

---

(۱) الحجر، ۱۵: ۴۵

(۲) الأعراف، ۷: ۲۷

(۳) الناس، ۱۱۴: ۶

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ○[1]

بے شک ہم نے شیطانوں کو ایسے لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے○

یعنی وہ لوگ زندگی میں ایمان کو عملاً پسِ پشت ڈال کر کفر جیسی بری راہ پر چل پڑتے ہیں۔ شیطانوں کو ان کا ولی اور سرپرست بنا دیا جاتا ہے۔ گویا شیاطین ان کے رہنما (guide) بن جاتے ہیں جو قدم قدم پر ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

۴۔ سورۃ الأعراف میں ہی مزید بیان ہوتا ہے:

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ○ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ○[2]

(مجھے قسم ہے کہ) میں (بھی) ان (افرادِ بنی آدم کو گمراہ کرنے) کے لیے تیری سیدھی راہ پر ضرور بیٹھوں گا (تا آنکہ انہیں راہِ حق سے ہٹا دوں)○ پھر میں یقیناً ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے ان کے پاس آؤں گا، اور (نتیجتاً) تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہ پائے گا○

اس آیت کریمہ نے ایک بات مزید واضح کر دی کہ جس پر شیطان کا اثر ہوگا، اُس پر شیطانی اثرات کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی ناشکری سے ہوتی ہے۔ یہ تمام آیات اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ شیطان بندے کے خیالات کے مطابق رہنمائی بھی کرتے ہیں اور انہیں ساتھ بھی لے کر چلتے ہیں۔

۵۔ سورۃ النحل میں فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ○ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ

(۱) الأعراف، ۷: ۲۷

(۲) الأعراف، ۷: ۱۶-۱۷

يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۝ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۝ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۝ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ۝ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ۝ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ۝ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ۝ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۝ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ۝ وَاَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ۝ وَثَمُوْدَا فَمَآ اَبْقٰى ۝ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ۝ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۝ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ۝ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ۝ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۝ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ۝ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ۝ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۝

سو جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود (کی وسوسہ اندازیوں) سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں ○ بے شک اسے ان لوگوں پر کچھ (بھی) غلبہ حاصل نہیں ہے جو ایمان لائے اور اپنے ربّ پر توکل کرتے ہیں ○ بس اس کا غلبہ صرف انہی لوگوں پر ہے جو اسے دوست بناتے ہیں اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے ہیں ○

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اُس کی راہ پر چلو گے تو تمہارے اوپر شیطان کا اثر نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیاطین کا غلبہ صرف انہی پر ہوتا ہے جو اسے اپنا دوست بناتے ہیں اور وہ دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والے ہوتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مذکورہ پہلی دو آیات میں مومنین کو شیطان مردود کی وسوسہ اندازیوں سے بچنے کے لیے اپنی پناہ میں آنے کی دعوت دی ہے، کیونکہ جس مومن کو دونوں جہانوں کے پروردِگار کی حفاظت میسر آ جائے اور وہ اُس پر کامل توکل اور بھروسہ بھی رکھتا ہو تو اس پر شیاطین کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے تیسری آیت کریمہ میں اس حقیقت کو منکشف کر دیا ہے کہ شیاطین کا زور اور غلبہ صرف اُنہی پر چلتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے اور شیطان کی دوستی کا دم بھرنے والے ہوتے ہیں۔ گویا یہ دراصل ان کی اپنی خواہش اور منشا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ان پر دونوں راستے واضح کر دیے ہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الأنعام میں فرمایا ہے:

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ. [۲]

اور بے شک شیاطین اپنے دوستوں کے دلوں میں (وسوسے) ڈالتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔

---

(۱) النحل، ۱۶: ۹۸-۱۰۰

(۲) الأنعام، ۶: ۱۲۱

یہاں بھی لفظ 'وحی' الہام کے معنی میں استعمال ہوا ہے؛ یعنی خیالات، افکار و تصورات کو القاء کرنا۔ یہ دراصل وحی کا لغوی معنی ہے۔ وحی کا ایک معنی صریح اشارہ بھی ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے کئی مقامات پر لفظ وحی کو الہام اور القاء کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد قطعاً وحیِ نبوت نہیں ہوتی۔

(۳) شیطان کی کرشمہ سازی: گم راہ بھی خود کو ہدایت پر سمجھتا ہے

امر واقعہ یہ ہے کہ شیطان جب کسی بندے کو غلط علم اور غلط فکر دیتا ہے تو وہ بندہ اپنی دانست میں اپنے آپ کو راہِ ہدایت پر سمجھتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ○[1]

اور وہ (شیاطین) انہیں (ہدایت کے) راستہ سے روکتے ہیں اور وہ یہی گمان کیے رہتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں○

یہ شیطان کی حیلہ سازی اور کاری گری ہے۔ اگر بھٹکا ہوا شخص یہ سمجھنے لگے کہ میں راہِ حق سے بہک کر گم راہ ہو گیا ہوں تو شیطان کی کرشمہ سازی کیا ہوئی؟ اس طرح تو وہ بندہ فوری طور پر اپنی اصلاح کر کے گم راہی سے تائب ہو کر صراطِ مستقیم اختیار کر لے گا۔ شیطان کی فن کاری یہی ہے کہ وہ جسے گم راہ کرتا ہے اُسے یہ باور بھی کرواتا ہے کہ وہ ہدایت اور سیدھے راستے پر ہے۔ جیسا کہ فرمانِ اِلٰہی ہے:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ○ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ○ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ○[2]

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں؟○ وہ ہر جھوٹے (بہتان طراز) گناہ گار پر اترا کرتے ہیں○ جو سنی سنائی باتیں (ان کے کانوں میں) ڈال دیتے

(۱) الزخرف، ۴۳: ۳۷

(۲) الشعراء، ۲۶: ۲۲۱-۲۲۳

ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں○

اس کے برعکس صاحبانِ استقامت پر فرشتوں کے ذریعے غیبی امداد اترتی ہے جن کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں سورۂ حم السجدہ کی آیت نمبر ۳۰ اور ۳۱ کے تحت پڑھ چکے ہیں۔ اس استدلال کا مقصد یہ تھا کہ آیات قرآنی سے نہ صرف ملائکہ کے ذریعہ الہام کا اثبات ہے بلکہ گناہ گار اور بے عمل انسان پر شیاطین کے گم راہ کن خیالات کے ورود کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے۔ اب کسی کو نہ تو فرشتے نازل ہوتے نظر آتے ہیں اور نہ ہی شیطان اترتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح نفس بھی مرئی (visible) نہیں ہے، جو بری راہ پر چلنے کا شوق اور رغبت دلاتا اور انسان کو گم راہ کرتا ہے۔ اسی طرح شیاطین بھی جنات میں سے ہیں، وہ بھی نظر نہیں آتے۔ لہٰذا ان کا اُترنا تو نظر نہیں آتا، لیکن ان کے اُترنے سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں اُن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جس سے افعال سرزد ہو رہے ہیں وہ کس کے زیر اثر ہے۔ صبح و شام ہمارے ہاں معاشرے میں جو بہتان تراشی ہوتی ہے، تہمتیں لگتی ہیں اور جھوٹ بولا جاتا ہے، ایسے سب لوگوں پر یہی شیطان اترتے ہیں جو انہیں ان اعمالِ بد پر اُبھارتے ہیں۔ ایسی باتیں گھروں میں کی جائیں یا مجالس میں، معاشرتی زندگی میں ہوں یا سیاسی زندگی میں، ان کے مرتکب افراد کے قلوب و اذہان میں درحقیقت شیطان جھوٹے اور بہتان طرازی پر مبنی خیالات ڈالتے ہیں۔ یوں معاشرے میں سنی سنائی باتوں پر فتنہ و فساد برپا ہوتا رہتا ہے۔

اِس کے برعکس اہل ایمان کے احوال بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا.[1]

سوائے ان (شعراء) کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہے (یعنی اللہ اور رسول ﷺ کے مدح خواں بن گئے) اور اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد (ظالموں سے بزبانِ شعر) انتقام لیا۔

---

(۱) الشعراء، ۲۶: ۲۲۷

اِس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ان برے اثرات سے صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں، جن کے اندر درج ذیل تین خوبیاں پائی جاتی ہیں:

۱۔ ایمان

۲۔ اعمال صالحہ

۳۔ ذکرِ الٰہی کی کثرت

یہ تینوں چیزیں معاشرے میں پھیلائے گئے برے کاموں سے بندے کا دفاع کرتی ہیں۔ گویا جہاں شیاطین اُترتے ہیں، وہیں ان سے دفاع کی بھی ایک قوت موجود ہوتی ہے۔

(۴) شیطانی حربوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے

شیطان کے اِن حربوں اور وسوسوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں اور محبوبوں کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ اُنہیں ہر آن اپنی مدد فراہم کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیا کی مدد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○ (۱)

خبردار! بے شک اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ و غمگین ہوں گے○

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دوست بن جاتے ہیں تو خوف اور غم ان سے دور ہو جاتا ہے۔ انہیں گم راہی کے بجائے ہدایت مل جاتی ہے اور ان پر سے شیطان کا قبضہ اور اثر ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکہف میں فرمایا ہے:

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ط هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا○ (۲)

(۱) یونس، ۱۰: ۶۲

(۲) الکہف، ۱۸: ۴۴

یہاں (پتہ چلتا ہے) کہ سب اختیار اللہ ہی کا ہے (جو) حق ہے، وہی بہتر ہے انعام دینے میں اور وہی بہتر ہے انجام کرنے میں○

اللہ تعالیٰ کی ولایت حق ہے۔ وہ اپنے مومن بندوں کا دوست ہوتا ہے اور بندے اپنے مولیٰ کے دوست ہوتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کے ساتھ ولایت اور دوستی کو چن لیتے ہیں تو اس کے نتائج، ثمرات اور اثرات کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں یوں کیا گیا ہے:

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ.[1]

اللہ ایمان والوں کا کارساز ہے وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں ان کے حمایتی شیطان ہیں وہ انہیں (حق کی) روشنی سے نکال کر (باطل کی) تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اپنے دوستوں اور شیطان کے پیروکاروں دونوں کی دوستی اور ان کے ثمرات و نتائج کو یوں کھول کر بیان کر دیا ہے کہ حق اور باطل کی پہچان روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ مومنین کا دوست ہے اور وہ ایمان والوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شیطان کی دوستی کو یا نفس کی دوستی کو ترجیح دیتے ہیں، شیاطین انہیں نور سے نکال کر اندھیروں اور تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

۳۔ اِلہام و اِلقاء کا عمل کیسے تشکیل پاتا ہے؟

الہام کا یہ سارا عمل کیسے ہوتا ہے؟ وہ کون سے ذرائع ہیں جن سے یہ علم تشکیل پاتا ہے اور یہ علم کا ذریعہ (source) کیسے بنتا ہے؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے علم کے درجات کا جاننا ضروری ہے۔

---

(۱) البقرہ، ۲:۲۵۷

آیئے! اس کے درجات اور مراتب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ علم کی دو اقسام ہیں:

۱۔ علمِ جلی

۲۔ علمِ خفی

(۱) علمِ جلی

وہ علم جو ظاہری حواسِ خمسہ، عقل اور استفادۂ صحیحہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اُسے علمِ جلی یعنی علم ظاہر کہتے ہیں۔

ہم آلاتِ علم اور ذرائع علم کی بحث میں اس کا تفصیل سے تذکرہ کر چکے ہیں کہ یہ منقولات کا علم ہے۔ پہلی بات معقولات اور محسوسات کی تھی۔ کبھی اس سے علمِ قطعی کا فائدہ ہوتا ہے اور کبھی علمِ ظنی کا، پھر اس کے بعد وجدانیات، فطریات، تجربیات، حدثیات اور بدیہیات کا بیان کیا تھا۔ یہ ساری چیزیں علمِ جلی کے ذرائع میں آجاتی ہیں، جن پر ہم ابتدائی ابواب میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

(۲) علمِ خفی

دوسرا ذریعۂ علم، علمِ خفی یا علمِ باطن ہے۔

۱۔ حضرت جابر بن عبد اللہ ﷺ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذَاکَ الْعِلْمُ النَّافِعُ. وَعِلْمٌ عَلَی اللِّسَانِ فَتِلْکَ حُجَّةُ اللهِ عَلٰی عِبَادِهٖ.[1]

---

(۱) ۱۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۴: ۳۴۶، رقم: ۲۱۷۹

۲۔ ابن أبی شیبة نے 'المصنف (۷: ۸۲ رقم: ۳۴۳۶۱)' میں اسے حضرت حسن بصری سے مرسلا روایت کیا ہے۔

۳۔ دارمی نے 'السنن (۱: ۱۱۴ رقم: ۳۶۴)' میں اسے حضرت حسن ⟵

علم دو (طرح کے) ہیں: ایک علم دل میں ہوتا ہے اور یہ علم نافع ہے؛ ایک علم زبان پر ہوتا ہے اور یہ ابن آدم پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے۔

سادہ الفاظ میں ہم انہیں علم ظاہری اور علم باطنی کہہ سکتے ہیں کہ علم بالقلب باطنی علوم کی طرف اشارہ ہے اور علم علی اللسان سے مراد ظاہری علوم ہیں۔

۲۔ اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ ﷺ نے بھی اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: فَعِلْمٌ ثَابِتٌ فِي الْقَلْبِ وَعِلمٌ فِي اللِّسَانِ فَذٰلِکَ حُجَّةٌ عَلٰی عِبَادِهٖ. (۱)

علم دو (طرح کے) ہیں: ایک علم دل میں راسخ ہوتا ہے اور ایک علم زبان پر (جاری ہوتا) ہے۔ پس یہ (دوسرا) علم اللہ تعالیٰ کے بندوں پر حجت ہے (یعنی اگر وہ اس علم پر عمل نہیں کریں گے تو یہ علم ان کے خلاف گواہ ہوگا)۔

علم علی اللسان میں فرائض و واجبات، سنن و مباحات، مکروہات و محرمات اور اخلاق و آداب شامل ہیں جو ہماری ظاہری زندگی کو سنوارنے کے لیے ہیں۔ ائمہ دین نے ظاہری اور باطنی علم کو ہمیشہ جمع کیا ہے کیونکہ ہدایت تبھی ملتی ہے جب ظاہری اور باطنی دونوں علوم یک جا ہوں۔

۳۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰی سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، لِكُلِّ آيَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ. (۲)

..... بصری سے مرسلا روایت کیا ہے۔

۴۔ ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، ۱: ۱۹۰-۱۹۱

۵۔ بيهقي عن الفضيل بن عياض، شعب الإيمان، ۲: ۲۹۴، رقم: ۱۸۲۵

(۱) الديلمي، مسند الفردوس، ۳: ۶۸، رقم: ۴۱۹۴

(۲) ۱۔ ابن حبان، الصحيح، ۱: ۲۷۶، رقم: ۷۵ ⟵

قرآن مجید سات مختلف حروف (قرأت) میں نازل کیا گیا ہے۔ ہر آیت کا ایک ظاہری معنی ہے اور ایک باطنی معنی ہے۔

۴۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷺ نے ہی ایک دوسری روایت بھی بیان کی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، لِكُلِّ آيَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ، وَلِكُلِّ حَدٍّ مَطْلَعٌ. (۱)

قرآن مجید سات مختلف حروف (قرأت) میں نازل کیا گیا۔ ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اور ہر حد کا ایک مطلع ہے (جہاں سے اس کی ابتدا ہوتی ہے)۔

۵۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷺ سے ہی مروی ایک روایت میں فرمایا گیا ہے:

لِكُلِّ حَرْفٍ حَدٌّ، وَلِكُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ. (۲)

قرآن مجید کے ہر حرف کی ایک حد ہے جہاں اُس کی انتہاء ہوتی ہے اور ہر حد کا ایک مطلع ہے (جہاں سے اُس کی ابتداء ہوتی ہے)۔

۲۔ طحاوی، شرح مشکل الآثار، ۸: ۸۷

۳۔ بزار، المسند، ۵: ۴۴۲، رقم: ۲۰۸۱

۴۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۱۰: ۱۰۵، رقم: ۱۰۱۰۷

۵۔ ابن عبد البر، التمہید، ۸: ۲۸۲

۶۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۷: ۱۵۲

(۱) ۱۔ طحاوی، شرح مشکل الآثار، ۸: ۱۰۹

۲۔ أبو یعلی، المسند، ۹: ۸۰-۸۲، رقم: ۵۱۴۹

۳۔ عبد الرزاق، المصنف، ۳: ۳۵۸، رقم: ۵۹۶۵، امام حسن بصری سے مرسلا روایت کی۔

(۲) طبرانی، المعجم الکبیر، ۹: ۱۳۶، رقم: ۸۶۶۷-۸۶۶۸

یعنی ہر آیت کے ظاہری معانی بھی ہیں جو علمائے ظاہر جانتے ہیں اور ہر آیت کے باطنی معانی بھی ہیں جو علمائے باطن جانتے ہیں۔ اس میں مبتدی بھی ہیں اور اس میں منتہی بھی ہیں۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ سے روایت ہے:

إِنَّ الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، مَا مِنْهَا حَرْفٌ إِلَّا لَهٗ ظَهْرٌ وَبَطْنٌ، وَإِنَّ عَلِيَّ ابْنَ أَبِي طَالِبٍ ﷺ عِنْدَهٗ عِلْمُ الظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ. (۱)

بے شک قرآن مجید سات حروف (یا سات قراءات) پر نازل ہوا ہے۔ اس کے ہر حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ یقیناً حضرت علی بن ابی طالب ﷺ کے پاس اس کے ظاہر کا علم بھی ہے اور اس کے باطن کا بھی۔

۷۔ حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں:

حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ وِعَاءَيْنِ فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهٗ وَأَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهٗ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ. (۲)

میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو تھیلے (یعنی دو طرح کا) علم حاصل کیا ہے۔ ایک کو میں نے لوگوں میں پھیلا دیا ہے جب کہ دوسرے کو اگر میں ظاہر کر دوں تو یہ گلا کاٹ ڈالا جائے۔

یعنی اس دوسرے علم سے ایسے اسرار وغوامض اور ایسے معارف و اطلاعات مراد ہیں جو کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئیں گی، یا کسی کے ذہن سے مطابقت نہ رکھیں گی اور اس وجہ سے

---

(۱) ۱۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۱:۶۵
۲۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۴۲:۴۰۰
۳۔ مناوی، فيض القدير، ۳: ۴۶
(۲) بخاری، الصحيح، كتاب العلم، باب حفظ العلم، ۱: ۵۶، رقم: ۱۲۰

میری گردن اڑا دی جائے گی۔ لہٰذا میں وہ مسائل عوام میں بیان نہیں کرتا۔

ان احادیثِ مبارکہ کو اس لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح قرآن مجید سے الہام اور علمِ خفی ثابت ہے، اسی طرح احادیثِ نبویہ سے بھی ان کی پوری تائید ہوتی ہے۔

۴۔ علمِ خفی کے مراتب

علمِ خفی کے درج ذیل پانچ مراتب ہیں:

۱۔ مغیبات کا آشکار ہونا

۲۔ مرتبہ اسماع

۳۔ مرتبہ افہام

۴۔ مرتبہ بیان

۵۔ مرتبہ تحدیث

سالک درجہ بدرجہ ان مراتب پر فائز ہوتا چلا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ جس قدر بھی مراتب کھلتے ہیں وہ سب قلب کی دنیا میں کھلتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ. (۱)

پھر جب انہوں نے کج روی جاری رکھی تو اللہ نے اُن کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ. (۲)

---

(۱) الصف، ۶۱: ۵

(۲) النساء، ۴: ۱۵۵

ہمارے دلوں پر غلاف (چڑھے ہوئے) ہیں، (حقیقت میں ایسا نہ تھا) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے باعث ان کے دلوں پر مُہر لگا دی ہے۔

یعنی دل کے اوپر غلافوں کے حجابات کا چڑھنا اور ان کا اتر جانا یہی وہ راستہ ہے جو دل کی آنکھیں اور اُس کے کان کھولتا ہے۔

آیئے اِن مراتب کا بالتفصیل مطالعہ کرتے ہیں:

(۱) مغیبات کا آشکار ہونا

شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبد اللہ بن محمد الانصاری الہروی بیان کرتے ہیں کہ روحانی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعے روح ہر قسم کی کثافت سے مصفّٰی اور مزکّٰی ہو جاتی ہے۔ نفس امارہ ترقی پا کر نفس لوّامہ، ملہمہ اور مطمئنہ بن جاتا ہے۔ قلب اور جسم کے ظروف جب پاک اور صاف ہو جاتے ہیں تو اس میں پاکیزہ اسرار کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جب علم مغیبات آشکار کرتا ہے اور ظاہر و باطن اور حاضر و غائب کی حدود کو عبور کر کے اگلے مرحلے میں داخل ہوتا ہے۔[1]

اسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ.[2]

(وہی) ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔

عالم شہادت کو ہم سر کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جبکہ عالم الغیب کو آنکھوں، حواس اور عقل سے نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ یہ مادی علم کے ذرائع سے ماورا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے، وہ بندوں کو ان کی استعداد، صلاحیت اور ظرف کے مطابق جس قدر چاہتا ہے علم عطا فرما

(۱) ۱۔ الهروي، منازل السائرين: ۷۶-۷۷
۲۔ ابن القيم، مدارج السالكين، ۲: ۴۷۱-۴۷۲
(۲) الأنعام، ۶: ۷۳

دیتا ہے۔

شیخ الاسلام ابو اسماعیل الہروی فرماتے ہیں کہ ابدان (جسموں) اور نفوس کے پاک صاف ہو جانے کے بعد بندے کے باطن کو جب یہ علم خفی نصیب ہو جاتا ہے تو اس سے غیب کے پردے اٹھا دیے جاتے ہیں اور اصل حقائق آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو جاتے ہیں۔[1]

غیب جاننے سے کیا مراد ہے؟

شیخ الاسلام ابو اسماعیل الہروی فرماتے ہیں کہ اسے علمِ خفی کا نام اس لیے دیا جاتا ہے کہ وہ علمائے ظاہر سے مخفی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنی شان میں فرماتا ہے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ.[2]

(وہی) ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔

اللہ کے ہاں تو کوئی چیز غیب اور مخفی نہیں ہے تو اس کا غیب جاننے سے کیا مراد ہے؟ یہ دراصل ایک اضافی اصطلاح (term) ہے۔ ہماری آنکھوں سے جو کچھ مخفی ہے اسے ہمیں سمجھانے کے لیے غیب کہا جا رہا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو غیب اور شہادت دونوں کا خالق اور آشنا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ میں غیب کو جانتا ہوں تو اس سے مراد وہ غیب ہے جو ہمارے حواس اور عقل سے اوجھل ہے۔ وہ جب یہ کہتا ہے کہ میں ظاہر کو جانتا ہوں تو اس سے مراد یہ ہے کہ جو ہماری آنکھوں کے سامنے نظر آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب یہ دونوں الفاظ غائب اور موجود کا ذکر کرتا ہے تو انسان کی نسبت سے کرتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ درحقیقت علمِ خفی اس علم کو کہتے ہیں جو حواس اور عقل سے مخفی ہوتا ہے۔

علامہ شوکانی، علامہ ابن القیم اور علامہ ابن تیمیہ سب نے علم کی تقسیم میں علم خفی اور علم

---

(۱) الهروي، منازل السائرين:۷۷

(۲) الأنعام، ۶: ۷۳

جلی کو بیان کیا ہے۔ یہ تینوں علماء کہتے ہیں کہ جب انسان اپنے قلب و باطن کو دنیا کے اشغال و علائق اور اس کی غلاظتوں سے پاک کر لیتا ہے تو پھر اس کا شیشۂ قلب بھی روشن ہو جاتا ہے۔ جس طرح سے آئینے پر گرد و غبار پڑا ہو تو ہم اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتے۔ جب آئینہ صاف ہو جاتا ہے تو شکل واضح دکھائی دیتی ہے۔ یہی کیفیت الہام سے کشف کی طرف لے جاتی ہے، جس قدر کسی کا شیشۂ قلب صاف ہوتا ہے اسی قدر اس کا کشف بھی واضح ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اولیاء اور صلحاء کے کشف بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اس بات کا انحصار اس امر پر ہے کہ اُسے کس قدر مقامِ صفائے قلب میسر ہے۔

شیخ الاسلام ابو اسماعیل الہروی اور علامہ ابن القیم نے قلب کو 'زمین' اور ریاضت و مجاہدہ کو 'پانی' قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر قلب کی زمین پر اچھے طریقے سے کاشت کی جائے اور ریاضت و مجاہدہ کا پانی بھی مناسب مقدار میں میسر آئے تو اس سے جو پودے اُگتے ہیں انہیں علمِ باطن اور معرفت کا نام دیا جاتا ہے۔[1]

ان علوم کے حامل وہ لوگ ہیں جو اصحابِ ہمم عالیہ ہیں، جن کی ہمتیں بلند ہیں، یعنی ارادوں کی بلندی قلبی و نفسانی ریاضت اور مجاہدہ کے باعث نشو و نما پاتی ہے اور جیسے جیسے اجلا پن بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے اہل ہمت کی ہمتیں بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ انہیں اہل ہمت اس لیے کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے شوقِ دیدار میں ان کے ارادے جنت و دوزخ کی توجہات سے بھی بلند ہو چکے ہوتے ہیں۔

(۲) مرتبہ اسماع

علمِ خفی کا دوسرا مرتبہ 'اسماع' ہے۔ شیخ الاسلام ابو اسماعیل الہروی نے 'منازل السائرین' میں 'الاسماع الساہیۃ' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ الاسماع الساہیہ سے مراد سمع القلوب ہے، یعنی دلوں کے کانوں کے ذریعے سننا۔ صفائے قلب کے نتیجے میں بندے کو سماعِ قلب عطا ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ اسماع پر فائز لوگوں کی ہمتیں تمام چیزوں سے بلند ہوتی ہیں۔ جب یہ کیفیت

(۱) ابن القیم، مدارج السالکین، ۲:۴۷۳

ہوتی ہے تو اس شخص کو درجہ اسماع مل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قلب میں کان عطا فرماتا ہے جس کے ذریعے وہ الوہی نغمات سننے لگتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:

الساهية، أي: السالمة من الصم.

یعنی بہرے پن سے ان کے دلوں کے کان چھٹکارا پا جاتے ہیں، بہرے نہیں رہتے۔

قرآن حکیم میں ایک مقام پر فرمایا گیا ہے:

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ○(۱)

یہ بہرے، گونگے (اور) اندھے ہیں پس وہ (راہِ راست کی طرف) نہیں لوٹیں گے○

جس طرح بعض لوگ پیدائشی طور پر کان، زبان اور آنکھ سے بہرے، گونگے اور اندھے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اکثر لوگ قلب کے بھی بہرے، گونگے اور اندھے ہوتے ہیں اور ان کے دل اللہ کے نور، آخرت کی نعمتوں اور حقائق باطنیہ کو دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔ وہ ملاء اعلیٰ کی نعمتوں کے اشارات، خطابات، ارواح اور خطابات الٰہیہ کو دیکھنے اور سننے سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے دل ذاکر بھی نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلام بھی نہیں ہوتے۔ یہ قلوب مشاہدہ سے محروم ہوتے ہیں۔ یوں ان کے دلوں کا بہرا، گونگا اور اندھا پن ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

وَلَوْ عَلِمَ اللهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ. (۲)

اور اگر اللہ ان میں کچھ بھی خیر (کی طرف رغبت) جانتا تو انہیں (ضرور) سنا دیتا۔

جب کوئی شخص خود برائی اختیار کر لے تو شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی تقویٰ، پرہیزگاری، ریاضت، مجاہدہ، تزکیہ نفس اور صفائے قلب کا راستہ اپنالے یعنی وہ

---

(۱) البقرة، ۲: ۱۸

(۲) الأنفال، ۸: ۲۳

اللہ کی رضا کی طرف چل پڑے تو اللہ اس کے دل کو اپنے اُلوہی نغمات کی سماعت عطا فرما دیتا ہے۔ یہاں سماع سے مراد ہمارا روز مرہ کا سماع نہیں ہے بلکہ یہ وہ سماع ہے جو مولیٰ کریم اپنے بندوں کی ریاضت و مجاہدات کے نتیجے میں صفائے قلب حاصل ہونے پر عطا فرماتا ہے۔ اسے مرتبۂ اسماع کہتے ہیں۔

آپ غور کریں کہ بندے میں خیر ہو یا شر ہو اس کے کان تو ہر صورت ہی سنتے ہیں۔ یوں تو کفار کے کان بھی سنتے ہیں اور مومنین کے کان بھی سماعت کرتے ہیں، مگر یہاں اس سے مراد وہ سماع نہیں ہے بلکہ یہ وہ سماعت ہے، جس کے سینے میں ایمان اور معرفت شامل ہو اور آدمی نیکیوں کی طرف بڑھے۔ اسی کیفیت کو یوں بیان فرمایا گیا:

وَ مَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ○[1]

اور اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے○

اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کے دل کو دیکھنے والا بنا دیتا ہے، ورنہ بظاہر آنکھیں تو ہر ایک کے پاس ہوتی ہیں جو دیکھتی ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ ان کے دل نہیں دیکھتے۔ اس لیے فرمایا کہ اندھا اور دیکھنے والا کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔

پھر فرمایا کہ تاریکی اور روشنی بھی برابر نہیں ہو سکتے:

وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ○[2]

اور نہ تاریکیاں اور نہ نور (برابر ہو سکتے ہیں)○

سایہ اور دھوپ کو بھی ایک جیسا نہیں کہا جا سکتا، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ○[3]

---

(۱) فاطر، ۳۵: ۱۹
(۲) فاطر، ۳۵: ۲۰
(۳) فاطر، ۳۵: ۲۱

اور نہ سایہ اور نہ دھوپ○

اسی طرح زندہ اور مُردہ بھی باہم برابر نہیں ہیں، فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ.(۱)

اور نہ زندہ لوگ اور نہ مُردے برابر ہو سکتے ہیں۔

یہ سب مثالیں ان جسمانی کانوں اور آنکھوں کے لیے نہیں دیں بلکہ یہ زندگی اور موت کا فرق، اندھیرے اور نور کا تضاد، سائے اور سورج کا فرق؛ یہ سارے تضادات بیان کر کے کہنا کہ کبھی بینا اور نابینا برابر نہیں ہو سکتے تو اس سے مراد قلب کی بینائی ہے۔ اسی حوالے سے فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ.(۲)

بے شک اللہ جسے چاہتا ہے سنا دیتا ہے۔

یعنی اللہ جس شخص میں خیر دیکھتا ہے تو اسے سننے والا قلب عطا فرما دیتا ہے۔ یہی اسماع القلوب ہے۔

اس کی مزید وضاحت ایک اور آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے:

اُولٰٓئِکَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ○(۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر مُہر لگا دی ہے اور یہی لوگ ہی (آخرت کے انجام سے) غافل ہیں○

---

(۱) فاطر، ۳۵: ۲۲

(۲) فاطر، ۳۵: ۲۲

(۳) النحل، ۱۶: ۱۰۸

دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اس وقت مہر لگتی ہے جب کوئی شخص مسلسل نافرمانیوں اور بدکاریوں کا مرتکب ہو کر سراپا شر بن جاتا ہے۔ مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اب انہوں نے بد اعمالیوں کے سبب اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ جہاں سے وہ پلٹ کر خیر کی طرف نہیں آئیں گے۔

(i) اسماع کی اقسام

'اسماع' کی دو اقسام ہیں:

(ا) مرتبہ نازلہ

(ب) مرتبہ عالیہ

(ا) مرتبہ نازلہ

جب صفائے قلب کے نتیجے میں بندے کو سماعِ قلب عطا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے فہم کو ایسی صلاحیت عطا فرما دیتا ہے جو عام عقل و دماغ والے کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس طرح الہام اس کے علم میں شامل ہو جاتا ہے۔

اس صورت میں ہمارے حواسِ خمسہ اور مدرکاتِ حسی کے اندر ہی اللہ تعالیٰ ایسی برکت ڈال دیتا ہے کہ یہ آنکھیں وہ کچھ دیکھتی ہیں جو عام نظریں دیکھ نہیں پاتیں۔ یہی کان وہ کچھ سنتے ہیں جو عام کان سماعت نہیں کر سکتے۔ یہی عقل اور دماغ وہ کچھ سوچ سمجھ لیتے ہیں جو عام لوگوں کے عقل و دماغ سوچ بھی نہیں سکتے۔ یعنی اس کے اندر مدرکاتِ حسی، عقل و حواسِ خمسہ کی قوتِ فہم اور قوتِ سماعت یکسر بڑھ جاتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ ملاء اعلیٰ کے انوار کو اس کے جسمانی حواس و عقل کے ذرائع میں شامل فرما دیتا ہے۔ اس اشتراک سے ان ذرائع میں برکت آجاتی ہے۔ اب کتاب تو ہر کوئی پڑھتا ہے مگر صاحبِ قلبِ سلیم جب اسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اس میں سے وہ کچھ نظر آتا ہے، جو دوسرے قارئین سے پنہاں ہوتا ہے۔ الفاظ و معانی پر ہر کوئی غور کرتا ہے مگر یہ جب غور و فکر کرتا ہے تو اس پر الہامی دروازے کھل جاتے ہیں اور انوارِ ملاء اعلیٰ

اس کے شاملِ حال ہو جاتے ہیں۔

ان غور وفکر کرنے والوں کا ذکر سورۂ آل عمران میں یوں کیا گیا ہے:

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○[1]

یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور (سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اس کی عظمت اور حُسن کے جلووں) میں فکر کرتے رہتے ہیں (پھر اس کی معرفت سے لذت آشنا ہو کر پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا، تو (سب کوتاہیوں اور مجبوریوں سے) پاک ہے پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے ○

الغرض اس کی عقل میں ایسی چیزیں آتی ہیں جن سے دوسرے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ یہ مرتبہ الہام کی ہی ایک شکل ہے اور یہ نچلا مرتبہ ہے۔

(ب) مرتبہ عالیہ

اس علمِ خفی کا ایک درجہ مرتبۂ عالیہ بھی ہے۔ مرتبۂ عالیہ یہ ہے کہ اُس کے قلب کو خطاب کیا جاتا ہے۔ وہ چیزوں کو سنتا ہے اور اس کے قلب پر مختلف اقسام کی نورانی تجلیات کا ورود ہوتا ہے۔ یہ تجلیات قلب پر نازل ہو کر علوم و معارف، فہم و ادراک اور حقائق سے آگاہی دیتی ہیں۔

بعض اوقات یہاں تعبیر کرتے ہوئے عارف کو مغالطہ بھی لگ سکتا ہے۔ اگر سالک صلاحیت اور مرتبہ میں تھوڑا ناقص ہے تو وہ اس تجلی کو- جو بظاہر اس قدر واضح اور عیاں ہوتی ہے

(۱) آل عمران، ۳: ۱۹۱

- خود سے خطاب سمجھ بیٹھتا ہے۔ ہم میں سے اکثر نے اپنی عملی زندگی میں یہ دیکھا اور محسوس کیا ہوگا کہ کئی بار اچانک ایک خیال القاء ہوتا ہے یا اس طرح سمجھتے ہیں کہ جیسے کسی نے ہمیں آواز دی ہے، یا باہر کسی نے دروازہ پر دستک دی ہے۔ گھر والے کہتے ہیں کہ ایسی کوئی آواز نہیں آئی، مگر ہم اصرار کرتے ہیں کہ میں نے ایسی آواز خود سنی ہے۔

یہ تو عام روزمرہ کی بات ہے چہ جائیکہ اس کا مرتبہ عالم ملکوت و جبروت کے خطاب کا ہو۔ وہ تجلی تو روزِ روشن کی طرح اتنی واضح ہوتی ہے کہ بعض اوقات وصول کرنے والا اسے براہِ راست خطاب سمجھ کر اس پر یقین کر لیتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ آواز، حروف اور الفاظ کا خطاب نہیں ہوتا، بلکہ دراصل اُس کے فہم میں غلطی ہوتی ہے۔ جوں جوں درجہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے اور صفائے قلب کی سطح مرتبۂ روحانیت میں اونچی ہوتی چلی جاتی ہے تو مغالطے کے امکانات بھی کم سے کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس طرح کا خطاب آواز، الفاظ اور حروف کا نہیں ہوتا بلکہ یہ مخاطبہ بشکلِ تجلی ہوتا ہے۔

یہ دراصل کشف کی بنیادی شکل ہوتی ہے۔ ابھی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ مکمل پردہ اٹھ گیا ہو۔ یہ کبھی ہلکے پردوں کے پیچھے سے نظر آتا ہے، کبھی مخاطبہ کی شکل میں سنائی دیتا ہے لیکن اس مقام پر اتنی بات ضرور ہے کہ سالک کا بہرا پن اور اندھا پن ختم ہو چکا ہے۔ اب صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ والا معاملہ نہیں رہا، جیسا کہ قرآن مجید نے کہا ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ○[1]

تو حقیقت یہ ہے کہ (ایسوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں○

(ii) اِلہام کے راستے میں آنے والے حجابات

بندہ جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو غائب ظاہر ہونے لگتا ہے اور علوم مزید ترقی پاتے

(۱) الحج، ۲۲: ۴۶

چلے جاتے ہیں۔ یہ تجلیات کی ایک شکل ہوتی ہے۔ اس کے آگے علم لدنی کا مرتبہ آتا ہے، پھر درجہ بدرجہ حجابات اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے جیسے حجابات اٹھتے چلے جاتے ہیں ویسے ویسے پردے کے پیچھے سے صاف نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ حجابات مختلف اشکال کے ہوتے ہیں۔

ذیل میں ان میں سے کچھ حجابات کا ذکر کیا جا رہا ہے:

(ا) الحُجب العقدية

سب سے پہلے عقیدے کی خرابیاں قلب و باطن اور روح کے حجابات کا روپ دھار لیتی ہیں، جو بظاہر نظر نہیں آتیں۔ اس لیے سب سے پہلے عقائد کا درست ہونا لازمی ہے۔ صحابہ کرام ﷺ، تابعین اور اتباع التابعین سے منقول اور مروی ہے کہ ہم قرآن مجید کی قراءت اور تلاوت سیکھنے سے پہلے عقیدۂ صحیحہ سیکھا کرتے تھے۔ ایمان کی تعلیم لیتے تھے کہ عقیدہ کیا ہے؟ چونکہ اگر ہمارا بنیادی عقیدہ ہی درست نہیں ہے تو اس کا حجاب ایسا ہے کہ وہ کبھی ہدایت کی طرف آنے ہی نہیں دے گا۔ یہ دورِ پرفتن ہے۔ غلط عقیدے والا بھی تو قرآن کا ہی حوالہ دیتا نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ قرآن کو ہی پڑھ رہا ہے مگر شیاطین اس کے نفس کے اندر غلط الہام کر رہے ہوتے ہیں، آنکھوں پر حجابات ہیں اور عقل و قلب نور سے خالی ہیں۔ قرآن حکیم کا درج ذیل فرمان اسی امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا.[1]

(اس طرح) اللہ ایک ہی بات کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گم راہ ٹھہراتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔

(ب) الحُجب القولية

یہ دوسرا حجاب ہے۔ اسے قولیہ اس لیے کہتے ہیں کہ غلط اور گم راہ کن اقوال سے عقائد میں حجابات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) البقرة، ۲: ۲۶

(ج) الحُجب العملية

غلط اعمال سے بھی حجابات پیدا ہوتے ہیں۔ دل کے اوپر حجاب در حجاب، پردہ در پردہ گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نیکی، تقویٰ اور سلوک و طریقت کی راہ میں جد و جہد کرنے والوں سے سرزد ہونے والے غلط اعمال ہی ان کے لیے حجاب بن جاتے ہیں۔

(د) حجب الكبائر الباطنة

جس طرح نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ ظاہری اَعمالِ صالحہ ہیں، اُسی طرح باطنی اَعمالِ صالحہ بھی ہیں جیسے، صدق، اخلاص، توجہ اِلی اللہ، قربِ الٰہی اور اَخلاقِ حسنہ۔ یہ اعمالِ صالحہ کا باطن ہیں اور یہ سارے اُمور باطن میں نیت کو بہتر کرتے ہیں۔ جس طرح تکبر، شرک، قتل، بدکاری اور والدین کی نافرمانی وغیرہ ظاہری گناہِ کبیرہ ہیں، اسی طرح باطنی گناہِ کبیرہ بھی ہیں، جیسے تکبر، غضب، کبر، ریاکاری، حسد، غرور اور نفس پرستی وغیرہ۔ یہ وہ کبائر ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے۔ گناہِ کبیرہ باطنیہ کے حجابات ہمارے ظاہری گناہِ کبیرہ کی نسبت زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ ظاہری گناہِ کبیرہ کے حجابات اتنے کثیف نہیں ہوتے، وہ پردے جلد اٹھ جاتے ہیں مگر اس کے برعکس تکبر، غضب، ریاکاری، حسد، حرص اور دوسروں کو حقیر اور گھٹیا سمجھنا وغیرہ ایسے باطنی حجابات ہیں کہ ان کا ختم ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ان کے لیے کڑی ریاضت اور سخت مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

(ر) حجب الصغائر الباطنة

بہت ساری چھوٹی چھوٹی نافرمانیاں اور غفلتیں جو انسان سے خطیئات و سیئات اور ذلات کی شکل میں سرزد ہوتی رہتی ہیں وہ سب صغائر گناہ ہیں۔ ہر صغیرہ گناہ کا بھی ایک حجاب ہوتا ہے۔

(س) حجب الغفلة

غفلت کے بھی حجابات ہوتے ہیں۔ اس کی دو اقسام ہیں:

(i) حجب التوسع فی المباحات

اس سے مراد ہے کہ ہر مباح کام کو کرنے کی طبیعت میں رغبت پیدا ہو جانا۔ جہاں مباح نظر آئے، جو منع نہیں، وہ کام کر گزرنا۔ جہاں رخصت نظر آئے، عزیمت سے بچتے ہوئے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا۔ تقویٰ و پرہیزگاری اور ایسی عبادت جس میں زیادہ محنت کرنا پڑے، اس سے بچنا۔ جہاں آسانی نظر آئے اور اس کی طرف طبیعت راغب ہو جائے تو اسے حجب التوسع فی المباحات کہتے ہیں۔

(ii) حجب التوسع فی الغفلات

جب سالک غفلتوں کی طرف سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان کا مرتکب ہو جاتا ہے تو اس کا یہ عمل توسع فی الغفلات کے ذیل میں آتا ہے۔ اس کے بھی بڑے حجابات ہوتے ہیں اور اگر یہ حجابات پڑے رہیں تو انسان روحانی سفر طے نہیں کر پاتا، بلکہ یہ سلسلہ رک جاتا ہے۔

(ص) حجب الخواطر

یہ بھی حجابات ہیں کہ آدمی اللہ کا سالک ہو کر راہِ حق پر جا رہا ہے، مگر نیت کے حوالے سے اس کا دھیان اللہ کی خالص رضا سے دائیں اور بائیں کی چیزوں میں بھی ساتھ ساتھ تقسیم ہوتا چلا جائے۔ اس کا خیال کشف و کرامات اور روحانی مقامات و درجات میں لگ جائے تو وہ ہر خیال اور دھیان جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی قربت، اس کی رضا کا متقاضی ہوتا ہے، اس سے ہٹ جائے گا اور یہ سارے خیالات اس کی نیت میں آتے چلے جائیں گے۔ یاد رہے کہ یہ گرد و غبار ہے۔ یہ مکدر پن اس کی نیت میں آ کر حجاب کا باعث بنتا ہے اور اس کی باطنی حالت کو خراب کرتا ہے۔

یہاں ہم نے چند حجابات کا ذکر کیا ہے۔ الہام کے راستے میں یہ حجابات اگر بتدریج اٹھتے چلے جائیں تو علمِ خفی کا درجہ بلند سے بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے اور کشف بھی بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کا قلب سماعت کرنے لگتا ہے۔

(۳) مرتبۂ اِفہام

علمِ خفی کا تیسرا مرتبہ 'افہام' ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کے دل کو وہ فہم نصیب ہوتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے عام آدمی کے پاس نہیں رکھا ہوتا۔ جیسے حضرت سلیمان ﷺ اور حضرت داؤد ﷺ کے لیے فرمایا:

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا.(۱)

چنانچہ ہم ہی نے سلیمان (ﷺ) کو وہ (فیصلہ کرنے کا طریقہ) سکھایا تھا اور ہم نے ان سب کو حکمت اور علم سے نوازا تھا۔

خصوصی فہم اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے۔ یہ فہم خاص اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے۔ صحابہ کرام ﷺ میں سے بھی بعض کے ساتھ یہ مخصوص تھا۔ اِس فہمِ خاص سے مراد وہ ادراک نہیں ہے جو عام عقل وحواس کے ذریعے لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

حضرت عمر ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷺ کو خط بھیجا۔ اس میں انہوں نے فرمایا:

أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّ الْقَضَاءَ فَرِيْضَةٌ مُحْكَمَةٌ، وَسُنَّةٌ مُتَّبَعَةٌ، فَافْهَمْ إِذَا أُدْلِيَ إِلَيْکَ بِحُجَّةٍ. ..... اَلْفَهْمَ الْفَهْمَ فِيْمَا يُخْتَلَجُ فِي صَدْرِکَ مِمَّا لَمْ يَبْلُغْکَ فِي الْکِتَابِ أَوِ السُّنَّةِ، اعْرِفِ الْأَمْثَالَ وَالْأَشْبَاهَ، ثُمَّ قِسِ الْأُمُوْرَ عِنْدَ ذٰلِکَ فَاعْمَدْ إِلٰى أَحَبِّهَا عِنْدَ اللهِ وَأَشْبَهِهَا بِالْحَقِّ فِيْمَا تَرٰى.(۲)

---

(۱) الأنبياء، ۲۱: ۷۹

(۲) ۱۔ دار قطني، السنن، کتاب في أقضية والأحکام، باب کتاب عمر إلى ـــ

اما بعد! منصبِ قضاء پر فائز ہونا ایک بڑی ذمہ داری ہے اور یہ اتباع کرنے والی سنت بھی ہے۔ جب تیرے پاس کوئی دلیل لائی جائے تو اُسے خوب سمجھ لے۔ ..... فہم اس بات کے بارے میں ہوتا ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور جس کے بارے میں قرآن و حدیث سے تجھے کوئی چیز نہ پہنچے۔ ایک جیسی اور مشابہ چیزوں کی خوب چھان بین کر لیا کرو۔ پھر اُس وقت کسی اَمر کا دوسرے پر قیاس کرو اور اس بات پر اعتماد کرو جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پسندیدہ ہو اور تیری رائے میں حق بات کے زیادہ قریب ہو۔

گویا حضرت عمر فاروق ﷺ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیے گئے فہم اور استعداد سے معاملہ کو سمجھنے اور انہیں استعمال کرنے کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں کہ جب کوئی عقلی یا قرآن وسنت کی دلیل سے بات کرے تو اس میں غور وفکر کرتے ہوئے فہم کا استعمال کیا کرو۔

حضرت عمر فاروق ﷺ اس خط میں دو مختلف مواقع پر اَلْفَهْم کو بیان کر رہے ہیں۔ پہلے فہم کا تعلق دلیلِ ظاہری کے ساتھ تھا، وہاں **فہمِ عقلی** کی بات تھی کہ عقل کے فہم سے کام لے۔ اب بات یہ ہو رہی ہے کہ اگر دل میں کوئی کھٹکا آ جائے، کوئی شک پیدا ہو جائے اور اطمینان قلب نہ ہو تو **فہمِ قلبی** سے کام لیا جائے۔ یہ فہمِ قلبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کے ذریعے کشفِ قلبی کی شکل میں بندے کو نصیب ہوتا ہے اور یہی مرتبہ افہام ہے۔

حضرت فاروق اعظم ﷺ صحابہ کرام ﷺ میں سے جسے قاضی یا جج مقرر کرتے تو ان کے لیے یہ ہدایات فرماتے تھے۔ حضرت فاروق اعظم کا یہ خط بہت جامع ہے لیکن یہاں صرف متعلقہ حصہ بیان کیا گیا ہے۔

..... أبی موسیٰ الأشعری، ۴: ۲۰۶-۲۰۷، رقم: ۱۵-۱۶

۲۔ بیہقی، السنن الکبری، ۱۰: ۱۵۰، رقم: ۲۰۳۲۴

۳۔ بیہقی، معرفة السنن والآثار، ۷: ۳۶۶-۳۶۷، رقم: ۵۸۷۳

۴۔ خطیب بغدادی، الفقیه والمتفقه، ۱: ۴۹۲

فہم کا دروازہ عقل و دماغ کی بجائے قلب سے کھلتا ہے۔ اس کی ایک مثال علامہ ابن القیم سے لیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

اَلْفَهْمُ نِعْمَةٌ مِنْ نِعَمِ اللهِ عَلٰى عَبْدِهٖ وَنُوْرٌ يَقْذِفُهُ اللهُ فِي قَلْبِهٖ، وَيَعْرِفُ بِهٖ وَيُدْرِكُ مَا لَا يُدْرِكُهُ غَيْرُهُ وَلَا يَعْرِفُهُ، فَيَفْهَمُ مِنَ النَّصِّ مَا لَا يَفْهَمُهُ غَيْرُهُ مَعَ اسْتِوَائِهِمَا فِي حِفْظِهٖ وَفَهْمٌ أَصْلُ مَعْنَاهُ. فَالْفَهْمُ عَنِ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ ﷺ عُنْوَانُ الصِّدِّيْقِيَّةِ وَمَنْشُوْرُ الْوِلَايَةِ النَّبَوِيَّةِ.[1]

یہ فہم اللہ کی اپنے بندے پر کی گئی نعمتوں سے ایک نعمت ہے اور یہ وہ نور ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے قلب میں اتارتا ہے۔ پھر بندہ اس نور کے ذریعے وہ کچھ جان اور پہچان لیتا ہے، جو کوئی دوسرا جان اور پہچان نہیں سکتا۔ پھر بندہ نص سے وہ کچھ سمجھ لیتا ہے جو کوئی اور سمجھ نہیں سکتا، حالانکہ اس نص کو یاد کرنے میں دونوں برابر ہوتے ہیں۔ یہ فہم کا حقیقی مفہوم ہے۔ اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے فہم نصیب ہو تو یہ صدیقیت کا عنوان اور ولایتِ نبوی کا منشور ہے۔

علامہ ابن القیم نے یہاں مثال دی ہے کہ ایک دن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تشریف فرما تھے۔ حاضرینِ مجلس میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما (جو ابھی نوجوان تھے) بھی موجود تھے۔ انہوں نے درج ذیل آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ ○[2]

جب اللہ کی مدد اور فتح آ پہنچے ○

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ بھلا اس سورت میں کیا خاص بات کہی گئی ہے؟ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ اللہ کی فتح اور نصرت کا بیان ہوا ہے، مگر حضرت عبد اللہ

---

(۱) ابن القیم، مدارج السالکین، ۱: ۴۱

(۲) النصر، ۱۱۰: ۱

بن عباس ﷺ کا جواب تمام صحابہ ﷺ سے مختلف تھا۔ آپ ﷺ نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں حضور نبی اکرم ﷺ کے وصال فرما جانے کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک مکمل ہوگئی ہے اور اب آپ ﷺ کا اس دنیائے فانی سے رحلت فرمانے کا وقت قریب ہے۔[1]

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ آپ ﷺ کی جد و جہد کو منزل مقصود تک پہنچاؤں گا۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًاo[2]

(اے حبیبِ مکرم!) بے شک ہم نے آپ کے لیے (اسلام کی) روشن فتح (اور غلبہ) کا فیصلہ فرما دیا (اس لیے کہ آپ کی عظیم جدّ وجہد کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جائے)o

یعنی فتح کی منزل کے پہنچنے تک مدد نازل فرماؤں گا۔ لہٰذا میں اس سورۃ النصر کے نزول سے میں سمجھ گیا کہ چونکہ فتح کی تکمیل کی شکل میں وعدہ اُلوہیت مکمل ہو گیا ہے، لہٰذا اب حضور نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک بھی پوری ہونے والی ہے اور ان کا اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔

یہ وہ فہمِ خاص ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ کو حاصل تھا، جس کا چشمہ ملاء اعلیٰ اور عالم ملکوت کی طرف سے الہامِ ربانی کی شکل میں قلب سے پھوٹتا ہے۔ حالانکہ اس وقت ان سے بڑے جلیل القدر صحابہ ﷺ بھی موجود تھے، مگر ان میں سے کسی کا فہم اس طرف نہ جا سکا کیونکہ سورت کی کسی آیت میں یہ بات واضح طور پر موجود نہیں تھی۔ چنانچہ پردوں کے اندر کیا کیا لطائف باطنی پنہاں ہیں، ان کا ادراک اور معرفت صرف انہی کو نصیب ہوتی ہے جن پر فہم کا دروازہ تجلّیِ حق کی صورت میں کھل گیا ہوتا ہے۔

---

(۱) ۱۔ ابن القیم، مدارج السالکین، ۱: ۴۱
۲۔ ابن عربي، أحکام القرآن، ۴: ۲۰۱
۳۔ سیوطي، الدر المنثور، ۸: ۶۶۲

(۲) الفتح، ۴۸: ۱

(۴) مرتبۂ بیان

علم خفی کے چوتھے مرتبہ و درجے پر بندۂ خاص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و باطل میں تمیز کر دینے والا بیان عطا ہوتا ہے۔ بات کو پڑھتے یا سنتے ہی فہمِ خاص کی بدولت صاحبِ علمِ باطن تمیز کر لیتا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے۔ اگرچہ آیات اور کلام ہر کوئی سنتا ہے، کتاب ہر کوئی پڑھتا ہے، دلائل ہر کوئی سنتا اور بیان کرتا ہے مگر بیانِ خاص صرف انہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جن کے ظاہری حواس کے اندر تجلیِ حق کا نور شامل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ظاہری حواس اور عقل کو بھی روشن فرما دیتا ہے اور اس کے قلب کے ذریعے علم و معرفت کے چشمے کھول دیتا ہے۔

(۵) مرتبۂ تحدیث

یہ علم خفی کا پانچواں درجہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان اقدس ہے:

قَدْ كَانَ يَكُوْنُ فِي الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ مُحَدَّثُوْنَ فَإِنْ يَكُنْ فِي أُمَّتِي مِنْهُمْ أَحَدٌ، فَإِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ مِنْهُمْ.

وقَالَ ابْنُ وَهْبٍ: تَفْسِيْرُ 'مُحَدَّثُوْنَ' مُلْهَمُوْنَ.[1]

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب فضائل الصحابة، باب مناقب عمر بن الخطاب ﷺ، ۳: ۱۳۴۹، رقم: ۳۴۸۶

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الأنبیاء، باب أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ، ۳:۱۲۷۹، رقم: ۳۲۸۲

۳۔ مسلم، الصحیح، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر ﷺ، ۴:۱۸۶۴، رقم: ۲۳۹۸

۴۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۶:۵۵، رقم: ۲۴۳۳۰

۵۔ ترمذی، السنن، کتاب المناقب، باب فی مناقب عمر بن الخطاب ﷺ، ۵:۶۲۲، رقم: ۳۶۹۳

تم سے پہلی اُمتوں میں محدَّث ہوتے تھے۔ اُن جیسا اگر کوئی ایک بھی میری اُمت میں ہوا تو وہ عمر بن خطاب ہوگا۔

ابن وہب نے کہا ہے کہ محدَّث اس شخص کو کہتے ہیں جس پر الہام کیا جاتا ہو۔

ایک روایت میں حضرت ابوسعید خدری ﷺ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام ﷺ نے پوچھا:

يَا رَسُوْلَ اللهِ، كَيْفَ مُحَدَّثٌ؟

یا رسول اللہ! اس الہام کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

تَتَكَلَّمُ الْمَلَائِكَةُ عَلٰى لِسَانِهٖ. (۱)

اس کی زبان پر فرشتے بولتے ہیں۔

یہ وہ مرتبہ تحدیث ہے کہ جہاں مخاطبہ ہوتا ہے۔ تجلیاتِ حق قلب پر اتنی غالب ہو جاتی ہیں کہ کلام بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے اور بندہ اسے تراشتا یا بناتا نہیں ہے۔ دراصل اس کی زبان سے ملائکہ بول رہے ہوتے ہیں۔ اس پر عالم ملکوت اور عالم جبروت سے القاء ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ الفاظ وحروف کی شکل میں زبان سے ادا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس مقام پر ایک طرف بندے کے قلب کا ملاء اعلیٰ سے رشتہ جڑا ہوتا ہے اور دوسری طرف قلب کا اس کی زبان کے ساتھ تعلق قائم ہوا ہوتا ہے۔ یہاں اُس کی زبان عقل سے پوچھ کر الفاظ، معانی، مضامین اور مفاہیم کو تراش کر بیان نہیں کر رہی ہوتی۔ دیکھنے میں عمل وہی ہوتا ہے مگر وہ مضامین کبھی ملاء اعلیٰ، کبھی ملکوت، کبھی جبروت اور کبھی لاہوت سے تجلیاتِ ربانی کی صورت میں اس کے قلب پر وارد ہوتے ہیں۔ یہ تجلیات الفاظ، زبان اور کلمات کی شکل میں بندہ کی زبان سے ادا ہو رہی ہوتی ہیں۔ جب یہ کیفیت ہو جائے تو یہ مرتبہ تحدیث ہے کہ اس کی زبان سے ملائکہ بولتے

---

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الأوسط، ۷:۱۸، رقم: ۶۷۲۶

۲۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۹: ۶۹

ہیں۔ اگر وہ الفاظ بن کر زباں سے نہیں نکلتے بلکہ تجلی دل پر پڑی اور اس کی تاویل وتشریح کی یا معنی سمجھ لیا تو پھر اس تجلی کو تحدیث نہیں کہتے ہیں بلکہ وہ مرتبہ الہام رہا۔ الہام ہی کا ایک اونچا درجہ مرتبہ تحدیث ہے۔

اگر قلب پر تجلیات وارد ہوں اور ان تجلیات کی تعبیر و تاویل یا تشریح کی جائے جیسے خواب میں عالم مثال کی دیکھی گئی چیزوں کی تعبیر و تاویل کی جاتی ہے، تو یہ دراصل کشف کی ایک شکل ہوتی ہے اور ہم اس کی تعبیر اور تاویل کرتے ہیں۔ کبھی مرتبہ اس سے بھی اونچا ہو جاتا ہے، وہ افہام اور بیان کا مرتبہ ہے، وہ اسماع کا مرتبہ ہے۔ اگر الہام کے مراتب اس سے اور اونچے ہو جائیں اور پردے مزید اٹھ جائیں، قلب کو مزید صفا نصیب ہو جائے تو پھر تجلیِ حق جو قلب پر اُتری تھی وہ الفاظ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر زبان سے بندہ جو کچھ کہتا ہے بسا اوقات اس کو خود خبر نہیں ہوتی کہ میری زبان سے کیا ادا ہوگیا ہے۔ اس وقت اُس کی زبان قلب کے خزانے سے علم لے رہی ہوتی ہے اور قلب یہ سارے علوم و معارف ملاء اعلیٰ، عالمِ جبروت اور عالمِ ملکوت سے حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا تعلق اب بذریعہ قلب و روح عالم بالا کے ساتھ ملا ہوتا ہے۔ اگر اس مرتبے پر صاحبِ الہام اور صاحبِ ولایت پہنچ جائے تو وہ مرتبہ تحدیث ہے جسے محدَّث اور مکلَّم کا نام خود حضور نبی اکرم ﷺ نے عطا فرمایا ہے۔

باب نمبر 14

کشف اور علمِ لدنی

کشف سے مراد پردے کا اٹھ جانا ہے۔ اِسی سے مکاشفہ ہے۔ بندہ جیسے جیسے نفس کی کدورتوں، رزائل اور کثافتوں سے پاک ہوتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے قلب کا تصفیہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کیفیت میں مومنین اور صالحین کو صفائے قلب نصیب ہوتا ہے اور دل کا آئینہ گناہوں کی گرد وغبار سے اجلا ہو کر حق کی تجلیوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ قرآن مجید میں کشف کا لفظ کچھ اس معنی میں آیا ہے:

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ○[1]

حقیقت میں تُو اِس (دن) سے غفلت میں پڑا رہا سو ہم نے تیرا پردۂ (غفلت) ہٹا دیا پس آج تیری نگاہ تیز ہے○

آیت مبارکہ میں مذکور وہ پردہ کیا ہے جس کے ہٹانے کو قرآن لفظِ کشف کے ذریعے بیان کر رہا ہے؟ آیئے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

ا۔ کشف اور حجابات

گزشتہ ابواب میں ہم حجابات کی مختلف اقسام کا مطالعہ کر چکے کہ حجابات مختلف اقسام کے پردے ہیں جو انسان کے دل پر پڑے ہوئے ہیں۔ اِن حجابات کو دور کئے بغیر روحانی ترقی ممکن نہیں ہوتی۔ اِن حجابات کے علاوہ مختلف انواع کی سیاہیاں بھی ہیں جو اَعمال سیئہ اور برے اخلاق کے نتیجے میں دل کو سیاہ کرتی ہیں۔ ان سیاہیوں کے علاوہ دل کے درج ذیل زنگ بھی

(ا) قٓ، ۵۰: ۲۲

ہیں جو انسانی دل پر چھائے ہوئے ہیں:

(۱) غین

یہ دِل پر چھانے والے زنگ میں سے ہلکی قسم ہے، جس میں دل پر چھوٹی موٹی گرد و غبار پڑ جاتی ہے۔ یہ نہایت ہلکا حجاب ہوتا ہے۔

(۲) غیم

یہ غین سے زیادہ کثیف حجاب ہوتا ہے۔

(۳) ران

غیم سے کثیف حجاب کو رَین اور **ران** کہتے ہیں۔

اِن حجابات کا ذکر قرآن مجید اور احادیثِ نبوی میں مختلف حوالوں سے آیا ہے۔ ان حجابات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بندے کو علم ہو کہ دل پر چھانے والا حجاب کس نوعیت کا ہے؟ وہ حجاب کتنا پتلا اور کتنا زیادہ سخت ہے۔ حجابات کے اٹھنے کے عمل کو رفعِ حُجب کہتے ہیں۔ جب ہماری آنکھوں کے سامنے ایک پردہ بھی پڑا ہو تو ہمیں واضح نظر نہیں آتا۔ سادہ سی بات ہے کہ اگر پردہ اٹھا دیں تو کیا ہوتا ہے؟ جو کچھ ورائے حجاب یعنی پردے کے پیچھے تھا وہ سب کچھ نظر آنے لگ جاتا ہے۔ یہ پردے کیسے اُٹھتے ہیں؟ دراصل یہ سب کشف ہی کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم اِس پر تفصیل سے گفتگو (discuss) کر آئے ہیں کہ جس طرح جسمانی کان، آنکھیں اور زبان ہوتے ہیں، عین اِسی طرح قلب کی بھی آنکھیں، کان اور زبان ہیں۔ قلب اپنی زبان سے اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ قلب اپنے کانوں سے مخاطبات اور فرشتوں کے کلمات کو سنتا ہے۔ اِسی طرح قلب اپنی آنکھوں سے مغیّبات یعنی غیب کی چیزوں کو واضح طور پر دیکھتا ہے جنہیں سر کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ قلب (دل) پر چونکہ چھوٹے، بڑے، ظاہری

اور باطنی گناہوں، برے عقائد و خیالات، بری باتوں، شہوات اور طرح طرح کے حجابات پڑے ہوئے ہوتے ہیں، حتیٰ کہ غفلتوں، اعلیٰ کاموں کو چھوڑ کر ادنیٰ کام کرنے اور مباحات کی کثرت جیسے اعمال کے پردے حائل ہوتے ہیں؛ لہٰذا جیسے جیسے ریاضات و مجاہدات اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں گناہوں کی سیاہی دھلتی چلی جاتی ہے، ویسے ویسے دل سے پردے اور حجابات بھی اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا.[1]

اور جو لوگ ہمارے حق میں جہاد (یعنی مجاہدہ) کرتے ہیں تو ہم یقیناً انہیں اپنی (طرف سَیر اور وصول کی) راہیں دکھا دیتے ہیں۔

راستوں کے کھول دینے سے مراد انہی حجابات کا اٹھا دینا اور انہی راستوں کا کھلنا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب پردے اٹھتے ہیں تو تبھی راستے کھلتے ہیں۔ سو اس بنیادی تصور کا نام ہی 'کشف' اور 'مکاشفہ' ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں لفظ 'کشف' کا استعمال اور اس کے معانی

قرآن مجید میں کشف کو جن معانی میں استعمال کیا گیا ہے، آیئے! ان پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

(۱) غفلت کا پردہ اٹھ جانا

قرآن مجید نے سورۃ ق کی آیت نمبر 22 میں اِس لفظ کو پردۂ غفلت اُٹھا دینے کے معنی میں استعمال فرمایا ہے:

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَ كَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ

(۱) العنکبوت، ۲۹:۶۹

حَدِیْدٌ○[1]

حقیقت میں تُو اِس (دن) سے غفلت میں پڑا رہا سو ہم نے تیرا پردۂ (غفلت) ہٹا دیا پس آج تیری نگاہ تیز ہے○

اس آیتِ مبارکہ میں غفلت اور کشف کے درمیان ایک تناسب بیان کیا گیا ہے کہ غفلت دراصل قلب پر پردے ڈالتی ہے اور کشف اُن پردوں کو اٹھا دیتا ہے۔ اِس آیت کریمہ میں ان دونوں چیزوں کا ورود ہوا ہے کہ انسان حقیقت میں یوم حشر سے غفلت میں پڑا ہوا تھا اور اس غفلت نے اس کے دل کو اندھا کر دیا تھا کہ اُس کا دل آنے والے روزِ قیامت کو اللہ کے حضور پیش ہونے کو دیکھ سکے، سمجھ سکے اور اُس کی معرفت حاصل کر سکے۔ پھر کیا ہوا؟ اس سے غفلت کے پردہ کو ہٹا دیا گیا۔ یعنی کل تک جو کچھ پنہاں تھا، غفلت کا پردہ اٹھ جانے کے بعد آج وہ ہر چیز کو عیاں دیکھ کر اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

(۲) قیامت کی ہولناکیوں سے پردہ اُٹھ جانا

قرآن مجید نے قیامت کے دن کے احوال کا بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ○[2]

جس دن ساق (یعنی اَحوالِ قیامت کی ہولناک شدت) سے پردہ اٹھایا جائے گا اور وہ (نافرمان) لوگ سجدہ کے لیے بلائے جائیں گے تو وہ (سجدہ) نہ کر سکیں گے○

روزِ محشر وہ دن ہوگا جس دن ساق سے پردہ اُٹھایا جائے گا۔ یہاں احوالِ قیامت کی ہولناکیوں اور شدتوں کو 'ساق' کہا گیا ہے۔ ان سے انسان پریشان ہوں گے۔ تاحال جو کچھ وہ نہیں دیکھ سکتے تھے اب اُنہیں واضح نظر آنے لگ جائے گا۔ اُنہیں دعوت دی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤ مگر وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔

---

(۱) قٓ، ۵۰: ۲۲

(۲) القلم، ۶۸: ۴۲

حضرت قتادہ التابعی نے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن کا کشف (یعنی پردے کا اُٹھنا) قیامت کی ہولناکیوں، شدائد اور مشکلات سے ہوگا۔[1]

(۳) عظیم نور سے پردہ اُٹھ جانا

صحابہ کرام ﷺ اور تابعین نے 'ساق' کے کئی اور معانی بھی بیان کیے ہیں۔ امام بخاری نے 'صحیح بخاری' کی کتاب التفسیر میں 'بَابُ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ' کے عنوان سے باب قائم کیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری ﷺ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

يَكْشِفُ رَبُّنَا عَنْ سَاقِهِ.[2]

ہمارا رب اُس دن اپنی ساق سے پردہ اُٹھا دے گا۔

یعنی کشف کر دیا جائے گا۔ لوگوں کی آنکھوں سے پردے اٹھ جائیں گے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷺ 'ساق' کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ[3]، قَالَ: عَنْ نُوْرٍ عَظِيْمٍ يَخِرُّوْنَ لَهُ سُجَّدًا.[4]

---

(۱) ۱۔ طبری، جامع البیان، ۲۹:۳۹
۲۔ سیوطی، الدر المنثور، ۸:۲۵۶

(۲) بخاری، الصحیح، کتاب التفسیر، باب: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾، ۴: ۱۸۷۱، رقم: ۴۶۳۵

(۳) القلم، ۶۸:۴۲

(۴) ۱۔ أبو یعلی، المسند، ۱۳: ۲۶۹، رقم: ۷۲۸۳
۲۔ عسقلانی، فتح الباری، ۸: ۶۶۴
۳۔ سیوطی، الدر المنثور، ۸: ۲۵۴
۴۔ ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح، ۱۰: ۲۰۱
۵۔ شوکانی، فتح القدیر، ۵: ۲۷۸

جس دن ساق سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ فرمایا: اس سے مراد ایک عظیم نور (نورِ الٰہی) ہے جسے دیکھتے ہی سب (مؤمنین) سجدے میں گر جائیں گے۔

عظیم نور سے مراد جلوۂ حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اَنوار و تجلیات اُنہیں غفلت اور کفر و فسق کے پردے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہے ہوں گے۔ چنانچہ پردہ اُٹھتے ہی وہ نورِ حق کا جلوہ کریں گے۔

اِس کے علاوہ 'صحیح بخاری'، 'صحیح مسلم' اور صحاح ستہ کی کتب میں کئی احادیث موجود ہیں جہاں لفظِ کشف سے مراد اللہ تعالیٰ کے چہرۂ قدرت اور جمالِ حق سے پردہ اٹھنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ کبھی نورِ ربانی نظر آنے کے لیے پردے کا اٹھانا اور کشف کے لفظ کا ذکر آیا ہے۔ گویا کشف کا معنی کسی چیز سے پردہ اٹھانا ہے۔ وہ پردہ سر کی آنکھوں سے بھی اٹھایا جا سکتا ہے اور دل کی آنکھوں سے بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ کشف ہونے سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ دل دیکھنے سے قاصر تھا، پردہ اٹھ جانے سے وہ چیز واضح نظر آ جائے۔

۳۔ کشف کی اصطلاحی تعریف

کشف کے لغوی معنی کے بعد اب کشف کی اصطلاحی تعریف پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

امام جرجانی 'التعریفات' میں کشف کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هُوَ الْاِطِّلَاعُ عَلٰى مَا وَرَاءَ الْحِجَابِ مِنَ الْمَعَانِيِّ الْغَيْبِيَّةِ وَالْأُمُوْرِ الْحَقِيْقِيَّةِ وُجُوْدًا وَشُهُوْدًا. (۱)

کشف سے مراد وہ علم ہے جو غیب کے معانی سے پردہ اُٹھا دے، جو حقیقت میں موجود ہوں اور ظاہر بھی ہوں۔

اِس تعریف میں **چار چیزیں** قابل توجہ ہیں:

---

(۱) الجرجانی، التعریفات، ۱: ۲۳۷

۱۔ غیبی معانی

۲۔ اُمورِ حقیقیہ

۳۔ وجود

۴۔ شہود

(۱) قرآن مجید کے غیبی معانی سے پردہ اُٹھنا

قرآن مجید کے **غیبی معانی** سے پردہ اُٹھ جائے تو یہ بھی کشف ہے۔ جیسا کہ پہلے کئی روایات بیان ہوئی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید کی آیات کریمہ کے بارے میں فرمایا:

لِكُلِّ آيَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ. (۱)

ہر ایک آیت کا ایک ظاہری معنی ہے اور ایک باطنی معنی ہے۔

ابتدائی مقامات پر فائز اولیاء، عرفاء، اصحابِ کشف، اصحابِ علمِ لدنی باطنی معنی کی اس ابتدا تک رسائی حاصل کرتے ہیں، جب کہ معارف اور اسرار و رموز کے اعلیٰ درجے کے منتہی اولیاء، عرفاء، اہل کشف اور اہلِ علمِ لدنی باطنی معنی کی اس انتہا تک رسائی رکھتے ہیں۔ گویا قرآن مجید، احادیث نبویہ اور احکام شرعیہ کے اندر چھپے ہوئے اسرار و رموز، معارف اور آیات کے مختلف معانی سے پردہ اُٹھ جانا کشف کہلاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے قلب اور نفس کو تزکیہ اور تصفیہ عطا کر کے اُس کے قلب کے وہ تمام پردے یوں اٹھا دے کہ اُس پر مخفی اور غیبی معانی

---

(۱) ۱۔ ابن حبان، الصحیح، ۱:۲۷۶، رقم:۷۵

۲۔ طحاوی، شرح مشکل الآثار، ۸:۸۷

۳۔ بزار، المسند، ۵:۴۴۲، رقم:۲۰۸۱

۴۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۱۰:۱۰۵، رقم:۱۰۱۰۷

۵۔ ابن عبد البر، التمہید، ۸:۲۸۲

۶۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۷:۱۵۲

آشکار ہو جائیں۔ یہ کوئی مادی اجسام اور چیزوں کا کشف نہیں ہو رہا بلکہ قرآنِ حکیم کے باطنی معانی کا عظیم کشف ہو رہا ہے۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ یہ تعریف علامہ جرجانی کی کتاب 'التعریفات' سے پیش کی جا رہی ہے جو کہ شرعی علوم کے اندر اصطلاحات کی تعریفات پر مبنی سب سے معتمد اور معتبر کتاب ہے۔ بعد ازاں جس کسی نے بھی علمی، دینی، فنی، شرعی اور اسلامی اصطلاحات پر بات کی ہے، اُس نے اِنہی پر اعتماد کیا ہے۔

علامہ جرجانی کہتے ہیں کہ بنیادی چیز تو یہ ہے کہ حجاب کے پیچھے جو کچھ ہے اس پر مطلع ہو جانے کو کشف کہتے ہیں۔ وہ بطریقِ الہام، بطریقِ علمِ لدنی اور بطریقِ رفعِ حجاب بھی مُطلع ہوسکتا ہے۔ دوسرا وہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید ہو، احادیثِ نبوی ہوں یا احکامِ دین ہوں، اُن کے غیبی معانی، اسرار و رموز اور پوشیدہ معارف جو الفاظ کی صورت میں ظاہری علوم کے عالم کو معلوم نہیں ہوتے، اُن معانی کا ادراک ہو جانے کو بھی کشف کہتے ہیں کیونکہ بندے کے قلب کی رسائی اُن کے غیبی معانی تک ہو جاتی ہے۔

(۲) اُمورِ حقیقیہ کا فہم و ادراک

مذکورہ تعریف میں علامہ جرجانی مزید فرماتے ہیں کہ پردہ اُٹھنے سے حقیقی اُمور پر ادراک ہو جائے تو اِسے بھی کشف کہتے ہیں، خواہ وہ وجود سامنے آجائے یا اُس کا مشاہدہ، صفات اور تفصیلات کے ساتھ ہونے لگے۔

(۳) علومِ خفیہ کا اِکتشاف

کشف کے ذریعے علومِ خفیہ بھی منکشف ہوجاتے ہیں یعنی اب تک جو کچھ مخفی اور پردۂ غیب میں تھا، وہ علومِ غیبیہ بھی قلب پر آشکار ہوجاتے ہیں اور قلب ان کی حقیقت پر آگاہ ہوجاتا ہے۔

۴۔ کشف کیسے ہوتا ہے؟

کشف کیسے ہوتا ہے؟ اس امر کو جاننے کے لیے یہ ذہن نشین رہے کہ بندے کو صفائے قلب کے بعد اللہ تعالیٰ جب بندے کے دل سے پردے اٹھاتا ہے تو اُسے صفا اور شرحِ صدر نصیب ہوتا ہے اور نورِ اِلٰہی سے ہر شے روشن ہو جاتی ہے۔ سالک کو کبھی اللہ تعالیٰ کے افعال، کبھی اللہ کی صفات، کبھی اللہ کی ذات اور کبھی اللہ کے اسماء کا نور اور تجلیات نصیب ہوتی ہیں۔ اِن تمام تجلیات کا حاصل ہونا صاحبِ کشف ولایت، صاحبِ مرتبہ اور صاحبِ صفائے قلب کے درجہ کی بلندی پر منحصر ہے۔

یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ **مکاشفہ** یا کشف اُن حقائق کا ہوگا جن تک حواسِ خمسہ کی رسائی نہیں ہے۔ وہ چیز جو سر کی آنکھیں دیکھ رہی ہوں، اُسے کشف نہیں کہتے۔ عام آدمی کے کان جو کچھ سن رہے ہیں، اگر یہی سنائی دے تو اُسے کشف نہیں کہتے۔ گویا وہ حقائق جو حواسِ خمسہ ظاہری اور عقل کے ادراک اور فہم سے ماورا ہیں، ان کا حصول کشف ہے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ یہ فیضِ بارگاہِ اُلوہیت سے نصیب ہو اور نورانیت کے طور پر اللہ تعالیٰ سے حاصل ہونے والے نور کے ذریعے نصیب ہو، اس کیفیت کو ہی کشف کہتے ہیں۔

اس ضمن میں شیخ عبد الرزاق کاشانی 'لطائف الاعلام' میں بیان کرتے ہیں:

اَلْمُكَاشَفَةُ فِي الْعُرْفِ الْعَامِ: عِبَارَةٌ عَنْ كَشْفِ النَّفْسِ لما غَابَ عَنِ الْحَوَاسِ إِدْرَاكهٗ. (۱)

عرف عام میں مکاشفہ سے مراد نفس کا کشف کے ذریعے ایسی چیزوں کا ادراک کرنا ہے جن تک حواسِ خمسہ کے ذریعے رسائی ممکن نہ ہو۔

امام کاشانی مزید بیان کرتے ہیں کہ یہ کشف:

۱۔ کبھی حقائقِ علمیہ کا ہوتا ہے، اور

(۱) الكاشاني، لطائف الأعلام: ۳۲۴

۲۔ کبھی حقائقِ کونیہ کا ہوتا ہے۔

یعنی ایک کشف یہ ہے کہ علمی حقائق جو ایک عام عالم کو استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے سے نصیب نہیں ہوئے اور اُن حقائق کا اُس کے قلب میں ادراک نہیں ہوا، کتابوں کے مطالعہ، نصابات کو پڑھنے یا عمر بھر کتب کو کھنگالنے سے وہ حقائق اُس کی سمجھ میں نہیں آئے، بعض اوقات قلب و دل کی آنکھ سے پردہ اٹھتا ہے اور اُن حقائق کی معرفت ہو جاتی ہے تو اُسے کشف کہتے ہیں۔

حقائقِ کونیہ کے کشف سے مراد یہ ہے کہ اس مادی کائنات (material universe) میں جو چیزیں دور اور نظروں سے اوجھل ہیں وہ بیٹھے بیٹھے نظر آنے لگ جائیں تو اُسے حقائقِ کونیہ کا کشف کہتے ہیں۔

(۱) کشف کا اِدراک ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے ہے

کشف کا ادراک ماضی سے حال اور مستقبل تک ہر جگہ اور زمانے پر ہوتا ہے۔ ایک واقعہ جو ماضی میں ہوا اور وہ آج نظر آ جائے، حالانکہ وہ بظاہر آنکھوں کے سامنے نہیں ہے تو یہ بھی کشف ہے۔ ماضی میں جب واقعہ پیش ہوا تو اس زمانے کے لوگ دیکھتے تھے کیونکہ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوا، لہٰذا وہ ان لوگوں کے لیے کشف نہیں تھا مگر اب ماضی گزر گیا ہے، واقعہ اوجھل ہو گیا ہے، اب وہ حقیقت آنکھوں کے سامنے نہیں رہی، اب اگر کوئی اُسے دیکھتا ہے تو اُسے کشف کہتے ہیں۔ اسی طرح جو کچھ مستقبل میں ہونے والا ہے، ممکن ہے جب اُس کے ظہور کا وقت آئے تو اُس زمانے کے لوگ ننگی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں لیکن اُس سے قبل دیکھ لینا بھی کشف ہے۔ آنے والے وقت کے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور صاحبِ کشف صدیوں، سالوں، ہفتوں اور کئی دن پہلے ہی رونما ہونے والی بات دیکھ لے، یہ بھی کشف ہے۔

(۲) کشفِ سرّی و کشفِ حِسّی

باطن کی آنکھ سے چیزوں کو دیکھ لینا مکاشفہ اور کشف کہلاتا ہے۔ یہ دو طرح کا

ہوتا ہے:

۱۔ سرّی

۲۔ حسّی

اگر معانی، لطائف، معارف، اَسرار و رموز اور حقائقِ علمیہ کا کشف ہوا تو اُسے کشفِ سرّی کہا جاتا ہے۔ اگر مادی حقائق (physical objects) اور دنیا کا مکاشفہ ہوا تو یہ کشف حسّی ہے۔ یہ روحانیت میں ترقی کی دس میں سے پہلی منزل ہے۔ یہ بھی پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مکاشفہ جب آگے بڑھتا ہے تو اِس میں خطا کا امکان بھی ہوتا ہے۔

(۳) کشف اور عالمِ مثال

مکاشفہ یا کشف اکثر و بیشتر عالمِ مثال میں ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا عالمِ اجسام ہے اور اِسے عالمِ شہادت کہتے ہیں۔ دوسری دنیا عالمِ اَرواح ہے، جہاں روحیں رہتی ہیں۔ عالمِ اَرواح سے روحیں آئیں اور اِس دنیا میں ہمارے جسموں میں منتقل ہوئیں۔ عالمِ اجسام اور عالمِ ارواح کے درمیان ایک عالم ہے، اُسے عالمِ مثال کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کے اندر وہی حقائق ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں یا وہ حقائق عالمِ ارواح میں موجود ہوتے ہیں۔ یعنی عالمِ مثال میں الگ مثالی صورتوں میں حقائق موجود ہوتے ہیں۔ عالمِ مثال میں عالمِ اجسام کا بھی پرتو ہوتا ہے اور عالمِ ارواح کا بھی پرتو موجود ہوتا ہے۔ دونوں کے عکس (reflections) جب باہم ہو کر جمع (combine) ہو جاتے ہیں تو اسے عالمِ مثال کہتے ہیں۔

(i) عالمِ مثال اور ہمارے خواب

ہم جو کچھ خواب میں دیکھتے ہیں وہ عالمِ مثال ہی ہوتا ہے۔ وہ حقائق کی مثالی صورت ہوتی ہے۔ لہٰذا خواب میں جو چیز دیکھی اور سنی جاتی ہے اُس سے مراد من وعن وہ شے نہیں ہوتی بلکہ اُس کی تعبیر ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر اگر کسی نے خواب میں دودھ دیکھا تو اس کی تعبیر علمِ دین کا حصول ہوگا۔ اگر خواب میں نفس امارہ کی مختلف چیزیں دیکھے مثلاً کبھی بیت الخلاء نظر آئے، تو اُس سے مراد گندگی نہیں ہوتا بلکہ اُس کا اشارہ نفسانی غلاظت اور دنیا کی طرف کیا جا رہا ہوتا ہے۔ کبھی اصطبل نظر آتا ہے، کبھی شراب نظر آتی ہے، کبھی افیون نظر آتی ہے، کیچڑ نظر آتا ہے اور کبھی ٹھہرا ہوا گندہ پانی نظر آتا ہے۔ اِس طرح کی چیزیں جو کچھ انسان دیکھتا ہے، وہ اُس کے نفس امارہ کی مختلف کیفیتوں کی مثالیں ہوتی ہیں۔

عالم مثال کی یہ شکلیں کبھی اُس کے حرص اور طمع پر، کبھی اُس کے بخل اور کنجوسی پر، کبھی اُس کی جہالت اور غفلت پر، کبھی سستی اور کاہلی پر، کبھی بغض و عناد پر اور کبھی اُس کے غیض و غضب پر دلالت کر رہی ہوتی ہیں۔ الغرض آدمی خواب میں یعنی عالم مثال میں جو مختلف اشیاء دیکھتا ہے وہ اُس کی نفسانی کیفیات کی عکاسی ہوتی ہیں۔ خواب میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہی من وعن نہیں سمجھا جاتا بلکہ اُس کی تعبیر کی جاتی ہے۔

کبھی خواب میں ہاتھی نظر آتا ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اُس آدمی پر نفس کا غلبہ ہے اور وہ بہت زیادہ مغرور اور متکبر ہے۔ کبھی عالمِ رویا میں سانپ نظر آتا ہے تو اس کی تعبیر نفس کے اندر منافقت کا موجود ہونا ہے۔ اب مختلف خوابوں کی الگ الگ تعبیرات ہیں۔ دشمن بھی سانپ کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اگر بچھو نظر آتا ہے تو اس کی تعبیر عذاب ہے۔ چڑیا، جوئیں، کھٹمل وغیرہ اور اس طرح کی دیگر اشیا نظر آتی ہیں تو یہ مکروہات کے ارتکاب اور ناپسندیدہ عادات کی علامت ہوتی ہیں۔

الغرض جو کچھ بھی خواب میں نظر آتا ہے وہ عالمِ مثال کی چیزیں ہوتی ہیں۔ جو دوسری چیزوں، کیفیات یا رجحانات پر دلالت کرتی ہیں۔ اِسی طرح کبھی بھیڑ، بکری نظر آئے گی تو یہ حلال جانور کی طرف اشارہ ہوگا۔ اس کی تعبیر ہے کہ خواب دیکھنے والے کی رغبت رزقِ حلال کی طرف ہے۔ اگر مچھلی، بطخ، مرغا، مرغی یا کبوتر نظر آئے، چونکہ یہ تمام پاکیزہ جانور ہیں تو خواب دیکھنے والے کی رغبت حلال کی طرف ہونے پر دلالت ہے۔ یہاں سے پتہ چلے گا کہ اس کا

نفس لوامہ ہو چکا ہے یا پھر لوامہ کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔

اگر خواب میں اونٹ نظر آئے تو بوجھ اٹھانا چونکہ اس کی اخلاقی صفت ہے، لہٰذا یہ نفس کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ خواب دیکھنے والا تو بظاہر اونٹ دیکھ رہا ہے مگر اُس کی بوجھ اٹھانے کی صفت کو بطور تعبیر لیا جائے گا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ بندہ دوسرے بندوں کے بوجھ اٹھانے اور تحمل و برداشت کا حامل ہے اور اِس کے اندر رواداری کے اوصاف پیدا ہو رہے ہیں۔

اِسی طرح اگر خواب میں کھجور یا شہد نظر آئے تو اس کی بھی یہی تعبیر ہے کہ وہ شخص حسن خلق کا پیکر ہے۔ چونکہ شہد اور کھجور کا تذکرہ قرآن میں آیا ہے اور یہ حضور نبی اکرم ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی پسندیدہ خوراک ہے۔ یہ اچھی چیزوں اور پاکیزہ اخلاق کی طرف رغبت پر دلالت کرے گا۔ اِسی طرح دوسرے پھل اور میوے نظر آئیں گے تو وہ بعض اوقات بے معنی اور لغو کلام سے نجات حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہوگا۔

بعض اوقات کسی کو کوئی شخص مست اور مدہوش نظر آئے تو یہ نفسِ ملہمہ کی مثالی شکلیں ہوں گی۔ اگر کسی شخص کو لنگڑا اور اپاہج دیکھا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اُس کے اعمالِ صالحہ میں کمزوری ہے۔ بظاہر تو خواب میں لنگڑے آدمی کو دیکھ رہا ہے مگر اشارہ ہے کہ اُس کے ایمان اور عمل کے اندر کم زوری ہے۔

یونہی اگر کسی شخص کو گونگا دیکھے گا تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوگا کہ خواب دیکھنے والے میں حق کہنے کی جرأت نہیں ہے۔ اگر جواری اور مسخرے کو دیکھے تو اُس کی تعبیر ہے کہ اُس کے اندر عبادت ترک کرنے کا رجحان ہو رہا ہے اور وہ حرام کاری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگر خواب میں چور کو دیکھے تو اِس کا مطلب ہے کہ اُس کے اندر ریاکاری ہے۔ اگر قصاب کو دیکھے تو اُس کے دل پر گناہوں کی سیاہی نظر آئے گی۔ کسی کو اگر اندھا اور بھینگا دیکھے تو اُس کا مطلب ہے کہ اُس بندے کے اندر گم راہی جنم لے رہی ہے اور وہ مزید برے اعمال و احوال کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اِسی طرح اگر کوئی شخص اپنے آپ کو قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہوا دیکھے، اللہ کے نبی ﷺ کا دیدار کرے، مدینہ طیبہ دیکھے، بیت المقدس دیکھے، صحابہ کرام ﷺ اور اولیاء اللہ اور مشائخ کی زیارت کرے، مسجد دیکھے، مدارس دیکھے یا حدیث، تفسیر اور دیگر دینی کتب دیکھے تو یہ علامات ہیں کہ اُس کے اندر نفس مطمئنہ کی خصوصیات پیدا ہو رہی ہیں۔ اب وہ غور کرے گا کہ کتنی خوبیاں پیدا ہو چکی ہیں اور کتنی پیدا نہیں ہوئیں۔

اگر نیک بادشاہ یا عادل حکمران کو دیکھتا ہے تو اِس کی تعبیر ہے کہ اُس کے اندر عبادت و ریاضت کی رغبت پیدا ہو رہی ہے۔ اگر وہ خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کرتا ہے تو اُس کا مطلب ہے اُس کا دل اوہام اور وسوسوں سے پاک ہو رہا ہے۔

اگر کوئی شخص خواب میں جامع مسجد، دینی مدارس اور نیک چیز کو دیکھے تو اُس کا مطلب ہے کہ گویا اُس کے اندر نیک اعمال کے سبب اچھائی کی قوت اور اس کے قلب پر اطمینان کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔ وہ اعمال میں بہتری کی طرف گامزن ہو رہا ہے۔ اگر کوئی شخص خواب میں تیر اور کمان، بندوق اور دیگر اسلحہ دیکھے تو اِس کا مطلب ہے کہ اُس کے دل میں ابھی کچھ وسوسے موجود ہیں۔ اس صورت میں اسے چاہیے کہ وہ مزید عبادت و ریاضت کرے، مجاہدہ کرے اور خود کو اُن وسوسوں سے مزید پاک اور صاف کرے۔

خواب اور ان کی تعبیروں کے یہ چند ایک نمونے اِس لیے تحریر کیے ہیں کہ اِسی طرح مقامات بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے جیسے مقامات بڑھتے چلے جاتے ہیں ویسے ویسے عالمِ رویاء میں جو کچھ دیکھتا ہے اُس کے مدارج اور کیفیات بھی بڑھتی اور بدلتی چلی جاتی ہیں۔ لہٰذا خواب میں جو مختلف چیزیں نظر آتی ہیں ان کی اپنی تعبیر ہوتی ہے۔ خواب میں عالمِ مثال کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ عالمِ مثال میں دیکھی گئی چیز اور عالمِ اجسام میں اس کی تعبیر اور معنی میں ایک ربط ہوتا ہے۔ اسی معنوی ربط سے 'تعبیر کا علم' نکلتا ہے۔

(ii) رؤیا اور احلام میں فرق

مذکورہ تمام خواب حقیقی (actual) رؤیاء کی مثالیں ہیں۔ اس کے برعکس آدمی جو مختلف چیزیں دیکھتا ہے کہ جن میں کوئی ربط نہیں ہوتا تو ایسے خواب منتشر خیالی کے باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً کبھی آپ پر کوئی حملہ کر رہا ہے، آپ چیخ رہے ہیں، پریشان ہو رہے ہیں، کبھی دیکھتے ہیں کہ اچانک پانی میں کود گئے اور پھر اپنے آپ کو بستر پر موجود پا رہے ہیں۔ کبھی دیکھتے ہیں کہ الٹے لٹک گئے، کبھی گھوڑا آ گیا، کبھی شیر نے آپ کو پکڑ لیا، کبھی اچانک گھر میں بچوں کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں، کبھی سفر کر کے کہیں پہنچ گے اور کبھی دریا میں ڈوب گئے۔ یہ ساری چیزیں دن بھر کے خیالات کی پریشانی راتوں میں احلام بن کر پراگندہ خیالی کی شکل میں آتی ہے۔ یہ پراگندہ خیالی خواب (رویاء) نہیں بلکہ اَحلام کہلاتی ہے۔

﴿أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ﴾ مَا لَا تَأْوِيلَ لَهُ.[1]

ایسے پراگندہ خیالات جن کی کوئی تاویل نہ ہو۔

اُنہیں خواب نہیں کہتے اور نہ ہی اُن کی کوئی تعبیر ہوتی ہے۔ یہ دیکھنے کے بعد صبح اٹھ کر **أعوذ بالله من الشيطان الرجيم** پڑھ کر بائیں جانب تین بار تھوک دے اور اس خواب کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے۔

(iii) رویائے صالحہ وحی کا چھیالیسواں حصہ ہیں

رؤیائے صالحہ یعنی اچھے خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ ابوسلمہ کہتے ہیں خواب دیکھنے سے میری بخار کی سی کیفیت ہو جاتی تھی، البتہ میں چادر نہیں اوڑھتا تھا، حتیٰ کہ حضرت ابوقتادہ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے:

---

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورة یوسف، ۴: ۱۷۲۷، الرقم: ۴۴۱۰

الرُّؤْيَا مِنَ اللهِ وَالْحُلُمُ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَإِذَا حَلَمَ أَحَدُكُمْ حُلُمًا يَكْرَهُهُ فَلْيَنْفُثْ عَنْ يَسَارِهِ ثَلَاثًا، وَلْيَتَعَوَّذْ بِاللهِ مِنْ شَرِّهَا، فَإِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهُ. (۱)

رؤیا (اچھا خواب) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور حلم (برا خواب) شیطان کی طرف سے ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کوئی شخص ناگوار خواب دیکھے تو وہ بائیں جانب تین بار تھوک دے اور اس خواب کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے۔ پھر وہ خواب اسے ضرر نہیں دے گا۔

حضرت عبد اللہ بن خباب ؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابو سعید خدری ؓ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ. (۲)

اچھا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہوتا ہے۔

یعنی اچھے خواب نبوت کا فیض ہیں۔ اِس پر ایمان رکھا جاتا ہے۔ رؤیا صالحہ کا مطلقاً انکار کرنا کفر ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف ؑ کو خواب آنے کا ذکر موجود ہے اور اِسی طرح دیگر رؤیا صالحہ کا ذکر بھی موجود ہے۔ احادیث مبارکہ میں بھی کثرت سے رویاء صالحہ کا ذکر آیا ہے، بلکہ حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ ﷺ صحابہ کرام ؓ کو نمازِ فجر کے بعد اچھا خواب بیان کرنے کا حکم دیتے۔

حضرت سمرہ بن جندب ؓ بیان کرتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا صَلَّى الصُّبْحَ أَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: هَلْ رَآى

---

(۱) مسلم، الصحيح، كتاب الرؤيا، ۴: ۱۷۷۱ رقم: ۲۲۶۱

(۲) ۱۔ بخاری، الصحيح، كتاب التعبير، باب الرؤيا الصالحة جزء من ستة وأربعين، ۶: ۲۵۶۴، رقم: ۶۵۸۸

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب الرؤيا، ۴: ۱۷۷۴، رقم: ۲۲۶۳

أَحَدٌ مِنْكُمُ الْبَارِحَةَ رُؤْيَا؟[1]

حضور نبی اکرم ﷺ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور فرماتے: تم میں سے کسی نے گزشتہ شب کوئی خواب دیکھا ہے؟

صحابہ کرام ﷺ اپنے خواب سناتے اور حضور نبی اکرم ﷺ ان کی تعبیر بیان فرماتے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بھی صحابہ کرام ﷺ کو اپنے خواب مبارک بیان فرمائے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر ﷺ، حضرت فاروق اعظم ﷺ، حضرت عثمان غنی ﷺ اور حضرت علی شیر خدا ﷺ نے بھی خواب دیکھے ہیں۔

'صحیح بخاری'، 'صحیح مسلم'، 'سنن ابی داؤد' اور 'سنن ترمذی' سمیت تمام کتبِ حدیث میں ابوابِ الرؤیا کے عنوانات قائم ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ.

نبوت کا کوئی جزو سوائے مبشرات کے باقی نہیں رہا۔

صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد الصلاۃ الصبح، ۶: ۲۵۸۳ رقم: ۶۶۴۰

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الرؤیا، باب رؤیا النبی ﷺ، ۴: ۱۷۸۱ رقم: ۲۲۷۵

۳۔ أبو داود، السنن، کتاب الأدب، باب ما جاء في الرؤیا، ۴: ۳۰۴ رقم: ۵۰۱۷

۴۔ ترمذي، السنن، کتاب الرؤیا، باب ما جاء في رؤیا النبي ﷺ، ۴: ۵۴۳ رقم: ۲۲۹۴

اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ.[1]

نیک خواب۔

ایک روایت میں حضرت انس بن مالک ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِي وَلَا نَبِيَّ. قَالَ: فَشَقَّ ذٰلِکَ عَلَى النَّاسِ. فَقَالَ: لٰکِنِ الْمُبَشِّرَاتُ. قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ، وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: رُؤْيَا الْمُسْلِمِ وَهِيَ جُزْءٌ مِنْ أَجْزَاءِ النُّبُوَّةِ.[2]

نبوت و رسالت ختم ہوگئی ہے، اس لیے میرے بعد کوئی رسول ہے نہ کوئی نبی۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ یہ بات لوگوں پر گراں گزری (کہ اب سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: لیکن مبشرات باقی ہیں۔ صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مبشرات سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمان کے (نیک) خواب، اور یہ نبوت کی خصوصیات کا ایک جزو ہے۔

(iv) اَولیاء کے خواب بھی کشف ہوتے ہیں

خواب اور کشف کا ایک باہمی تعلق ہے۔ عام آدمی صاحبِ کشف نہیں ہوتا، اُس کے

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب التعبیر، باب المبشرات، ۶:۲۵۶۴، رقم: ۶۵۸۹

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳:۲۶۷، رقم: ۱۳۸۵۱

۲۔ ترمذی نے 'السنن (کتاب الرؤیا، باب ذهبت النبوة وبقيت المبشرات، ۴:۵۳۳، رقم:۲۲۷۲)' میں کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

۳۔ حاکم نے 'المستدرك (۴:۴۳۳، رقم:۸۱۷۸)' میں کہا ہے کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرائط پر صحیح ہے۔

۴۔ مقدسی، الأحادیث المختارة، ۷:۲۰۶، رقم:۲۶۴۵

نفس کا وہ تزکیہ نہیں ہوا ہوتا جو کشف کے لیے درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا جب یہ خواب دیکھتا ہے بشرطیکہ وہ پریشاں خیالی نہ ہو، پراگندہ خیالی نہ ہو، صحیح خواب ہو تو اِسے مثالی کشف کہتے ہیں؛ یعنی یہ عالمِ مثال کا کشف ہے اور تعبیر و تاویل کا تقاضا کرتا ہے۔

دوسری طرف اولیاء اللہ کا مقام ہے۔ وہ چونکہ نفس کی آلائشوں سے پاک ہو کر تزکیہ و تصفیہ کا مقام حاصل کر لیتے ہیں، لہٰذا اُن کے خواب بدرجہ اولیٰ انتہائی اونچے درجے کے حامل اور اَتم و اَکمل ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے یہی خواب ان کا کشف ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی آدمی خواب میں کچھ دیکھتا ہے۔ بعد ازاں وہ واقعہ عین اُسی طرح وقوع پذیر ہو جاتا ہے جو اُس نے خواب میں دیکھا تھا۔ ہماری زندگی میں ایسے ہزارہا واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ ہم ایک خواب دیکھتے ہیں اور بعد میں ویسا ہی واقعہ حقیقت میں رونما ہو جاتا ہے۔ خواب بذاتِ خود (itself) کشف ہے لیکن انسان سے اس کی تعبیر میں غلطی ہو جاتی ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ خواب کا انکار کرنا کفر ہے، چونکہ خواب قرآن اور حدیث کی نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے۔ خواب کی تعبیر کا علم، علم الرویاء کہلاتا ہے۔ اگر کسی کو تعبیر میں غلطی یا مغالطہ ہوتا ہے تو ایک الگ بات ہے، مگر خواب دیکھنے والا شخص بھی کشف کر رہا ہے۔ اُس کے قلب اور روح کو حالتِ خواب میں کشف ہو رہا ہے۔ یعنی وہ آنے والے زمانے کی چیزیں دیکھ رہا ہے یا دور دراز کی کوئی چیز دیکھ رہا ہے، جو اُس کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی اور نہ ہی عقل سوچ سکتی تھی۔ ایسی صورت میں اُسے مثالی یعنی عالم مثال کا کشف ہو رہا ہے۔ لہٰذا وہ تعبیر اور تاویل طلب ہے اور اُس کی فن تعبیر سے تفصیل معلوم کی جائے گی۔

(v) تعبیر کا تعلق صرف خواب سے نہیں، بلکہ صاحبِ خواب پر بھی منحصر ہے

خواب میں دیکھی جانے والی ایک چیز کی دس تعبیریں بھی ہوسکتی ہیں۔ ایک ہی خواب دو الگ آدمی دیکھتے ہیں تو اُن دونوں کی تعبیر الگ الگ ہوگی۔ دونوں کی تعبیر میں تضاد کا سبب دونوں کے روحانی و قلبی مرتبے کا جدا جدا ہونا ہے۔ ایک کی صفائے قلب کی کیفیت کچھ اور ہے تو دوسرے کی صفائے قلب کی کیفیت کچھ اور ہے۔ ایک ہی خواب ایک نیک متقی شخص دیکھے تو اُس

کی تعبیر اور ہوگی؛ وہی خواب ایک گناہ گار، فاسق و فاجر شخص دیکھے گا تو اُس کی تعبیر کچھ اور ہوگی۔ ایک ہی خواب اگر مریض دیکھے تو اُس کی تعبیر اور ہوگی۔ اگر وہی خواب صحت مند شخص دیکھے تو عین ممکن ہے کہ تعبیر کچھ اور ہو۔ شادی شدہ شخص نے ایک خواب دیکھا تو اُس کی تعبیر اور ہوگی؛ غیر شادی شدہ شخص نے دیکھا تو تعبیر کچھ اور ہوگی۔

اسی طرح ہر شخص کے اپنے حالات و احوال کے مطابق خواب بھی جدا جدا ہوتے ہیں۔ اس کا سبب اُن کے درجات کا الگ ہونا ہے، اُن کی روحانی کیفیات، قلب ونفس کے احوال اور اُس کے تزکیہ کی کیفیات جدا جدا ہوتی ہیں، یوں خواب بھی مختلف ہوتے ہیں اور اُن کی تعبیر بھی مختلف ہوگی۔

اِسی طرح اولیاء کرام کو جب کشف ہوتا ہے تو اُن کے کشف بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ کسی کو کشف ہوا تو اُس میں دھندلاہٹ ہے، کسی کا کشف زیادہ صاف ہے، کسی کو اور زیادہ صاف ہوا حتیٰ کہ اتنا صاف ہوا کہ اس میں کوئی شک نہ رہا۔ اگر مثالی کشف ہے تو اولیاء بھی اُس مثالی کشف کی تعبیر کرتے ہیں۔ ایک نے تعبیر کچھ اور کی تو دوسرے نے تعبیر کچھ اور کی۔ مختلف حالات اور مختلف زمانوں میں تعبیرات مختلف ہوتی ہیں۔

۵۔ کشف کا دوسرا درجہ 'مشاہدہ' ہے

مکاشفہ کے بعد پھر اگلا درجہ مشاہدہ کا ہے۔ مشاہدہ میں حجابات اُٹھتے ہیں۔ کسی کے حجابات خواب میں اُٹھتے ہیں اور کسی کے حالتِ بیداری میں بھی اُٹھ جاتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں جب رفعِ حجاب ہوتا ہے، تو دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اِسے کتنی شفافیت نصیب ہوئی ہے۔ صاحبِ کشف کو جتنی شفافیت حاصل ہوئی، اتنا ہی کشف درست ہوگا۔ یہ اُس پر منحصر ہے کہ اُس کے قلب کو کس قدر صفا نصیب ہوئی اور اس کے نفس کو کتنی صفائی اور تزکیہ نصیب ہوا ہے۔ مشاہدہ میں عالمِ مثال کی چیز باقی نہیں رہتی اور یہ تعبیر طلب بھی نہیں ہوتا۔ کئی حضرات کا روحانی مقام اتنا بلند ہوتا چلا جاتا ہے کہ کشف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس مقام پر کشف یعنی مکاشفہ حالتِ مشاہدہ میں بدل جاتا ہے اور آدمی جس طرح سر کی آنکھ سے چیزوں کو دیکھتا ہے اور مغالطہ کا

امکان نہیں رہتا، اسی طرح اصحابِ مشاہدہ بغیر خطا کے پسِ پردہ چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اُن کا درجہ اصحابِ مکاشفہ سے بلند ہوتا ہے۔ یہ رویت کی طرح واضح اور شفاف ہوتا ہے، یعنی یہ عین الیقین ہے۔[1]

۶۔ کشف کا تیسرا درجہ 'معائنہ' ہے

مکاشفہ اور مشاہدہ کے بعد تیسرا بلند ترین درجہ معائنہ ہے۔ اس مقام پر ارد گرد کوئی خصوصیات اور صفات ایسی نہیں رہتیں، جن کے تعین سے مغالطہ ہو سکے۔ معائنہ حق الیقین کی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

اس لحاظ سے کشف کے مندرجہ ذیل درجات بنتے ہیں:

۱۔ مکاشفہ = علم الیقین

۲۔ مشاہدہ = عین الیقین

۳۔ معائنہ = حق الیقین[2]

۷۔ قرآن مجید سے کشف کا اِثبات

قرآن مجید میں بھی ہمیں متعدد ایسے مقامات نظر آتے ہیں جن سے کشف کا اثبات ہوتا ہے۔

آیئے! ان میں سے چند مقامات کا مطالعہ کرتے ہیں:

---

(۱) الكاشاني، لطائف الأعلام:۳۲۴

(۲) الكاشاني، لطائف الأعلام: ۳۲۴

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے عجائباتِ خلق اور عالمِ ملکوت کا کشف

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے ارشاد فرمایا ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ○[1]

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمین کی تمام بادشاہتیں (یعنی عجائباتِ خلق) دکھائیں اور (یہ) اس لیے کہ وہ عین الیقین والوں میں ہو جائے○

آیت مبارکہ میں نُرِیٓ (رؤیت) کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد مکاشفہ سے اوپر مشاہدہ کا درجہ ہے، یعنی عالمِ مثال کی مثالی شکلیں نہیں دکھائیں جو تعبیر و تاویل کی متقاضی ہوتی ہیں بلکہ سر کی آنکھوں سے جس طرح چیزیں دیکھتے ہیں اور مغالطہ نہیں ہوتا، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے عجائباتِ خلق کا مشاہدہ کروا دیا۔

(۲) حضرت جبریل علیہ السلام کا مثالی شکل میں ظاہر ہونا

قرآن مجید میں حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر آیا ہے کہ جبریل امین علیہ السلام اُن کے پاس انسانی شکل میں آئے۔ وہ جبریل امین علیہ السلام کی حقیقی شکل تو نہیں تھی۔ فرشتہ جب بھی انسانی شکل میں آتا ہے تو اِس کیفیت کو مثالی صورت کہتے ہیں۔ اس واقعہ کو قرآن مجید ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا○[2]

تو ہم نے ان کی طرف اپنی روح (یعنی فرشتہ جبریل) کو بھیجا سو (جبریل) ان کے

(۱) الأنعام، ۶: ۷۵

(۲) مریم، ۱۹: ۱۷

سامنے مکمل بشری صورت میں ظاہر ہوا○

یہ صورت بھلا کیا تھی؟ یہ جبریل امین علیہ السلام کی صورتِ اصلیہ نہیں تھی، اِسے صورتِ مثالیہ کہتے ہیں۔

بعض اوقات جب جبریل امین علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے اور جب حضرت جبرائیل علیہ السلام انسانی صورت میں حضرت دحیہ کلبی نامی صحابی رسول کی شکل میں تشریف لاتے تھے تو یہ روح الامین کی مثالی شکل ہوتی تھی۔ ملائکہ کبھی مثالی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر اپنی اصل نورانی شکل پر رہتے ہیں۔ فرشتے اپنی نورانی شکل پر آئیں تو انسانی آنکھیں انہیں دیکھ نہ پائیں گی۔ اس صورت میں اُن کی تجلیات قلب پر وارد ہوں گی، البتہ قلب کی آنکھ انہیں دیکھتی ہے۔ اگر مثالی شکل پر آئیں تو عام آدمی سر کی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں پہچانیں یا نہ پہچانیں۔

'صحیح بخاری' و 'صحیح مسلم' میں متفق علیہ حدیثِ جبریل ہے، جس میں اِسلام، ایمان اور احسان کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس حدیث مبارک میں ہے کہ ایک دیہاتی شخص آیا۔ وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بیٹھ گیا: اور پوچھا: یا رسول اللہ! اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا، تو اُس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے صحیح فرمایا۔ پھر پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا، اُس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے درست فرمایا۔ پھر پوچھا: احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا، اُس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے بجا فرمایا۔ جب وہ چلے گئے تو حضور نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: تم نے اِس شخص کو پہچانا کہ یہ کون تھا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

هٰذَا جِبْرِيْلُ جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِيْنَهُمْ.[1]

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الإیمان، باب سوال جبریل النبی ﷺ ۱: ۲۷، رقم: ۵۰ ←

یہ جبریل امین ﷺ تھے جو لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے۔

صحابہ کرام ﷺ نے حضرت جبرائیل ﷺ کو ایک دیہاتی شخص کے روپ میں دیکھا۔ یہ حضرت جبریل ﷺ کی مثالی صورت تھی۔ معلوم ہوا ملائکہ تو کیا سیدنا جبریل امین جیسی ہستی بھی بشری مثالی صورت میں زمین پر ظاہر (appear) ہوتی ہے۔ وہ جس طرح مثالی صورت میں زمین پر ظاہر ہوتے ہیں، اِسی طرح عالم مثال میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ کشف کا درجہ ہے۔ یہ جب بڑھتا ہے تو مشاہدہ کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم ﷺ کو اسی درجہ پر ساری کائنات کا مشاہدہ کروایا گیا تھا۔

(۳) حضرت سلیمان ﷺ کا ملکہ سبا بلقیس کا تخت منگوانا

قرآن مجید میں سورۃ النمل کی آیت نمبر 38 سے ایک مضمون شروع ہو رہا ہے۔ جو مشاہدہ کی ایک اور مثال ہے۔ حضرت سلیمان ﷺ نے اپنے صحابہ سے ملکہ بلقیس کا تخت ملکِ سبا سے اُٹھا کر لانے کا مطالبہ کیا تھا۔ قرآن مجید نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ○[1]

(سلیمان ﷺ نے) فرمایا: اے دربار والو! تم میں سے کون اس (ملکہ) کا تخت میرے پاس لاسکتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ فرمانبردار ہو کر میرے پاس آ جائیں○

قابلِ غور بات ہے کہ حضرت سلیمان ﷺ کا دربار بیت المقدس (یروشلم) میں ہے اور وہ تخت یمن میں تقریباً ہزار میل کی دوری پر ملکِ سبا میں پڑا ہوا ہے۔ حضرت سلیمان ﷺ ہزار میل کے لگ بھگ مسافت پر فلسطین میں بیٹھے درباریوں سے پوچھتے ہیں کہ کون ہے جو وہ تخت لاسکتا ہے؟ اللہ کے نبی کے اس سوال کے پوچھنے کا مطلب ہے کہ ایسا آدمی ہونا چاہیے جو

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الإیمان، باب بیان الإیمان والإسلام والإحسان، ۱: ۳۹، رقم: ۹

(۱) النمل، ۲۷: ۳۸

اُس تخت کو دیکھ بھی رہا ہو کہ وہ کہاں پڑا ہے؟ اُس کا راستہ بھی معلوم ہو اور یہاں پیش کرنے کی قدرت، تصرف اور طاقت بھی رکھتا ہو۔ اللہ کا نبی بذاتِ خود پوچھ رہا ہے۔ اگر یہ ناممکن ہو تو اللہ کا نبی اپنے درباریوں سے یہ سوال ہی نہ کرے۔ قابلِ غور بات ہے کہ جن لوگوں سے پوچھا جا رہا ہے، اُن میں کوئی نبی بھی نہیں ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت اِس بات پر بھی دلالت کرتی نظر آتی ہے کہ کشف غیر نبی کو بھی ہو سکتا ہے، اس لیے حضرت سلیمان ﷺ اپنے درباریوں سے پوچھ رہے ہیں جو اولیاء، صلحاء اور آپ کے اصحاب میں سے ہیں۔ واضح رہے کہ اُس وقت ان کے دربار میں جنات اور انسان دونوں طبقے موجود تھے۔ حضرت سلیمان ﷺ نے یہ سوال دانستہ کیا، اگر یہ ناممکن چیز ہوتی تو اللہ کا نبی اُن سے یہ سوال کبھی نہ کرتا۔ آپ کے اس سوال پر درباریوں کی طرف سے جواب آنا شروع ہو گئے:

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ○[1]

ایک قوی ہیکل جِن نے عرض کیا: میں اسے آپ کے پاس لاسکتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنے مقام سے اٹھیں اور بے شک میں اس (کے لانے) پر طاقتور (اور) امانت دار ہوں○

حضرت سلیمان ﷺ نے اُس قوی ہیکل جن کی یہ پیشکش قبول نہیں فرمائی۔ (کیوں قبول نہیں فرمائی؟ اِس واقعہ کی تفصیل میں نہیں جا رہے کیونکہ یہاں صرف کشف کا نکتہ بیان کرنا مقصود ہے۔) اس قوی ہیکل جن کے بعد آصف بن برخیا نامی ایک ولی اللہ اٹھے، جو جنات میں سے نہیں بلکہ ایک بشر تھے۔ قرآن مجید اُن کا تعارف ان الفاظ میں کرواتا ہے:

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ.[2]

(پھر) ایک ایسے شخص نے عرض کیا جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ علم تھا۔

---

(۱) النّمل، ۲۷: ۳۹

(۲) النمل، ۲۷: ۴۰

عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ سے کون سا علم مراد تھا؟ آسمانی کتاب تو قرآن مجید بھی ہے۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام پر نازل ہونے والا صحیفہ قرآن مجید سے بڑے رتبے والا تو نہیں تھا۔ جیسے سب انبیاء کرام علیہم السلام میں سے خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کا مقام و مرتبہ سب سے اعلیٰ اور افضل ہے عین اسی طرح قرآن مجید کی فضیلت تمام الہامی کتابوں اور صحائف میں سب سے بلند و برتر ہے۔ آج قرآن مجید کا علم رکھنے والے ہزاروں بلکہ لاکھوں علماء موجود ہیں تو کیا وہ ہزاروں میلوں کی مسافت سے کشف کے ذریعے تخت دیکھ سکتے اور اسے لا سکتے ہیں؟ اگر ظاہری علم رکھنے والے ایسا نہیں کر سکتے تو سوال یہ ہے کہ وہ کون سا علم تھا جو آصف بن برخیا کے پاس تھا؟

ثابت ہوگیا کہ وہ علم علمِ ظاہر نہیں تھا۔ قرآن مجید کا ظاہری علم رکھنے والے بھی لاکھوں کی تعداد میں مشرق سے مغرب تک موجود ہوں گے تو کیا وہ سب اصحابِ کشف بھی ہیں؟ کیا وہ سبھی اصحابِ تصرف بھی ہیں؟ نہیں! ایسا نہیں ہے۔ تو پھر ظاہری علم کے علاوہ وہ کون سا علم ہے جو پردے اٹھا کر کشف عطا کر رہا ہے؟ وہ علم جو القدس (مسجد اقصیٰ) میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو پردے اٹھا کر یمن میں ملکہ بلقیس کا تخت دکھا رہا ہے؟ وہ علم دراصل علمِ باطن ہے، وہ کشف اور مکاشفہ ہے۔ قرآن مجید نے اس نکتہ کو سمجھانے کے لیے عِلْمٌ مِّنَ الْکِتَاب پر تاکید کی کہ اب جن کی بات نہیں ہو رہی، اس کی پیشکش آپ نے رد کر دی ہے، اب یہ انسان ہے۔ اولیاء و صالحین اور آپ کے صحابہ میں سے ہے۔ وہ علم ظاہری نہیں بلکہ باطنی علم رکھتے تھے۔ وہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا:

اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ.[1]

میں اسے آپ کے پاس لا سکتا ہوں قبل اس کے کہ آپ کی نگاہ آپ کی طرف پلٹے (یعنی پلک جھپکنے سے بھی پہلے)۔

معلوم ہوا کہ اگر انسان کو علمِ لدنی، علمِ کشف، علمِ باطنی اور مرتبۂ ولایت نصیب ہو جائے تو اس کی روحانی طاقت جنات سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ قوی ہیکل جن جنات کا سردار

(۱) النمل، ۲۷: ۴۰

تھا۔ اُس نے اپنی ساری طاقت اور قوت کے بھروسہ پر جتنے وقت (time frame) کا مطالبہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے کرسی سے کھڑے ہونے سے قبل تخت لا سکتا ہوں جبکہ اس کے مقابل جو بشر اور ولی اللہ ہے، صاحبِ علمِ لدنی اور مرتبۂ ولایت پر فائز حضرت آصف بن برخیا تھے، وہ اتنا وقت بھی نہیں لے رہے جتنا کرسی سے کھڑے ہونے میں لگتا ہے۔ بلکہ انہوں نے کہا کہ میں یہ تخت آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے لا سکتا ہوں۔ انسانی جسم کے اعضاء میں سے سب سے فوری اور تیز ترین حرکت آنکھ کا جھپکنا ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ وہ کون سی طاقت تھی جس نے اُنہیں اس قابل بنایا کہ وہ پلک جھپکنے سے بھی پہلے ہزاروں میل کی دوری سے تخت کو اُٹھا لائے؟ وہ دراصل مکاشفہ اور مشاہدہ کی طاقت تھی۔

مرتبۂ ولایت، نفس کی نفی کا تقاضا کرتا ہے

حضرت سلیمان علیہ السلام نے نہایت قلیل وقت کو دیکھتے ہوئے اجازت دی کہ ملکہ بلقیس کا تخت یہاں حاضر کر دو۔ حضرت آصف بن برخیا نے پلک جھپکنے سے پہلے اپنے قول کو فعل میں تبدیل کر کے دکھا دیا۔ قرآن مجید میں بیان ہوا:

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ.(1)

پھر جب (سلیمان علیہ السلام نے) اس (تخت) کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا (تو) کہا: یہ میرے رب کا فضل ہے۔

پہلے دعویٰ کرنے والا جن ولی اللہ نہیں تھا، لہٰذا اُس کی بولی کچھ اور تھی۔ اس کے الفاظ پر غور کیجیے:

وَاِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ○

اور بے شک میں اس (کے لانے) پر طاقت ور (اور) امانت دار ہوں○

وہ جن اپنی قوت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ آصف بن برخیا ولی اللہ ہیں، ان کے

(1) النمل، ۲۷: ۴۰

پاس ربانی طاقت ہے۔ اِنہوں نے پلک جھپکنے سے پہلے تخت لا دیا۔ حضرت سلیمان ﷺ نے اس (تخت) کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا (تو) کہا: یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ آیا میں شکر گزاری کرتا ہوں یا ناشکری۔ انہوں نے اپنی طاقت کی طرف نہیں بلکہ اپنے اللہ کے فضل کی طرف اشارہ فرما کر اپنی ذات کی نفی کر دی۔ گویا مرتبۂ ولایت کا مطلب ہے کہ نفس کی نفی کی جائے۔ دل کے آئینے میں صرف اللہ اور اُس کے انوار و تجلیات ہی جلوہ افروز دکھائی دیں۔ اِس لیے اولیاء اللہ کو اپنی قوت، طاقت اور لیاقت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ ولایت کا مرتبہ ہے کہ اپنی کچھ خوبی نظر ہی نہ آئے اور ہر چیز نہ صرف اللہ کی طرف منسوب کرے بلکہ جدھر دیکھے اسی کی قوت، طاقت اور قدرت کارفرما نظر آئے۔

اہم نکتہ

اس موقع پر اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بڑے کا چھوٹے کو حکم دینا اظہارِ محتاجی نہیں بلکہ نظرِ عنایت ہوتا ہے۔ آصف بن برخیا نبی نہیں ہیں بلکہ وہ تو ولی اللہ ہیں۔ اللہ کے نبی حضرت سلیمان ﷺ فرما رہے ہیں کہ ہے کوئی جو ملکہ سبا کا تخت اُٹھا لائے؟ اللہ کا نبی حکم دے رہا ہے جبکہ اللہ کا ولی ان کی خدمت بجا لا رہا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے مرتبے کا مالک اللہ کا نبی اپنے غلام، اپنے امتی کو کوئی کام کرنے کا کہے کہ میرے لیے یہ کر دو تو معاذ اللہ اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اللہ کا نبی خود وہ کام کرنے کی قدرت نہیں رکھتا یا اُس سے کوئی چیز مانگ رہا ہے، مدد لے رہا ہے یا اِس کا درجہ معاذ اللہ اس سے اونچا ہے۔ استغفراللہ! ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں جب کوئی نبی اپنے امتی کو حکم دیتا ہے تو اِس کا مطلب ہوتا ہے کہ حاکم اپنے درباری کو حکم دے رہا ہے۔ وہ مخدوم ہے اور اپنے خادم سے خدمت لینا چاہتا ہے۔ جب چھوٹا بڑے کو کہتا ہے کہ میرے لیے یہ کر دو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اُس سے مدد مانگ رہا ہے لیکن جب بڑے درجے کی ہستی چھوٹے کو کہتی ہے کہ میرے لیے یہ کر دو تو اِس کا مطلب ہے کہ وہ اُس سے خدمت لے کر اُسے شرف یاب کر رہا ہے۔

(۴) واقعہ موسیٰ و خضر علیہما السلام سے کشف کا اِستدلال

علم کشف اور علمِ لدنی کا قرآن مجید سے اثبات کے باب میں آیئے اب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں۔ طوالت کی غرض سے پورا واقعہ بیان کرنے کے بجائے براہِ راست اُسی آیت مبارکہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام، حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش میں نکلے، جب مطلوبہ مقام پر پہنچے تو قرآن مجید کے الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًاo[1]

تو دونوں نے (وہاں) ہمارے بندوں میں سے ایک (خاص) بندے (خضر علیہ السلام) کو پا لیا جسے ہم نے اپنی بارگاہ سے (خصوصی) رحمت عطا کی تھی اور ہم نے اسے علمِ لدنی (یعنی اَسرار و معارف کا اِلہامی علم) سکھایا تھاo

اُس بندے کی علامت کیا تھی؟ وہ علامت یہ تھی کہ اِس سفر میں ان دونوں حضرات نے اپنے کھانے کے لیے مچھلی بھون کر ساتھ رکھ لی تھی۔ راستے میں ایک جگہ رکے، دریا کنارے وضو کیا اور آگے روانہ ہوگئے۔ چلتے چلتے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھوک محسوس کی تو فرمایا: وہ مچھلی نکالو اور کھانا کھاتے ہیں۔ حضرت یوشع نے عرض کی: اے کلیم اللہ! میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا کہ جہاں ہم دریا پر منہ ہاتھ دھونے کے لیے رُکے تھے، مچھلی وہاں زندہ ہو کر پانی میں غائب ہوگئی تھی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سنا کہ اُس جگہ مچھلی زندہ ہوگئی تھی تو آپ نے فرمایا:

ذٰلِکَ مَا کُنَّا نَبْغِ.[2]

یہی وہ (مقام) ہے ہم جسے تلاش کر رہے تھے۔

---

(۱) الکہف، ۱۸:۶۵

(۲) الکہف، ۱۸: ۶۴

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یوشع! ہم اُسی جگہ کی تلاش میں تو نکلے تھے، اس لیے کہ جہاں مردہ زندہ ہو جائے اللہ کا ولی وہیں موجود ہوتا ہے۔ اللہ کے ولی نے اُس ہوا میں سانس لیا، اللہ تعالیٰ نے اُس آب و ہوا میں یہ تاثیر پیدا کر دی کہ تنِ مردہ کو زندگی مل گئی اور وہ بھنی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر پانی کے اندر جا پہنچی۔ اِس طرح اللہ تعالیٰ اولیاء کو یہ روحانی تاثیر عطا کر دیتا ہے کہ اللہ والے نہ صرف خود زندہ ہوتے ہیں بلکہ اُن کی صحبت اور توجہ سے مردہ دل بھی جِلا یعنی نئی زندگی پاتے ہیں۔ لہٰذا حضرت موسیٰ اور یوشع بن نون علیہما السلام واپس اُسی جگہ پہنچے۔ قرآن فرماتا ہے:

فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا○

پس دونوں اپنے قدموں کے نشانات پر (وہی راستہ) تلاش کرتے ہوئے (اسی مقام پر) واپس پلٹ آئے○

وہاں دونوں نے اللہ تعالیٰ کے خاص بندے حضرت خضر علیہ السلام کو پا لیا، جن کی خصوصیت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کی ہے:

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا○

اور ہم نے اسے علمِ لدنی (یعنی اَسرار و معارف کا اِلہامی علم) سکھایا تھا○

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا:

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا○[1]

کیا میں آپ کے ساتھ اس (شرط) پر رہ سکتا ہوں کہ آپ مجھے (بھی) اس علم میں سے کچھ سکھائیں گے جو آپ کو بغرضِ ارشاد سکھایا گیا ہے○

یعنی میں آپ کی رفاقت اختیار کر سکتا ہوں کہ اگر آپ اُس خاص علم میں سے مجھے بھی کچھ سکھا دیں جو آپ کو ملا ہے؟ جس علم نے حقائق کونیہ اور حقائق علمیہ کے سب پردے اٹھا

(۱) الکہف، ۱۸: ۶۶

دیے ہیں۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت ابی بن کعب ﷺ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کی ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اِس سوال کے جواب میں حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

يَا مُوْسٰى، إِنِّي عَلٰى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللهِ عَلَّمَنِيْهِ، لَا تَعْلَمُهُ أَنْتَ، وَأَنْتَ عَلٰى عِلْمٍ عَلَّمَكَهُ، لَا أَعْلَمُهُ. (۱)

اے موسیٰ! مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے علوم میں سے ایک ایسا علم دیا ہے جسے آپ نہیں جانتے اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا علم دیا ہے جسے میں نہیں جانتا۔

محدثین اور شارحینِ حدیث نے مزید بیان کیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

يَا مُوْسٰى، إِنَّ لِي عِلْمًا لَا يَنْبَغِي لَكَ أَنْ تَعْلَمَهُ (أَي جَمِيْعَهُ). وَإِنَّ لَكَ عِلْمًا لَا يَنْبَغِي لِي أَنْ أَعْلَمَهُ (أَي جَمِيْعَهُ). (۲)

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب العلم، باب ما یستحب للعالم اذا سئل أي الناس أعلم، ۱:۵۷، رقم: ۱۲۲

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الأنبیاء، باب طوفان من السیل یقال للموت الکثیر، ۳:۱۲۴۷ رقم: ۳۲۲۰

۳۔ بخاری، الصحیح، کتاب التفسیر، باب وإذ قال موسی لفتاہ لا أبرح، ۴:۱۷۵۳ رقم: ۴۴۴۸

۴۔ ابن حبان، الصحیح، ۱۴:۱۰۶ رقم: ۶۲۲۰

۵۔ حمیدی، المسند، ۱:۱۸۳ رقم: ۳۷۱

(۲) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب التفسیر، باب فلما بلغا مجمع بینهما نسیا حوتهما، ۴: ۱۷۵۵، رقم: ۴۴۴۹

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۱۲۰، رقم: ۲۱۱۵۷

۳۔ عسقلانی، فتح الباری، ۸: ۴۱۸

۴۔ عینی، عمدۃ القاری، ۱۹: ۴۳

اے موسیٰ! بے شک میرے پاس اپنا (خاص) علم ہے، آپ کے لیے ضروری نہیں کہ آپ وہ سارے کا سارا جان لیں۔ اور آپ کے پاس اپنا (خاص) علم ہے، میرے لیے ضروری نہیں کے میں وہ سارے کا سارا جان لوں۔

ائمہ نے بیان کیا ہے کہ اس علمِ باطن کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت موسیٰ ﷺ کے پاس وہ علم بالکل نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہے! ان کے پاس وہ خاص علم اتنا ضرور تھا کہ جتنا ایک پیغمبر کے لیے اپنی اُمت کی اصلاح کے لیے ضروری تھا۔ حضرت موسیٰ ﷺ علمِ شریعت میں بہت اونچے تھے، مگر اِس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت خضر ﷺ کے پاس وہ علم شرعی یا علم ظاہر بالکل نہیں تھا۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ ان کے پاس شریعت کا علم اتنا ضرور تھا جتنا اُن کے لیے ضروری تھا، مگر علمِ باطن میں وہ آگے اور خاص تھے۔ حضرت موسیٰ ﷺ علمِ ظاہر اور علمِ شریعت میں ان سے بہت آگے تھے۔ دونوں ہستیوں کا مقام و مرتبہ جدا اور اپنے اپنے دائرہ کار میں بہت بلند تھا۔

اِس واقعہ میں علمِ لدنی اور کشف درج ذیل صورتوں میں ظاہر ہوا ہے:

(i) پہلا کشف

حضرت موسیٰ ﷺ اور حضرت خضر ﷺ کے اکٹھے سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کو طوالت کے خوف سے یہاں درج نہیں کیا جارہا ہے۔ بلکہ یہاں یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس موقع پر اِن کا لب لباب کیا ہے اور ان سے علمِ لدنی کا اظہار کس طرح ہوتا ہے؟

جب حضرت موسیٰ ﷺ اور حضرت خضر ﷺ کے اُس سفر کا اختتام ہوگیا اور دونوں شخصیات جدا ہونے لگیں تو حضرت خضر ﷺ نے اپنے اُن واقعات کی تعبیر بیان کی جو آپ سے صادر ہوئے تھے۔

پہلا واقعہ تھا کہ جب حضرت موسیٰ ﷺ اور حضرت خضر ﷺ دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو حضرت خضر ﷺ نے وہ کشتی توڑ دی۔ اس کشتی کو توڑنے کی جو وجہ حضرت خضر ﷺ نے بیان کی

قرآن مجید اُسے ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا○[1]

وہ جو کشتی تھی سو وہ چند غریب لوگوں کی تھی وہ دریا میں محنت مزدوری کیا کرتے تھے پس میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار کر دوں اور (اس کی وجہ یہ تھی کہ) ان کے آگے ایک (جابر) بادشاہ (کھڑا) تھا جو ہر (بے عیب) کشتی کو زبردستی (مالکوں سے بلامعاوضہ) چھین رہا تھا○

یعنی ان غریب اور مسکین لوگوں کا ذریعہ معاش صرف وہی ایک کشتی تھی۔ اگر بادشاہ اُس کشتی کو اپنے قبضے میں لے لیتا تو اُن کا روزگار ختم ہو جاتا۔ لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام نے اُسے عیب دار کرنے کے لیے اس کا کچھ حصہ توڑ دیا تاکہ بادشاہ کی نظر جب اِس پر پڑے تو وہ کہے کہ یہ ٹوٹی ہوئی کشتی میرے کسی کام کی نہیں۔ وہ غریب ملاح کشتی کو لکڑی کے ٹکڑے اور کیل لگا کر پھر جوڑ لے گا اور بادشاہ کے غصب سے محفوظ رہے گا۔ اِس طرح حضرت خضر علیہ السلام نے اُن کا روزگار بچا لیا۔

یہ واقعہ صریح کشف تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام تو سب کے ساتھ کشتی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ کشتی آگے جا کر کنارے لگے گی تو بادشاہ اور اس کی فوج کشتیوں کو قبضے میں لیتی نظر آئے گی۔ وہ تو ابھی اِس طرف سے چل ہی رہے ہیں اور بادشاہ تو آگے دوسری جانب کھڑا ہے۔ حالات و واقعات کو پیش آنے سے قبل جان لینا کشف ہے اور یہ اس کشف کا ایک اظہار تھا۔

حضرت خضر علیہ السلام جمہور مذہب کے مطابق نبی نہیں بلکہ ولی ہیں، ان سے اس کشف کا اظہار کرامت بھی کہلا سکتا ہے، کیونکہ کشف کا صدور بھی ظاہری اسباب کے خلاف ہوتا ہے اور کرامت بھی خرقِ عادت واقعہ کا نام ہے۔ اسی طرح اگر نبی سے کشف صادر ہو تو اُسے معجزہ کہیں گے۔ معجزہ اِس لیے کہتے ہیں کہ عادتاً وہ چیز ممکن نہ تھی جو ممکن ہوگئی۔ لہٰذا خرقِ عادت

(۱) الکہف، ۱۸: ۷۹

ہونے کی وجہ سے اُسے کرامت یا معجزہ کہیں گے۔ لیکن اس کرامت یا معجزہ کے ظہور کے پیچھے کار فرما عامل کشف ہے کہ اسی صلاحیت سے ولی یا نبی آنے والے حالات و واقعات سے قبل از وقت آگاہی حاصل کر لیتے ہیں۔

(ii) دوسرا کشف

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کو دوران سفر پیش آنے والا دوسرا واقعہ بھی کشف کو ظاہر کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے سوال کیا کہ ایک بچہ کھیل رہا تھا، آپ نے اسے کیوں قتل کر دیا؟ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے حضرت خضر علیہ السلام فرمایا:

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا○[1]

اور وہ جو لڑکا تھا تو اس کے ماں باپ صاحبِ ایمان تھے پس ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ (اگر زندہ رہا تو کافر بنے گا اور) ان دونوں کو (بڑا ہوکر) سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا○

حضرت خضر علیہ السلام نے کشف سے معلوم کر لیا تھا کہ اُس کے ماں باپ مومن ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ کشف سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا تو کافر ہوگا۔ اب اس چھوٹی عمر میں بچے کے ماتھے پر تو کافر نہیں لکھا ہوا تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے یہ بھی کشف سے معلوم کر لیا کہ جب بڑا ہوگا تو کافر ہوگا جبکہ اس کے ماں باپ مومن ہیں۔ اُس کے کفر کی وجہ سے اُس کے ماں باپ بھی فتنہ میں پڑ کر سرکشی اور کفر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ گویا یہ بھی کشف سے معلوم کر لیا کہ یہ بچہ اپنے والدین کی آخرت خراب کرے گا۔ قابلِ غور بات ہے کہ اس ایک واقعہ میں تین کشف ظاہر ہو رہے ہیں:

۱۔ بچے کے ماں باپ کا مومن ہونا بھی کشف سے معلوم کر لیا۔

۲۔ بچے کا بڑا ہو کر کافر بننا بھی کشف سے معلوم کر لیا۔

---

(۱) الکہف، ۱۸: ۸۰

۳۔ یہ بھی معلوم کر لیا کہ بچے کا کفر ماں باپ کے ایمان کو بھی برباد کر دے گا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حقیقت سے مطلع کرنے کے بعد فرمایا:

فَاَرَدْنَآ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا۝[1]

پس ہم نے ارادہ کیا کہ ان کا رب انہیں (ایسا) نعم البدل عطا فرمائے جو پاکیزگی میں (بھی) اس (لڑکے) سے بہتر ہو اور شفقت و رحمدلی میں (بھی والدین سے) قریب تر ہو۝

آیتِ مبارکہ میں فَاَرَدْنَآ قابل غور ہے کہ 'ہم نے ارادہ کیا'۔ یہاں 'ہم' سے مراد اللہ اور خضر علیہ السلام ہیں۔ گویا حضرت خضر علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور میں نے ارادہ کیا کہ اللہ تعالیٰ اِس بچے کو مار کر اِس کا نعم البدل دے، جو اپنے ماں باپ کی خدمت بھی کرے اور اُن کے ایمان کی حفاظت بھی کرے۔ تفاسیر میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کے بدلے میں اُنہیں ایک بیٹی عطا کی اور اُس دختر نیک بخت کی اولاد سے ستّر سے زائد انبیاء کرام علیہم السلام پیدا ہوئے۔

(iii) تیسرا کشف

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیسرا سوال کیا کہ سفر کے دوران گاؤں والوں نے ہم سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا، ہمیں رات ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں دی، کھانا بھی نہیں دیا اور ہماری مہمان نوازی بھی نہیں کی تھی۔ اِس کے باوجود وہاں ایک گرنے والی دیوار موجود تھی، آپ نے اُسے تعمیر کر دیا اور اس کی مزدوری بھی نہیں لی۔ ایسا کیوں کیا؟ اِس کی وجہ بیان کرتے ہوئے سیدنا خضر علیہ السلام نے فرمایا:

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَیْنِ یَتِیْمَیْنِ فِی الْمَدِیْنَةِ.[2]

اور وہ جو دیوار تھی تو وہ شہر میں (رہنے والے) دو یتیم بچوں کی تھی۔

---

(۱) الکہف، ۱۸: ۸۱

(۲) الکہف، ۱۸: ۸۲

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس سفر کے دوران کشف در کشف عیاں ہو رہے ہیں۔ دیوار کن کی تھی؟ یہ بھی کشف سے معلوم کیا۔ یہ بھی کشف سے معلوم کیا کہ دونوں یتیم بچے ہیں۔ حالاں کہ وہاں صرف ایک دیوار کھڑی تھی، یتیم بچے موجود نہ تھے۔ نیز یہ بھی کشف سے معلوم کیا کہ:

كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا.

اس کے نیچے ان دونوں کے لیے ایک خزانہ (مدفون) تھا۔

اور یہ بھی کشف سے معلوم کر لیا کہ:

كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا.

ان کا باپ صالح (شخص) تھا۔

یعنی ان بچوں کے آباء و اجداد اور ان کے نسب کو بھی معلوم کر لیا۔ تفاسیر میں موجود ہے کہ ان بچوں کی پچھلی پشتوں میں ایک اللہ کا ولی تھا، جس کی نسبت کا خیال کرتے ہوئے حضرت خضر علیہ السلام نے اُن کی مدد کی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے یہ سارے اُمور کشف سے معلوم کر لیے۔ پھر بیان کیا کہ جب یہ بچے جوان ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اِنہیں آگاہی ہو جائے گی اور دیوار کے نیچے سے وہ اپنے بزرگوں کا خزانہ حاصل کریں گے تاکہ اِن کے لیے وسائل پیدا ہوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے یہ سب حقائق کشف سے معلوم کیے۔ گویا حضرت خضر علیہ السلام نے ماضی بھی کشف سے جھانک لیا، زمین کے نیچے پوشیدہ خزائن کو بھی کشف کی بدولت دیکھ لیا اور مستقبل بھی کشف سے ملاحظہ کر لیا۔

واقعہ موسیٰ و خضر علیہما السلام سے کشف کے اِثبات پر حافظ ابن کثیر کا نقطہ نظر

حافظ ابن کثیر کی 'تفسیر القرآن العظیم' بڑی معتمد تفسیر ہے۔ حرمین شریفین اور عرب کی جامعات میں یہی تفسیر بطور نصاب پڑھائی جاتی ہے اور سب سے زیادہ اعتماد اسی پر کیا جاتا ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں مذکورہ آیات بیان کرنے کے بعد اس آیت ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ کے تحت روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ نے فرمایا:

وَكَانَ رَجُلًا يَعْلَمُ عِلْمُ الْغَيْبِ قَدْ عُلِّمَ ذٰلِكَ.(۱)

حضرت خضر ﷺ ایک ایسے شخص تھے جو علم غیب جانتے تھے کیونکہ یہ علم اُنہیں سکھایا گیا تھا۔

معلوم ہوا کشف اور علمِ لدنی علوم مغیّبات یعنی غیبی علوم میں سے ہیں۔ جب پردہ اٹھا دیا جاتا ہے تو پھر اس کا مکاشفہ اور مشاہدہ ہوتا ہے۔ نیز یہ الفاظ بھی غور طلب ہیں کہ یہ علم اُنہیں سکھایا اور عطا کیا گیا تھا۔

حافظ ابن کثیر نے حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ کا یہ قول بیان کر کے واضح کر دیا کہ اس علم کی نوعیت کیا ہے۔

کشف کے حوالے سے اسی واقعہ سے ماخوذ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اُس دیوار کے نیچے مدفون خزانہ اصلا نقدی یا ہیرے جواہرات نہ تھے بلکہ خزانۂ علم تھا۔ اس نکتے کو حافظ ابن کثیر نے بیان کیا ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ بیان کرتے ہیں:

كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزُ عِلْمٍ.(۲)

اس کے نیچے علم کا خزانہ دفن تھا۔

یعنی جس علم کے ذریعے اس کشف کا اظہار ہو رہا ہے، اُسی علم کو خزانہ قرار دیا جا رہا ہے۔

ایک اور روایت میں حضرت سعید بن جبیر (تابعی) اور حضرت مجاہد (تابعی) نے بھی روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

---

(۱) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۳:۹۶

(۲) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۳: ۹۹

صُحُفٌ فِيْهَا عِلْمٌ.(۱)

وہ صحائف تھے جن میں علم تھا۔

یعنی اُس دیوار کے نیچے تہہ در تہہ جا کر صحائف اور کتب دفن تھیں جن میں علومِ معرفت وعلومِ اسرار تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام چاہتے تھے کہ ان بچوں کا وہ علمی خزانہ ضائع نہ ہو۔

پھر حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّ الْكَنْزَ الَّذِي ذَكَرَهُ اللهُ فِي كِتَابِهِ، لَوْحٌ مِنْ ذَهَبٍ مُصْمَتٍ، مَكْتُوْبٌ فِيْهِ: ..... لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ ﷺ.(۲)

وہ خزانہ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن میں کیا ہے، وہ ایک پختہ سونے کی تختی تھی جس میں (آخر پر) لکھا تھا: **لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ ﷺ**۔

اللہ کی توحید تو ہر پیغمبر کے کلمہ میں تھی، نئی چیز اُس خزانے میں یہ تھی کہ **محمد رسول اللہ ﷺ** کا کلمہ اس میں لکھا ہوا تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ یہ ضائع نہ ہو، حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی خبر نسل در نسل آگے چلتی رہے۔

امام ابن جریر طبری نے اسے جلیل القدر تابعی امام حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ وہ ﴿وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: وہ سونے کی تختیاں تھیں اور اُن میں جو کچھ علم کا خزانہ لکھا ہوا تھا اُس کی ابتداء **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** سے ہوتی تھی اور اس میں اختتام پر لکھا ہوا تھا: **لا إله إلا الله محمد رسول الله ﷺ**۔(۳)

گویا حضور نبی اکرم ﷺ کا کلمہ طیبہ اس میں لکھا ہوا تھا۔

---

(۱) ابن كثير، تفسير القرآن العظيم، ۳: ۱۰۰

(۲) ابن كثير، تفسير القرآن العظيم، ۳: ۱۰۰

(۳) ۱۔ طبري، جامع البيان في تفسير القرآن، ۱۶: ۶

۲۔ ابن كثير، تفسير القرآن العظيم، ۳: ۱۰۰

ابن وہب روایت کرتے ہیں کہ وہ کنز سونے کی تختیاں تھیں، جن کی ابتداء میں بسم اللہ لکھی ہوئی تھی اور اُن کا اختتام **أشهد أن لا إله إلّا الله وأشهد أنّ محمدا عبده ورسوله** ﷺ پر ہوتا تھا۔[1]

یعنی اس دیوار کا تعلق بھی علم کشف کے ساتھ ہی تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام چاہتے تھے کہ اَسرارِ دینیہ کا اور حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی اطلاعات کا خزانہ ضائع نہ ہو جائے۔ اگلی نسلوں کو ان الواح وتختیوں کے ذریعے آپ ﷺ کی آمد کی خبر ملتی رہے۔ یقیناً انبیاءِ کرام علیہم السلام بھی اُمتوں کو بتاتے تھے مگر تحریری طور پر وہ الواح تھیں جو یقیناً کسی اللہ کے نبی کی طرف سے وراثت میں آئی ہوں گی جو اپنی اُمت کو بتایا کرتے تھے کہ آخر میں رسولِ آخر الزماں ﷺ تشریف لائیں گے۔ لہٰذا اگر تم ان کا زمانہ پالو تو اُن پر ایمان لے آنا اور اُن کی اتباع کرنا۔

نیز یہ فرمان کہ 'اُن کا باپ نیک آدمی تھا' نسب کا معاملہ ہے کہ کون نیک آدمی تھا؟ حافظ ابن کثیر نے اُس صالح شخص کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان یتیم بچوں کے آباء کی سات پشتوں میں ایک نیک شخص گزرا تھا۔[2] اس نے حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی معرفت سے متعلق وہ خزانہ انبیاء کرام علیہم السلام سے لے کر دفن کیا تھا تاکہ اُس کی آئندہ نسلوں کو ملے۔ حضرت خضر علیہ السلام کی نگاہوں نے بذریعہ کشف اُسے دیکھا اور اُسے اگلی اُمتوں تک پہنچانے کے لیے محفوظ کر دیا۔

'خضر' کی وجہ تسمیہ

حضرت خضر علیہ السلام کو خضر کیوں کہتے ہیں؟ علمِ باطن، علمِ لدنی اور علمِ الٰہیہ سے ہم کنار ہونے کے بعد ان کا نام خضر پڑا۔ مفسرین لکھتے ہیں ان کا اصل نام خضر نہیں تھا۔ اس ضمن میں مختلف نام لکھے گئے ہیں، کوئی کہتے ہیں ان کا نام بلیا بن ملکان بن فالک تھا۔ کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ کہا۔ کوئی کہتے ہیں: ابو العباس اُن کی کنیت تھی۔

---

(۱) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۳: ۱۰۰

(۲) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۳: ۱۰۰

امام احمد بن حنبل نے خضر نام کے حوالے سے حضور نبی اکرم ﷺ کی حدیث کو روایت کیا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے وجہ تسمیہ بیان کی اور امام بخاری نے اس کو صحیح بخاری میں اور امام عبد الرزاق نے اسے اپنی مصنف میں حضرت ہمام بن منبہ ؒ کے طریق سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: خضر ؑ جب خشک، سفید، چٹیل اور بے آب و گیاہ زمین پر بیٹھ کر اٹھتے تھے تو وہاں سبزہ اُگ آتا تھا، یعنی جہاں قدم رکھتے تھے، مردہ زمین زندہ ہو جاتی تھی۔ وہ جہاں قیام کرتے، غسل کرتے اور وضو کرتے تھے اُس پانی اور ہوا کو یہ تاثیر مل گئی تھی کہ مردے اُس سے جِلا پاتے تھے، یعنی زندہ ہو جایا کرتے تھے۔[1]

یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت یوشع بن نون ؑ جب وہاں سے گزرے تو وہ مچھلی بطور سالن تیار کر کے چلے تھے، مگر وہ بھنی ہوئی مچھلی بھی اس آب و ہوا کے اثر سے زندہ ہوگئی تھی۔ یہ مقام علمِ لدنی کے سبب ملتا ہے۔ مذہبِ مختار یہ ہے کہ حضرت خضر نبی نہیں بلکہ اللہ کے ولی تھے۔ لہٰذا اگر نبی کو کشف کا معجزہ نصیب ہوتا ہے تو حضور نبی اکرم ﷺ کی امت کے اولیاء اللہ کو بھی کشف کرامت کے طور پر نصیب ہوتا ہے۔

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الأنبیاء، باب حدیث الخضر مع موسی ؑ، ۳: ۱۲۴۸، رقم: ۳۲۲۱

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۳۱۸، رقم: ۸۲۱۱

۳۔ ترمذی، السنن، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة الکهف، ۵: ۳۰۹، رقم: ۳۱۴۹

۴۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۱۲: ۲۰۹، رقم: ۱۲۹۱۴

۵۔ طبرانی، المعجم الأوسط، ۶: ۴۵، رقم: ۵۷۴۹

۶۔ ابن عساکر، تاریخ مدینة دمشق، ۱۶: ۴۰۲

باب نمبر 15

کشف اور مرتبۂ علمِ محمدی ﷺ

گزشتہ باب میں قرآن مجید کی متعدد آیاتِ کریمہ کی روشنی میں کشف، مکاشفہ اور مشاہدہ کو بیان کیا گیا۔ اس باب میں ہم حیاتِ نبوی سے کشف کے اِثبات کا مطالعہ کریں گے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بھی کشف کے بہت سے مظاہر ملتے ہیں۔ آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ سے شرعی دلیل کے طور پر بنیاد میسر آتی ہے کہ کشف ایک ذریعۂ علم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کو عطا فرماتا ہے اور ان کی وساطت سے اپنے اولیاء عظام کو بھی عطا فرماتا ہے۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اُمت میں آصف بن برخیا نامی ولی اللہ کو ملا، حضرت خضر علیہ السلام کو ملا۔ اِسی طرح اُمت مسلمہ میں ہزارہا اولیاء کرام حضور نبی اکرم ﷺ کے طفیل صاحبان کشف و کرامت ہوگزرے ہیں۔

ذیل میں چند احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں جن سے حیاتِ نبوی ﷺ سے بھی ہمیں کشف کا ثبوت ملتا ہے۔

ا۔ غزوۂ بدر کے واقعات سے کشف کا اِثبات

ایک طویل روایت میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہمیں ابو سفیان کے (قافلہ کی شام سے) واپس آنے کی خبر پہنچی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! شاید آپ ہماری رائے جاننا چاہتے ہیں؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اگر آپ ہمیں سمندر میں گھوڑے ڈالنے کا حکم دیں تو ہم سمندر میں بھی گھوڑے ڈال دیں گے اور اگر آپ ہمیں برکِ غماد پہاڑ سے گھوڑوں کے سینے ٹکرانے کا حکم دیں تو ہم ایسا ہی کریں گے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو غزوۂ بدر کی طرف بلایا تو لوگ روانہ ہوئے اور وادیِ بدر میں پڑاؤ

ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

هٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ. قَالَ: وَيَضَعُ يَدَهُ عَلَى الْأَرْضِ، هَاهُنَا وَهَاهُنَا. قَالَ: فَمَا مَاطَ أَحَدُهُمْ عَنْ مَوْضِعِ يَدِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ. (۱)

یہ فلاں کافر کے (قتل ہوکر) گرنے کی جگہ ہے۔ آپ ﷺ زمین پر اِس جگہ اور کبھی اُس جگہ دستِ اقدس رکھتے۔ حضرت انس ؓ کہتے ہیں: پھر (دوسرے دن) کوئی کافر بھی (قتل ہوکر) رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی جگہ سے ذرا برابر اِدھر اُدھر نہیں گرا۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

هٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ غَدًا. (۲)

کل فلاں کافر کی لاش گرنے کی یہ جگہ ہے۔

---

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة بدر، ۳:۱۴۰۳-۱۴۰۴، رقم:۱۷۷۹

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب عرض مقعد الميت من الجنة أو النار عليه وإثبات عذاب القبر والتعوذ منه، ۴:۲۲۰۲، رقم:۲۸۷۳

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳:۲۱۹، رقم:۱۳۳۲۰

۴۔ نسائي، السنن، كتاب الجنائز، باب أرواح المؤمنين، ۴:۱۰۸، رقم:۲۰۷۴

۵۔ نسائي، السنن الكبرى، ۱:۶۶۵، رقم:۲۲۰۱

۶۔ ابن أبي شيبة، المصنف، ۷:۳۶۲، رقم:۳۶۷۰۸

۷۔ ابن حبان في الصحيح، ۱۱:۲۴-۲۵، رقم:۴۷۲۲

(۲) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب الجنة وصفة نعيمها، باب عرض مقعد الميت من الجنة أو النار، ۴: ۲۲۰۲، رقم: ۲۸۷۳

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱:۲۶، رقم:۱۸۲ ←

گویا حضور نبی اکرم ﷺ نے میدانِ بدر میں جنگ ہونے سے پہلے ہی مشرکین مکہ کے مقتل کی نشان دہی فرما دی تھی۔ اگلے دن جب جنگ ہوئی تو حضور نبی اکرم ﷺ نے جس شخص کا جہاں نام لیا تھا، عین اُس جگہ پر اُس کی لاش گری۔ اس کی لاش کا ایک تھوڑا سا حصہ بھی اُس نشان سے ہٹ کر نہیں گرا تھا۔

یہ واقعہ اتنا واضح اور صریح ہے کہ اِس پر کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کشف ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ پر یہ پردے اِس طرح اُٹھے تھے کہ جو کچھ بعد میں ہونے والا تھا ایک ایک شے کو دیکھ کر پہلے ہی بیان فرما رہے ہیں۔ وہ سارے کفار جو بدر میں واصلِ جہنم ہوئے اُن کی موت کی خبر بھی دے دی اور یہ بھی واضح طور پر بتا دیا کہ مر کر ان کی لاشیں کہاں کہاں گریں گی؟ یہ کشف کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔

۲۔ غزوۂ موتہ کے اَحوال سے کشف کا ثبوت

حضور نبی اکرم ﷺ نے جنگِ موتہ کے لیے لشکر روانہ فرمایا۔ ملکِ شام میں میدان جنگ میں گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے اور آپ ﷺ مدینہ طیبہ کی مقدس سرزمین پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس میں بیٹھے وہاں کے حالات تفصیل سے بیان فرما رہے ہیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَعٰى زَيْدًا وَجَعْفَرًا وَابْنَ رَوَاحَةَ رضی اللہ عنہم لِلنَّاسِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَهُمْ

۳۔ أبو داود، السنن، كتاب الجهاد، باب في الأسير ينال منه ويضرب ويقرن، ۳:۵۸، رقم:۲۶۸۱

۴۔ ابن أبي شيبة، المصنف، ۷:۳۶۲، رقم:۳۶۷۰۹

۵۔ أبو يعلى، المسند، ۱/۱۲۹-۱۳۰، رقم:۱۴۰

۶۔ بزار، المسند، ۱:۳۴۰-۳۴۱، رقم:۲۲۲

۷۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۸:۲۱۹، رقم:۸۴۵۳

۸۔ طبراني، المعجم الصغير، ۲:۲۳۳، رقم:۱۰۸۵

خَبَرُهُمْ، فَقَالَ: أَخَذَ الرَّايَةَ زَيْدٌ، فَأُصِيبَ، ثُمَّ أَخَذَ جَعْفَرٌ، فَأُصِيبَ، ثُمَّ أَخَذَ ابْنُ رَوَاحَةَ، فَأُصِيبَ. وَعَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ حَتّٰى أَخَذَ الرَّايَةَ سَيْفٌ مِنْ سُيُوْفِ اللهِ، حَتّٰى فَتَحَ اللهُ عَلَيْهِمْ. (۱)

(جنگِ موتہ کے موقع پر) حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت زید، حضرت جعفر اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ ؓ کی (مدینہ میں) خبر آنے سے پہلے ہی اُن کے شہید ہو جانے کے متعلق لوگوں کو بتا دیا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اب زید نے جھنڈا سنبھالا ہوا ہے لیکن وہ شہید ہوگئے۔ پھر جعفر نے جھنڈا سنبھال لیا ہے اور وہ بھی شہید ہوگئے۔ پھر ابنِ رواحہ نے جھنڈا سنبھالا ہے اور وہ بھی جامِ شہادت نوش کر گئے۔ یہ فرماتے ہوئے آپ ﷺ کی چشمانِ مبارک اَشک بار تھیں۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا:) یہاں تک کہ اب اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (یعنی خالد بن ولید ؓ) نے جھنڈا سنبھال لیا ہے، حتیٰ کہ اُس کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے کافروں پر فتح عطا فرمائی ہے۔

آپ ﷺ مدینہ منورہ میں موجود ہیں اور صحابہ کرام ؓ کو ملکِ شام میں موتہ کے مقام پر ہونے والی اس جنگ کی لحہ بہ لحہ کی صورتِ حال سے آگاہ فرما رہے ہیں۔ یہ واقعہ چونکہ حضور نبی اکرم ﷺ سے صادر ہو رہا ہے، لہٰذا یہ معجزہ تو ہے مگر یہ واقعہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے کشف ہے۔ اِحیاءِ موتی، پتھروں کو کلمہ پڑھانا، کھجوروں کو بڑھانا، مردوں کو زندہ کرنا، چاند کو دو ٹکڑے کرنا اور ڈوبے ہوئے سورج کو پلٹانا یہ سب واقعات معجزہ ہیں، مگر ہر ایک واقعہ کی ماہیت جدا جدا ہے۔ جنگِ موتہ کے مذکورہ واقعہ کی ماہیت کشف، مکاشفہ اور مشاہدہ کی ہے جس میں

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب المغازي، باب غزوة مؤته من أرض الشام، ۴:۱۵۵۴، رقم:۴۰۱۴

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب فضائل الصحابة، باب مناقب خالد بن الولید ؓ، ۳:۱۳۷۲، رقم:۳۵۴۷

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱:۲۰۴، رقم: ۱۷۵۰

۴۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۲:۱۰۵، رقم: ۱۴۶۱

شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تمام ائمہ کا اس پر مکمل اتفاق ہے کہ نبی کی مطابعت و ابتاع کے باعث اُس کی امت کے اولیاء کو کرامات بھی ملتی ہیں، صرف بعض ایسے معجزات ہوتے ہیں جو اولیاء کرام کو بطورِ کرامت نہیں دیے جاتے، جیسے چاند کا ٹکڑے کرنا اور ڈوبے سورج کو پلٹا دینا۔ چند استثنائی صورتوں کے علاوہ نبی کے ہاتھ سے بطورِ معجزہ صادر ہونے کے تسلسل میں اُن کی اُمت کے اولیاء کو اکثر نوے فی صد خرقِ عادات بطور کرامت عطا کیے جاتے ہیں۔

۳۔ نماز پنج گانہ میں اَحوالِ کشف کا رُونما ہونا

حضور نبی اکرم ﷺ کی پنج گانہ نماز میں بھی کشف کے احوال رونما ہوتے تھے۔

۱۔ حضرت انس بن مالک ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب دورانِ نماز صف میں کھڑے ہوتے تو مقتدی صحابہ کرام ؓ کو فرماتے:

أَتِمُّوا الرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَ، فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ، إِنِّي لَأَرَاكُمْ مِنْ بَعْدِ ظَهْرِي إِذَا مَا رَكَعْتُمْ وَإِذَا مَا سَجَدْتُمْ. (۱)

رکوع اور سجود پوری طرح ادا کیا کرو، کیونکہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! بے شک میں تمہیں اپنی پشت کے پیچھے بھی دیکھتا ہوں جبکہ تم رکوع کر رہے ہوتے ہو یا سجدہ کر رہے ہوتے ہو۔

یعنی آپ ﷺ پر یہ سب کچھ کشف کے ذریعے عیاں رہتا تھا کہ جس طرح آپ ﷺ

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الأیمان والنذور، باب کیف کانت یمین النبي ﷺ، ۶:۲۴۴۹، رقم:۶۲۶۸

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الصلاۃ، باب الأمر بتحسین الصلاۃ وإتمامہا والخشوع فیہا، ۱:۳۱۹، رقم:۴۲۵

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳:۱۷۰، رقم:۱۲۷۵۶

آگے دیکھتے تھے، عین اُسی طرح پیچھے سے بھی دیکھتے تھے۔

واضح رہے کہ آپ ﷺ کا آگے کی جانب دیکھنا حواسِ خمسہ اور عادت کے ذریعے تھا جبکہ پشت کی جانب دیکھنا کشف کے ذریعے تھا۔

۲۔ ایک اور روایت میں حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

هَلْ تَرَوْنَ قِبْلَتِي هَاهُنَا؟ فَوَاللهِ، مَا يَخْفٰى عَلَيَّ خُشُوْعُكُمْ وَلَا رُكُوْعُكُمْ، إِنِّي لَأَرَاكُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِي. (۱)

کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ چونکہ قبلہ اِدھر ہے (اور میں حالت نماز میں قبلہ رخ کھڑا ہوں اور تم یہی سمجھ رہے ہو کہ میرا چہرہ قبلہ رُخ ہے، سو میں پیچھے کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ بے شک میرا چہرہ قبلہ رخ ہے لیکن) اللہ کی عزت کی قسم! تمہارے خشوع اور رکوع بھی میری آنکھوں سے مخفی نہیں۔ بے شک میں تمہیں اپنے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

آپ ﷺ نے واضح فرما دیا کہ رکوع اور سجود تو جسمانی حرکت ہے، میں تمہارے رکوع اور سجود میں موجود خشوع و خضوع اور تمہارے قلب کی کیفیت تک جانتا ہوں کہ وہ اللہ کی طرف کتنے متوجہ ہیں؟ یعنی میرا کشف صرف تمہارے جسموں اور پچھلی سمت دیکھنے تک نہیں ہے، بلکہ میرا کشف تمہارے جسموں کے پار تمہارے قلب و روح کی کیفیات تک بھی ہے، تمہارے باطن

---

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب الصلاة باب عظة الإمام الناس في إتمام الصلاة وذكر القبلة، ۱:۱۶۱ رقم: ۴۰۸

۲۔ بخاري، الصحيح، كتاب الأذان، باب الخشوع في الصلاة، ۱:۲۵۹ رقم: ۷۰۸

۳۔ مسلم، الصحيح، كتاب الصلاة، باب الأمر بتحسين الصلاة وإتمامها والخشوع فيها، ۱:۳۱۹، رقم: ۴۲۴

۴۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲:۳۰۳، رقم: ۸۰۱۱

پر بھی ہے۔ تمہارے ظاہر، باطن آگے، پیچھے اور دائیں بائیں کی جہات کے سارے پردے میرے سامنے اُٹھ گئے ہیں۔

۳۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز جماعت کرانے کے بعد رخِ انور ہماری طرف پھیرا، پھر ایک شخص کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

يَا فُلَانُ، أَلَا تُحْسِنُ صَلَاتَکَ؟ أَلَا يَنْظُرُ الْمُصَلِّي إِذَا صَلّٰى کَيْفَ يُصَلِّي؟ فَإِنَّمَا يُصَلِّي لِنَفْسِهٖ، إِنِّي، وَاللهِ، لَأُبْصِرُ مِنْ وَرَائِي کَمَا أُبْصِرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ.(۱)

اے فلاں شخص! (آپ ﷺ نے نام لیا) تم نے نماز اچھی طرح ادا کیوں نہیں کی؟ کیا نمازی نماز ادا کرتے وقت غور نہیں کرتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے؟ وہ محض اپنے لیے نماز پڑھتا ہے۔ خدا کی قسم! میں تمہیں اپنی پشت کے پیچھے بھی ایسے ہی دیکھتا ہوں جیسا کہ اپنے سامنے دیکھتا ہوں۔

یہ واقعہ کسی ایک وقت کا نہیں کہ کوئی کہہ دے کہ کسی خاص وقت میں ایسا ہوگیا ہے، نہیں! ایسا نہیں ہے۔ بلکہ حضور نبی اکرم ﷺ کو ہمہ وقت مکاشفہ، مشاہدہ، معائنہ سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام پر اور عمدہ کیفیت میں میسر رہتا تھا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو نہیں جانتے تھے کہ اُس نے کیسے نماز پڑھی؟ لیکن آپ ﷺ نے جب سلام پھیرا تو اُس شخص کا باقاعدہ نام لے کر بلایا۔

---

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، کتاب الصلاة، باب الأمر بتحسين الصلاة وإتمامها والخشوع فيها، ۱: ۳۱۹، رقم: ۴۲۳

۲۔ نسائي، السنن، کتاب الإمامة، باب الرکوع دون الصف، ۲: ۱۱۸، رقم: ۸۷۲

۳۔ أبو عوانة، المسند، ۱: ۴۳۴-۴۳۵، رقم: ۱۶۱۴

۴۔ بيهقي، السنن الکبری، ۲: ۲۹۰، رقم: ۳۳۹۸

۵۔ بيهقي، السنن الصغری، ۱: ۴۹۵، رقم: ۸۷۸

یہ چند احادیثِ نبوی ہیں جن میں آپ ﷺ نے خود اپنی زبان مبارک سے اپنے کشفِ تام، مشاہدۂ کاملہ کی کیفیت اور معائنہ تامہ کی دائمی کیفیت کو بیان فرمایا ہے۔

۴۔ حالتِ نماز میں جنت و دوزخ اور دیگر احوال کا کشف

حضور نبی اکرم ﷺ نہ صرف احوالِ قلوب کی خبر رکھتے تھے، بلکہ جنت و دوزخ سے بھی آپ ﷺ کے لیے پردے اُٹھا لیے گئے تھے۔ آپ ﷺ اُن کا براہ راست معائنہ فرماتے تھے، جو مکاشفہ اور مشاہدہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

۱۔ حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ بیان فرماتے ہیں:

خَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَصَلّٰى قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ، رَأَيْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَيْئًا فِي مَقَامِكَ ثُمَّ رَأَيْنَاكَ تَكَعْكَعْتَ. قَالَ: إِنِّي أُرِيْتُ الْجَنَّةَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنْقُوْدًا وَلَوْ أَخَذْتُهُ لَأَكَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِيَتِ الدُّنْيَا. (۱)

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب صفة الصلاة، رَفْعِ الْبَصَرِ إِلَى الْإِمَامِ فِي الصَّلَاةِ وَقَالَتْ عَائِشَةُ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ فِي صَلَاةِ الْكُسُوفِ: فَرَأَيْتُ جَهَنَّمَ يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا حِينَ رَأَيْتُمُونِي تَأَخَّرْتُ، ۱: ۲۶۱، رقم: ۷۱۵

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الکسوف، باب صلاة الکسوف جماعة، ۱: ۳۵۷، رقم: ۱۰۰۴

۳۔ مسلم، الصحیح، کتاب الکسوف، باب ما عرض علی النبی ﷺ فی صلاة الکسوف من أمر الجنة والنار، ۲: ۶۲۷، رقم: ۹۰۴

۴۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۲۹۸، رقم: ۲۷۱۱، ۳۳۷۴

۵۔ نسائی، السنن، کتاب الکسوف، باب قدر قرائة فی صلاة الکسوف، ۳: ۱۴۷، رقم: ۱۴۹۳

۶۔ مالك، الموطأ، ۱: ۱۸۶، رقم: ۴۴۵

رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں سورج گرہن لگا تو آپ ﷺ نے نمازِ کسوف ادا فرمائی۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے (دورانِ نماز) اپنی جگہ پر کوئی شے پکڑی تھی؟ پھر ہم نے دیکھا کہ آپ پیچھے ہٹے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے جنت دیکھی تو اس میں سے ایک انگوروں کا خوشہ پکڑنے لگا تھا اور اگر میں اسے لے لیتا تو تم اس میں سے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے۔

یہ حدیث متفق علیہ ہے اور کثیر کتب معتمدہ وصحیحہ میں آئی ہے۔ اِس حدیث مبارک سے صریحاً ثابت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ حالتِ نماز میں مصلّٰی پر کھڑے ہیں اور اس دوران آپ ﷺ جنت کا بغور نظارہ کر رہے ہیں۔ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ آپ ﷺ کو جنت کی تصویر دکھائی گئی ہو یا عکس نظر آیا ہو۔ اگر وہ جنت کی تصویر یا عکس ہوتا تو حضور ﷺ یہ سمجھ جاتے کہ یہ عکس ہے یا تصویر ہے اور کبھی دست مبارک بڑھا کر انگوروں کے خوشے کو نہ تھامتے۔ آپ ﷺ نے انہیں مکمل طور پر حقیقی جانا کہ وہ جنت ہی ہے اور انگوروں کا خوشہ ہی ہے، تبھی آپ ﷺ نے کسی مغالطے کے بغیر اُن کی طرف ہاتھ بڑھایا اور انہیں پکڑا۔ اگر ایسا گمان ہوتا تو صحابہ کرام ﷺ ہی عرض کر دیتے کہ یا رسول اللہ! کیا وہ واقعی جنت تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اُس کی تصویر یا کوئی عکس ہو۔ آپ ﷺ جواب دیتے تم کیا سمجھتے ہو کہ محض تصویر دیکھ کر میں ہاتھ بڑھا کر وہاں سے انگور پکڑنا چاہوں گا؟ نہیں، قطعاً ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد فرمانا کہ اگر میں چاہتا تو اس خوشے میں سے انگور توڑ کر لے آتا اور تم رہتی دنیا تک انہیں مسلسل کھاتے رہتے۔ یہ سارا کلام اُس جنتی انگوروں کے خوشے کے حقیقی وجود پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ 'صحیح بخاری' کی کتاب النکاح میں یہ حدیث کچھ الفاظ کے اضافہ کے ساتھ دوبارہ آئی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ ہی راوی ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا:

يَا رَسُولَ اللهِ، رَأَيْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَيْئًا فِي مَقَامِكَ هٰذَا، ثُمَّ رَأَيْنَاكَ تَكَعْكَعْتَ.

یا رسول اللہ! ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ اپنی جگہ سے آگے بڑھے اور کسی چیز کو پکڑا، پھر ہم نے دیکھا کہ آپ پیچھے ہٹ گئے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنِّي رَأَيْتُ الْجَنَّةَ أَوْ أُرِيتُ الْجَنَّةَ، فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنْقُودًا، وَلَوْ أَخَذْتُهُ لَأَكَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِيَتِ الدُّنْيَا وَرَأَيْتُ النَّارَ فَلَمْ أَرَ كَالْيَوْمِ مَنْظَرًا قَطُّ. (۱)

میں نے مصلّی پر جنت دیکھی یا مجھے دکھائی گئی، اور اُس کے اندر انگوروں کا ایک خوشہ پکڑا۔ اگر میں اُس خوشے سے انگور توڑ کر لے آتا تو تم رہتی دنیا تک اسے کھاتے رہتے (کیونکہ جنتی پھل کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بہشت کی کسی بھی چیز پر کبھی فنا نہیں آتی)۔ میں نے دوزخ بھی دیکھی ہے اور (جنت وجہنم کے) اتنے واضح اور صاف مناظر اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے۔

۳۔ اسی واقعہ کو مزید تفصیل کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے نمازِ کسوف پڑھانے کے بعد فرمایا:

إِنَّهُ عُرِضَ عَلَيَّ كُلُّ شَيءٍ تُوْلَجُوْنَهُ، فَعُرِضَتْ عَلَيَّ الْجَنَّةُ حَتّٰى لَوْ تَنَاوَلْتُ مِنْهَا قِطْفًا أَخَذْتُهُ أَوْ قَالَ: تَنَاوَلْتُ مِنْهَا قِطْفًا، فَقَصُرَتْ يَدِي عَنْهُ وَعُرِضَتْ عَلَيَّ النَّارُ، فَرَأَيْتُ فِيْهَا امْرَأَةً مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ تُعَذَّبُ فِي هِرَّةٍ لَهَا رَبَطَتْهَا، فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ، وَرَأَيْتُ أَبَا ثُمَامَةَ عَمْرَو بْنَ مَالِكٍ يَجُرُّ قُصْبَهُ فِي النَّارِ، وَإِنَّهُمْ كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ: إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا يَخْسِفَانِ إِلَّا لِمَوْتِ عَظِيْمٍ، وَإِنَّهُمَا آيَتَانِ مِنْ

---

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب النکاح، باب كُفْرانِ العَشِيرِ وهو الزَّوْج وهو الخليط من المعاشرة فيه عن أَبِي سعيد عن النَّبِيِّ ﷺ، ۵: ۱۹۹۴، رقم: ۴۹۰۱

آيَاتِ اللهِ يُرِيْكُمُوْهُمَا فَإِذَا خَسَفَا فَصَلُّوا حَتّٰى تَنْجَلِيَ.(۱)

مجھ پر وہ تمام چیزیں پیش کی گئیں جن میں تم داخل ہوگے، مجھ پر جنت پیش کی گئی حتیٰ کہ اگر میں اس سے کوئی خوشہ لینا چاہتا تو لے لیتا لیکن میں نے اپنا ہاتھ اس سے روک لیا۔ مجھ پر جہنم پیش کی گئی۔ میں نے جہنم میں بنی اسرائیل کی ایک عورت کو دیکھا جسے بلی کی وجہ سے عذاب ہو رہا تھا، اس عورت نے بلی کو باندھ کر رکھا، نہ اسے خود کچھ کھانے کو دیا نہ ہی اسے کھلا چھوڑا کہ وہ زمین میں اِدھر اُدھر سے کچھ کھا لیتی۔ میں نے جہنم میں ابو ثمامہ عمرو بن مالک کو دیکھا (جس نے بت پرستی کا آغاز کیا تھا) کہ وہ جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹ رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کسی بڑے آدمی کی موت کی وجہ سے سورج یا چاند کو گرہن لگ جاتا ہے، حالانکہ سورج اور چاند کا گرہن لگنا اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، جو اللہ تعالیٰ تمہیں دکھاتا ہے۔ جب سورج یا چاند کو گرہن لگے تو تم نماز پڑھا کرو حتیٰ کہ وہ روشن ہو جائیں۔

آپ ﷺ نے اس ایک ہی جملے 'عُرِضُ عَلَيَّ كُلُّ شَيءٍ تُوْلَجُوْنَهٗ' میں اپنے پورے کشف کو بیان فرما دیا کہ 'مجھ پر وہ تمام چیزیں پیش کی گئیں جن میں تم داخل ہو گے' یعنی جنت و جہنم اور دیگر روز قیامت کے دیگر مقامات کا آپ ﷺ نے اپنے مصلی پر قیام کی حالت میں ہی مشاہدہ فرما لیا۔ یہ کشفِ نبوی ہے بلکہ کشف کا بھی یہ بلند ترین درجہ معائنہ ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے دوزخ کا اس قدر باریک معائنہ فرمایا کہ وہاں موجود افراد کی حالت اور جن اعمال کی وجہ سے انہیں سزا ہو رہی تھی، اُسے بھی بیان فرما دیا۔

۴۔ اِسی کی مزید تفصیل 'صحیح مسلم' میں مروی ایک حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

وَرَأَيْتُ فِي النَّارِ امْرَأَةً حِمْيَرِيَّةً سَوْدَاءَ طَوِيْلَةً.(۲)

(۱) مسلم، الصحيح، كتاب الكسوف، باب ما عرِض على النّبيّ ﷺ في صلاة الكسوف من أمرِ الجنة والنّارِ، ۲: ۶۲۲ رقم: ۹۰۴

(۲) مسلم، الصحيح، كتاب الكسوف، باب ما عرِض على النّبيّ ﷺ في صلاة الكسوف من أمر الجنّة والنّار، ۲: ۶۲۳، رقم: ۹۰۴

میں نے جہنم میں ایک لمبی کالی حمیری عورت کو دیکھا۔

آپ ﷺ نے دوزخ کے اس مشاہدہ کے دوران جہاں بنی اسرائیل کی ایک عورت کو دیکھا وہیں یمن کے قبیلہ حمیر کی خاتون کو بھی دیکھا اور اُس کی رنگت اور قد و قامت تک کو بیان فرما دیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ دونوں آپ ﷺ کی امت کے افراد نہیں ہیں، اس کے باوجود آپ ﷺ ان کے حال پر مطلع ہو رہے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کی امت میں جو لوگ فوت ہوں گے، وہ جنت میں جائیں یا دوزخ میں جائیں، حضور ﷺ کا اُن کے بارے مشاہدہ کا عالم کیا ہوگا؟ اگر حضور ﷺ نے گزری ہوئی قوموں میں سے بنی اسرائیل، یمن اور حمیر کی عورتوں تک کو دیکھا ہے اور دورِ جاہلیت کے مرد کو دیکھا ہے اور پھر اُن کے عذاب کے اسباب بھی بیان فرما دیے ہیں؛ تو پھر آپ ﷺ کے مشاہدہ اور معائنہ سے باقی کیا رہ گیا ہوگا؟

اس موقع پر آپ ﷺ نے جنت کا مشاہدہ بھی کیا اور اس میں سے انگوروں کے خوشہ کو بھی لینا چاہا مگر پھر فرمایا کہ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر میں یہ خوشہ لے گیا تو یہ انگور تو قیامت تک ختم نہیں ہوں گے۔ اگر جنت کا پھل تمہارے ہاتھ آ گیا تو تم محنت، کام کاج، مزدوری اور روزگار کمانے کا عمل چھوڑ دو گے اور تمہیں جب بھی بھوک لگے گی تم اس جنت کے پھل کو کھاتے رہو گے۔ لہٰذا تم اپنے سب کام کاج چھوڑ دو گے۔ اللہ تعالیٰ نے کسبِ معاش کا جو نظام بنایا ہے وہ جاری رہے اور تم محنت کر کے اپنا کسبِ معاش کرو، اسی بنا پر میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ آپ ﷺ نے ان تمام مشاہدات و معائنہ کو بیان کرنے کے بعد آخر پر پھر دہرایا:

فَمَا مِنْ شَيءٍ تُوْعَدُوْنَهٗ إِلَّا قَدْ رَأَيْتُهٗ فِي صَلَاتِي هٰذِهٖ.

تم سے وعدہ کی گئی چیزوں میں سے کوئی ایسی شے نہیں ہے جو میرے کشف سے رہ گئی ہو اور جس کا آج میں نے اپنی اس نماز میں مشاہدہ اور معائنہ نہ کیا ہو۔

اتنا عظیم کشف صرف شانِ نبوت محمدی ﷺ کے شایانِ شان ہے۔ یہ آپ ﷺ کی عظمتِ بے مثال کا ایک منفرد اظہار ہے۔

(۱) جنت اور دوزخ کہاں وقوع پذیر ہیں؟

حضور نبی اکرم ﷺ کا کشف مبارک اتنا جامع تھا کہ آپ ﷺ نے حالتِ نماز میں اُس مقام پر کھڑے کھڑے جنت اور دوزخ دونوں کا مشاہدہ اور معائنہ کر لیا۔ اسی ضمن یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جنت اور دوزخ کہاں واقع ہیں اور ان کی ماہیت کیا ہے؟

جنت کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ أَعَدَّهَا اللهُ لِلْمُجَاهِدِيْنَ فِي سَبِيْلِهِ، كُلُّ دَرَجَتَيْنِ مَا بَيْنَهُمَا كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللهَ فَسَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَأَعْلَى الْجَنَّةِ، وَفَوْقَهُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ، وَمِنْهُ تَفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ. (۱)

جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کر رکھے ہیں۔ ہر دو درجوں کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا زمین اور آسمان کے درمیان۔ لہٰذا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کیا کرو کیونکہ یہ جنت کا درمیانی اور سب سے اونچا حصہ ہے اور اس سے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔

ائمہ نے جنت کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ ساتویں آسمان کے اُوپر ہے اور دوزخ کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ وہ زمین کی تحت الثریٰ سے بھی نیچے ہے۔ یعنی جہاں ساری

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب التوحید، باب وکان عرشه علی الماء وهو رب العرش العظیم، ۶: ۲۷۰۰، رقم: ۶۹۸۷

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجهاد والسیر، باب درجات المجاهدین فی سبیل الله، ۳: ۱۰۲۸، رقم: ۲۶۳۷

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۳۳۰، رقم: ۸۴۵۵

زمینیں ختم ہو جاتی ہیں اُن کے نیچے دوزخ ہے۔

وَقَدْ ثَبَتَ بِالْأَدِلَّةِ أَنَّ الْجَنَّةَ فَوْقَ السَّمَاءِ السَّابِعَةِ وَأَنَّ النَّارَ تَحْتَ الْأَرْضِ السَّابِعَةِ.(۱)

یہ بات دلائل سے ثابت ہوچکی ہے کہ جنت ساتوں آسمانوں سے اوپر اور دوزخ ساتوں زمینوں سے بھی نیچے ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مادی کائنات اللہ تعالیٰ نے بنائی، ان میں سب سے نیچے تحت الثریٰ ہے اور دوزخ اس سے بھی نیچے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کائنات کی وسعتوں کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یعنی کائنات کے اسفل ترین کنارے پر دوزخ ہے اور کائنات کا سب سے اونچا کنارہ عرش الٰہی ہے، اس کے بعد تو پھر لامکاں ہے۔ عرش الٰہی جنت کی چھت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عالم مکاں کا سب سے اونچا کنارہ جنت اور اس کا سب سے نچلا کنارہ دوزخ ہے۔

(۲) وحی اور کشف میں فرق

دیگر واقعات کی طرف بڑھنے سے پہلے اِسی دن کے کشف کا ایک اور واقعہ بھی اس موقع پر بیان کرنا خالی از فائدہ نہیں ہوگا۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر ؓ اس حدیث کی راویہ ہیں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر ؓ نے اِس حدیث میں صرف اُسی خطبہ کو روایت کیا ہے، جو حضور نبی اکرم ﷺ نے نماز سے فارغ ہوکر ارشاد فرمایا ہے۔ امام بخاری اسے 'باب صلاة النساء مع الرجال فی الکسوف' میں بھی لائے ہیں اور یہ مسئلہ بھی اخذ کر رہے ہیں کہ جب صلاۃ الکسوف ہو تو عورتیں بھی مردوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر ؓ نے نماز کسوف کی ادائیگی کے بعد

(۱) ۱۔ سیوطی، شرح الصدور: ۲۴۶
۲۔ آلوسی، روح المعانی، ۱۹: ۱۰۱

خود خطبہ سنا۔ لہٰذا روایت کر رہی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے صلوٰۃ الکسوف کے بعد سلام پھیرا، خطبہ ارشاد فرمایا اور اسی خطبہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

مَا مِنْ شَيءٍ كُنْتُ لَمْ أَرَهُ إِلَّا قَدْ رَأَيْتُهُ فِي مَقَامِي هٰذَا حَتَّى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ. وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيَّ أَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِي الْقُبُوْرِ. (۱)

کوئی چیز ایسی نہیں جو میں نے نہیں دیکھی تھی مگر اس جگہ پر دیکھ لی حتیٰ کہ جنت اور دوزخ بھی؛ اور مجھ پر وحی کی گئی ہے کہ قبروں میں تمہارا امتحان ہوگا۔

اس خطبہ کا جو متعلقہ (relevant) حصہ بطور حوالہ یہاں پیش (quote) کیا جارہا ہے، بڑا توجہ طلب ہے۔ اِس میں مزید دو نکتے ہیں:

ایک بیانِ کشف ہے اور ساتھ ہی متصلاً اگلے جملے میں بیانِ وحی ہے۔ اب اِس سے کوئی یہ التباس پیدا نہیں کرسکتا اور کسی کو ہونا بھی نہیں چاہیے کہ یہ جو مشاہدہ ہو رہا ہے یہ بھی وحی تھی۔ اس ضمن میں واضح رہے کہ یہ وحی نہیں ہے۔ وحی اور چیز ہے۔ وحی میں اطلاع دی جاتی ہے، خبر دی جاتی ہے، آواز دی جاتی ہے اور علم دیا جاتا ہے۔ اوپر جو بیان کیا جا رہا ہے یہ مکاشفہ اور مشاہدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی آنکھوں سے براہِ راست جو مشاہدہ فرما رہے اور دستِ مبارک سے چیزوں کو پکڑ رہے اور تیزی سے پیچھے ہٹ رہے ہیں، یہ وحی نہیں بلکہ مشاہدہ اور مکاشفہ کی کیفیات ہیں۔

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الوضوء، باب مَن لم یتوضّأ إلّا مِن الغشیِ المثقلِ، ۱:۷۹، رقم: ۱۸۲

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجمعة، باب صلاة النساء مع الرجال فی الکسوف، ۱: ۳۵۸، رقم: ۱۰۰۵

۳۔ مسلم، الصحیح، کتاب الکسوف، باب ما عرض علی النبی ﷺ فی صلاة الکسوف من أمر الجنة والنار، ۲:۶۲۴، رقم: ۹۰۵

۴۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۶:۳۴۵، رقم: ۲۶۹۷۰

۵۔ مالك، الموطأ، ۱:۱۸۹، رقم: ۴۴۷

۱۔ پہلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ آج تک جو چیز میرے مشاہدے سے رہ گئی تھی، وہ بھی میں نے دیکھ لی۔ آج آفاق، پوری کائنات، تحت الثریٰ سے عرشِ معلیٰ تک ساری کائناتی وسعتوں کا میرا مشاہدہ و مکاشفہ مکمل ہوگیا اور جو چیز بچ گئی تھی، میں نے نہیں دیکھی تھی وہ بھی آج دیکھ لی ہے۔ حتیٰ کہ عالم مکان کے آخری کنارے تک یعنی جنت کی چھتوں تک کو بھی دیکھ لیا اور تحت الثریٰ کے نچلے کنارے تک یعنی دوزخ کے احوال بھی دیکھ لیے۔

۲۔ دوسرا جملے میں آپ ﷺ نے واضح فرمایا کہ یہ بات مجھے وحی کی گئی ہے۔ گویا اِن دو باتوں یعنی کشف اور وحی میں آپ ﷺ نے واضح فرق سمجھایا کہ **پہلا** مشاہدہ اور مکاشفہ تھا۔ وہ کشف تھا جس کے ذریعے پوری کائنات کے مخفی حقائق کا علم اور ادراک ہو رہا ہے اور دوسرا جملہ کہ قبروں میں ہر ایک سے سوال جواب ہوں گے اور ہر ایک کا امتحان ہوگا، آزمایا اور پوچھا جائے گا، اُس کی اطلاع حضور ﷺ کو بذریعہ وحی فرمائی گئی ہے۔

(۳) حضور ﷺ کے علم کا اِرتقاء اور نکتۂ کمال

حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشادِ گرامی سے پہلی چیز یہ ثابت ہوتی ہے کہ نبی کا علم بھی ہر آن اور ہر لمحہ ارتقاء پذیر رہتا ہے خواہ وہ علم بالمکاشفہ ہو یا علم بالمشاہدہ ہو۔ مغیبات (غیب) کا علم ہے، یا اطلاع اور علم دینے کے اور طریقوں سے ہے جو اللہ تعالیٰ انہیں عطا کرتا ہے۔ خواہ وہ اخبار کے طریقے ہیں یا وحی کے، خواہ وہ قرآن کی شکل میں وحی جلی ہے یا وحی خفی یا جو آپ ﷺ کے قلبِ مبارک پر القاء کیا جاتا ہے؛ خواہ علم فرشتے کے ذریعے دیا جاتا ہے یا فرشتے اور واسطے کے بغیر دیا جاتا ہے۔ علم کی ساری اشکال جن جن طریقوں سے اللہ کے نبی کو عطا کی جاتی ہیں، اُن تمام طریقوں سے حاصل ہونے والے علم میں ہر پل ترقی ہوتی رہتی ہے۔ علم نبوت، نبی کی معلومات، نبی کی اطلاعات، نبی کے علوم اور نبی کے معارف میں ہر آن ارتقاء جاری رہتا ہے یعنی وہ علومِ حسّیہ ہوں یا علومِ غیبیہ ہوں، اِس دنیا سے متعلق علوم ہوں یا آخرت سے متعلق علوم ہوں، ماضی کے حقائق کی اطلاعات ہوں یا مستقبل کے حقائق کی اطلاعات ہوں، جو بھی علم جس شکل اور جس طریقے سے اللہ کے اَنبیاء اور خصوصاً حضور نبی اکرم ﷺ کو عطا کیا گیا، عطا کیا جاتا

رہا اور عطا کیا جاتا ہے، وہ ہمیشہ ارتقاء میں رہتا ہے، وہ مرحلہ وار ترقی کرتا اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ سارے مغیبات (جس کو ہم غیب کہتے ہیں) ایک ہی وقت میں عطا کرتے ہوئے اُس کی اطلاع دے دی گئی۔ اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ (gradually) علم عطا فرماتا ہے۔ بتدریج نبی کا علم بڑھتا رہتا ہے، پردے اُٹھائے جاتے ہیں اور کشف ہوتا رہتا ہے۔ اطلاع ہوتی رہتی ہے، علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ آپ ﷺ کو وصال سے قبل ایک مقام ایسا بھی حاصل ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی شے نہیں چھوڑی جس کا علم اور اطلاع اپنے محبوب ﷺ کو عطا نہ کر دی ہو۔

مذکورہ حدیث اس امر پر واضح دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو کچھ میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا وہ آج سب دیکھ لیا ہے۔ ثابت ہوا کہ اُمورِ غیبیہ میں سے پہلے زمانے میں جو دکھایا اور بتا دیا گیا تھا، اُس کا علم ہوگیا اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ آج دکھا دیا گیا ہے۔ اِس طرح آپ ﷺ کی رؤیت اُس دن جائے نماز پر کامل ہوگئی۔ آپ ﷺ کا مکاشفہ اور مشاہدہ مکمل ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم طریقِ رؤیت، طریقِ مکاشفہ اور طریقِ مشاہدہ سے عطا کرنا مقصود تھا، وہ سارا علم اپنے تکمیل کے مرحلے کو پہنچ کر مکمل ہوگیا۔

اِس حدیث مبارک سے دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ حضور نبی اکرم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے اور وہاں بھی مشاہدے کرائے گئے۔ واقعۂ معراج کے موقع پر آقائے دو جہاں ﷺ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرما رہے تھے، لہٰذا وہ معائنہ اور مشاہدہ تھا، وہ مکاشفہ نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ پردہ اُٹھا دیا گیا ہو اور کشف کے ذریعے دور سے دیکھ لیا ہو۔ اس لیے کہ کشف کے لیے یہ شرط ہے کہ آپ عادی طریق سے، اپنی اِس نگاہ سے معمول میں نہ دیکھ سکتے ہوں اور پردہ اٹھایا جائے تو آپ دور سے بھی دیکھ لیں۔

۵۔ زمان و مکان کے پردوں کا سمٹ جانا کشف کہلاتا ہے

یہاں ایک اور نکتہ سمجھ لیں کہ آپ ﷺ نے جائے نماز پر کھڑے کھڑے جنت اور دوزخ کا مشاہدہ فرمایا جبکہ حسّی طور پر نہ جنت وہاں پر موجود ہے اور نہ ہی وہاں دوزخ ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جنت عرش کے نیچے ہے اور دوزخ تحت الثریٰ میں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو فاصلے تھے وہ بھی آپ ﷺ کے لیے سمیٹ دیے گئے۔ جب پردہ اٹھایا جاتا ہے تو فاصلے نہیں رہتے، قرب اور بُعد کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ سارے بُعد قرب میں بدل جاتے ہیں اور دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ زمانہ بھی ایک پردہ ہے۔ جو واقعات ہمارے پیدا ہونے سے سو سال قبل ہوگئے تو ایک صدی کا یہ زمانہ ہمارے لیے پردہ ہے، اُس وقت کے لوگ دیکھ رہے تھے، مگر ہم ان واقعات کو نہیں دیکھ سکتے۔

قیامِ پاکستان کی مثال لے لیجیے۔ 1947ء میں یہ تاریخی واقعہ پیش آیا، جو لوگ اس موقع پر موجود نہیں تھے، اُنہوں نے تو ہندوستان کے بٹوارے کے وقت دی گئی قربانیوں کے متعلق صرف سنا ہے کہ اِس طرح خون بہا، اِس طرح جان و مال کی قربانیاں دی گئیں، اِس طرح گھر بار اور سب کچھ لُٹائے گئے۔ یہ سب ہم نے نہیں دیکھا، مگر جو لوگ اُس وقت موجود تھے، ہجرت کر رہے تھے، اُن کے لیے یہ غیب نہیں تھا اور نہ ہی یہ کشف تھا۔ اُن پر تو یہ سب کچھ بیت رہا تھا اور ہمارے لیے وہ ماضی ہوگیا، اُن کے لیے وہ حال تھا۔

آج اگر ہم میں سے کسی پر پردہ اُٹھ جائے تو وہ قیامِ پاکستان کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے وقوع پذیر ہوتا دیکھنے لگے گا کہ نہتے مسلمان قتل ہو رہے ہیں، ہر طرف خون بہہ رہا ہے، تقسیم ہو رہی ہے، اِدھر سے ہندو اور سکھ نقل مکانی کر کے اُدھر جا رہے ہیں اور اُدھر سے مسلمان ہجرت کر کے اِدھر آ رہے ہیں۔ جیسا کہ آج کل ہم ٹی وی پر replay کا آپشن دیکھتے ہیں۔

جس طرح ہم ٹی وی سکرین پر گزرے ہوئے واقعہ کو replay کی شکل میں دوبارہ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک ولی اللہ کے قلب سے جب ماضی کا پردہ اٹھتا ہے تو اُس کے لئے بھی سب کچھ replay ہو جاتا ہے۔ وہ اُس کو اِسی طرح دیکھتا ہے جیسے ہم ٹی وی

سکرین پر دیکھتے ہیں۔ پردہ کا اٹھنا اُس کے لیے اسی طرح ہے جس طرح سکرین پر تمام مناظر عیاں ہو جاتے ہیں اور وہ دور بیٹھا ان کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے۔ اگر یہاں بیٹھ کر کوئی بغداد، شام، امریکہ کو دیکھے تو اِس کا مطلب ہے کہ فاصلے کا پردہ اٹھ گیا ہے۔ پردے کا تصور ذہن میں رکھ لیں کہ یہ پردہ کوئی کپڑے یا کسی اور مادے کا بنا ہوا نہیں ہوتا بلکہ فاصلہ، وقت، اَعمالِ سیاہ بذاتِ خود پردہ ہیں، جسے حجاب کہتے ہیں۔

جنت اور دوزخ تو موجود ہیں مگر اُس کا عینی مشاہدہ لوگوں کو قیامت کے دن کے بعد ہوگا۔ موت آئے گی، قبروں میں جائیں گے، دوبارہ جی اٹھنا ہوگا، پھر محشر میں جائیں گے، حساب و کتاب ہوگا، قیامت کے دن کے پچاس ہزار سال کا عرصہ گزرے گا۔ یومِ حشر سے گزر کر جنتی جنت میں جائیں گے اور دوزخ میں جانے والے اپنے برے ٹھکانے پر پہنچیں گے۔ یہ سب کچھ اُس وقت جا کر عیاں ہوگا۔ اِس وقت وہ سب کچھ پردۂ غیب میں ہے لیکن اُس وقت یہ اُمور غیب نہیں رہیں گے۔ سو آج نہ قیامت بپا ہوئی، نہ قیامت کے دن کا خاتمہ ہوا اور نہ جنت و دوزخ عیاں ہوئی ہیں۔ جب کہ آج سے تقریباً ساڑھے چودہ سو برس قبل حضور نبی اکرم ﷺ اپنے زمانۂ اقدس میں حالت نماز کے دوران مصلّی پر کھڑے قیامت کو دیکھ رہے ہیں، جنت اور دوزخ کا معائنہ کر رہے ہیں۔ اگلی بات مزید دل چسپ ہے کہ جہنم میں کس نے جلنا ہے اور جنت میں کس نے جانا ہے؟ یہ واقعہ بھی قیامت کے دن کے بعد رونما ہوگا جب دوزخی دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے اور جنتی جنت میں بھیج دیے جائیں گے۔ ابھی تو جہنمی قبر میں عذاب جھیل رہے ہیں اور جنتی قبر میں آرام سے ہیں۔ عین دوزخ میں ڈالا جانا تو یوم قیامت کے ختم ہونے کے بعد ہوگا۔ حساب و کتاب کے بعد پتہ چلے گا کہ کون جہنم میں جل رہا ہے اور کون جنت کے مزے لے رہا ہے۔ اِس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ابھی کوئی جہنم میں جلنے کا واقعہ پیش نہیں آیا، ابھی یہ فیصلہ صرف علمِ الٰہی میں ہے۔ مگر حضور نبی اکرم ﷺ اِن تمام امور کو ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ یہ کشف در کشف ہے، جس کی مثال کوئی اور نفس، کوئی اور شخص کائنات میں نہیں بن سکتا۔

گویا کشف دو طرح کا ہوا:

۱۔ گزرے ہوئے واقعہ پر کشف ہونا اور اسے دیکھنا۔

۲۔ واقعہ ابھی رونما ہی نہیں ہوا، ابھی وہ علمِ الٰہی میں ہے مگر اُس واقعہ کو بھی وقوع پذیر ہوتا ہوا دیکھ لینا۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے کشف اور علم کا عالم یہ ہے کہ جو بات علمِ الٰہی میں مستقبل میں ہونا ہے اُس کو بھی عین حسّی اور مادی واقعے کی طرح اپنی آنکھوں سے کشف اور مشاہدہ فرما رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے مستقبل کی جو چیزیں بیان فرمائیں وہ ساری یا تو کشف کی ہیں یا وحیِ خفی کی ہیں یا آپ ﷺ کی اطلاع اور اعلام کی ہیں۔ سب کی صورتِ حال اِسی طرح ہے۔

وحی کے ذریعے جو اطلاع دے دی گئی، آنکھوں سے نہیں دیکھا، اُس پر تو کوئی کلام نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جو بعد میں ہونے والا ہے اللہ تعالیٰ نے فرشتے کے ذریعے یا براہِ راست (directly) اپنے نبی کو اُس کا علم عطا فرما دیا ہے۔ مستقبل کے واقعات کا علم ہو جائے یہ الگ موضوع ہے مگر کشف کے ذریعے اللہ کا نبی یا کوئی ولی، اُس واقعہ کو جو ابھی اِس مادی کائنات میں ہوا ہی نہیں اور اسے ابھی وجود بھی نہیں ملا، مگر پھر بھی اُس واقعے کو دیکھ لینا ایسا کشف ہے جو عام تصور سے بھی باہر ہے۔ اُس کشف کی بات ہو رہی ہے۔ آپ ﷺ جب جنت و دوزخ کے دیکھنے کی بات کرتے ہیں تو یہی وہ کشف ہے جسے سمجھانا مقصود ہے۔

۶۔ معجزۂ معراج مشاہدات و معائنات اور مکشوفات پر مبنی ہے

مجزۂ معراج کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ معجزہ معراج اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔ اگر کوئی اس کا انکار کرے تو گویا اُس نے متفق علیہ حدیث اور علمِ یقینی کا انکار کرتے ہوئے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ گویا اُس نے حضور نبی اکرم ﷺ کے معجزات اور آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا۔ متفق علیہ حدیث قطعیت کی حامل ہوتی ہے، علم کے اعتبار سے وہ قرآن مجید کی آیات کی طرح علمِ یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ معجزۂ معراج کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اِس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور نبی اکرم

ﷺ نے معراج کی رات جو کچھ نظارے کیے، وہ مکاشفات نہیں بلکہ مشاہدات اور معائنات تھے یعنی اپنی چشمانِ مقدس سے معائنہ کیا تھا۔ آپ ﷺ پہلے القدس، مسجد اقصیٰ گئے وہاں انبیاء کرام علیہم السلام کو نماز پڑھائی، پھر آپ ﷺ اپنے جسدِ اقدس اور روحِ مبارک سمیت اوپر تشریف لے گئے۔ اِس لیے فرمایا گیا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ.[1]

وہ ذات (ہر نقص اور کمزوری سے) پاک ہے جو رات کے تھوڑے سے حصہ میں اپنے (محبوب اور مقرّب) بندے کو لے گئی۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اُن کی روح کو سیر کرائی یا اُنہیں خواب دکھایا، نہیں بلکہ بِعَبْدِہٖ فرمایا یعنی وہ ذات اپنے برگزیدہ بندے کو لے گئی۔ 'عبدٗ' کا اطلاق روح اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔ خالی جسم کو بھی عبد نہیں کہا جاتا اور خالی روح کو بھی عبد نہیں کہا جاتا بلکہ عبد روح اور جسم دونوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ 'سبحٰن' کے لفظ کے ذریعے اپنی قدرت کا بیان فرما رہا ہے۔ اگر خواب میں سیر کرائی ہوتی تو اُس میں کون سی قدرت کے اظہار کی ضرورت ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ چونکہ تمام مقامات پر گئے، ساتوں آسمانوں اور اُن میں موجود مقامات کا مشاہدہ فرمایا، سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا، ملائکہ کو دیکھا، انبیاء کو دیکھا، حتیٰ کہ عرشِ الٰہی کو بھی دیکھا۔ جب مکہ سے بیت المقدس کی طرف براق پر محوِ پرواز تھے تو اس دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر مبارک کے اوپر سے گزرے اور انہیں اپنی قبر میں مصروفِ صلاۃ دیکھا۔ (اُس صلاۃ سے مراد کیا تھی؟ آیا کوئی نماز تھی یا آپ کے گزرنے پر استقبال کرتے ہوئے حضور ﷺ پر درود و سلام پڑھ رہے تھے، اس لئے کہ درود و سلام پڑھنا بھی صلوٰۃ ہے۔ یہ الگ بحث ہے اور یہاں ہمارے موضوع کا حصہ نہیں ہے۔) آپ ﷺ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی قبر میں دیکھنا بھی کشف ہے۔ اُس سفر میں مشاہدات بھی ہو رہے تھے اور مکاشفات بھی ہو رہے تھے۔ جو کچھ عیاں آنکھوں کے سامنے

(۱) الإسراء، ۱۷: ۱

دکھائی دینے کے قابل تھا وہ تو مشاہدہ ہو رہا تھا اور جو سر کی آنکھوں سے دیکھا جانے والا نہ تھا اور آپ ﷺ دیکھ رہے تھے، وہ مکاشفہ اور معائنہ ہو رہا تھا۔ پھر سدرۃ المنتہیٰ سے گزرے، مقام قاب قاسین تک گئے، حتیٰ کہ جلوۂ حق دیکھا اور اس وقت کیفیت کیا تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰیo[1]

اُن کی آنکھ نہ کسی اور طرف مائل ہوئی اور نہ حد سے بڑھی (جس کو تکنا تھا اسی پر جمی رہی)o

آپ ﷺ اس پورے سفر کے دوران مشاہدات کرتے آئے اور آیاتِ کبریٰ دیکھیں۔ اسی لئے فرمایا:

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا.[2]

کہ ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں۔

یعنی ہم انہیں سماوی کائنات میں لے جا رہے ہیں اور عرش، فوق العرش، عالم مکاں، لامکاں اور مقامِ قاب قوسین سے أو أدنیٰ تک کا سارا سفر اِس لیے کروا رہے ہیں کہ ہم اپنی نشانیاں دکھائیں اور ان نشانیوں کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

معراج کی رات تو حضور نبی اکرم ﷺ نے اُن مقامات پر جا کر یہ مشاہدات و معائنات فرمائے مگر مدینہ منورہ میں حالتِ نماز میں مصلّٰی پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے جو کچھ دیکھا وہ الگ منظر ہے۔ یہاں آپ ﷺ نے آسمانی سفر نہیں فرمایا، عرش تک نہیں گئے، بلکہ سورج گرہن کی نماز پڑھا رہے ہیں اور یہاں رسول اللہ ﷺ کی شان نرالی ہے کہ جو معراج کی رات وہاں سب کچھ جا کر دیکھا وہ یہاں مسجد نبوی میں مصلّٰی پر کھڑے ہو کر دیکھ لیا۔ حجابات اٹھ گئے اور تحت الثریٰ سے عرشِ معلّٰی تک اور جنت و دوزخ سب کچھ دیکھ لیا۔

---

(۱) النجم، ۵۳: ۱۷

(۲) الإسراء، ۱۷: ۱

اس حدیث مبارک سے یہ چیز بھی ثابت ہوئی کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ ہستیوں کے لیے کوئی ایک یا دو طریقے یا ذرائع علم محصور و مقید نہیں اور منحصر نہیں ہے کہ بس اس طریقے پر ہی وہ دیکھ سکتے ہیں کہ جائیں تو دیکھیں، لے جایا جائے تو دیکھیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ اللہ کی قدرت اور اپنے حبیب ﷺ کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ وہ جو چاہے جس مقام پر جتنے وقت میں جتنا چاہے دکھا دے۔ وہ مشاہدہ جو شاید صدیوں میں کوئی نہ کر سکے، آپ ﷺ نے دو رکعت نماز میں تحت الثریٰ سے عرش معلیٰ تک کر لیا۔ معلوم ہوا کہ عالمِ علوی، عالمِ سفلی، عالمِ ملکوت اور عالمِ ناسوت سب کچھ حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک نماز میں دیکھ لیا۔ اُس کے بعد آگے جو کچھ قیامت کے بعد ہونے والا ہے، جنت و دوزخ میں جو واقعہ ابھی تک صادر نہیں ہوا، عالمِ حسّی میں اُس کے صادر ہونے اور اُس واقعہ کو وجود ملنے سے بھی پہلے آپ ﷺ نے دیکھ لیا۔ یہ مشاہدہ و مکاشفہ تھا۔

۷۔ قبر میں دیدارِ مصطفیٰ ﷺ بھی کشف کے ذریعے ہوگا

صلوٰۃ الکسوف سے متعلقہ زیرِ بحث حدیث میں ایک اور اہم چیز بیان کی گئی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

وَلَقَدْ أُوْحِيَ إِلَيَّ اَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِي الْقُبُوْرِ.[1]

اب مجھ پر وحی کی گئی ہے کہ تم میں سے ہر ایک سے اُس کی قبر میں سوال کیا جائے گا۔

اس میں ایک بڑی عجیب حکمت اور معرفت ہے۔ حالتِ نماز میں جنت و دوزخ کا دکھایا جانا وحی نہیں تھی بلکہ مکاشفہ اور مشاہدہ تھا، پردے اٹھا کر سب کچھ دکھا دینا تھا۔ اب حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے اور میرے قلبِ اطہر پر یہ علم وارد اور اِلقاء کیا ہے کہ ہر شخص کا قبروں میں امتحان لیا جائے گا اور وہ امتحان یہ ہے کہ جب لوگ دفن کر کے واپس پلٹ

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب الوضوء، باب من لم یتوضّأ إلّا من الغشی المثقلِ، ۱:۷۹، رقم: ۱۸۲

آئیں گے تو فرشتے اس میت سے آ کر پوچھیں گے:

مَا عِلْمُکَ بِهٰذَا الرَّجُلِ؟(۱)

اس شخصیت کے بارے میں تمہارا علم کیا کہتا ہے؟

حضور نبی اکرم ﷺ نے بڑے لطیف اشارے میں بات فرما دی۔ فرمایا: میں سامنے ہوں گا، میری طرف اشارہ کر کے یہ پوچھا جائے گا کہ اِس شخصیت کے بارے میں تمہارا عقیدہ کیا تھا؟ احادیث کی کتب میں یہ حدیث کثرت کے ساتھ آئی ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ پوچھا جائے گا:

مَا کُنْتَ تَقُوْلُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ؟(۲)

تو ان ﷺ کے متعلق زندگی میں کیا کہا کرتا تھا؟

حضور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں سب کچھ پوچھا جائے گا۔ آپ ﷺ کی شان، عظمت، معرفت اور علوِ مرتبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ اِن کے متعلق تیرا عقیدہ کیا تھا اور تو کیا کہا کرتا تھا؟ لہٰذا تمام مسلمان، آپ ﷺ کے کلمہ گو اور اللہ کے سب بندوں کو میری نصیحت ہے کہ آخرت کو بہتر کرنے کے لیے حضور نبی اکرم ﷺ کی معرفت کو مضبوط کریں۔ واضح رہے کہ آپ ﷺ کی معرفت بہتر کیے بغیر کسی کی آخرت بہتر نہیں ہوگی۔ آپ ﷺ کی شانِ اقدس کو حقیقی طور پر جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ ﷺ کی شان کو کاملاً تو کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا مگر جتنی ہماری سمجھ ہے، اُسی قدر معرفت ہوگئی تو ہماری نجات یقینی ہے۔

اِس حدیث کے اگرچہ بہت سے گوشے ہیں، لیکن یہاں صرف کشف کے پہلو کو بیان

---

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب الوضوء، باب من لم یتوضّأ إلّا من الغشي المثقلِ، ۱:۷۹، رقم: ۱۸۲

(۲) بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب المیت یسمع خفق النعال، ۱: ۴۴۸، رقم: ۱۲۷۳

کیا جا رہا ہے۔ مومن فرشتوں کے اس سوال کے جواب میں کہتا ہے:

هُوَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ جَائَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى فَأَجَبْنَا وَآمَنَّا وَاتَّبَعْنَا.

یہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ ہمارے پاس اللہ کی واضح نشانیاں، معجزات اور ہدایت لے کر آئے۔ ہم نے انہیں لبیک کہا، ہم ان پر ایمان لے آئے اور ہم نے ان کی اتباع اور پیروی کی۔

جب مومن کو آپ ﷺ کی معرفت نصیب ہوگی تو وہ آپ ﷺ کو پہچان لے گا اور پھر فرشتے اسے کہیں گے کہ اب تو سو جا۔ اب تجھے کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ پھر اُس کی نیند شروع ہو جائے گی اور وہ قیامت تک آرام سے سوئے گا۔

یہ حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن نسائی؛ الغرض کثیر کتب حدیث میں آئی ہے اور سب کے الفاظ یہ ہیں:

هٰذَا الرَّجُلِ. (۱)

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر، ۱:۴۶۲، رقم: ۱۳۰۸

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب المیت یسمع خفق النعال، ۱:۴۴۸، رقم: ۱۲۷۳

۳۔ مسلم، الصحیح، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب التي یصرف بها فی الدنیا أهل الجنة وأهل النار، ۴:۲۲۰۰، رقم: ۲۸۷۰

۴۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳:۱۲۶، رقم: ۱۲۲۹۳

۵۔ أبو داود، السنن، کتاب السنة، باب فی المسألة في القبر وعذاب القبر، ۴: ۲۳۸، رقم: ۴۷۵۲

۶۔نسائی، السنن کتاب الجنائز، باب المسألة فی القبر، ۴: ۹۷، رقم: ۲۰۵۱

اِس ہستی (کے بارے میں تو کیا کہا کرتا تھا)؟

یہ بات طے شدہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں اور نہ ہی ہونا چاہیے کہ ھٰذَا اسمِ اشارہ قریب کے لیے بولا جاتا ہے۔ جب تک کوئی قریب نہ ہو، بالکل آنکھوں کے سامنے نہ ہو تو ھٰذَا استعمال نہیں کرتے۔ اب یہ کہنا:

مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ؟

یا

مَا عِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ؟

تو اِس سے مراد ذاتِ مصطفیٰ ﷺ ہی ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کوئی آدمی اِدھر اُدھر کی بات کرے تو صرف گم راہی، نادانی اور جہالت و بے خبری ہے۔ اس سوال پر بندہ اُن کو دیکھ کر، ان کی زیارت کرتے ہوئے جواب میں کہہ رہا ہے:

هُوَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ ﷺ.

وہ اللہ کے رسول محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

اس حدیث مبارک سے دو چیزیں متحقق (established) ہوگئیں:

۱۔ حضور نبی اکرم ﷺ ہر شخص کو قبر کے اندر سامنے نظر آئیں گے، بالکل قریب ہوں گے اور قبر والا اُن کی زیارت کر رہا ہوگا۔

۲۔ دوسرا یہ امر متحقق ہو گیا کہ یہ رؤیت بالعین ہوگی۔ یعنی وہ قبر میں لیٹا ہوا شخص اپنی آنکھوں سے زیارتِ رسول ﷺ سے بہرہ یاب ہوگا۔

متفق علیہ روایت میں ہے کہ جب لوگ مردے کو قبر میں دفنا کر واپس لوٹتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز بھی سن رہا ہوتا ہے یعنی اسے زندہ کرکے اس کی روح دوبارہ لوٹا دی جاتی ہے، اس وقت اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا کر کہتے ہیں:

مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ ﷺ؟[1]

تو اس ہستی سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کے متعلق (دنیا میں) کیا کہا کرتا تھا؟

حدیث مبارک کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بندہ اپنی قبر میں زندہ ہے، اُس کا فہم بھی پلٹ آتا ہے، اُس کی عقل بھی پلٹ آتی ہے، اس کے حواس بھی پلٹ آتے ہیں، آنکھیں دیکھنے لگتی ہیں، کان سننے لگتے ہیں، تب ہی تو فرشتوں کا سوال سن رہا ہے۔ زبان بولنے لگتی ہے، تب ہی تو وہ جواب دینے کے قابل ہوا ہے۔ آنکھیں دیکھنے اور پہچاننے کے قابل ہو جاتی ہیں تب ہی تو وہ پوچھتے ہیں کہ اس ہستی کے بارے میں تو کیا کہتا تھا؟ تیرا کیا عقیدہ تھا؟ ہر شخص خواہ وہ مومن ہے یا کافر اپنی آنکھوں سے حضور نبی اکرم ﷺ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ موت کے بعد اُس کافر (غیر مومن) کی آنکھوں کو بھی یہ صلاحیت عطا فرما دیتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیسے دیکھتا ہے؟ اس بارے میں ہم صرف توجیہ ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ حدیث مبارک میں حضور نبی اکرم ﷺ نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ وہ کیسے دیکھتے ہیں؟ محدثین، شارحین، علماء، فقہاء اور صاحبِ دانش افراد نے اس کی شرح فرمائی ہے اور واضح

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر، ۱:۴۶۲، رقم: ۱۳۰۸

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب المیت یسمع خفق النعال، ۱:۴۴۸، رقم: ۱۲۷۳

۳۔ مسلم، الصحیح، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب التی یصرف بها فی الدنیا أهل الجنة وأهل النار، ۴:۲۲۰۰، رقم: ۲۸۷۰

۴۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳:۱۲۶، رقم: ۱۲۲۹۳

۵۔ أبو داود، السنن، کتاب السنة، باب فی المسألة في القبر وعذاب القبر، ۴: ۲۳۸، رقم: ۴۷۵۲

۶۔ نسائی، السنن، کتاب الجنائز، باب المسألة فی القبر، ۴: ۹۷، رقم: ۲۰۵۱

کیا ہے کہ وہ کیسے دیکھتے ہیں؟

مثال سے وضاحت

ایک شخص کی وفات امریکہ میں ہو رہی ہے، کسی کی موت افریقہ میں ہورہی ہے، کسی کی مصر میں، کسی کی پاکستان میں، کسی کی بھارت میں، کسی کی شام میں، کسی کی یمن میں، کسی کی آسٹریلیا میں اور کسی کی وفات کینیڈا میں ہو رہی ہے،، جب کہ آپ ﷺ کا روضۂ انور مدینہ منورہ میں ہے۔ بالفرض بیک وقت دنیا کے مختلف ممالک میں ایک وقت میں ایک ہزار آدمی وفات پا گئے۔ وہ سب کے سب ایک ہی وقت میں دفنائے گئے اور ایک ہی وقت میں فرشتے ان سب کے پاس پہنچ گئے۔ دنیا کے مختلف براعظموں کے مختلف ممالک میں جب ایک ہی وقت میں دفنائے گئے تو ایک ہی وقت میں ان سب سے سوال ہوا۔ یہ نہیں ہوسکتا کے اس میں وقت کا تضاد (time difference) آجائے کہ ایک فوت شدہ شخص سے سوال کے بعد منکر نکیر دوسرے سے سوال کریں گے۔ اگر وہ ایسے انتظار کرتے رہیں پھر تو سوال جواب کی باری ہی نہ آئے، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ جس لمحے کوئی فوت شدہ دفن ہوا، عین اُسی لمحے فرشتے ہر ایک کی قبر میں پہنچتے ہیں اور ہر ایک سے سوالات پوچھتے ہیں۔

الغرض! ایک وقت میں اگر لاکھوں لوگ بھی فوت ہو جائیں تو ہر ایک کی قبر میں حضور نبی اکرم ﷺ ان کے سامنے ہوں گے اور ہر ایک سے فرشتے پوچھیں گے: اس ہستی کے بارے میں تو کیا کہا کرتا تھا (یعنی تیرا عقیدہ کیا تھا)؟

اس موقع پر یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیں کہ آپ ﷺ کی جو بھی زیارت کرتا ہے خواہ قبر میں کرتا ہے، خواہ خواب میں کرتا ہے، خواہ عالمِ بیداری میں کرتا ہے، جہاں بھی کرتا ہے وہ جسدِ حقیقی نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ کا جسدِ حقیقی گنبدِ خضریٰ کے نیچے موجود ہے جہاں آپ ﷺ آرام فرما ہیں۔ زیارت میں دکھائی دینے والا جسم مبارک آپ ﷺ کا جسدِ مثالی ہوتا ہے۔

اس طرح باقی اولیاء میں سے بھی اگر کسی کی کوئی زیارت کرتا ہے تو وہ جہاں مدفون

ہیں ان کا اصل جسم وہیں ہوتا ہے، زیارت میں اُن کا جسدِ مثالی ہوتا ہے۔ عین اسی طرح جیسے ملائکہ جسدِ مثالی کے ساتھ ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ عالم مثال کی کئی مثالیں ہم گزشتہ باب میں پڑھ چکے ہیں۔ خواب میں ہم جسے بھی دیکھتے ہیں حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت ہو، انبیائے کرام میں سے کسی کی زیارت ہو، صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار علیہم السلام میں سے کسی کی زیارت ہو یا اولیاء اللہ میں سے کسی کا دیدار ہو، یاد رکھ لیں کہ وہ خواب کی صورت میں ان کا جسدِ مثالی ہوتا ہے۔

اِس پر ائمہ و محدثین اور خاص طور پر امام جلال الدین سیوطی اور دیگر ائمہ کے احوال میں اس کا ذکر موجود ہے۔ زیارت خواہ خواب میں ہو یا میت کو قبر میں ہو، جب بھی کسی کو زیارت ہوتی ہے تو وہ جسدِ مثالی ہوتا ہے۔ نہ تو روح مبارک مدینہ منورہ سے چل کر آتی ہے اور نہ ہی جسم اقدس چل کر آتا ہے۔

عالمِ مثال میں اس دنیا کے ہر وجود کو ایک مثالی شکل حاصل ہے۔ ہر ایک وجود جو اس دنیا عالم شہادت اور عالم اجسام میں ہے اس کا ایک مثالی وجود ہے۔ جیسا کہ عالم ارواح میں ایک روحانی وجود ہے، روح کا ایک مثالی وجود ہے۔ گزشتہ باب میں ہم قرآن مجید کی آیت کا مطالعہ کر چکے جس میں فرمایا گیا کہ جب حضرت مریم علیہا السلام کے پاس جبریل امین علیہ السلام آئے تو قرآن مجید نے کہا:

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا○ (۱)

تو ہم نے ان کی طرف اپنی روح (یعنی فرشتہ جبرائیل) کو بھیجا سو (جبرائیل) ان کے سامنے مکمل بشری صورت میں ظاہر ہوا۔

حضرت جبریل امین علیہ السلام کو حضرت مریم علیہا السلام کے پاس پورے انسانی و بشری وجود کے ساتھ بھیجا تو اُن کا وجود مثالی تھا۔

اسی طرح قرآن مجید میں ہاروت اور ماروت کا قصہ ذکر ہوا ہے۔ یہ دونوں فرشتے تھے جو جسدِ مثالی کے ساتھ زمین پر تشریف لائے تھے۔

(۱) مریم، ۱۹:۱۷

حضور نبی اکرم ﷺ کے پاس جبریل امین ؑ کے حاضر ہونے کی ایک صورت اُن کا جسدِ مثالی کے ساتھ آنا تھا۔ مسجد نبوی کے ایک باب کا نام بابِ جبریل اسی لیے ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں پیش ہونے کے لئے اکثر و بیشتر جبریل امین ؑ اُس جگہ سے داخل ہوتے اور سلام عرض کر کے بیٹھ جاتے تھے۔

ان مثالوں سے سمجھانا یہ مقصود ہے کہ جب حضور نبی اکرم ﷺ سے متعلق ہر قبر والے سے پوچھا جائے گا تو وہاں دیکھنے کی صورت کیا ہوگی؟ تمام ائمہ و محدثین، شارحین اور اکابر نے اس بارے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حوالے سے دو امکانات ہیں:

۱۔ پہلا امکان یہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ ہر ایک کی قبر میں جسدِ مثالی کے ساتھ تشریف لائیں گے اور قبر والا حضور ﷺ کی زیارت کرے گا۔

یہ وہ عظیم معجزہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمایا اور اتنے بڑے روحانی تصرف سے نوازا ہے۔ اگر بالفرض دس لاکھ آدمی وفات پا جائیں اور ایک وقت میں دس لاکھ قبروں میں بھی زیارت کرانی ہو تو اجسادِ مثالیہ کے ساتھ ہر جگہ حضور ﷺ کی زیارت ہو سکتی ہے۔

۲۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ قبر میں جسدِ مثالی میں بھی تشریف نہیں لاتے۔ زیادہ وقیع، زیادہ وزنی اور آپ ﷺ کی شان و ادب کے زیادہ لائق، مقامِ نبوت کے ادب کے شانِ شایان اور ارجح و درست شرح یہی ہے کہ آپ ﷺ جسدِ مثالی سے ہر قبر میں تشریف نہیں لاتے بلکہ قبر والے کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دیا جاتا ہے اور وہ روضۂ انور میں موجود آپ ﷺ کے جسد مثالی زیارت کرتا ہے۔

اسی کو کشف کہتے ہیں۔ یہی بات بیان کرنے کے لیے مذکورہ حدیث مبارک بیان کی گئی ہے۔ اُس کی تشریح سے یہ واضح ہوا کہ فوت شدہ شخص کو کو کشف کرایا جاتا ہے اور وہ کشف مومن و کافر ہر ایک کے لیے اللہ تعالیٰ یکساں کر دیتا ہے، چونکہ اُس کی آخرت کا فیصلہ کرنا ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ گنبدِ خضریٰ میں آرام فرما ہیں، وفات پانے والے خواہ تعداد میں ہزاروں ہوں، ہر کسی سے قبر میں جب فرشتے سوال کرتے ہیں تو اُس کی آنکھ سے پردہ اُٹھا دیا

جاتا ہے اور وہ وہیں اپنی قبر سے حضور ﷺ کا دیدار کرتا ہے۔ اُسے یہ دیدار بذریعہ کشف کروایا جاتا ہے۔ جب پردہ اُٹھتا ہے تو نہ صرف قبر کی دیوار کا حجاب اٹھتا ہے بلکہ فاصلے اور زمانے کا بھی پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ اس لیے یوں لگتا ہے جیسے حضور نبی اکرم ﷺ بالکل آنکھوں کے سامنے قبر کے اندر ہی تشریف فرما ہیں۔ اسی کیفیت کا نام کشف ہے۔

۸۔ حضور ﷺ کے مقامِ شاہدیت سے اِثباتِ کشف

آیئے! صحیح بخاری کی ایک اور حدیث مبارکہ سے کشفِ مصطفیٰ ﷺ پر استدلال کرتے ہیں۔ امام بخاری نے یہ حدیث مختلف مقامات پر بار بار مختلف سندوں سے روایت کی ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ ایک روز میدانِ اُحد میں تشریف لے گئے اور شہداء اُحد پر اس طرح نماز پڑھی جیسے میت پر نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ پھر آپ ﷺ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور فرمایا:

إِنِّي فَرَطٌ لَكُمْ، وَأَنَا شَهِيْدٌ عَلَيْكُمْ، وَإِنِّي وَاللهِ، لَأَنْظُرُ إِلٰى حَوْضِي الْآنَ، وَإِنِّي أُعْطِيْتُ مَفَاتِيْحَ خَزَآئِنِ الْأَرْضِ، أَوْ مَفَاتِيْحَ الْأَرْضِ، وَإِنِّي وَاللهِ، مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوْا بَعْدِي وَلٰكِنْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تَتَنَافَسُوْا فِيْهَا.[1]

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب الصلاة علی الشهید، ۱:۴۵۱، رقم: ۱۲۷۹

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب المغازي، باب أحد یحبنا ونحبه، ۴:۱۴۹۸، رقم: ۳۸۵۷

۳۔ بخاری، الصحیح، کتاب المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام، ۳:۱۳۱۷، رقم: ۳۴۰۱

۴۔ بخاری، الصحیح، کتاب الرقاق، باب ما یحذر من زهرة الدنیا والتنافس فیها، ۵:۲۳۶۱، رقم: ۶۰۶۲

۵۔ مسلم، الصحیح، کتاب الفضائل، باب إثبات حوض نبینا ﷺ وصفاته، ـــ

بے شک میں تمہارا پیش رو اور تم پر گواہ ہوں۔ اللہ کی قسم! میں اپنے حوضِ کوثر کو اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں، بے شک مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں - یا فرمایا: روئے زمین کی کنجیاں - عطا کر دی گئی ہیں۔ اللہ کی قسم! مجھے یہ ڈر نہیں کہ میرے بعد تم شرک کرنے لگو گے، بلکہ مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ تم دنیا کی محبت (یعنی مال و دولت کی حرص) میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

حضور ﷺ کا یہ فرمان مبارک قیامت تک آنے والی پوری اُمت کے لیے ہے:

أَنَا شَهِيْدٌ عَلَيْكُمْ.

میں تم سب پر گواہ ہوں۔

تمہارے اعمال، احوال اور افعال کو دیکھ رہا ہوں اور میں نے اس کی گواہی دینی ہے کہ تم میں سے کون نیک اعمال کرتا رہا اور کون برے اعمال کرتا رہا ہے۔ قرآن مجید نے اسی بات کو یوں بیان فرمایا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍم بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا○[1]

پھر اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے حبیب!) ہم آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گے○

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا.[2]

اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہو۔

..... ۴:۱۷۹۵، رقم:۲۲۹۶

۶۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴:۱۵۳، رقم:۱۷۴۳۵

(۱) النساء، ۴: ۴۱

(۲) البقرة، ۲: ۱۴۳

یعنی روزِ قیامت حضور نبی اکرم ﷺ صرف اپنی اُمت پر گواہ نہیں ہوں گے بلکہ اول و آخر، ماضی و حال کی ساری اُمتوں، اَقوام اور سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی اُمتوں پر گواہ ہوں گے۔

گواہ کے لیے موقع پر موجودگی لازم ہے

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ کوئی شخص مشاہدے کے بغیر گواہی نہیں دے سکتا۔ آپ عدالت میں چلے جائیں اور کہیں کہ میں اس واقعہ پر گواہ ہوں، تو جج پوچھے گا کہ کیا آپ موقع پر موجود تھے؟ کیا آپ نے سارا وقوعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ کیا آپ اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں؟ اس کے جواب میں اگر آپ کہیں کہ میں تو وہاں موجود نہیں تھا اور نہ ہی میں نے یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے تو ایسی صورت میں جج آپ کی گواہی قبول نہیں کرے گا۔

گواہ کو عربی میں 'شہید' اور 'شاہد' کہتے ہیں۔ یہ شہود اور مشاہدہ سے ہے۔ جو آنکھوں سے دیکھے وہی گواہ ہوتا ہے، یا پھر اللہ کی طرف سے عطا کردہ علم بالوحی ہو، یعنی جسے یقینی علم ہو وہ گواہ ہوتا ہے۔ اب اُمتی کے ایک ایک عمل پر گواہی دینا اور نہ صرف اپنے اُمتی بلکہ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام کی امتوں کے احوال و اعمال کی گواہی دینا چہ معنی دارد؟ قرآن مجید نے تو ان تمام کے احوال بیان نہیں کئے۔ معلوم ہوا کہ قرآنی وحی کے ذریعے ان کا علم نہیں ملا۔ یہ علوم وحی خفی کے ذریعے عطا ہوئے ہیں یا پردے اُٹھائے گئے اور ماضی و حال کے مشاہدے نصیب ہوئے ہیں، تیسرا کوئی راستہ موجود ہی نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں بھی صرف چھبیس انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ سوا لاکھ انبیاء اور ان کی امتوں کے ساتھ کیا بیتا، قرآن مجید میں تو تمام انبیاء کے نام تک نہیں آئے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نہ صرف اُن پر بلکہ اُن سب کی اُمتوں پر بھی گواہ ہوں گے۔ جب اُن انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں کا ذکر قرآن مجید نے نہیں کیا اور قرآنی وحی میں ان کا ذکر نہیں تو پھر اس اطلاع کے دو ہی راستے رہ گئے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنی وحی کے علاوہ حضور نبی اکرم ﷺ کو وحی خفی کے ذریعے جو الہام

کئے اور علم مغیّبات عطا کئے ہیں، ان کے ذریعے ماضی اور مستقبل کے اس علم کی خبر ہوئی اور آپ ﷺ اُن امتوں پر بھی گواہ بنے۔

۲۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی چشمانِ مقدس سے ماضی اور حال کے زمانوں کے تمام پردے اُٹھا دیے گئے اور کشف اتنا قوی ہوگیا کہ آپ ﷺ ہر چیز اس طرح بیان کرتے ہیں جس طرح گواہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے والے واقعہ پر گواہی دیتا ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے فرمانِ مبارک - أَنَا شَهِيْدٌ عَلَيْكُمْ - سے مراد یہ بھی ہے گویا حضور نبی اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ ہر روز تمہارے اعمال مجھ پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کی تائید حضرت سعید بن مسیّب کے اس قول سے ہوتی ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

لَيْسَ مِنْ يَوْمٍ إِلَّا تُعْرَضُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ أُمَّتُهُ غُدْوَةً وَعَشِيَّةً، فَيَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ وَأَعْمَالِهِمْ فَلِذَالِکَ يَشْهَدُ عَلَيْهِمْ.(۱)

کوئی دن ایسا نہیں کہ جس میں صبح و شام حضور نبی اکرم ﷺ پر آپ ﷺ کی ساری اُمت پیش نہ کی جاتی ہو۔ آپ ﷺ اُن کی ظاہری علامات اور اعمال سے اُنہیں پہچانتے ہیں، اسی لیے تو آپ ﷺ ان پر (روزِ قیامت) گواہی دیں گے۔

گویا حضور ﷺ کو کشف عطا کیا جاتا ہے، پردے اُٹھائے جاتے ہیں اور ہر اُمتی خواہ وہ مشرق میں ہے یا مغرب میں اس کے اعمال ہر روز آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کئے جاتے ہیں اور آپ ﷺ انہیں صبح و شام ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اسی لیے آپ ﷺ اُن پر گواہی دیں گے۔

یہ جلیل القدر تابعی سیدنا سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ کا عقیدہ ہے جو حضرت عبد اللہ بن

(۱) ۱۔ ابن المبارك، الزهد، ۲: ۴۲، رقم: ۱۶۶
۲۔ قرطبی، الجامع لأحكام القرآن، ۵: ۱۹۸
۳۔ ابن الحاج، المدخل، ۱: ۲۵۹
۴۔ عینی، عمدة القاری، ۲۰: ۶۰
۵۔ عسقلانی، فتح الباری، ۹: ۹۹

عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں۔ اُنہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے علم حاصل کیا اور اُسی سے یہ عقیدہ اور تفسیر بیان کی ہے۔ اس قول کو حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور امام قرطبی نے بھی روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے فرمایا گیا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍم بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًاo[1]

پھر اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے حبیب!) ہم آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گےo

حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ مشاہدہ فرمانا کشف کے ذیل میں آتا ہے، اسی کشف کی بناء پر آپ ﷺ نہ صرف اپنی اُمت پر بلکہ دیگر اُمتوں پر بھی گواہی دیں گے۔

۹۔ کشف سے حوضِ کوثر کا مشاہدہ فرمانا

شہداء اُحد کے قبرستان میں منعقدہ اجتماع میں آپ ﷺ نے یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا:

وَإِنِّي وَاللهِ، لَأَنْظُرُ إِلٰى حَوْضِي الْآنَ.[2]

(۱) النساء، ۴: ۴۱

(۲) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب الصلاة علی الشهید، ۱: ۴۵۱، رقم: ۱۲۷۹

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب المغازي، باب أحد یحبنا ونحبه، ۴: ۱۴۹۸، رقم: ۳۸۵۷

۳۔ بخاری، الصحیح، کتاب المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام، ۳: ۱۳۱۷، رقم: ۳۴۰۱

۴۔ بخاری، الصحیح، کتاب الرقاق، باب ما یحذر من زهرة الدنیا والتنافس فیها، ۵: ۲۳۶۱، رقم: ۶۰۶۲

۵۔ مسلم، الصحیح، کتاب الفضائل، باب إثبات حوض نبینا ﷺ وصفاته، ۴: ۱۷۹۵، رقم: ۲۲۹۶

۶۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۱۵۳، رقم: ۱۷۴۳۵

اللہ کی قسم! میں اپنے حوضِ کوثر کو اس وقت بھی (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہا ہوں۔

یعنی شہدائے اُحد کے مزارات کے پاس منبر پر کھڑے ہو کر حضور نبی اکرم ﷺ حوضِ کوثر کو بھی دیکھ رہے ہیں، حالانکہ حوضِ کوثر روزِ قیامت آپ ﷺ کو عطا کیا جائے گا۔ گویا مستقبل سے بھی پردے اُٹھ گئے اور آپ ﷺ کو اس کا بھی کشف عطا کر دیا گیا۔ وہی حوضِ کوثر جسے اللہ تعالیٰ نے اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ، کے فرمان کے ذریعے حضور ﷺ کو عطا کئے جانے کی نوید سنائی۔ حضور نبی اکرم ﷺ اس حوض سے جام بھر بھر کر اپنے امتی غلاموں کو پلائیں گے۔ ابھی تو اس حوض کا ظہور نہیں ہوا، لیکن ظہور سے پہلے، وقوعِ محشر سے پہلے آپ ﷺ قیامت کو بھی دیکھ رہے ہیں، اور جنت میں آپ ﷺ کو عطا کیے جانے والے حوض کوثر کا مشاہدہ بھی فرما رہے ہیں۔

وحیِ جلی اور وحیِ خفی میں فرق

پہلے بھی بیان ہو چکا ہے اور اس موقع پر پھر توضیح و تصریح کرنا چاہتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ پر جو وحی اترتی تھی اُس کی دو شکلیں ہوتی تھیں:

۱۔ وحی جلی

جو قرآن مجید کی صورت میں آئی ہے۔

۲۔ وحی خفی

وہ وحی جس کا نزول آپ ﷺ پر جبریل امین علیہ السلام کے ذریعے نہیں، بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بلا واسطہ آپ ﷺ کے قلبِ اَطہر پر علم، خبر اور کسی چیز کا حکم القاء فرمایا ہے۔ وہ طریقہ الہام کا بھی ہے اور طریقہ اعلام کا بھی ہے۔ وہ طریقہ کسی بھی صورت میں ہو وہ اخبارِ الٰہی ہے اور اُسی کو ہم بنیاد بنا کر سنت اور حدیث کی حجیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ سورۃ النجم میں ارشاد فرمائے گئے اس فرمان کی تفصیل ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰیo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰیo[1]

(۱) النجم، ۵۳: ۳-۴

اور وہ (اپنی) خواہش سے کلام نہیں کرتےo اُن کا ارشاد سَراسَر وحی ہوتا ہے جو انہیں کی جاتی ہےo

معلوم ہوا آپ ﷺ کی زبان اقدس سے صادر ہونے والا ایک ایک لفظ وحی ہے۔ اگر وہ وحی حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کے ذریعے اتری ہو تو قرآن بن جاتا ہے، اگر فرشتے اور جبرائیل امین علیہ السلام کے واسطے کے بغیر براہِ راست آپ ﷺ کے قلب اطہر پر اُس کا علم القاء ہوا ہو تو وہ وحی خفی بن جاتی ہے۔ قرآن وحی جلی کے زمرے (category) میں آتا ہے اور آپ ﷺ نے سنت اور تمام احادیث مبارکہ میں جو علم، اطلاعات، خبریں اُمت کو دیں وہ سب علم وحی خفی میں آتے ہیں۔

کشف حضور ﷺ کا ایک اور مرتبہ ہے۔ یہ وہ مقامِ علم ہے جس میں حجابات اٹھا دیے جاتے تھے۔ پھر یہ کشف کرامت کی صورت میں حضور ﷺ کی امت کے صلحاء، اولیاء اور اہلِ صفائے قلب کو بھی نصیب ہوتا ہے۔ ایسے واقعات جن میں آپ ﷺ نے کسی چیز کا مشاہدہ کرنے کا ذکر فرمایا، ان میں آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے اس چیز کے بارے میں خبر دی گئی ہے یا یہ علم میرے قلب پر القاء ہوا ہے یا اللہ تعالیٰ نے مجھے خاص طریقے سے مطلع فرمایا ہے۔ شہداء اُحد پر نماز پڑھنے والی زیر بحث حدیث مبارک میں بھی آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے مطلع کیا گیا ہے کہ قیامت والے دن حوضِ کوثر بھی ہوگا جہاں سے آپ ﷺ اپنے امتیوں کو سرمدی جام بھر بھر کر پلائیں گے بلکہ فرمایا: میں اس وقت حوضِ کوثر کو دیکھ رہا ہوں۔ اِس علم کا مصدر، منبع، ذریعہ (Source) اور وسیلہ الگ ہے۔

اسی طرح جب حضور ﷺ اپنی امت کو فرماتے ہیں کہ أَنَا شَهِيْدٌ عَلَيْكُمْ کہ قیامت کے دن میں تمہارے اوپر گواہی دینے والا ہوں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اُس وقت یہ نہیں فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ میں قیامت کے دن تمہارے اوپر گواہی دے رہا ہوں۔ بلکہ فرمایا أَنَا شَهِيْدٌ عَلَيْكُم 'میں تمہارے اوپر گواہی دینے والا ہوں'۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اپنے اس مرتبے کی آگاہی اللہ تعالیٰ نے بطریقِ اعلام اور بطریقِ وحی فرمائی۔

لہٰذا اگر حضور ﷺ فرما دیں کہ مجھے اس کی خبر دی گئی ہے، یا مجھے آگاہ کیا گیا ہے کہ ایسا ہوگا تو اس کا مطلب ہے وہ اعلام و اخبار کا طریقہ ہے، قرآنی وحی ہے یا حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کے ذریعے آپ ﷺ کو جن علوم سے آگاہ فرما دیا اُن میں سے ہے، لیکن جب فرما دیں کہ میں دیکھ رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے براہ راست بذریعہ مکاشفہ اور مشاہدہ آپ ﷺ کو علم عطا کیا ہے۔ یہ صورت مختلف ہوگئی اور یہی کشف ہے۔

۱۰۔ کشف کے ذریعے شاہِ حبشہ نجاشی کے اِنتقال کی خبر دینا

حضور نبی اکرم ﷺ کے کشف کی ایک مثال شاہِ حبشہ نجاشی کے انتقال کی خبر اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھانا بھی ہے۔ جب شاہِ حبشہ نجاشی کا حبشہ (Abyssinia، جسے آج کل ایتھوپیا کہتے ہیں) میں انتقال ہوا تو حضور نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں تھے۔ آپ ﷺ نے عین اُسی لمحے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کی وفات کی خبر سنائی اور مدینہ طیبہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفیں قائم کروا کر ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ان معلومات کا ظاہری ذریعہ (source of information) کچھ نہیں تھا بلکہ یہ صرف حضور نبی اکرم ﷺ کا کشف تھا کہ آپ ﷺ نے حبشہ میں شاہ نجاشی کے انتقال کو مدینہ منورہ میں موجود ہوتے ہوئے جان لیا۔ گویا یہ ایک ایسا علم ہے جو آپ ﷺ کو بطریقِ کشف عطا ہو رہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ نَعَى النَّجَاشِيَّ فِي الْيَوْمِ الَّذِي مَاتَ فِيْهِ خَرَجَ إِلَى الْمُصَلّٰى، فَصَفَّ بِهِمْ وَكَبَّرَ أَرْبَعًا.(۱)

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب الرجل ینعی الی أهل المیت بنفسه، ۱: ۴۲۰، رقم: ۱۱۸۸

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب التکبیر علی الجنازة أربعا، ۱: ۴۴۷، رقم: ۱۲۶۸

۳۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب الصفوف علی الجنازة، ۱: ۴۴۳، ←

رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کے فوت ہونے کی اُسی روز خبر دی جس روز انہوں نے وفات پائی۔ آپ ﷺ جنازگاہ کی طرف نکلے، لوگوں نے صفیں بنائیں اور آپ ﷺ نے چار تکبیریں کہیں۔

(۱) معجزہ اور کشف میں فرق

کوئی اس واقعہ اور اس جیسے دیگر سیکڑوں واقعات کے بارے میں کہہ سکتا ہے کہ یہ تو حضور نبی اکرم ﷺ کے معجزات ہیں۔ اس کی وضاحت میں عرض ہے کہ بلا شک و شبہ یہ آپ ﷺ کا معجزہ بھی ہے اور اس کا تعلق کشف کے ساتھ بھی ہے۔ معجزہ ہونے پر نہ بحث ہے اور نہ ہی انکار ہے کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور نبی کی ذات سے جو کوئی بھی خرقِ عادت، خلافِ عادت واقعہ صادر ہوگا تو اُسے معجزہ ہی کا ٹائٹل دیں گے۔ مگر کسی واقعہ کے معجزہ ہو جانے سے اس کے کشف ہو جانے کا انکار نہیں ہو جاتا، یا اس کے کشف قرار پانے سے معجزہ ہو جانے کا انکار نہیں ہو جاتا۔ لفظ معجزہ اُس واقعہ کے بارے میں بولا جاتا ہے جو خرقِ عادت اور خلافِ عادت ہو، لیکن جب اس واقعہ کی ماہیت پر بات کریں گے کہ اس کی ماہیت کیا ہے؟ کیسے ہوا؟ تو اس کا جواب ہوگا کہ یہ کشف سے ہوا۔ اگر پوچھا جائے کہ یہ واقعہ کیا ہے اور اسے کیا کہیں گے؟ تو جواب ہوگا کہ یہ معجزہ ہے۔ 'کیا' کے جواب میں 'معجزہ' کہیں گے اور 'کیسے' کے جواب میں 'کشف' کہیں گے۔ اُس واقعہ کی ماہیت، طریقے اور وقوع پذیر ہونے کے طریق کو کشف کہا جاتا ہے۔

ایسے ہی کشف حضور ﷺ کی اُمت کے اولیاء کو بھی ہوتے تھے، ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور ان سے ثابت ہیں اور یہ عقیدے کا حصہ ہے۔ اشاعرہ، ماتریدیہ، تمام مذاہب، تمام اہل سنت اور اہل تشیع، سلفی، غیر سلفی، حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی بغیر کسی تخصیص کے اُمت کے چودہ سو سال کے عرصہ میں کسی ایک طبقہ نے بھی کشف کے وجود، اس کی حقیقت اور اس کے قائم

..... رقم: ۱۲۵۵

۴۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۵۲۹، رقم: ۱۰۸۶۴

ہونے اور باقی رہنے کا انکار نہیں کیا۔ اس پر کامل اتفاق اور اجماع ہے۔

اگر حضور نبی اکرم ﷺ کے اِن مکاشفات کو محض معجزہ کہیں اور صرف نبی کی ذات تک اسے محدود رکھیں تو پھر اس سوال کا جواب ہوگا کہ خلفاء راشدین سمیت دیگر اکابر صحابہ کرام، اہل بیت اطہار ﷺ اور اولیاء کرام کو بھی اسی طرح کے واقعات درپیش رہتے تھے کہ فاصلے اور وقت کے پردے اُن کے سامنے سے اُٹھا دیئے جاتے تھے۔ اگر کوئی کشف کی حقیقت، ماہیت، اُس کے وجود، اُس کے ثبوت اور اُس کے موجود (exist) ہونے کا انکار کرنا چاہے اور اس کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ یہ کہہ دے کہ یہ تو معجزہ ہے۔ تو وہ صحابہ کرام ﷺ کے حوالے سے اسی طرح کے واقعات پر کیا کہے گا؟ اُن کے لیے تو معجزہ نہیں کہیں گے۔ یہی بات واضح کرنا مقصود ہے کہ معجزہ ٹائٹل ہے اور جب کشف کہتے ہیں تو یہ علم کے حصول کی نوعیت ہے کہ یہ علم حاصل کیسے ہوا؟ دیکھا کیسے؟ 'کیسے' کا جواب 'کشف' ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی کے ہاتھ پر صادر ہوا تو معجزہ کہیں گے اور اگر اللہ کے ولی کے ہاتھ سے صادر ہوتا یا ہوتو اسے کرامت کہیں گے۔

(۲) کشف کے لیے مسلم یا غیر مسلم کی شرط نہیں

کشف غیر مومن کے ہاتھ سے اور غیر مسلم کی آنکھوں سے بھی صادر ہوسکتا ہے۔ ہندو جوگی ریاضت اور مجاہدہ کرنے والوں کے بھی کشف ہوتے ہیں۔ کشف تو کفار کو بھی ہوسکتا ہے۔ یہ ریاضت اور مجاہدے سے پردے کا اٹھنا ہے۔ اگر یہ کسی فاسق و فاجر، غیر مومن یا غیر مسلم کو ہو جائے تو اسے 'استدراج' کہیں گے، مگر وہ بھی کشف ہی ہے۔ جب نوعیت کی بات ہوگی تو کشف کہیں گے، جب ٹائٹل دیں گے تو استدراج کہیں گے۔ لہٰذا واقعہ ایک، نوعیت ایک، ماہیت ایک اور اُس علم کے حصول کا طریقہ کار بھی ایک ہی ہے مگر افراد بدل رہے ہیں تو نسبت کے اعتبار سے ٹائٹل بھی بدل گیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی خلافِ معمول واقعہ نبی سے صادر ہوا تو معجزہ ہوا، ولی سے صادر ہوا تو کرامت ہوئی اور کسی فاسق و فاجر حتیٰ کہ غیر مسلم سے صادر ہوگیا تو اُسے استدراج کہا جائے گا۔ یوں شخصیات کے بدلنے سے ٹائٹل بھی بدل جائے گا۔

۱۱۔ حضور ﷺ پر قبروں کے اندر کے حالات کا کشف ہونا

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيْرٍ. أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيْمَةِ، ثُمَّ أَخَذَ جَرِيْدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا بِنِصْفَيْنِ، ثُمَّ غَرَزَ فِي كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً. فَقَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ، لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا؟ فَقَالَ: لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا. (۱)

ان دونوں (قبر والوں) کو عذاب ہو رہا ہے اور انہیں کسی کبیرہ گناہ کے باعث عذاب نہیں ہو رہا۔ بلکہ ان میں سے ایک تو پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا لوگوں کی بہت چغلیاں کیا کرتا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے ایک سبز ٹہنی لی اور اس کے دو

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب الجرید علی القبر، ۱:۴۵۸، رقم:۱۲۹۵
۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الأدب، باب الغیبة، ۵:۲۲۴۹، رقم:۵۷۰۵
۳۔ مسلم، الصحیح، کتاب الطهارة، باب الدلیل علی نجاسة البول ووجوب الاستبراء منه، ۱:۲۴۰، رقم:۲۹۲
۴۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱:۲۲۵، رقم:۱۹۸۰
۵۔ أبو داود، السنن، کتاب الطهارة، باب الاستبراء من البول، ۱:۶، رقم:۲۰
۶۔ ترمذی، السنن، کتاب الطهارة، باب ما جاء في التشدید في البول، ۱:۱۰۲، رقم:۷۰
۷۔ نسائی، السنن، کتاب الطهارة، باب التنزه عن البول، ۱:۲۸، رقم:۳۱
۸۔ ابن ماجه، السنن، کتاب الطهارة، باب التشدید في البول، ۱:۱۲۵، رقم:۲۴۷، ۳۴۹۔

حصے کر کے ہر قبر پر ایک حصہ گاڑ دیا۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہ ہوں گی تو ان کے عذاب میں کمی ہوتی رہے گی۔

غور فرمائیں! قبروں کے پاس سے صحابہ کرام ؓ بھی گزرے اور حضور نبی اکرم ﷺ بھی گزرے۔ صحابہ نہیں دیکھ سکے مگر آپ ﷺ نے دیکھا۔ آپ ﷺ کو یہ کشف اس حد تک ہوا کہ آپ ﷺ نے کشف سے سببِ عذاب بھی جان لیا کہ ایک کو پیشاب کی ناپاکی کے باعث عذاب ہو رہا ہے اور دوسرے کو چغلی اور غیبت کی عادت کے باعث عذاب ہو رہا ہے۔

المختصر یہ کہ دونوں قبروں کے معاملات کو جاننا یہ آپ ﷺ کا کشف تھا۔

۱۲۔ کشفِ محمدی ﷺ زمانوں اور فاصلوں کا محتاج نہیں ہے

حضور نبی اکرم ﷺ کے کشف کی شان یہ ہے کہ آپ ﷺ کا کشف نہ تو زمانوں کا محتاج ہے اور نہ ہی فاصلوں کا محتاج ہے۔ نہ واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کا محتاج ہے اور نہ ہی کسی حقیقت کے عالم حسی اور عالم وجود میں ظاہر ہو جانے کا محتاج ہے۔ آپ ﷺ کا کشف نہ کسی بندے یا کسی شے کے وقوع کا محتاج ہے، نہ کسی کے ظہور کا محتاج ہے۔ ماضی کے زمانے کا محتاج ہے نہ مستقبل کا محتاج ہے، نہ حال کا محتاج ہے، نہ قریب کا محتاج ہے اور نہ بعید کا محتاج ہے۔ اُس چیز کو ظاہری وجود بھی نہ ملا ہو تب بھی حضور ﷺ کے کشف میں وہ نظر آتی ہے اور حضور ﷺ اسے دیکھتے ہیں۔

یہ حضور نبی اکرم ﷺ کا وہ مقامِ علم ہے کہ جس کی کوئی مثال کائنات میں نہ تو کوئی نبی دے سکتا ہے نہ کوئی رسول، نہ پیغمبر اور نہ ہی کوئی ولی۔ اولیاء اللہ کو ان کی شان و مراتب کے مطابق آپ ﷺ کے معجزات کے تسلسل اور تتبع میں کشفِ محمدی ﷺ سے ایک بڑا بطور خیرات نصیب ہوتا ہے۔ جسے کرامت اور کشف کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں علم باطن کے ذرائع و وسائل کا فہم و معرفت اور انبیاء و اولیاء کو حاصل علم باطن کے طرق کی آگہی عطا فرمائے۔

باب نمبر 16

صحابہ کرام اور اَولیاء عظام کے مکاشفات

گزشتہ باب میں یہ اَمر ثابت ہو چکا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے علم بالکشف کو یہ کہہ کر ردّ نہیں کر سکتے کہ یہ صرف معجزات تھے۔ اس لیے کہ ان کو معجزہ صرف عنوان کے طور پر کہہ سکتے ہیں جب کہ اپنی ماہیت میں وہ کشف ہے۔ مکاشفات کی یہ کیفیات بطور خیرات حضور نبی اکرم ﷺ کے اُمتیوں کو بھی عطا ہوئی ہیں۔ اس باب میں ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اولیاء عظام کے علم بالکشف کا مطالعہ کریں گے۔

ا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مکاشفات

انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات کے بیان کے بعد اب غیر نبی کے مکاشفات کا ذکر کرتے ہیں اور سب سے پہلے اس طبقہ کا ذکر کرتے ہیں کہ جو خود بھی صاحبِ ہدایت ہیں اور ان کی اقتداء کرنے والے بھی ہدایت یافتہ ہیں؛ یعنی اس باب کا آغاز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مکاشفات سے کرتے ہیں۔

(ا) سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کشف

اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غابہ نامی وادی میں انہیں کھجور کے چند درخت ہبہ کیے تھے، جن کی آمدن بیس وسق کھجوریں تھیں۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے فرمایا: اے میری پیاری بیٹی، اللہ کی قسم! تمام لوگوں میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کا اپنے بعد غنی ہونا مجھے تمہارے غنی ہونے سے زیادہ پسند ہو اور اپنے بعد مجھے کسی کی مفلسی بھی تمہارے مفلس ہونے سے زیادہ گراں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہیں کھجور کے کچھ درخت دیئے تھے جن سے

بطور آمدن بیس وسق کھجوریں آتی تھیں۔ اگر تم نے ان پر قبضہ کیا ہوتا تو اس وقت وہ تمہارے ہو جاتے، لیکن اب وہ میراث کا مال ہے اور تمہارے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ لہٰذا تم اس مال کو اللہ کی کتاب کے حکم کے مطابق تقسیم کر لینا۔

سیدہ عائشہ ﷺ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: ابا جان! مال خواہ کتنا ہی زیادہ ہوتا میں چھوڑ دیتی، لیکن میری بہن تو صرف حضرت اَسماء ہیں، دوسری کون ہے؟ حضرت ابو بکر صدیق ﷺ نے فرمایا:

ذُوْ بَطْنِ بِنْتِ خَارِجَةَ، أُرَاهَا جَارِيَةً.[1]

وَفِي رِوَايَةِ ابْنِ سَعْدٍ: فَوَلَدَتْ أُمَّ كُلْثُوْمٍ.

وہ (میری زوجہ) بنت خارجہ کے پیٹ میں ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ لڑکی ہے۔

ابن سعد کی ایک روایت میں اضافہ ہے کہ پھر حضرت اُم کلثوم پیدا ہوئیں۔

یہ سیدنا صدیق اکبر ﷺ کا کشف ہے کہ جس سے آپ نے معلوم کر لیا کہ پیدا ہونے والی بیٹی ہوگی۔

کشف اور کرامت کیا ہے؟

یہاں ضمناً عرض کرتے چلیں کہ یہ دونوں عنوان بنیادی طور پر ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔

---

(۱) ۱۔ مالك، الموطأ، كتاب الأقضية، باب ما لا يجوز من النحل، ۲:۷۵۲، رقم:۱۴۳۸
۲۔ لالكائي، كرامات الأولياء:۱۱۶-۱۱۷، رقم:۶۲-۶۳
۳۔ طحاوي، شرح معاني الآثار، ۴:۸۸
۴۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۶:۱۶۹، رقم:۱۱۷۲۸، ۱۲۲۶۷
۵۔ ابن سعد، الطبقات الكبرى، ۳:۱۹۴-۱۹۵

امام تاج الدین سبکی نے اپنی تصنیف طبقات الشافعیۃ الکبریٰ کی جلد اوّل میں حضور نبی اکرم ﷺ کے احوال کو بیان کیا ہے اور پھر صحابہ کرام ﷺ سے صادر ہونے والی کرامات کو بھی تحریر کیا ہے۔ امام سبکی حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کا مذکورہ واقعہ بیان کرنے سے قبل کرامت کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

إِعْلَمْ أَوَّلًا أَنَّ كُلَّ كَرَامَةٍ ظَهَرَتْ عَلٰى يَدِ صَحَابِيٍّ أَوْ وَلِيٍّ قَدْ تُظْهَرُ إِلٰى يَوْمٍ يَقُوْمُ النَّاسُ إِلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنِ، فَإِنَّهَا مُعْجِزَةٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ لِأَنَّ صَاحِبُهَا إِنَّمَا نَالَهَا بِالْإِقْتِدَاءِ بِهٖ. (۱)

جان لو! قیامت کے دن لوگوں کے رب العالمین کی بارگاہ میں کھڑے ہونے تک، کسی صحابی یا ولی کے ہاتھ پر جو بھی کرامت صادر ہوگی وہ حضور نبی اکرم ﷺ کے معجزہ کا تسلسل ہوگا، کیوں کہ انہیں یہ مقام آپ ﷺ کی اقتداء اور پیروی کرنے کے باعث ہی ملا ہے۔

گویا انہوں نے یہ دلیل قائم کر دی کہ کوئی شخص اگر کسی ولی کی کرامت کا انکار کرتا ہے تو وہ معجزۂ رسول ﷺ کا منکر ہے کیونکہ ہر ولی کی کرامت نبی کے معجزے کا تسلسل ہے۔ وہ حضور ﷺ کا جاری معجزہ ہے، چونکہ اسے یہ مرتبۂ کرامت اپنے نبی کی اتباع کی برکت میں ہی نصیب ہوا ہے۔ اگر وہ حضور ﷺ کی اتباع نہ کرتا تو اس مرتبۂ کرامت تک نہ پہنچتا۔ لہٰذا صاحب کرامت ہونا اتباعِ نبوت کی برکت اور اس کا پھل ہے اور وہ کرامت حضور ﷺ ہی کا معجزہ تصور کی جائے گی۔

امام تاج الدین سبکی کرامت کے مفہوم کو واضح کرنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کے ہاتھ سے صادر ہونے والی کرامات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ درج بالا واقعہ میں ان کے کشف کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سیدنا صدیقِ اکبر ﷺ نے کیسے دیکھ لیا کہ ان کی زوجہ کے بطن میں ان کی ایک اور بیٹی بھی ہے۔

---

(۱) سبکی، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ۲: ۳۲۱

اس روایت کا انکار پوری اسلامی تاریخ میں کسی نے نہیں کیا۔ تمام ائمہ اور محدثین خواہ وہ احناف تھے، مالکی تھے، شافعی تھے، حنبلی تھے، سلفی تھے، مقلد تھے یا غیر مقلد، کسی مکتب فکر کے علماء نے بھی اس روایت کا انکار نہیں کیا۔ سب نے سیدنا صدیق اکبر ﷺ کی اسی کرامت سے اپنی تصنیفات میں کرامات کے باب کا آغاز کیا ہے۔

امام سبکی بیان کرتے ہیں کہ اس واقعہ میں دو کرامتیں موجود ہیں:

ایک کرامت تو یہ کہ وصال سے قبل آپ نے کشف سے جان لیا کہ ان کی زوجہ کے پیٹ میں بیٹا نہیں بلکہ بیٹی ہے۔ پورے یقین اور وثوق کے ساتھ دو ٹوک کہا کہ اے عائشہ! تیرے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں یعنی تمہارے سمیت کل پانچ بہن بھائی ہیں۔ اللہ کے احکام کے مطابق ان میں مالِ وراثت تقسیم کرنا۔

اس میں **دوسری** کرامت یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنی اسی مرض میں وفات پا جانے کی خبر بھی دے دی۔ آدمی بیسیوں بار بیمار ہوتا ہے، پھر شفایاب ہو جاتا ہے لیکن آپ کا یہ فرمان:

وَإِنَّمَا هُوَ الْيَوْمَ مَالُ وَارِثٍ. (۱)

(لیکن) اب وہ میراث کا مال ہے۔

یعنی اب یہ مال میرا نہیں رہا، بلکہ وارثوں کا ہوگیا ہے۔ وراثت کا اشارہ کر کے آپ نے بتا دیا ہے کہ اب میری وفات ہونے والی ہے، میں اس مرض سے صحت یاب نہیں ہو پاؤں گا۔

---

(۱) ۱۔ مالك، الموطأ، كتاب الأقضية، باب ما لا يجوز من النحل، ۲:۷۵۲، رقم:۱۴۳۸

۲۔ لالكائي، كرامات الأولياء:۱۱۶-۱۱۷، رقم:۶۲-۶۳

۳۔ طحاوي، شرح معاني الآثار، ۴:۸۸

۴۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۶:۱۶۹، رقم:۱۱۷۲۸، ۱۲۲۶۷

۵۔ ابن سعد، الطبقات الكبرى، ۳:۱۹۴

(۲) سیدنا عمر فاروق ﷺ کا کشف

امام احمد بن حنبل اور کثیر ائمہ و محدثین نے حضرت عمر فاروق ﷺ کے کشف پر مبنی ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب ﷺ نے ایک لشکر روانہ کیا اور اس کا سپہ سالار ساریہ نامی شخص کو مقرر کیا۔ اس دوران ایک دن حضرت عمر ﷺ مدینہ منورہ میں لوگوں سے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، دوران خطبہ آپ منبر پر ہی بلند آواز میں پکارنے لگے:

يَا سَارِيَ الْجَبَلَ، يَا سَارِيَ الْجَبَلَ.[1]

اے ساریہ! پہاڑ کی اُوٹ لو۔ اے ساریہ! پہاڑ کی اُوٹ لو۔

اسی واقعہ کو حضرت عمرو بن حارث نے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب ﷺ منبر پر جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اچانک خطبہ ادھورا چھوڑ کر آپ ﷺ نے بلند آواز میں پکارنا شروع کر دیا: 'اے ساریہ! پہاڑ کی اوٹ لو'۔ آپ ﷺ نے دوران خطبہ یہ جملہ دو یا تین بار ارشاد فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنا خطبہ

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، فضائل الصحابة، ۱:۲۶۹، رقم:۳۵۵
۲۔ لالكائي، شرح أصول اعتقاد أهل السنة، ۷:۱۳۳۰-۱۳۳۱، رقم:۲۵۳۷-۲۵۳۸
۳۔ آجری، الشريعة، ۴:۱۸۸۸، رقم:۱۳۶۰
۴۔ بيهقي، دلائل النبوة، ۶:۳۷۰
۵۔ بيهقي، الاعتقاد:۳۱۴
۶۔ أبو نعيم، دلائل النبوة، ۱:۵۷۹، رقم:۵۲۶
۷۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۴۴:۳۳۶
۸۔ ابن كثير، البداية والنهاية، ۷:۱۳۱، ابن کثیر نے کہا ہے: اس کی سند حسن جید ہے۔
۹۔ خطيب تبريزي، مشكاة المصابيح، ۳:۱۶۷۸، رقم:۱

جمعہ جاری رکھا اور اسے مکمل کیا۔ وہاں موجود صحابہ کرام ﷺ نے گمان کیا کہ شاید حضرت عمر ﷺ پر دورانِ خطاب جوش و جنون کی کیفیت طاری ہوگئی تھی جس میں انہوں نے بلند آواز میں ساریہ کو پکارا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر حضرت عبد الرحمٰن بن عوف ﷺ ان کے پاس حاضر ہوئے اور تمام ماجرا دریافت کیا تو حضرت عمر ﷺ نے فرمایا:

إِنِّي، وَاللهِ، مَا مَلَكْتُ ذَالِكَ، رَأَيْتُهُمْ يُقَاتِلُوْنَ عِنْدَ جَبَلٍ، يُؤْتَوْنَ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ، فَلَمْ أَمْلِكْ أَنْ قُلْتُ: يَا سَارِيَةُ الْجَبَلَ، لِيَلْحَقُوْا بِالْجَبَلِ. (۱)

اللہ کی قسم! یقیناً میں اُنہیں پہاڑ کے پاس لڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا، ان پر آگے پیچھے سے حملہ کیا جا رہا تھا تو میں نے بے اختیار ہو کر پکارا: اے ساریہ! پہاڑ (کی اوٹ لو)، تاکہ وہ پہاڑ کی اوٹ لے (کر دشمن کا مقابلہ کر سکیں)۔

کچھ دنوں کے بعد حضرت ساریہ ﷺ کا قاصد خط لے کر حاضر ہوا اور اُس نے اس بات کی تصدیق کی کہ جمعہ کے روز جب سورج چمک رہا تھا تو ہم نے کسی پکارنے والے کی آواز سنی: اے ساریہ! پہاڑ کی اوٹ لو۔ پھر ہم پہاڑ کی اوٹ لے کر دشمن پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح سے سرفراز فرمایا۔

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ حضرت عمر ﷺ نے دوران خطبہ کشف سے اس جنگ کا مشاہدہ کیا اور اپنے فوجیوں کی راہ نمائی کی۔ ایسا نہیں ہوا کہ حضرت عمر ﷺ کشف کے لیے بیٹھ کر مراقبہ کر رہے ہیں، بلکہ وہ جمعہ کا خطبہ دے رہے ہیں۔ سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا کر دیا تھا جسے مقامِ تحدیث کہتے ہیں کہ سارے پردے آپ سے اُٹھا دیے گئے تھے۔

---

(۱) ۱۔ أبو نعيم، دلائل النبوة، ۱: ۵۸۰، رقم: ۵۲۸
۲۔ سيوطي، تاريخ الخلفاء: ۱۲۶
۳۔ ہندی، كنز العمال، ۱۲: ۲۵۶ رقم: ۳۵۷۹۰
۴۔ ابن حجر الهيتمي، الصوعق المحرقة، ۱: ۲۹۴

مذکورہ واقعہ کے ذیل میں امام ابن ملقّن انصاری نے فرمایا ہے:

فِيْهِ كَرَامَتَانِ لَهُ: بُلُوْغُ صَوْتِهِ وَكَشْفُهُ لَهُ عَنْهُ.(۱)

اس واقعہ میں (حضرت عمر ﷺ کی) دو کرامات بیان ہوئی ہیں: حضرت ساریہ تک میدان جنگ میں ان کی آواز کا پہنچنا اور میدان جنگ کا انہیں وہیں سے کشف ہونا (یعنی میدان جنگ دکھا دیا جانا)۔

ملا علی قاری نے 'مرقاۃ المفاتیح' میں بیان کیا ہے:

﴿فَبَيْنَمَا عُمَرُ يَخْطُبُ﴾ أَيْ فِي مَسْجِدِ الْمَدِيْنَةِ عَلٰى رُؤُوْسِ الْأَشْهَادِ مِنْ أَكَابِرِ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ، مِنْهُمْ عُثْمَانُ وَعَلِيٌّ ﷺ فَهٰذِهِ كَرَامَةٌ عَظِيْمَةٌ، وَمَنْقَبَةٌ جَسِيْمَةٌ، دَالَّةٌ عَلٰى مَزِيَّةِ جَلَالَتِهِ، وَصِحَّةِ خِلَافَتِهِ. ..... فِيْهِ أَنْوَاعٌ مِنَ الْكَرَامَةِ لِعُمَرَ ﷺ، كَشْفُ الْمَعْرِكَةِ، وَإِيْصَالُ صَوْتِهِ، وَسَمَاعُ كُلِّ مِنْهُمْ لِصَيْحَتِهِ، وَفَتْحُهُمْ وَنَصْرُهُمْ بِبَرَكَتِهِ.(۲)

(مذکورہ موقع پر جب حضرت عمر ﷺ خطاب فرما رہے تھے) یعنی مسجد نبوی میں جلیل القدر صحابہ اور تابعین کی موجودگی میں جن میں حضرت عثمان اور حضرت علی ﷺ (جیسے اکابر صحابہ) بھی تھے، یہ حضرت عمر ﷺ کی ایک عظیم کرامت اور عالی شان منقبت ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی جلالتِ شان اور خلافت کے برحق ہونے پر (بھی) دلالت کرتا ہے۔ ..... اس واقعہ میں حضرت عمر ﷺ کی کئی کرامات کا ثبوت ہے۔ (مثلاً) آپ کو (مسجد نبوی کے منبر پر کھڑے کھڑے) جنگ کا کشف (و مشاہدہ) ہونا، اپنی آواز کو (میدان جنگ میں موجود) ان (اصحاب) تک پہنچانا، اہل معرکہ میں سے ہر ایک کا آپ کی پکار کو سننا اور بالآخر آپ کی برکت سے ان کا فتح یاب و کامران ہونا۔

---

(۱) ابن الملقن، حدائق الأولياء، ۲:۴۹۷

(۲) ملا علي القاري، مرقاة المفاتيح، ۱۱:۹۹، رقم:۵۹۵۴

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر ﷺ کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب ﷺ نے مسجد نبوی میں منبر رسول ﷺ پر کھڑے ہوئے ایران میں ہونے والی جنگ کا کشف و مشاہدہ فرما لیا اور آپ کی آواز کو صرف حضرت ساریہ نے ہی نہیں بلکہ پورے لشکر کے ہزاروں صحابہ نے سنا: 'اے ساریہ! پہاڑ کی اُوٹ لو'

یہاں ضمناً اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ حضرت فاروق اعظم ﷺ صاحبِ کشف تو تھے ہی لیکن ان کے تصرفات کا بھی کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ (۱)

(۳) سیدنا عثمان غنی ﷺ کا کشف

۱۔ حضرت عثمان بن عفان ﷺ پر اپنی شہادت و تدفین کا مقام وفات سے قبل ہی منکشف

(۱) امام تاج الدین سبکی نے اپنی کتاب 'طبقات الشافعیۃ الکبری (۳۲۴:۲)' میں امام الحرمین الجوینی کی کتاب الشامل سے بیان کیا ہے کہ آپ کے زمانہ اقدس میں ایک بار زلزلہ آ گیا، جب شدید زلزلہ آیا تو حضرت فاروق اعظم ﷺ تھرتھراہٹ محسوس کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ کے ہاتھ میں اکثر درّہ ہوتا تھا۔ آپ نے درّہ زمین پر مارا اور کہا:

أَقِرِّي أَلَمْ أَعْدِلْ عَلَيْكِ؟ فَاسْتَقَرَّتْ مِنْ وَقْتِهَا.

اے زمین! ٹھہر جا؟ کیا میں تمہارے اوپر عدل نہیں کر رہا؟ (آپ کے اس عمل سے) اُسی وقت زلزلہ ختم ہو گیا اور زمین تھم گئی۔

یہ آپ ﷺ کا تصرف اور روحانی مقام ہے۔ اس واقعہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم ﷺ کا دھیان فی الفور اس امر کی طرف کیوں گیا کہ کیا زمین پر عدل نہیں ہو رہا؟ گویا آپ نے اپنے اس فرمان سے یہ بھی واضح کر دیا کہ زلزلے اُسی سرزمین پر زیادہ آتے ہیں جس پر عدل ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں نظامِ عدل حقیقی معنوں میں نافذ نہیں ہوتا، جہاں انسانی حقوق برباد ہوتے ہیں، لوگوں کے خون بہتے ہیں، عزتیں لٹتی ہیں، لوٹ مار ہوتی ہے، بدعنوانیاں ہوتی ہیں، تباہی، بربادی ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام توڑے جاتے ہیں، وہاں زلزلے آتے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ جہاں زلزلے کے مادّی اسباب ہیں وہاں روحانی اسباب بھی ہیں۔

ہوگیا تھا۔

امام مالک ﷺ سے مروی ہے کہ جب کبھی حضرت عثمان بن عفان ﷺ باغِ کوکب کے قریب سے گزرتے تو فرماتے:

لَيُدْفَنُ هَاهُنَا رَجُلٌ صَالِحٌ. (۱)

یہاں ایک نیک انسان دفن کیا جائے گا (چنانچہ آپ خود وہاں دفن کیے گئے)۔

۲۔ امام تاج الدین سبکی طبقات الشافعیة الکبری میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی ﷺ، صحابہ کرام ﷺ کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص آپ کی مجلس میں آیا۔ وہ شخص جب گھر سے نکلا تو راستے میں اسے ایک خاتون نظر آئی، اس نے اسے فقط گھور کر دیکھا تھا۔ معاملہ صرف اس حد تک ہی تھا۔ وہ شخص جونہی حضرت عثمان ﷺ کی مجلس میں داخل ہوا تو آپ ﷺ اُس شخص کو دیکھ کر بولے:

يَدْخُلُ أَحَدُكُمْ وَفِي عَيْنَيْهِ أَثَرُ الزِّنَا. (۲)

ایک ایسا شخص تمہاری مجلس میں آیا ہے جس کی آنکھوں میں بدکاری کا اثر نظر آ رہا ہے۔

یعنی اس شخص کی آنکھیں بدکاری کر کے آئی ہیں۔ وہ سمجھ گیا، لرز گیا، اور پوچھا: کیا

---

(۱) ۱۔ طبراني، المعجم الكبير، ۱:۷۸، رقم:۱۰۹

۲۔ ابن سعد، الطبقات الكبرى، ۳:۷۷

۳۔ ابن عبد البر، الاستيعاب، ۳:۱۰۴۷

۴۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۳۹:۵۳۲

۵۔ مزی، تہذیب الکمال، ۱۹:۴۵۷

۶۔ ہیثمي نے 'مجمع الزوائد (۹:۹۵)' میں کہا ہے کہ اس کے تمام رجال ثقہ ہیں۔

(۲) ۱۔ سبکی، طبقات الشافعية الكبرىٰ، ۲:۳۲۷

۲۔ مناوی، فيض القدير، ۱:۱۴۳

حضور نبی اکرم ﷺ کے بعد بھی وحی کے اترنے کا سلسلہ جاری ہے کہ جو آپ بتا رہے ہیں کہ میں کیا کر کے آیا ہوں؟ گویا اس نے حضرت عثمانِ غنی ؓ پر منکشف ہونے والی بات کی تصدیق کر دی اور اپنے عمل کا اعتراف کرلیا۔ آپ ؓ نے فرمایا: نہیں، وحی تو بند ہوگئی اب یہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ مومن کے قلب میں اتارتا ہے۔

حضرت عثمان غنی ؓ اُس حدیث نبوی کی طرف اشارہ کیا جس میں حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ ثُمَّ قَرَأَ: ﴿إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ﴾ [1] أَيِ الْمُتَفَرِّسِيْنَ. [2]

مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے پھر آپ ﷺ نے یہ آیتِ مبارکہ تلاوت فرمائی: 'بیشک اس میں اہلِ فراست کے لیے نشانیاں ہیں'۔

(۴) سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کا کشف

۱۔ دلائل النبوۃ میں امام ابونعیم الاصبہانی أصبغ بن نباتہ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ ؓ اپنے دورِ خلافت میں جنگ صفین کے لیے کوفہ سے شام کی طرف تشریف لے جا رہے تھے کہ جب میدان کربلا میں پہنچے تو اس موقع پر شہادتِ امام حسین ؓ اور واقعہ کربلا کے رونما ہونے سے کئی سال پہلے ہی ارشاد فرما دیا:

---

(۱) الحجر، ۱۵:۷۵

(۲) ۱۔ خوارزمي، جامع المسانيد للإمام أبي حنيفة، ۱:۱۸۹

۲۔ ترمذی، السنن، کتاب تفسیر القرآن، باب من سورة الحجر، ۵:۲۹۸، رقم:۳۱۲۷

۳۔ طبرانی، المعجم الأوسط، ۸:۲۳، رقم: ۷۸۴۳

۴۔قضاعي، مسند الشهاب، ۱:۳۸۷، رقم: ۶۶۳

هٰهُنَا مَنَاخُ رِكَابِهِمْ، وَمَوْضِعُ رِحَالِهِمْ، وَمُهْرَاقُ دِمَائِهِمْ، فِتْيَةٌ مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ يُقْتَلُوْنَ بِهٰذِهِ الْعَرْصَةِ. تَبْكِي عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ.(۱)

یہاں ان (حسینی لشکر) کی سواریاں بیٹھیں گی اور یہیں وہ اپنا سامانِ سفر رکھیں گے۔ یہیں ان کا خون بہے گا، وہ آل محمد ﷺ کے نوجوان ہوں گے، جو اس جگہ پر شہید کیے جائیں گے اور ان پر آسمان و زمین روئیں گے۔

سانحۂ کربلا کا واقعہ 61 ہجری میں ہوا ہے اور جنگ صفین 37 ہجری میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔ لیکن عالم یہ ہے کہ تئیس چوبیس سال قبل حضرت علی ﷺ نے ایک ایک جگہ پر ہاتھوں کے نشان لگا کر بتا دیا کہ کہاں کیا ہوگا؟ یہ کشف ہے۔

۲۔ اسی طرح حسن بن کثیر اپنے والد - جنہوں نے حضرت علی ﷺ کا زمانہ بھی پایا تھا- سے روایت کرتے ہیں، اُنہوں نے فرمایا:

خَرَجَ عَلِيٌّ ﷺ إِلَى الْفَجْرِ، فَأَقْبَلْنَ الْوَزُّ، يَصِحْنَ فِي وَجْهِهٖ، فَطَرَدُوْهُنَّ عَنْهُ. فَقَالَ: ذَرُوْهُنَّ، فَإِنَّهُنَّ نَوَائِحُ. فَضَرَبَهُ ابْنُ مُلْجِمٍ.(۲)

---

(۱) ۱۔ أبو نعيم، دلائل النبوة، ۱: ۵۸۱

۲۔ سيوطي، الخصائص الكبرى، باب إخباره ﷺ بقتل الحسين ﷺ، ۲: ۲۱۴

۳۔ ابن حجر هيتمي، الصواعق المحرقة، ۲: ۵۶۶

۴۔ محب طبری، ذخائر العقبی: ۹۷

۵۔ عاصمی، سمط النجوم العوالي، ۳: ۱۹۵

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، فضائل الصحابة، ۲: ۵۶۰، رقم: ۹۴۴

۲۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۴۲: ۵۵۵

۳۔ ابن أثير، الكامل في التاريخ، ۳: ۲۵۴

۴۔ ابن حجر هيتمي، الصواعق المحرقة، ۲: ۳۸۹ ←

حضرت علی ﷺ فجر کی نماز کے لیے تشریف لائے تو مرغابیاں شور کرتی ہوئی ان کی طرف بڑھیں، لوگوں نے انہیں آپ سے پیچھے ہٹا دیا، آپ نے فرمایا: انہیں چھوڑ دو یہ نوحہ کناں ہیں۔ پھر (اسی صبح) ابن ملجم نے آپ پر وار کیا (اور آپ کو شدید زخمی کر دیا)۔

حضرت علی ﷺ بھی بذریعہ کشف اس بات سے مطلع تھے کہ آپ کی شہادت کا وقت قریب آ گیا ہے، اسی لیے مرغابیوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ نوحہ کناں ہیں اور اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ وہ آپ کے وصال فرما جانے پر غم زدہ ہیں۔

۳۔ ایک اور روایت میں جعفر بن محمد اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ دو آدمی حضرت علی ﷺ کے دورِ حکومت میں آپ کی بارگاہ میں پیش کیے گئے۔ آپ (فیصلہ فرمانے کے لیے وہیں) دیوار کی بنیاد کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایک آدمی نے کہا: اے امیر المومنین! دیوار گرنے لگی ہے۔ حضرت علی ﷺ نے فرمایا:

إِمْضِ، كَفٰى بِاللهِ حَارِسًا، فَقَضٰى بَيْنَهُمَا، وَقَامَ، ثُمَّ سَقَطَ الْجِدَارُ. (۱)

اپنی بات جاری رکھو، اللہ تعالیٰ کی حفاظت ہی کافی ہے۔ پھر آپ ان دونوں کے درمیان فیصلہ فرما کر وہاں سے اٹھ گئے۔ بعد ازاں دیوار گر پڑی۔

۴۔ حضرت سعید بن مسیّب بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت علی بن ابی طالب ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ کے قبرستان میں داخل ہوئے، حضرت علی ﷺ سیدہ فاطمۃ الزہرا ﷺ کی قبر پر تشریف لے گئے، جبکہ بقیہ لوگ (ادھر اُدھر) چلے گئے۔..... پھر آپ نے ندا دی: اے مومن

..... ۵۔ محب طبری، ذخائر العقبی:۱۱۲

۶۔ ہندی، کنز العمال، ۱۳:۸۴، رقم:۳۶۵۸۴

(۱) ۱۔ أبو نعيم، دلائل النبوة، ۱:۵۸۲، رقم:۵۳۱

۲۔ سيوطي، تاريخ الخلفاء:۱۷۸

۳۔ ہندی، کنز العمال، ۱۳:۶۶، رقم:۳۶۴۷۱

۴۔ محب طبری، ذخائر العقبی:۹۷

اہلِ قبور! تم ہمیں اپنی خبریں بتاؤ گے یا چاہو گے کہ ہم تمہیں تمہاری خبریں بتائیں؟ تم پر سلامتی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ پھر ہم نے ایک آواز سنی:

وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِيْنَ، خَبِّرْنَا عَمَّا كَانَ بَعْدَنَا. فَقَالَ عَلِيٌّ: أَمَّا أَزْوَاجُكُمْ فَقَدْ تَزَوَّجُوْا وَأَمَا أَمْوَالُكُمْ فَقَدِ اقْتَسَمُوْهَا، وَأَوْلَادُكُمْ فَقَدْ حُشِرُوْا فِي زُمْرَةِ الْيَتَامٰى، وَالْبِنَاءُ الَّذِي شَيَّدْتُمْ، فَقَدْ سَكَنَهَا أَعْدَاؤُكُمْ. فَهٰذِهِ أَخْبَارُكُمْ عِنْدَنَا. فَمَا أَخْبَارُ مَا عِنْدَكُمْ؟ فَأَجَابَهُ مَيِّتٌ: قَدْ تَخَرَّقَتِ الْأَكْفَانُ، وَانْتَثَرَتِ الشُّعُوْرُ، وَتَقَطَّعَتِ الْجُلُوْدُ، وَسَالَتِ الْأَحْدَاقُ عَلَى الْخُدُوْدِ، وَسَالَتِ الْمَنَاخِرُ بِالْقَيْحِ وَالصَّدِيْدِ. وَمَا قَدَّمْنَاهُ وَجَدْنَاهُ، وَمَا خَلَّفْنَاهُ خَسِرْنَاهُ، وَنَحْنُ مُرْتَهِنُوْنَ بِالْأَعْمَالِ.[1]

اے امیر المؤمنین! آپ پر بھی سلام، اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکات ہوں، ہمیں یہ بتائیں کہ ہمارے بعد کیا ہوا؟ حضرت علی ﷺ نے فرمایا: رہی تمہاری بیویاں تو انہوں نے شادیاں کر لیں، اور رہے تمہارے اموال تو وہ تمہارے ورثا نے آپس میں تقسیم کر لیے، اور تمہاری اولادیں یتیموں کے زمرہ میں داخل کر دی گئیں، اور جو مضبوط عمارتیں تم نے تعمیر کی تھیں، ان میں اب تمہارے دشمن رہتے ہیں۔ یہ تمہاری خبریں تھیں جو ہمارے پاس تھیں۔ اب تمہارے ہاں جو کچھ ہے اس کی کیا خبریں ہیں؟ ایک میت نے انہیں جواب دیا: کفن پھٹ چکے ہیں، بال بکھر چکے ہیں، جلدیں (چمڑے) پھٹ چکے ہیں، آنکھوں کے ڈھیلے رخساروں پر بہہ چکے ہیں، نتھنوں سے پیپ بہہ رہی ہے، (اعمال میں سے) جو کچھ ہم نے آگے بھیجا اسے ہم نے پا لیا اور

---

(۱) ۱۔ ابن عساکر، تاریخ مدینة دمشق، ۲۷:۳۹۴-۳۹۵

۲۔ سیوطي، الخصائص الکبری، ۲:۱۱۳

۳۔ سیوطي، شرح الصدور:۲۰۷، رقم:۳۷

جو (مال و متاع) پیچھے چھوڑ آئے اس پر پچھتاوا ہے، بے شک ہم اپنے اعمال کے مرہون ہیں۔

گویا حضرت علی ؑ نے اپنے کشف سے اہل قبور سے کلام کیا اور ان کا جواب بھی سنا۔ آپ ؑ نے اُنہیں اپنے احوال سے آگاہ کیا اور ان کے احوال کی خبر گیری کی۔ یہ سارے واقعہ کو حضرت علی ؑ کے علاوہ آپ کے ساتھ موجود دیگر ساتھیوں نے بھی دیکھا اور انہوں نے بھی صاحبانِ قبر کی آواز سنی۔

(۵) سیدہ فاطمہ ؑ کا کشف

حضرت اُمّ سلمٰی ؓ روایت کرتی ہیں کہ جب سیدہ فاطمہ ؑ اپنے مرضِ وصال میں تھیں تو میں ان کی تیمارداری کیا کرتی تھی۔ میں نے علالت کے عرصہ کے دوران دیکھا کہ ایک دن ان کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔ اس وقت حضرت علی ؑ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ سیدہ فاطمہ ؑ نے مجھے فرمایا: امی جان! میرے لیے غسل کا انتظام کریں۔ سیدہ اُم سلمی ؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اُن کے لیے غسل کا پانی رکھا اور اُنہوں نے اچھی طرح غسل کیا، پھر فرمایا: امی جان! مجھے نیا لباس پہنائیں۔ میں نے انہیں نئے کپڑے دیئے جو انہوں نے زیب تن فرمائے اور کہا: امی جان! میرے لیے گھر کے درمیان بستر لگا دیں۔ میں نے ایسا ہی کیا، پھر وہ قبلہ رخ ہو کر لیٹ گئیں اور اپنا ہاتھ رخسار مبارک کے نیچے رکھ لیا۔ پھر فرمایا:

يَا أُمَّهْ، إِنِّي مَقْبُوْضَةٌ الْآنَ، وَقَدْ تَطَهَّرْتُ فَلَا يَكْشِفُنِي أَحَدٌ. (۱)

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۶:۴۶۱، رقم:۲۷۶۵۶-۲۷۶۵۷
۲۔ أحمد بن حنبل، فضائل الصحابة، ۲:۷۲۵، رقم:۱۲۴۳
۳۔ زيلعي، نصب الراية، ۲:۲۵۰
۴۔ ابن أثير، أسد الغابة، ۷:۲۲۱
۵۔ هيثمي، مجمع الزوائد، ۹:۲۱۱
۶۔ محب طبری، ذخائر العقبی:۵۳-۵۴

ماں جی! اب میری وفات ہو جائے گی۔ میں (غسل کر کے) پاک ہو چکی ہوں۔ لہٰذا اس کے بعد کوئی مجھے (غسل کے لیے) بے حجاب نہ کرے۔

چنانچہ تھوڑی دیر بعد اُسی جگہ ان کی وفات ہوگئی۔ حضرت اُمّ سلمٰی بیان کرتی ہیں: پھر حضرت علی ﷺ تشریف لائے تو میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔

سیدہ فاطمہ ﷺ کا اپنی وفات سے قبل از وقت باخبر ہونا ان کا کشف تھا۔

(۶) امام حسن بن علی ﷺ کا کشف

جہاد کی مہمات میں حضرت علی ﷺ کے دائیں جانب جبریل ﷺ اور بائیں جانب حضرت میکائیل ﷺ رہا کرتے تھے جنہیں امام حسن بن علی ﷺ دیکھا کرتے تھے۔

حضرت عاصم بن ضمرہ ﷺ سے مروی ہے کہ جب حضرت علی ﷺ کو شہید کر دیا گیا تو حضرت امام حسن بن علی ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا:

يَا أَهْلَ الْكُوْفَةِ، أَوْ يَا أَهْلَ الْعِرَاقِ، لَقَدْ كَانَ بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ رَجُلٌ، قُتِلَ اللَّيْلَةَ، أَوْ أُصِيْبَ الْيَوْمَ، لَمْ يَسْبِقْهُ الْأَوَّلُوْنَ بِعِلْمٍ، وَلَا يُدْرِكُهُ الآخَرُوْنَ. كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا بَعَثَهُ فِي سَرِيَّةٍ كَانَ جِبْرِيْلُ ﷺ عَنْ يَمِيْنِهِ وَمِيْكَائِيْلُ ﷺ عَنْ يَسَارِهِ، فَلَا يَرْجِعُ حَتّٰى يَفْتَحَ اللهُ عَلَيْهِ. (۱)

اے اَہلِ کوفہ! یا اے اہلِ عراق! آج تمہارے درمیان وہ شخص شہید کر دیا گیا جس

..... ۷۔ دولابي، الذرية الطاهرة، ۱:۱۱۲-۱۱۳، رقم:۲۱۵

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱:۱۹۹، رقم:۱۷۱۹-۱۷۲۰

۲۔ ابن أبي شيبة، المصنف، فضائل علي بن أبي طالب ﷺ، ۶:۳۶۹، رقم:۳۲۰۹۴

۳۔ طبراني، المعجم الكبير، ۳:۷۹، رقم:۲۷۱۹

۴۔ ہندی، کنز العمال، ۱۳:۸۳، رقم:۳۶۵۷۳

سے علم میں (اُمت کے) اولین بھی سبقت نہیں لے سکے اور آخرین میں سے بھی کوئی ان کے مقام کو نہ پہنچ سکے گا۔ حضور نبی اکرم ﷺ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی جہاد کی مہم پر روانہ فرماتے تو آپ کی دائیں جانب جبرائیل علیہ السلام اور بائیں جانب میکائیل علیہ السلام رہا کرتے، چنانچہ آپ کبھی بھی فتح حاصل کیے بغیر نہیں لوٹتے تھے۔

(۷) حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا کشف

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب غزوۂ احد کا وقت قریب آیا تو میرے والد حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے مجھے رات کے وقت بلایا اور فرمایا:

مَا أَرَانِي إِلَّا مَقْتُولًا فِي أَوَّلِ مَنْ يُقْتَلُ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ، وَإِنِّي لَا أَتْرُكُ بَعْدِي أَعَزَّ عَلَيَّ مِنْكَ غَيْرَ نَفْسِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ، فَإِنَّ عَلَيَّ دَيْنًا، فَاقْضِ، وَاسْتَوْصِ بِأَخَوَاتِكَ خَيْرًا. (۱)

میں (کشف سے) یہی دیکھتا ہوں کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے صحابہ میں سب سے پہلے میں شہید کیا جاؤں گا اور (دیکھو) میں اپنے بعد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے سوا تم سے بڑھ کر کوئی (اور) عزیز نہیں چھوڑ کر جا رہا۔ (لہٰذا تمہارے لیے یہ میری وصیت ہے کہ) مجھ پر کچھ قرض ہے اسے ادا کر دینا اور اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ صبح ہوئی تو سب سے پہلے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ ہی شہید کیے گئے اور ایک دوسرے شہید کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے۔ بعدازاں

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب هل يخرج الميّت من القبر واللّحد لِعلّةٍ، ۱: ۴۵۳، رقم: ۱۲۸۶
۲۔ حاکم، المستدرك، ۳: ۲۲۴، رقم: ۴۹۱۳
۳۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۶: ۲۸۵، رقم: ۱۲۴۵۹

میرا دل اس پر رضامند نہ ہوا کہ انہیں قبر میں کسی دوسرے کے ساتھ چھوڑے رکھوں۔ لہٰذا چھ ماہ کے بعد میں نے ان کا جسدِ اقدس نکالا تو وہ اسی طرح تر و تازہ تھا جیسے دفن کرنے کے روز تھا، سوائے ایک کان کے جو دورانِ جنگ شہید ہو گیا تھا۔

(۸) حضرت عمران بن حصین ﷺ کا کشف

امام مسلم نے 'الصحیح' میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمران بن حصین ﷺ ہمیشہ اپنی زندگی میں ملائکہ کو دیکھا کرتے تھے اور ملائکہ ان سے مصافحہ بھی کیا کرتے تھے۔ مستند کتب حدیث و سیر میں ہے کہ تیس سال تک ملائکہ ان کے گھر میں ان کے حجرے اور صحن میں آتے جاتے تھے اور گھر والے ان کی آوازیں بھی سنتے تھے۔

حضرت عمران بن حصین ﷺ خود بیان کرتے ہیں:

قَدْ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ.(۱)

فرشتے مجھے سلام کیا کرتے ہیں۔

امام نووی 'صحیح مسلم' کی اسی حدیث کی شرح میں بیان کرتے ہیں:

وَكَانَتِ الْمَلَائِكَةُ تُسَلِّمُ عَلَيْهِ.(۲)

انہیں ملائکہ سلام کیا کرتے تھے۔

امام حاکم اپنی 'المستدرک' میں صحیح روایت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ہمیشہ ملائکہ حضرت عمران بن حصین ﷺ پر آ کر سلام کیا کرتے تھے، وہ خود بیان کرتے ہیں:

إِنَّهُ كَانَتْ تُسَلِّمُ الْمَلَائِكَةُ عَلَيَّ عِنْدَ رَأْسِي، وَعِنْدَ الْبَيْتِ، وَعِنْدَ بَابِ

---

(۱) مسلم، الصحيح، كتاب الحج، باب جاز التمتع، ۲: ۸۹۹ رقم: ۱۲۲۶

(۲) نووی، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، كتاب الحج، باب جواز التمتع، ۸: ۲۰۶

الْحِجْرِ.[1]

بے شک فرشتے میرے سر کی طرف سے مجھے سلام کرتے تھے، میرے گھر کے اندر بھی سلام کرتے تھے، میرے دروازے پر بھی سلام کرتے تھے۔

بلکہ یہاں تک فرمایا کہ جب علالت ہوئی تو انہوں نے ایک خاص طریقے سے علاج کروایا، جو ان کے مقامِ تقویٰ کے لیے مناسب نہ تھا۔ فرماتے ہیں کہ اس سے ملائکہ نے سلام کرنا اور آ کر ملنا چھوڑ دیا۔ مجھے پریشانی لاحق ہوئی کہ ملائکہ کیوں ہٹ گئے ہیں۔ بعد ازاں میں نے وہ علاج ترک کر دیا۔ جیسے ہی علاج ترک کیا، ملائکہ پھر واپس آ گئے اور سلام کرنے لگے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ تا دمِ وفات جاری رہا۔

حضرت قتادہ (تابعی) روایت کرتے ہیں:

إِنَّ الْمَلَائِكَةُ كَانَتْ تُصَافِحُ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ.[2]

ملائکہ حضرت عمران بن حصین ﷺ کے ساتھ آ کر مصافحہ کیا کرتے تھے۔

حضرت یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں:

مَا قَدِمَ عَلَيْنَا الْبَصْرَةَ مِنَ الصَّحَابَةِ أَفْضَلُ مِنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ ﷺ، أَتَتْ عَلَيْهِ ثَلَاثُوْنَ السَّنَةَ تُسَلِّمُ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ جَوَانِبِ بَيْتِهِ.[3]

بڑے بڑے صحابہ کرام ﷺ بصرہ میں آئے مگر حضرت عمران بن حصین ﷺ کی شان والا کوئی صحابی بصرہ میں وارد نہیں ہوا، ان کی شان یہ تھی کہ تیس سال تک ملائکہ ان

---

(۱) حاكم، المستدرك، ۳: ۵۳۶، رقم: ۵۹۹۴

(۲) ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ، ۴: ۲۸۸

(۳) ۱۔ أبو إسحاق شيرازی، طبقات الفقهاء: ۳۳

۲۔ سیوطی نے 'الخصائص الکبریٰ (۲: ۱۵۷)' میں کہا کہ اسے امام ابو نعیم نے بھی روایت کیا ہے۔

کے پاس آتے، مصافحہ کرتے، سلام کرتے اور ان کے گھروں کے چاروں اطراف سے سلام کیا کرتے تھے۔

یہی بات امام بیہقی نے 'دلائل النبوۃ' میں بھی روایت کی ہے، ان کے اہلِ خانہ کہتے:

وَنَسْمَعُ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ، وَلَا نَرٰى أَحَدًا.(۱)

ہم السلام علیکم کی آوازیں سنتے تھے، (لیکن السلام علیکم کہنے والا) کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

یہ حضرت عمران بن حصین ﷺ کا مقام کشف تھا کہ آپ کو فرشتوں کی زیارت ہوتی اور آپ ان سے مصافحہ بھی کرتے۔ وہ آپ کو السلام علیکم کہتے، آپ انہیں جواب دیتے اور یہ آواز ان کے علاوہ ان کے اہل خانہ بھی سنتے تھے۔

(۹) ایک صحابیِ رسول کا کشف

حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے کسی صحابی ﷺ نے ایک قبر پر اپنا خیمہ لگایا جبکہ انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ قبر ہے۔ انہیں اچانک پتہ چلا کہ یہ قبر ہے اور اس میں کوئی آدمی سورۃ الملک پڑھ رہا ہے، یہاں تک کہ پڑھنے والے نے قبر کے اندر مکمل سورۃ الملک پڑھی۔ وہ صحابی ﷺ حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ گوش گزار کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

هِيَ الْمَانِعَةُ، هِيَ الْمُنْجِيَةُ، تُنْجِيهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ.(۲)

---

(۱) ۱۔ بيهقي، دلائل النبوة، ۷: ۸۱

۲۔ سيوطي، الخصائص الكبرىٰ، ۲: ۱۵۷

(۲) ۱۔ ترمذي، السنن، كتاب فضائل القرآن، باب ما جاء في فضل سورة الملك، ۵: ۱۶۴، رقم: ۲۸۹۰

۲۔ طبراني، المعجم الكبير، ۱۲: ۱۷۴، رقم: ۱۲۸۰۱

۳۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۲: ۴۹۵، رقم: ۲۵۱۰

یہ (سورت عذاب کو) روکنے والی اور عذابِ قبر سے نجات دلانے والی ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابی کی بات سن کر یہ نہیں فرمایا کہ قبر کے اندر موجود میت تو نظر نہیں آتی، وہ تو غیب ہوتا ہے اور تجھ پر غیب کیسے منکشف ہوگیا! بلکہ آپ ﷺ نے اس کی بات کے تسلسل میں فرمایا کہ ہاں سورۃ الملک پڑھنے سے عذاب قبر سے نجات مل جاتی ہے۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ بہت سے لوگ ہیں کہ جنہیں بذریعہ کشف علم حاصل ہوتا ہے۔

(۱۰) شہداءِ اُحد علیہم السلام کے حوالے سے کشف

۱۔ ہاشم بن محمد عمری حضرت عمر بن علی کی اولاد میں سے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: مدینہ منورہ میں جمعہ کے روز فجر اور سورج کے طلوع ہونے کے درمیان میرے والد مجھے شہداء اُحد کی قبروں کی زیارت کے لیے لے گئے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جب وہ قبروں کے پاس پہنچے تو انہوں نے بلند آواز سے کہا:

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ، فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ، قَالَ: فَأُجِيْبَ: وَعَلَيْكَ السَّلَامُ، يَا أَبَا عَبْدِ اللهِ.(۱)

تم پر سلامتی ہو تمہارے صبر کرنے کے صلہ میں، پس (اب دیکھو) آخرت کا گھر کیا خوب ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں: (انہیں) جواب دیا گیا: **وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ يَا أَبَا عَبْدِ اللهِ!**

ہاشم بن محمد عمری نے بتایا کہ سلام کا جواب سننے کے بعد میرے والد گرامی میری طرف متوجہ ہوئے اور مجھ سے پوچھا: اے میرے بیٹے، کیا میرے سلام کا جواب تم نے دیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں! وہ بیان کرتے ہیں: یہ سنتے ہی میرے والد نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنی

..... ۴۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۳:۸۱

(۱) ۱۔ بيهقي، دلائل النبوة، ۳:۳۰۹

۲۔ ابن كثير، البداية والنهاية، ۴:۴۵

دائیں طرف کر لیا، اور ان شہداء پر دوبارہ سلام بھیجا۔ پھر جب بھی وہ انہیں سلام کرتے تو انہیں جواب ملتا، یہاں تک کہ انہوں نے یہ عمل تین مرتبہ دہرایا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد یہ رحمتِ الٰہی دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجا لائے۔

۲۔ اسی طرح حضرت عبد اللہ بن ابی فروہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے اُحد کے مقام پر شہداء کی قبروں کی زیارت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! بے شک تیرا بندہ اور تیرا نبی گواہی دیتا ہے کہ یہ شہداء ہیں اور قیامت کے دن تک جو شخص بھی ان کی زیارت کرے گا یا انہیں سلام کہے گا یہ اس کا جواب دیں گے۔

عطاف کہتے ہیں کہ میری خالہ نے مجھے بتایا کہ اس نے شہداء اُحد کی قبروں کی زیارت کی اور کہا کہ میرے ساتھ صرف دو غلام تھے جو میری سواری کی حفاظت کر رہے تھے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے جب ان شہداء کو سلام کیا تو خود ان کے سلام کا جواب سنا۔ انہوں نے فرمایا:

وَاللهِ، إِنَّا نَعْرِفُكُمْ، كَمَا يَعْرِفُ بَعْضُنَا بَعْضًا، قَالَتْ: فَاقْشَعْرَرْتُ وَقُلْتُ: يَا غُلَامُ، أَدْنِ بَغْلَتِي، فَرَكِبْتُ. (۱)

اللہ تعالیٰ کی قسم! ہم تمہیں ایسے ہی جانتے ہیں جیسے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ (یہ سن کر) میں کانپ اٹھی اور میں نے (اپنے غلاموں میں سے ایک کو) کہا: اے غلام! میرا خچر میرے قریب لاؤ۔ پھر میں اس پر سوار ہوگئی۔

۳۔ ایک روایت میں حضرت عطاف بن خالد بیان کرتے ہیں کہ میری خالہ ہمیشہ شہداءِ اُحد کی قبروں کی زیارت کیا کرتی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں: ایک دن میں حسب معمول شہداءِ اُحد کی قبروں کی طرف گئی؛ میں حضرت امیر حمزہ ﷺ کی قبر کے قریب اپنی سواری سے اتری اور

---

(۱) ۱۔ حاکم نے 'المستدرك، كتاب المغازي والسرايا، ۳:۳۱، رقم:۴۳۲۰)' میں فرمایا ہے کہ یہ مدنی سند صحیح ہے۔
۲۔ بيهقي، دلائل النبوة، ۳:۳۰۷
۳۔ سيوطي، الخصائص الكبرى، ۱:۳۶۴

نفل نماز کی اتنی رکعات پڑھیں جتنی اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی۔ اس وقت اس وادی میں نہ کوئی پکارنے والا تھا اور نہ ہی کسی کی پکار کا کوئی جواب دینے والا تھا، سوائے میرے غلام کے جو میری سواری کی لگام پکڑے کھڑا تھا۔ دریں حال جب میں اپنی نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے اپنے ہاتھ سے یوں اشارہ کرتے ہوئے اَلسّلامُ عَلَیْکُمْ کہا۔ وہ کہتی ہیں کہ جیسے ہی میں نے سلام کیا:

فَسَمِعْتُ رَدَّ السَّلَامِ عَلَيَّ يَخْرُجُ مِنْ تَحْتِ الْأَرْضِ، أَعْرِفُهُ كَمَا أَعْرِفُ كَمَا أَعْرِفُ أَنَّ اللهَ خَلَقَنِي، وَكَمَا أَعْرِفُ اللَّيْلَ مِنَ النَّهَارِ، فَاقْشَعَرَّتْ كُلُّ شَعْرَةٍ مِنِّي. (۱)

میں نے اپنے سلام کا جواب سنا جو زمین کے نیچے سے آ رہا تھا۔ (یقیناً) میں اس آواز کو یوں (ہی) پہچانتی ہوں جیسا کہ میں یہ جانتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کیا اور جیسا کہ میں دن کے مقابلہ میں رات کو جانتی ہوں۔ چنانچہ (ان کا جواب سن کر) میرے جسم کا بال بال کانپ اٹھا۔

۴۔ حضرت فاطمہ خزاعیہ ﷺ بیان کرتی ہیں کہ میں سورج کے غروب ہونے کے بعد شہداء اُحد کی قبور کے پاس تھی اور میرے ہم راہ میری بہن بھی تھی۔ میں نے اسے کہا: آؤ حضرت حمزہ ﷺ کی قبر پر سلام کرتے ہیں۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ ہم نے ان کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ، يَا عَمَّ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ، فَسَمِعْنَا كَلَامًا رَدَّ عَلَيْنَا: وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ. قَالَتْ: وَمَا قُرُبَنَا أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ. (۲)

اے رسول اللہ ﷺ کے چچا جان! آپ پر سلامتی ہو۔ (یہ کہنا تھا کہ) پھر ہم نے وہ

(۱) ۱۔ ابن أبي دنيا، من عاش بعد الموت: ۳۹، رقم: ۴۱
۲۔ بيهقي، دلائل النبوة، ۳: ۳۰۸
۳۔ ابن كثير، البداية والنهاية، ۴: ۴۵
(۲) بيهقي، دلائل النبوة، ۳: ۳۰۹

کلام سنا جو انہوں نے ہمیں جواباً فرمایا (اور وہ یہ تھا:) وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ (اور تم پر بھی سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو)۔ اس وقت لوگوں میں سے ہمارے آس پاس کوئی شخص بھی نہ تھا۔

۲۔ اولیاء و صالحین کا کشف

(۱) امام زین العابدین علیہ السلام کا کشف

۲۔ حضرت ابوحمزہ ثمالی بیان کرتے ہیں کہ وہ امام زین العابدین علی بن حسین علیہ السلام کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو مجھے ناگوار گزرا کہ میں آپ کے دروازہ پر دستک دے کر آپ کو باہر آنے کی زحمت دوں۔ لہٰذا میں وہیں انتظار میں بیٹھ گیا، حتی کہ آپ باہر تشریف لائے تو میں نے آپ کو سلام عرض کیا۔ آپ نے میرے سلام کا جواب دیا اور میرے لیے دعائیہ کلمات کہے۔ پھر آپ اپنے گھر کی ایک دیوار کے پاس رک گئے اور مجھ سے فرمایا: ابو حمزہ! اس دیوار کو دیکھتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، اے ابن رسول اللہ! فرمایا: میں ایک دن پریشانی کے عالم میں اس دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھا تو اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوب صورت چہرے اور صاف ستھرے کپڑوں والا شخص میری طرف دیکھے جا رہا ہے۔ پھر وہ مجھ سے کہنے لگا: اے علی بن حسین! میں تمہیں پریشان اور غمگین دیکھ رہا ہوں، کیا بات ہے؟ کیا دنیا کے متعلق پریشان ہو؟ وہ تو موجود رزق ہے جسے ہر نیک و بد کھا رہا ہے۔

میں نے کہا: میں اس پر غمگین نہیں ہوں اس لیے کہ بات وہی ہے جو آپ نے کی ہے۔ پھر وہ شخص پوچھنے لگا: کیا آخرت کے متعلق کوئی پریشانی ہے؟ اس کے متعلق وعدہ سچا ہے۔ اس میں قہار بادشاہ فیصلہ کر دے گا۔ میں نے کہا: نہیں! آخرت کے لیے بھی پریشان نہیں ہوں کیوں کہ یقیناً وہ اسی طرح ہے جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔ پھر اس نے کہا: اے علی بن حسین! پھر آپ کی اداسی کی کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا کہ میں ابن زبیر ﷺ کی آزمائش سے خوف زدہ ہوں کیونکہ یزید ان کے بھی مخالف ہوگیا ہے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا: اے علی! کیا آپ نے کسی کو

دیکھا ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے مانگا ہو اور مالکِ کون و مکاں نے اسے نہ دیا ہو؟ میں نے کہا: نہیں۔ پھر اس نے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرا ہو اور وہ اس کے لیے کافی نہ ہوا ہو؟ میں نے کہا: نہیں، یہ کہہ کر وہ شخص میرے سامنے سے غائب ہوگیا۔ پھر مجھے بتایا گیا:

هٰذَا الْخَضِرُ عليه السلام نَاجَاکَ. (۱)

(اے علی!) یہ خضر علیہ السلام تھے جو آپ سے سرگوشی کر رہے تھے۔

۲۔ حضرت ابوحمزہ ثمالی بیان کرتے ہیں کہ میں امام علی بن حسین علیہ السلام کے پاس موجود تھا کہ چڑیاں ان کے اردگرد آ کر اڑنے لگیں اور وہ آوازیں نکال رہی تھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ابوحمزہ! جانتے ہو یہ چڑیاں کیا کہہ رہی ہیں؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا:

فَإِنَّهَا تُقَدِّسُ رَبَّهَا عزوجل، وَتَسْأَلُهُ قُوْتَ يَوْمِهَا. (۲)

یہ اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کر رہی ہیں اور اس سے اپنے آج کے دن کا رزق مانگ رہی ہیں۔

(۲) حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا کشف

۱۔ حضرت ریاح بن عبیدہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کے ہاتھوں کا سہارا لے کر چلتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا: بے شک یہ آدمی بے ادب ہے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے ان سے پوچھا: یہ آدمی کون تھا جو ابھی ابھی آپ کے ہاتھ کا سہارا لیے ہوئے تھا؟ آپ نے فرمایا:

فَهَلْ رَأَيْتَهُ، يَا رِيَاحُ؟ قُلْتُ: نَعَمْ. قَالَ: مَا أَحْسِبُکَ إِلَّا رَجُلًا صَالِحًا.

---

(۱) ۱۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۳:۱۳۵

۲۔ ابن عساکر، تاريخ مدينة دمشق، ۴۱: ۳۸۳

۳۔ ابن کثير، البداية والنهاية، ۹:۱۱۳-۱۱۴

(۲) أبو نعيم، حلية الأولياء، ۳:۱۴۰

ذَاکَ أَخِي الْخَضِرُ. بَشَّرَنِي أَنِّي سَأُوَلّٰی وَأَعْدِلُ.(۱)

اے ریاح! کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: میں تمہیں ایک نیک شخص ہی گمان کرتا ہوں، وہ میرے بھائی خضر ﷺ تھے۔ انہوں نے مجھے خوش خبری دی کہ بے شک عنقریب مجھے خلافت سے نوازا جائے گا اور میں عدل کروں گا۔

امام ابو الحسن کِنانی نے فرمایا ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے بیان کے مطابق ریاح بن عبیدہ کی یہ حدیث حضرت خضر ﷺ کی بقاء (عمر جاوداں) کے باب میں وارد ہونے والی احادیث میں سے صحیح ترین ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ریاح کے بارے میں اگرچہ ابن مبارک نے کلام کیا ہے، لیکن ابن معین، ابو زرعہ، نسائی اور ابن حبان نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے

(۱) ۱۔ لالكائي، كرامات الأولياء:۱۶۸-۱۶۹، رقم:۱۲۳
۲۔ فسوی، في المعرفة والتاريخ، ۱: ۳۲۱
۳۔ آجری، في أخبار أبي حفص عمر بن عبد العزيز ﷺ:۵۲
۴۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۵:۲۵۴
۵۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۱۶:۴۳۲
۶۔ ذهبي، ميزان الاعتدال، ۳:۱۷۵
۷۔ ذهبي، تذكرة الحفاظ، ۱:۱۲۰
۸۔ عسقلاني نے 'فتح الباری (۶:۴۳۵)' میں کہا ہے: یہ سند جید کے ساتھ خبر ہے، اثر نہیں ہے۔
۹۔ عسقلاني، الزهر النضر في أخبار الخضر:۱۵۰
۱۰۔ أبو الحسن الكناني، تنزيه الشريعة، ۱:۲۳۶، رقم:۱۹
۱۱۔ مبارکپوری، تحفة الأحوذي، ۶:۴۳۳، آپ نے کہا ہے کہ اس کے راویوں میں کوئی عیب نہیں ہے۔ میرے پاس آج تک کوئی خبر اور اثر اتنی عمدہ سند کے ساتھ نہیں آئی جتنی عمدہ سند کے ساتھ یہ روایت آئی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ بہتر جاننے والا ہے۔[1]

۲۔ حضرت رجاء بن حیوہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت عمر بن عبد العزیز ﷺ نے اپنے مرض وفات میں کہا: تو ان لوگوں میں شریک ہونا جو مجھے غسل دیں گے، مجھے کفن پہنائیں گے اور میری قبر میں اتریں گے۔ جب تم مجھے میری لحد میں اتار دو تو میرے کفن کی گرہیں کھول دینا اور پھر میرے چہرے کو دیکھنا۔ حضرت رجاء بن حیوہ بیان کرتے ہیں کہ بے شک میں نے حضرت عمر بن عبد العزیز ﷺ سے قبل تین اُمراء سلطنت کو دفنایا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو جب میں نے لحد میں رکھا اور گرہ کھولی، پھر اس کے چہرے کو دیکھا تو اس کا چہرہ سیاہ اور قبلہ کے علاوہ کسی اور سمت میں تھا۔ رجاء نے کہا:

فَكُنْتُ فِيمَنْ غَسَّلَ عُمَرَ وَكَفَّنَهُ، وَدَخَلَ فِي قَبْرِهِ. فَلَمَّا حَلَلْتُ الْعُقْدَةَ، نَظَرْتُ إِلَى وَجْهِهِ، فَإِذَا وَجْهُهُ كَالْقَرَاطِيسِ إِلَى الْقِبْلَةِ.[2]

میں ان لوگوں میں شریک تھا جنہوں نے حضرت عمر بن عبد العزیز ﷺ کو غسل دیا، کفن پہنایا اور ان کی قبر میں داخل ہوئے، چنانچہ جب میں نے ان کے کفن کی گرہ کھول کر ان کے چہرہ کو دیکھا، تو ان کا چہرہ مصحف کے اوراق کی طرح روشن اور قبلہ رخ تھا۔

(۳) حضرت سعید بن مسیّب کا کشف

شام کے محدث اور فقیہ حضرت سعید بن عبد العزیز سے روایت ہے کہ جب ایامِ حرّہ (جن دنوں یزید نے مدینہ منورہ پر حملہ کروایا تھا) کا واقعہ پیش آیا تو مسجد نبوی میں تین دن تک اذان اور اقامت نہیں کہی گئی تھی۔ جبکہ حضرت سعید بن مسیّب ﷺ نے (جو جلیل القدر تابعی ہیں

(۱) أبو الحسن الكناني، تنزيه الشريعة، ۱:۲۳۶، رقم:۱۹

(۲) ۱۔ ابن سعد، الطبقات الكبرى، ۵:۴۰۷
۲۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۴۵:۲۵۶
۳۔ ذهبي، سير أعلام النبلاء، ۵:۱۴۳

اور جنہوں نے مسجدِ نبوی میں پناہ لی ہوئی تھی، تین دن تک) مسجد نہیں چھوڑی تھی۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی لحد مبارک سے آنے والی اذان کی آواز سے آپ کو نماز کے اوقات کا علم ہو جاتا تھا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

وَكَانَ لَا يَعْرِفُ وَقْتَ الصَّلَاةِ إِلَّا بِهَمْهَمَةٍ، يَسْمَعُهَا مِنْ قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ. (۱)

وہ نماز کا وقت ایک دھیمی آواز کے ذریعے ہی جان پاتے تھے جسے وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی قبر انور سے سنتے تھے۔

ایک روایت میں حضرت سعید بن مسیّب نے فرمایا:

لَمْ أَزَلْ أَسْمَعُ الْأَذَانَ وَالإِقَامَةَ فِي قَبْرِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ أَيَّامَ الْحَرَّةِ، حَتّٰى عَادَ النَّاسُ. (۲)

میں ایام حرّہ کے دوران مسلسل رسول اللہ ﷺ کی قبرِ اَنور سے اَذان اور اِقامت کی آواز سنتا رہا، یہاں تک کہ لوگ معمول کی صورت حال پر واپس لوٹ آئے (یعنی مسجد نبوی میں باقاعدہ اَذان و اِقامت شروع ہوگئی)۔

یہ حضرت سعید بن مسیّب کا کشف تھا، جو اُنہیں عطا کیا گیا۔

---

(۱) ۱۔ دارمي، السنن، باب ما أكرم الله تعالى نبيه ﷺ بعد موته، ۱:۵۶، رقم:۹۳

۲۔ خطيب تبريزی، مشكاة المصابيح، ۳:۱۶۷۷، رقم:۵۹۵۱

۳۔ ابن تيمية، مجموع الفتاوی، ۱۱:۲۸۰-۲۸۱

۴۔ سيوطي، شرح سنن ابن ماجه، ۱:۲۹۱، رقم:۴۰۲۹

(۲) ۱۔ المقريزی، إمتاع الأسماع، ۱۴:۶۱۶

۲۔ سيوطي، الخصائص الكبرى، ۲:۴۹۰

۳۔ زرقاني، شرح المواهب اللدنية، ۷:۳۶۵

(۴) حضرت سفیان ثوری کا کشف

ابوعبد اللہ نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت سفیان ثوری کے پاس حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: آپ امام اوزاعی کو لکھیں کہ وہ مجھے حدیث روایت کریں۔ حضرت سفیان ثوری نے بذریعہ کشف دیکھ لیا کہ امام اوزاعی کے وصال کا وقت قریب آ چکا ہے اور اس شخص کی ان سے ملاقات نہ ہو پائے گی۔ آپ نے اس لیے اسے جواب دیا:

أَمَا إِنِّي أَكْتُبُ لَكَ إِلَيْهِ وَلَا أَرَاكَ تَجِدُهُ إِلَّا مَيِّتًا، لِأَنِّي رَأَيْتُ رَيْحَانَةً رُفِعَتْ مِنْ قِبَلِ الْمَغْرِبِ. وَلَا أُرَاهُ إِلَّا لِمَوْتِ الْأَوْزَاعِيِّ، فَأَتَاهُ فَإِذَا هُوَ قَدْ مَاتَ. (۱)

میں انہیں تمہارے لیے لکھ دیتا ہوں، لیکن میرا نہیں خیال کہ تم انہیں زندہ پا لو گے، کیونکہ میں نے ایک گلدستہ دیکھا جو مغرب کی طرف سے اٹھا لیا گیا ہے: میرے خیال میں یہ اوزاعی کی موت کی طرف اشارہ ہے، پھر وہ شخص امام اوزاعی کے پاس آیا تو آپ وفات پا چکے تھے۔

(۵) حضرت ابراہیم بن ادھم کا کشف

محمد بن مبارک صوری سے مروی ہے کہ میں بیت المقدس جاتے ہوئے حضرت ابراہیم بن ادھم کے ساتھ تھا۔ ہم نے قیلولہ کے وقت انار کے درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا اور نماز کی چند رکعات ادا کیں۔ تھوڑی دیر بعد چھوٹے قد والے انار کے درخت کی جڑ سے میں نے آواز سنی: اے ابو اسحاق! مہربانی فرما کر میرا کچھ پھل کھا لو! یہ سن کر ابراہیم بن ادھم نے اپنا سر

---

(۱) ۱۔ عجلي، معرفة الثقات، ۲:۸۳، رقم:۱۰۶۳
۲۔ ہروی، ذم الكلام وأهله، ۵:۱۴۳، رقم:۹۳۸
۳۔ ابن عساکر، تاريخ مدينة دمشق، ۳۵:۲۲۲
۴۔ ذهبي، سير أعلام النبلاء، ۱۲:۵۰۷

نیچے کر لیا۔ اس درخت نے یہی بات تین بار دہرائی، پھر اس نے کہا: اے محمد! میری سفارش کر دیں کہ میرا تھوڑا سا پھل کھا لیں۔ میں نے کہا: اے ابو اسحاق! میں نے سن لیا ہے، چنانچہ آپ نے اُٹھ کر دو انار لیے۔ ان میں سے ایک خود کھایا اور دوسرا مجھے دے دیا۔ میں نے کھایا، تو وہ انار ترش تھا۔ کچھ عرصہ بعد واپسی پر ہم وہاں سے گزرے اور اس انار کے پودے کو دیکھا:

فَإِذَا هِيَ شَجَرَةٌ عَالِيَةٌ، وَرُمَّانُهَا حُلْوٌ. وَهِيَ تُثْمِرُ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّتَيْنِ. وَسَمُّوْهَا 'رُمَّانَةَ الْعَابِدِيْنَ' وَيَأْوِي إِلٰى ظِلِّهَا الْعَابِدُوْنَ.[1]

وہ ایک بلند درخت (بن چکا) تھا اور اب اس کے انار میٹھے تھے اور اس پر سال میں دو بار پھل لگتا تھا۔ لوگ اسے رمان العابدین (عابدوں کا انار) کہتے اور عابد لوگ اس کے سایہ میں پناہ لیتے۔

اس روایت سے جہاں حضرت ابراہیم بن ادھم کے صاحب کشف کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ بذریعہ کشف پودوں کی آواز سن اور سمجھ لیتے تھے، وہاں ایک یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اہل اللہ یعنی حضرت ابراہیم بن ادھم کی برکت سے اس پودے کی نہ صرف نشوونما میں اضافہ ہوا بلکہ اس کے پھل کا ذائقہ بھی ترش سے شیریں ہوگیا۔

(٦) امام ابو الحسین نوری کا کشف

امام ابو الحسین نوری اپنے دور کے ممتاز بزرگوں میں سے ہوئے ہیں، جنہیں تمام مشائخ نے عظمت و مرتبت کے اعتبار سے امیر القلوب کا خطاب عطا کیا۔ آپ حضرت سری سقطی کے شیخ اور حضرت جنید بغدادی کے ہم عصر تھے۔

(۱) ۱۔ قشیری، الرسالة:۵۰۴
۲۔ یافعي، مرأة الجنان، ۱:۳۵۰
۳۔ سبکي، طبقات الشافعية الكبرى، ۲:۳۳۹
۴۔ ابن الملقن نے 'حدائق الأولياء (۲:۵۱۴-۵۱۵)' میں کہا ہے کہ یہ مشہور حکایت ہے۔

فاطمہ جو کہ ابو حمزہ محمد بن ابراہیم، جنید بن محمد اور ابو الحسین نوری کی خادمہ ہیں اور جس کو زیتونہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، بیان کرتی ہیں: میں ایک دن ابو الحسین النوری کے پاس آئی اور وہ سخت سردی اور تیز ہوا والا دن تھا، میں نے انہیں مسجد میں تنہا بیٹھے ہوئے پایا، تو میں نے انہیں کہا: میں آپ کے پاس کھانے کے لیے کوئی چیز لے آؤں؟ آپ نے کہا: ہاں، لاؤ، میں نے کہا: آپ کیا پسند کریں گے تاکہ میں آپ کے لیے وہی لے کر آؤں؟ آپ نے فرمایا: روٹی اور دودھ۔ میں نے کہا: اس طرح کا ٹھنڈا دن کہ آپ جمنے کے قریب ہیں، میں آپ کے لیے کوئی اور چیز لے آتی ہوں، آپ نے فرمایا: ہر چیز تمہاری طرف سے فالتو ہوگی، جو میں نے تمہیں کہا ہے وہی لے کر آؤ، میں ان کے لیے ایک پیالے میں دودھ اور روٹی لے کر آئی اور اسے آپ کے سامنے رکھتے ہوئے ساتھ ہی آگ کی انگیٹھی بھی رکھ دی۔ وہ اپنے ہاتھ سے آگ کو پلٹتے اور تاپتے، پھر انہوں نے روٹی کو دودھ کے ساتھ کھانا شروع کر دیا، جب لقمہ پکڑتے تو دودھ ان کی کلائی پر گر جاتا، اور پھر آپ اپنی کلائی سے دھوئیں کی سیاہی کو صاف کرتے، میں نے اپنے دل میں کہا: اے میرے رب! تیرے اولیاء کتنے میلے کچیلے ہیں، تو ان میں سے کسی کو صاف لباس اور بدن والا نہیں دیکھے گا۔

میں ان کے پاس سے نکلی اور حضرت ابراہیم خواص کی مسجد کے قریب ایک دکان پر بیٹھ گئی، اور اس کی ایک طرف قریب ہی پولیس افسر کی چوکی تھی۔ جب میں وہاں بیٹھی تھی، تو اچانک ایک عورت نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور کہا: میری گٹھڑی تو نے ابھی ابھی میرے سامنے سے اٹھا لی ہے، اور تیرے علاوہ کسی نے نہیں اٹھائی۔ لوگ ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے، اور وہ عورت چلا رہی تھی، میری گٹھڑی اس کے علاوہ کسی نے نہیں اٹھائی، بات پولیس افسر تک پہنچ گئی، پولیس والے آئے اور مجھے اٹھا لیا اور وہ عورت میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی، پولیس والا ہمیں حاکم (جج) کے پاس لے گیا اور یہ بات حضرت ابو الحسین النوری تک بھی پہنچ گئی، لہٰذا وہ مسجد سے نکلے اور ہمارے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ جب ہم حاکم کے سامنے تھے اور عورت مجھ پر اپنی گٹھڑی چوری کرنے کا دعویٰ کر رہی تھی، تو امام نوری اندر داخل ہوئے اور حاکم سے کہا: اس عورت کو کچھ نہ کہنا، بے شک یہ بے قصور ہے۔ حکمران کو ابو الحسین النوری کا تعارف کرایا گیا تو

وہ چیخ کر بولا: چونکہ اس کے ساتھ اس کی مدعیہ موجود ہے اس لیے میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔ پھر امام نوری نے اسے کہا: میں نے تمہیں حقیقت بتا دی اب تو بہتر جانتا ہے، یہ کہہ کر آپ چلے گئے۔ ابھی ان کا معاملہ اسی طرح چل ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سیاہ فام باندی آگے بڑھی اور کہنے لگی: اے عورت! اس خاتون کو چھوڑ دو کیوں کہ وہ گٹھڑی میں اٹھا کر اپنے گھر لے گئی تھی۔ مدعیہ عورت نے پوچھا کہ تو نے وہ کہاں سے لی تھی؟ سیاہ فام باندی نے جواب دیا: میں نے وہ گٹھڑی تمہارے سامنے سے ہی اٹھائی تھی۔ حضرت نوری کی باندی فاطمہ بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا:

قُوْلِي أَنْتِ: مَا أَوْضَرَ أَوْلِيَاءَكَ.[1]

اب کہو: (اے اللہ!) تیرے اولیاء کتنے میلے کچیلے ہیں (اللہ نے تمہیں اپنے اولیاء سے نفرت کی سزا دی ہے)۔

امام ابو الحسین نوری نے بذریعہ کشف جان لیا کہ ان کی باندی بے قصور ہے اسی لیے انہوں نے اس کی بے گناہی کی گواہی دی۔ دوسری اہم بات جو اس واقعہ میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی شان میں گستاخی اللہ تعالیٰ کو بھی گوارا نہیں ہوتی۔ اسی لیے امام نوری کی باندی کو گستاخی کی سزا یہ ملی کہ اس پر چوری کا الزام لگا اور اسے جج کے سامنے پیش ہونا پڑا۔

(۷) شیخ اسماعیل الحضرمی کا کشف

۱۔ شیخ اسماعیل بن محمد الحضرمی شافعی عالم، محدث اور اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ آپ جلیل القدر تابعی ہیں۔ امام محبّ طبری نے روایت کیا ہے کہ شیخ اسماعیل حضرمی سے مروی ہے، جب

(۱) ۱۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۵:۱۳۴-۱۳۵
۲۔ قشیری، الرسالة:۵۱۷
۳۔ ابن الملقن، حدائق الأولیاء، ۲:۵۶۵
۴۔ أزدی، طبقات الصوفیة ویلیه ذکر النسوة المتعبدات الصوفیات:۴۰۴، رقم:۳۷

وہ یمن کے علاقے زبید کے قبرستان میں تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ صاحب قبر مجھے کہہ رہا ہے:

أَنَا فُلَانُ ابْنُ فُلَانٍ مِنْ حَشْوِ الْجَنَّةِ.(۱)

میں فلاں بن فلاں جنت کے وسط میں سے ہوں۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ امام یافعی نے محبّ طبری جو کہ شوافع کے ائمہ میں سے ایک امام ہیں اور 'التنبیہ' کے شارح ہیں، سے روایت کیا ہے کہ وہ شیخ اسماعیل الحضرمی کے ساتھ زبید کے قبرستان میں تھے، محبّ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے مجھے فرمایا: اے محبّ الدین! کیا تو فوت شدگان کے کلام پر ایمان رکھتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، آپ نے فرمایا: یہ قبر والا مجھے کہہ رہا ہے: میں جنت کے بیچ میں سے ہوں۔

۲۔ ایک روایت میں ہے: آپ قبرستان میں سے گزر رہے تھے اور آپ کے ساتھ لوگوں کی ایک جماعت بھی تھی، تو آپ بہت زیادہ روئے، پھر فوراً ہنسنے لگے۔ آپ سے اس بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: میں نے اس قبرستان والوں کو دیکھا کہ انہیں عذاب دیا جا رہا ہے، لہٰذا میں رو دیا، پھر میں نے اپنے رب تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ میری شفاعت ان کے حق میں قبول فرمائے، اس نے میری شفاعت قبول فرمائی۔ - اور آپ نے ایک پرانی کھودی ہوئی قبر کی طرف اشارہ کیا - اور اس قبر والی نے کہا:

وَأَنَا مَعَهُمْ يَا فَقِيْهُ إِسْمَاعِيْلُ، أَنَا فُلَانَةُ الْمُغَنِّيَةُ، فَضَحِكْتُ وَقُلْتُ: وَأَنْتِ مَعَهُمْ. قَالَ: ثُمَّ أَرْسَلَ إِلَى الْحَفَّارِ، وَقَالَ: هٰذَا قَبْرُ مَنْ؟ فَقَالَ: قَبْرُ فُلَانَةَ الْمُغَنِّيَةِ.(۲)

---

(۱) ۱۔ سبكي، طبقات الشافعية الكبرى، ۸:۱۳۰-۱۳۱، رقم:۱۱۱۷
۲۔ ابن الملقن، حدائق الأولياء، ۲:۵۰۶
۳۔ سيوطي، شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور:۲۰۴، رقم:۲۲
۴۔ عكرى، شذرات الذهب، ۵:۳۶۲

(۲) ۱۔ سبكي، طبقات الشافعية الكبرى، ۸:۱۳۰-۱۳۱، رقم:۱۱۱۷ ←

اے فقیہ اسماعیل! میں فلاں مغنیہ (گانے بجانے والی) بھی ان کے ساتھ ہوں، اس پر میں ہنس پڑا اور کہا: تو بھی ان کے ساتھ ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ پھر آپ نے گورکن کو بلا بھیجا اور فرمایا: یہ قبر کس کی ہے؟ اس نے کہا: فلاں مغنیہ (گانے بجانے والی) کی۔

(۸) سیدنا شیخ عبد القادر الجیلانی ﷺ کا کشف

۱۔ شیخ عزالدین اَحمد بن عمر الفاروقی بیان کرتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین السہر وردی نے فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں علم کلام میں سے کچھ پڑھوں لیکن میں متردد تھا کہ میں امام الحرمین الجوینی کی کتاب **الإرشاد** کا مطالعہ کروں یا شہرستانی کی **نهاية الإقدام** کا، یا پھر اپنے شیخ کی کتاب پڑھوں۔ چنانچہ میں اپنے ماموں اور شیخ حضرت ابونجیب کے ساتھ شیخ جیلان ﷺ کے پاس گیا جو شیخ عبد القادر جیلانی ﷺ کے پاس بلا ناغہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں: شیخ عبد القادر جیلانی ﷺ نے توجہ فرمائی اور مجھے فرمایا:

يَا عُمَرُ، مَا هُوَ مِنْ زَادِ الْقَبْرِ، مَا هُوَ مِنْ زَادِ الْقَبْرِ، فَرَجَعْتُ عَنْ ذَلِكَ. (۱)

اے عمر! اس کا تعلق قبر کے زادِ راہ سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق قبر کے زادِ راہ سے نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے اس کام سے (یعنی کتبِ علم الکلام پڑھنے سے) رجوع کرلیا۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

فَأَخْبَرَ أَنَّ الشَّيْخَ كَاشَفَهُ بِمَا كَانَ فِي قَلْبِهِ، وَنَهَاهُ عَنِ الْكَلَامِ، الَّذِي كَانَ يَنْسُبُ إِلَيْهِ الْقُشَيْرِيُّ وَنَحْوُهُ. (۲)

۲۔ ابن الملقن، حدائق الأولياء، ۲:۵۰۶

۳۔ سيوطي، شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور:۲۰۴، رقم:۲۳

(۱) ۱۔ ابن تيمية، الاستقامة:۸۷

۲۔ ذهبي، سير أعلام النبلاء، ۲۰:۴۴۳

(۲) ۱۔ ابن تيمية، الاستقامة:۸۷

انہوں نے بتایا کہ شیخ عبد القادر جیلانی ﷺ نے جو کچھ ان کے دل میں تھا اس کا مکاشفہ کیا اور انہیں اس کلام سے روک دیا جو قشیری اور دیگر آپ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

۲۔ اسی طرح ابو محمد بن خشاب نحوی بیان کرتے ہیں: جب میں جوانی میں نحو پڑھا کرتا تھا۔ اس وقت لوگوں سے شیخ عبد القادر جیلانی ﷺ کے حسنِ کلام کی تعریف سنا کرتا تھا، اس لیے میں چاہتا تھا کہ آپ کو سنوں، لیکن وقت مجھے اجازت نہ دیتا تھا۔ ایک روز اچانک میں آپ کے درس میں حاضر ہوگیا۔ جب آپ نے کلام کیا تو مجھے آپ کی گفتگو میں نہ حسن نظر آیا اور نہ میں اسے اچھی طرح سمجھ پایا۔ لہٰذا میں نے اپنے دل میں کہا کہ میرا آج کا دن ضائع ہوگیا، آپ نے میری قلبی کیفیات پر مطلع ہوکر میری طرف توجہ فرمائی اور فرمایا:

وَيْلَكَ تُفَضِّلُ النَّحْوَ عَلٰى مَجَالِسِ الذِّكْرِ وَتَخْتَارُ ذٰلِكَ؟ اِصْحَبْنَا نُصَيِّرْكَ سِيْبَوَيْهِ.[1]

افسوس، تو محافلِ ذکر پر نحو کو فضیلت دیتا ہے اور اُسے اختیار کرتا ہے؟ تو ہماری صحبت اختیار کر ہم تجھے (نحو کا امام) سیبویہ بنا دیں گے۔

۳۔ ابو بکر العماد بیان کرتے ہیں: میں اصولِ دین (یعنی علم العقیدہ والکلام) کے اسباق پڑھتا تھا کہ اس دوران میرے دل میں عقیدے کے حوالے سے کچھ خلش پیدا ہوئی۔ میں نے سوچا کہ شیخ عبد القادر کے درس میں جاتا ہوں چونکہ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ قلبی اَحوال جانتے ہیں۔ لہٰذا میں آپ کی مجلس میں حاضر ہوا۔ آپ نے کلام کرتے ہوئے فرمایا: ہمارا عقیدہ وہی ہے جو سلف صالحین اور صحابہ کا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: یہ جملہ آپ نے اتفاقیہ بولا ہے، آپ نے پھر گفتگو کرتے ہوئے میری سمت متوجہ ہو کر اپنا جملہ دہرایا۔ میں نے پھر سوچا: واعظ اِدھر اُدھر توجہ کیا ہی کرتا ہے۔ آپ نے تیسری مرتبہ میری طرف توجہ کر کے فرمایا:

---

(۱) ۱۔ ذهبي، سير أعلام النبلاء، ۲۰: ۴۴۹
۲۔ ذهبي، تاريخ الإسلام، ۳۹: ۹۸

يَا أَبَا بَكْرٍ، فَأَعَادَ الْقَوْلَ ثُمَّ قَالَ: قُمْ قَدْ جَاءَ أَبُوْكَ، وَكَانَ غَائِبًا. فَقُمْتُ مُبَادِرًا وَإِذَا أَبِي قَدْ جَاءَ.(۱)

ابو بکر! اور اپنا (وہی) جملہ ارشاد فرمانے کے بعد کہا: جاؤ، تمہارا باپ آ گیا ہے۔ جو (کافی عرصہ سے گھر سے) غائب تھا، میں جلدی جلدی کھڑا ہوا اور جا کر دیکھا تو میرے والد (گھر واپس) آ چکے تھے۔

(۹) بعض دیگر اولیاء کرام کے متفرق مکاشفات

۱۔ ابراہیم بن شیبان بیان کرتے ہیں: ایک مرید میرے پاس آیا اور میرے ہاں بیمار پڑ گیا، پھر اسی دوران وہ فوت ہوگیا، جب میں اس کی قبر میں اترا تو میں نے ارادہ کیا کہ اس کے رخسار کو ننگا کروں اور اسے مٹی پر عاجزی و انکساری کے ساتھ رکھ دوں، شاید اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور مجھے کہا:

تُذَلِّلُنِي بَيْنَ يَدَيَّ مَنْ يُدَلِّلُنِي، قَالَ: قُلْتُ: لَا، يَا حَبِيْبِي، أَحَيَاةٌ بَعْدَ الْمَوْتِ؟ فَأَجَابَ: أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ أَحِبَّاءَهُ لَا يَمْلِكُوْنَ، وَلٰكِنْ يُنْقَلُوْنَ مِنْ دَارٍ إِلٰى دَارٍ.(۲)

آپ مجھے اس کے سامنے بے وقعت کر رہے ہیں جو میرے ناز اٹھا رہا ہے! میں نے کہا: نہیں میرے دوست (یہ بات نہیں)، کیا موت کے بعد بھی زندگی ہے؟ اس نے جواب دیا: بے شک اس کے دوست کسی چیز کے مالک نہیں، لیکن وہ ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل کر دیے جاتے ہیں۔

۲۔ ایک روایت میں حضرت ابوعلی روذباری بیان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک فقیر آیا

(۱) ۱۔ ذهبي، سير أعلام النبلاء، ۲۰: ۴۴۲
۲۔ ذهبي، تاريخ الإسلام، ۳۹: ۹۰
(۲) كلاباذي، التعرف لمذهب أهل التصوف: ۱۵۸

اور فوت ہوگیا۔ میں نے اس کی تجہیز و تکفین کی، جب قبر میں رکھنے کے لیے میں نے اس کا چہرہ کھولا کہ اس کو عاجزی و انکساری کی خاطر مٹی پر رکھ دوں، تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی غریب الوطنی پر رحم فرمائے۔ اس نے اچانک آنکھیں کھولیں اور کہا:

يَا أَبَا عَلِيٍّ، أَتُذَلِّلُنِي بَيْنَ يَدَي مَنْ دَلَّلَنِي؟ فَقُلْتُ: يَا سَيِّدِي، أَحَيَاةٌ بَعْدَ مَوْتٍ؟ فَقَالَ لِي: بَلٰى، أَنَا حَيٌّ، وَكُلُّ مُحِبٍّ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، حَتّٰى لَأَنْصُرَنَّكَ غَدًا بِجَاهِي يَا رُوْذَبَارِيُّ. (۱)

ابوعلی! کیا تو مجھے اس رب کے سامنے بے وقعت کرنا چاہتا ہے، جس نے میرے ناز اٹھائے ہیں۔ میں نے کہا: جناب عالی! کیا موت کے بعد بھی زندگی؟ اس نے جواب دیا: میں زندہ ہوں اور اللہ عز وجل کا ہر محبّ زندہ ہوتا ہے۔ (اللہ کے ہاں) اپنی جاہ و منزلت کے ذریعہ میں قیامت کے دن تمہاری مدد کروں گا۔

۳۔ حضرت ابو یعقوب سوسی بیان کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں ایک مرید میرے پاس آیا اور کہا: اے استاد! میں کل ظہر کے وقت فوت ہو جاؤں گا، یہ دینار لے لیں، آدھے سے میرے لیے قبر کھدوائیں اور آدھے پیسوں سے مجھے کفن پہنائیں، چنانچہ جب دوسرا دن ہوا، اس نے آ کر خانہ کعبہ کا طواف کیا اور پھر دور ہٹ کر فوت ہوگیا۔ میں نے اسے غسل دیا، کفن پہنایا اور لحد میں رکھ دیا۔ اسی دوران اس نے آنکھیں کھولیں: میں نے کہا: کیا موت کے بعد بھی زندگی ہے؟ اس نے جواب دیا:

أَنَا مُحِبٌّ، وَكُلُّ مُحِبٍّ لِلّٰهِ حَيٌّ. (۲)

---

(۱) ۱۔ قشیری، الرسالة:۱۴۰

۲۔ إشبيلي، العاقبة في ذكر الموت:۱۶۱

۳۔ سبكي، طبقات الشافعية الكبرى، ۳:۵۰

۴۔ سيوطي، شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور:۲۰۵، رقم:۲۸

(۲) ۱۔ قشیری، الرسالة:۵۱۵

(ہاں) میں زندہ ہوں اور اللہ کا ہر محبّ زندہ ہوتا ہے۔

۴۔ امام ابو الحسین قیروانی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابو الخیر اقطع تیناتی کی زیارت کے لیے گیا۔ جب میں ان کے پاس سے روانہ ہونے لگا، تو وہ میرے ساتھ مسجد کے دروازے تک نکل کر آئے اور فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ آپ اپنے ساتھ کوئی چیز نہیں رکھتے، مگر یہ دو سیب اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں نے انہیں لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور چل پڑا، جب تین دن تک مجھے کوئی چیز نہ ملی، تو میں نے ایک سیب نکال کر کھا لیا۔ پھر کچھ دیر بعد دوسرا نکالنا چاہا، تو دیکھا دونوں سیب میری جیب میں موجود تھے۔ سو موصل کے دروازے تک میں ان دونوں سیبوں میں سے کھاتا رہا اور دونوں ویسے کے ویسے رہے، اس پر میں نے دل میں کہا کہ یہ سیب تو میری توکل کی حالت کو خراب کر دیں گے۔ کیونکہ مجھے ان کا حال معلوم ہو چکا ہے۔ میں نے ان دونوں کو ایک ہی دفعہ جیب سے نکال لیا اور ادھر ادھر دیکھا، تو ایک فقیر چادر میں لپٹا ہوا دکھائی دیا، جو یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اس سیب کی خواہش ہے۔ چنانچہ میں نے دونوں سیب اسے دے دیئے۔ جب میں آگے نکل گیا۔

وَقَعَ لِي أَنَّ الشَّيْخَ إِنَّمَا بَعَثَهُمَا إِلَيْهِ، وَكُنْتُ فِي رُفْقَةٍ فِي الطَّرِيْقِ، فَانْصَرَفْتُ إِلَى الْفَقِيْرِ فَلَمْ أَجِدْهُ.[1]

میرے دل میں خیال آیا کہ شیخ نے یہ سیب تو اسی آدمی کے لیے بھیجے تھے۔ اس وقت میرے ساتھ اور ساتھی بھی تھے، میں لوٹ کر اس فقیر کی طرف آیا تو اسے وہاں موجود نہ پایا۔

۵۔ ابو العباس حضرت خضر ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ ابدال میں سے کسی نے ان سے

..... ۲۔ سيوطي، شرح الصدور:۲۰۶، رقم:۳۲

(۱) ۱۔ قشيري، الرسالة:۳۴۹

۲۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۶۶:۱۶۲

۳۔ ذهبي، تاريخ الإسلام، ۲۵:۴۸۵

پوچھا: کیا آپ نے درجے میں اپنے سے بڑھ کر کوئی ولی اللہ بھی دیکھا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، میں مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں داخل ہوا تو امام عبد الرزاق کو دیکھا کہ ان کے گرد لوگوں کی ایک جماعت مسجد میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث سن رہی تھی۔ ایک نوجوان اپنے گھٹنوں پہ اپنا سر رکھ کے بیٹھا ہوا تھا، میں نے اس سے کہا: اے نوجوان! کیا تو لوگوں کو نہیں دیکھ رہا کہ وہ امام عبد الرزاق سے رسول اللہ ﷺ کی احادیث سن رہے ہیں، ان کے ساتھ تم کیوں نہیں سن رہے؟ اس نے میری طرف سر اٹھایا اور میری طرف توجہ کی، پھر اس نے کہا: کچھ ایسے بھی ہیں جو عبد الرزاق سے سنتے ہیں، اور کچھ ایسے بھی ہیں جو براہِ راست رزاق (ربّ تعالیٰ) سے سنتے ہیں، اس کے بندوں سے نہیں سنتے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: میں نے اس سے کہا: جو کچھ تو کہہ رہا ہے سچ ہے، تو پھر یہ بتاؤ میں کون ہوں؟ اس نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر کہا: اگر فراست حق ہے، تو آپ حضرت خضر ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں:

فَعَلِمْتُ أَنَّ لِلّٰهِ أَوْلِيَاءَ لَا أَعْرِفُهُمْ لِعُلُوِّ رُتْبَتِهِمْ.[1]

تب میں جان گیا کہ اللہ تعالیٰ کے بعض اولیاء ایسے بھی ہیں، جن کے علو مرتبت کے باعث میں بھی انہیں نہیں جانتا۔

۶۔ حضرت ابراہیم خواص بیان کرتے ہیں کہ میں نے بصرہ کے بازار میں ایک غلام کو دیکھا جس پر یہ ندا لگائی جا رہی تھی: اس غلام کو کون خریدے گا؟ میں نے بیچنے والے سے کہا: یہ غلام کتنے کا ہے؟ اس نے کہا: جو آپ دے دیں، کیونکہ یہ پاگل ہے۔ میں نے اس کی قیمت ادا کر دی اور اپنے دل میں کہا: اے اللہ! میں نے اسے تیری رضا کے لیے آزاد کیا۔ اچانک وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہا:

يَا إِبْرَاهِيمُ، إِنْ كُنْتَ أَعْتَقْتَنِي فِي الدُّنْيَا فَقَدْ أَعْتَقَكَ اللهُ فِي الْآخِرَةِ مِنَ النَّارِ، ثُمَّ غَابَ عَنِّي، فَلَمْ أَرَهُ.[2]

---

(۱) ۱۔ قشیری، الرسالة: ۵۰۴

۲۔ ابن الملقن، حدائق الأولیاء، ۲: ۵۴۴

(۲) ابن الملقن، حدائق الأولیاء، ۲: ۵۵۵

اے ابراہیم! اگر تو نے مجھے دنیا میں آزاد کیا ہے تو اللہ تعالیٰ تجھے آخرت میں آگ سے آزاد کرے گا، پھر وہ مجھ سے غائب ہوگیا، اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔

۷۔ امام ابن ناصر الدین دمشقی بیان کرتے ہیں کہ مجھے اس شخص نے بتایا ہے جس نے ابن رجب کی قبر کھودی تھی کہ شیخ زین الدین بن رجب اپنی وفات سے چند روز قبل میرے پاس تشریف لائے اور مجھے کہا: میرے لیے قبر کھود دو، اور اپنے ہاتھ سے زمین کے اس ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا جس میں وہ آج مدفون ہیں۔ اس نے بیان کیا کہ جب میں ان کے لیے قبر کھود کر فارغ ہوا تو آپ قبر میں اُترے اوراس میں لیٹ گئے، انہیں قبر پسند آئی اور فرمایا: یہ اچھی ہے۔ پھر باہر نکل آئے۔ وہ شخص بیان کرتا ہے:

فَوَاللهِ، مَا شَعَرْتُ بَعْدَ أَيَّامٍ إِلَّا وَقَدْ أُتِيَ بِهِ مَيِّتًا مَحْمُوْلًا فِي نَعْشِهِ فَوَضَعْتُهُ فِي ذٰلِكَ اللَّحْدِ وَوَارَيْتُهُ فِيْهِ.(۱)

اللہ کی قسم! چند دن ہی دن گزرے تھے کہ ان کا جنازہ اٹھا کر لایا گیا۔ پس میں نے انہیں اسی قبر میں اتارا اور دفن کر دیا۔

۸۔ محمد بن معاذ العنبری بیان کرتے ہیں کہ میں منیٰ کی مسجد میں موجود تھا، اچانک لوگوں کا رش ہونے لگا، میں نے کہا: یہ کون ہے جس کے لیے لوگ ہجوم کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: ابن سماک ہیں۔ میں ان کے قریب گیا، تو دیکھا کہ ایک بزرگ گھٹنے کھڑے کر کے، ہاتھوں کو ان کے گرد لپیٹ کر بیٹھے ہیں۔ میں نے انہیں فرماتے ہوا سنا:

كَأَنَّا قَدْ عَايَنَّا أَخْبَارَ السَّمَاءِ بِأَبْصَارِنَا، وَسَمِعْنَا أَصْوَاتَ الْمَلَائِكَةِ بِآذَانِنَا، فَقِيْلَ لِلْمُصَفِّيْنَ أَعْمَالَهُمْ: أَبْشِرُوا بِالْمُقَامِ الْعَجِيْبِ مِنَ الْحَبِيْبِ

(۱) ۱۔ شمس الدين محمد بن أبي بكر، الرد الوافر:۱۰۷
۲۔ عكرى، شذرات الذهب، ۶:۳۴۰
۳۔ كرمي، الشهادة الزكية:۵۰
۴۔ ابن فهد، لحظ الألحاظ:۱۸۲

الْقَرِيْبِ، قَطَعَ قُلُوْبَ الْعَارِفِيْنَ بِاللهِ ذِكْرُ الْخَالِدَيْنِ: الْجَنَّةِ وَالنَّارِ.[1]

ہم نے آسمان کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور فرشتوں کی آوازوں کو اپنے کانوں سے سنا، پرخلوص اعمال والوں سے کہا جا رہا تھا: تمہیں اپنے محبوب سے قرب والے انوکھے مقام کی خوش خبری ہو، عارف باللہ لوگوں کے دلوں کو ہمیشہ رہنے والی دو چیزوں کے ذکر نے کاٹ کر رکھ دیا ہے، (اور وہ دو چیزیں) جنت اور دوزخ ہیں۔

راوی بیان کرتے ہیں: لوگوں میں سے ایک نے زور سے چیخ ماری اور وہ فوت ہو کر گر گیا۔

درج بالا واقعات سے ثابت ہوا کہ کشف کا سلسلہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام تک محدود نہیں، بلکہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اولیاء عظام کو بھی نصیب ہوتا ہے۔ درج بالا واقعات اس پر صداقت کی سند ثبت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

(۱) ابن قدامة، الرقة والبكاء:۱۹۴، رقم/۲۸۴

باب نمبر 17

کشف پر ائمہ کرام اور فقہاء و محدثین عظام کا عقیدہ

حضور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام ﷺ و اولیاء عظام کے مکاشفات کا مطالعہ کرنے کے بعد اِس باب میں ہم کشف کے بارے میں ائمہ وفقہاء اور محدثین کا عقیدہ جاننے کو کوشش کریں گے۔ اس سے یہ حقیقت واضح کرنا مقصود ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال کی تاریخ میں کسی بھی مکتبۂ فکر کے عالم نے کشف کا انکار نہیں کیا ہے۔

ذیل میں ان میں سے چند نمائندہ ائمہ کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

۱۔ امام علاؤ الدین سمرقندی (۳۳۳-۳۷۳ھ)

امام علاؤ الدین سمرقندی اپنی تفسیر 'بحر العلوم' میں بیان کرتے ہیں کہ علمِ لدنی اور علمِ کشف وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ براہِ راست کسی واسطے اور سبب مالوف کے بغیر قلب پر نازل فرماتا ہے۔ جسم سے باہر کے جو اسباب ہیں، جن کے ساتھ ہماری زندگی مانوس اور عادی ہے وہ سب منقطع ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں علمِ لدنی میں جسمانی و مادی اسباب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ جب سب مادی ابواب بند ہو جاتے ہیں تب جا کر نیا باب کھلتا ہے۔[1]

۲۔ امام ابو القاسم القشیری (۳۷۶-۴۶۵ھ)

امام ابو القاسم القشیری انہی علوم کی تعریف کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

اَلْعِلْمُ مِنْ لَّدُنِّ اللهِ مَا يَتَحَصَّلُ بِطَرِيْقِ الإِلْهَامِ دُوْنَ التَّكَلُّفِ بِالتَّطَلُّبِ.[2]

اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم لدنی وہ علم ہے جس کے لیے انسان ظاہری طریقوں سے

(۱) سمرقندی، البحر العلوم، ۲: ۳۵۴-۳۵۵

(۲) قشیری، لطائف الإشارات، ۲: ۴۰۷

علم حاصل کرنے کی تکلیف اور مشقت میں مبتلا نہیں ہوتا۔ یہ علم بطریقِ الہام حاصل ہوتا ہے۔

یعنی علم حاصل کرنے کے عادی اور دنیوی معروف طریقے میں انسان کو جو مجاہدہ، محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے، علمِ لدنی کے حصول میں بندے پر وہ تکلف وارد نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ خاص سے حجابات ہٹا دیتا ہے۔ بلاشبہ اس کے پیچھے تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، بدنی اور نفسانی کثافتوں کو ختم کرنے کے لیے ریاضت و مجاہدہ کا ایک مسلسل عمل ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں یہ حجابات اٹھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں میں سے خواص کو علم لدنی کی دولت سے مالا مال فرماتا ہے۔

۳۔ امام غزالی (۴۵۰-۵۰۵ھ)

امام غزالی تصوف اور طریقِ علم باطن پر بحث کرتے ہوئے اپنی تصنیف **المنقذ من الضلال** میں فرماتے ہیں:

إِنَّ الصُّوْفِيَّةَ هُمُ السَّالِكُوْنَ لِطَرِيْقِ اللهِ خَاصَّةً. وَإِنَّ سِيْرَتَهُمْ أَحْسَنُ سِيَرٍ وَطَرِيْقَهُمْ أَصْوَبُ الطُّرُقِ وَأَخْلَاقَهُمْ أَزْكَى الْأَخْلَاقِ.

اولیاء اور صوفیا اللہ تعالیٰ کی راہ کے سالک یعنی مسافر ہوتے ہیں۔ اُن کی سیرت تمام سیرتوں سے اعلیٰ ہوتی ہے، اُن کا طریقہ تمام طریقوں سے درست ہوتا ہے اور اُن کا اخلاق سب اہلِ اخلاق سے پاکیزہ ہوتا ہے۔

پھر امام غزالی فرماتے ہیں:

بَلْ لَوْ جُمِعَ عَقْلُ الْعُقَلَاءِ وَحِكْمَةُ الْحُكَمَاءِ وَعِلْمُ الْوَاقِفِيْنَ عَلٰى أَسْرَارِ الشَّرْعِ مِنَ الْعُلَمَاءِ لِيُغَيِّرُوْا شَيْئًا مِنْ سِيْرَتِهِمْ وَأَخْلَاقِهِمْ وَيُبَدِّلُوْهُ بِمَا هُوَ خَيْرٌ مِنْهُ لَمْ يَجِدُوْا إِلَيْهِ سَبِيْلًا. (۱)

(۱) غزالی، المنقذ من الضلال: ۱۷۷-۱۷۸

اگر ساری دنیا کے عقل والوں کی عقل اور حکمت والوں کی حکمت جمع ہو جائے، شریعت کے اسرار جاننے والے علماء کا علم جمع ہو جائے اور (یہ سب مل کر) صوفیا اور اولیاء سے بہتر کوئی سیرت تشکیل دینا چاہیں اور صوفیہ کے اخلاق اور حکمت سے بہتر کوئی طریقہ تشکیل دینا چاہیں تو ساری دنیا کے علماء، حکماء، عقلاء اور فقہاء مل کر بھی صوفیہ کی سیرت، اُن کے اخلاق اور مرتبۂ علم سے بہتر کوئی مرتبہ پیش نہیں کر سکتے۔

قابلِ غور بات ہے کہ یہ ہندوستان کے کسی عالم کی تحریر کا اقتباس نہیں ہے بلکہ سب اکابر علماء یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ علم اور تحقیق کا رجحان ختم ہو گیا ہے، ہم نے مطالعہ کرنا چھوڑ دیا ہے، ہم اپنی ذاتی رائے اور ہوائے نفس کو علم کا نام دینے لگ گئے ہیں۔

مذکورہ اقوال آج کے دور کے کسی عالم دین کے نہیں، نہ ہی پچھلی ایک دو صدیوں کے کسی عالم کے اقوال ہیں۔ اگرچہ ان ادوار کے علماء بھی کشف (مکاشفات) اور مخاطبات کے علم پر ایمان رکھتے ہیں اور سب کا عقیدہ یہی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی؛ الغرض آپ اِن میں سے جس کی بھی کتاب کا مطالعہ کر لیں، کوئی ایک بھی عالم، محدث، متکلم یا فقیہ ایسا نہیں ہے جس نے کشف، مکاشفات، مشاہدات اور علوم باطنیہ کا انکار کیا ہو۔ لیکن مذکورہ اقوال ائمہ متقدمین اور متفق علیہ ائمہ کے اقوال ہیں، جن کا انکار ممکن نہیں۔

امام غزالی نے اپنی خود نوشت 'المنقذ من الضلال' میں تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ مجھے حق کی راہ کس طرح ملی اور میں شبہات و وسوسوں کی گرد سے کیسے نکلا؟ وہ فرماتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے کہ صوفیاء اور اولیاء کے پاس وہ علم، وہ معرفت، وہ عقل اور وہ حکمت ہے جو کسی اور کو میسر نہیں آ سکتی؟ اُس کی وجہ بڑی عجیب، لطیف اور ایمان افروز ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

فَإِنَّ جَمِيْعَ حَرَكَاتِهِمْ وَسَكَنَاتِهِمْ فِي ظَاهِرِهِمْ وَبَاطِنِهِمْ، مُقْتَبَسَةٌ مِنْ نُوْرِ مِشْكَاةِ النُّبُوَّةِ. (1)

(1) غزالی، المنقذ من الضلال: ۱۷۸

اس لیے کہ ان تمام اولیاء اور صوفیاء کے جتنے اعمال ہیں، طور طریقے ہیں، حرکات و سکنات ہیں اور ان کے اخلاق ہیں، یہ سارے براہِ راست سینۂ مصطفیٰ ﷺ کے نور سے فیض یافتہ ہیں۔

سینۂ نبوت میں نورِ الٰہی کا جو چراغ چمک رہا ہے یہ براہِ راست اُس نورِ نبوت سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے روشنی لیتے ہیں۔ اس لیے ان جیسا علم وحکمت کسی اور کو نصیب نہیں ہوسکتا۔ فرماتے ہیں:

وَلَيْسَ وَرَآءُ نُوْرِ النُّبُوَّةِ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ نُوْرٌ يُسْتَضَاءُ بِهٖ.

اور نورِ نبوت سے بہتر زمین پر ایسا کوئی نور نہیں ہے (بلکہ کائنات میں کسی کا نور نہیں ہے۔) جس سے استفادہ کیا جائے۔

یعنی اولیا وصوفیاء کے پاس نورِ نبوت ہوتا ہے، انہوں نے یہ روشنی نورِ نبوت کے چراغ سے لی ہوتی ہے اور نورِ نبوت سے بہتر کائنات میں کسی اور کا نور نہیں ہے۔ چونکہ اولیاء اللہ کے پاس نورِ نبوت ہوتا ہے اس لیے ان کا کشف بھی اسی نور سے منور ہوتا ہے۔

اس بحث کے اختتام پر امام غزالی لکھتے:

حَتّٰى إِنَّهُمْ فِي يَقَظَتِهِمْ يُشَاهِدُوْنَ الْمَلَائِكَةَ وَأَرْوَاحَ الْأَنْبِيَاءِ وَيَسْمَعُوْنَ أَصْوَاتًا وَيَقْتَبِسُوْنَ مِنْهُمْ فَوَائِدَ. (1)

حتیٰ کہ یہ عالمِ بیداری میں ملائکہ اور ارواحِ انبیاء کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کے اجسادِ مثالیہ کو بھی دیکھتے ہیں، اُن کی آوازیں سنتے ہیں اور اُن سے فوائد کا اکتساب فیض کرتے ہیں۔

امام غزالی کی اس بات کی تصدیق ہمیں امام جلال الدین سیوطی کے اس قول سے ملتی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے عالمِ بیداری میں بہتر (72) مرتبہ حضور نبی اکرم ﷺ کی

(1) غزالی، المنقذ من الضلال: ۱۷۸

زیارت کی ہے اور جن مسائل پر مجھے اشکال تھا میں نے آپ ﷺ سے براہ راست دریافت کیا ہے اور آپ ﷺ سے علمی اکتسابِ فیض کیا ہے۔

امام شعرانی سے لے کر علامہ انور شاہ کاشمیری تک کسی ایک عالم اور محدث نے بھی امام جلال الدین سیوطی کے اس قول کو رد نہیں کیا۔ سب نے اپنی اپنی کتب اور شروحِ حدیث میں ان کا مندرجہ بالا قول نقل کیا ہے۔

امام غزالی نے بھی یہی بات تحریر کی ہے کہ وہ اولیاء و سالکین حضور نبی اکرم ﷺ، دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اور ملائکہ سے علمی معارف کا اکتساب کرتے اور اُن کی آواز سنتے ہیں حتیٰ کہ

ثُمَّ يَتَرَقَّى الْحَالُ مِنْ مُشَاهَدَةِ الصُّوَرِ وَالْأَمْثَالِ، إِلٰى دَرَجَاتٍ.[1]

پھر اُن کا حال صورتوں اور امثال کے مشاہدہ سے ترقی پا کر مختلف درجات تک جا پہنچتا ہے۔

یہی نکتہ امام غزالی کے ایک اور شاگرد، جلیل القدر مالکی عالم امام ابو بکر بن العربی اپنی تصنیف 'قانون التاویل' میں بیان کرتے ہیں اور اسے امام جلال الدین سیوطی نے رقم کیا ہے۔

۴۔ علامہ زمخشری (۴۶۷-۵۳۸ھ)

علامہ زمخشری اپنی تفسیر الکشاف میں تحریر کرتے ہیں کہ یہ وہ علم تھا اللہ تعالیٰ نے جس کی نسبت اپنے علم (علمِ الٰہی) کی طرف فرمائی ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

وَهُوَ الإِخْبَارُ عَنِ الْغُيُوْبِ.[2]

وہ غیب کا علم عطا کرنے پر دلالت کرتا ہے۔

یعنی یہ ایسا علم ہے جو صاحبِ علم لدنی کو غیبی امور اور غیبی حقائق پر ادراک، معرفت

(۱) غزالی، المنقذ من الضلال: ۱۷۸

(۲) زمخشری، الکشاف، ۲: ۶۸۵

اور آگاہی عطا کرتا ہے۔ اس علم کو غیب اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ علم حواسِ خمسہ (جو معروف عادّی انسانی ذرائع ہیں) سے حاصل نہیں ہوتا۔

۵۔ قاضی ابوبکر بن العربی (۴۶۸-۵۴۳ھ)

امام محمود آلوسی نے اپنی تصنیف میں امام غزالی کے ایک جلیل القدر شاگرد القاضی ابوبکر بن العربی کا حوالہ دیا ہے، جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ جب انسان کو نفس کا تزکیہ حاصل ہوتا ہے تو اُس کے قلب و روح کثافتوں سے پاک و صاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں اس پر دنیاوی اسباب کے حجابات اٹھنے لگتے ہیں اور بندہ بشری اور نفسانی دنیا کی نجاست سے خود کو پاک کر کے اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے لگتا ہے۔ وہ اس وقت کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں:

كُشِفَتْ لَهُ الْقُلُوْبُ وَرَأَى الْمَلَائِكَةَ وَسَمِعَ كَلَامَهُمْ وَاطَّلَعَ عَلٰى أَرْوَاحِ الْأَنْبِيَاءِ.[1]

اُن کے دلوں کو مقام کشف نصیب ہو جاتا ہے اور وہ ملائکہ کو دیکھتے، ان کے کلام کو سنتے ہیں اور انبیاء کی روحوں پر مطلع ہوتے ہیں۔

۶۔ امام فخر الدین رازی (۵۴۴-۶۰۴ھ)

امام فخر الدین رازی اپنی معروف تفسیر 'التفسیر الکبیر' میں علم لدنی کے حوالے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کے حوالے سے سورۃ الکہف کی آیت نمبر ۶۵ کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

علوم لدنیہ بطریقِ کشف نصیب ہوتے ہیں۔ کشف کی مختلف صورتیں، درجات اور مراتب ہیں۔ جب حجاب اٹھا دیے جاتے ہیں تو انسان قلب کی آنکھ سے وہ غیبی اُمور دیکھنے اور

(۱) آلوسی، روح المعانی، ۲۲:۴۰

دل کے کانوں سے اس کلام کی سماعت کرنے لگتا ہے، جنہیں سر کی آنکھوں دیکھ نہیں سکتا اور نہ ہی کانوں سے سن سکتا ہے۔ غیب کے حجابات اٹھ جانے سے وہ ماورائی حقائق جو ورائے حجاب تھے، خواہ وہ حجاب مادی و جسمانی تھے، خواہ ماضی اور مستقبل سے متعلق تھے، وہ تمام بطریق کشف نصیب ہوتے ہیں۔ انہیں علومِ مکاشفہ بھی کہا جاتا ہے اور علومِ لدنیہ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ علم ظاہر و باطن کی یہ تقسیم پاکستان، بھارت یا بنگلہ دیش کے یا موجودہ زمانے کے عرب و عجم کے علماء اور صوفیا نے وضع کر لی ہے، بلکہ خود امام فخر الدین رازی نے علم الباطن اور علم لدنی کو مکاشفہ کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔

وہ 'التفسیر الکبیر (۲۱:۷۶)' میں علم بالکشف اور علم لدنی کا صحیح بخاری کی حدیث قدسی سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِي، يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا. (۱)

میرا بندہ ایسی کسی چیز کے ذریعے میرا قرب نہیں پاتا جو مجھے فرائض سے زیادہ محبوب ہو، میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعے برابر میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۵:۲۳۸۴، رقم: ۶۱۳۷

۲۔ ابن حبان، الصحیح، ۲:۵۸، رقم: ۳۴۷

اس سے ایک چیز تو واضح ہوگئی کہ کشف یا دیگر روحانی مراتب اور درجات کا حصول یا بندے کا اللہ تعالیٰ کے قرب کا سفر فرائض و واجبات کی بجا آوری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں شریعت نے جو فرائض و واجبات مقرر کئے ہیں، ان کی پابندی کے بغیر کوئی شخص نہ تو مرتبہ ولایت میں داخل ہوسکتا ہے، نہ ہی اسے اللہ تعالیٰ کی قربت و معرفت نصیب ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی علم لدنی کا حامل ہوسکتا ہے۔

بدقسمتی سے بعض دین سے بے بہرہ اور تارکینِ نماز کہتے ہیں کہ ہم تو ہر وقت ہی اللہ تعالیٰ کی حضوری میں رہتے ہیں۔ ان کے یہ کلمات سراسر عیاری، مکاری اور بد دیانتی پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایسے شخص سے بیعت کرنا اور اُس کی صحبت میں بیٹھنا بھی حرام ہے۔ جو شخص شریعتِ محمدی کا منکر ہے بھلا وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی امت میں ولایت کے مرتبے پر کیسے فائز ہوسکتا ہے؟ نوافل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر بندہ اضافتاً نوافل ادا کرے، تسبیحات و اذکار کرے اور ریاضات و مجاہدات کرے تو میں اسے اپنے قریب تر کرتا چلا جاتا ہوں، حتیٰ کہ اتنا قریب کر لیتا ہوں کہ میں خود اُس بندے سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔ پھر میں اُس کے کان بن جاتا ہوں، اُس کی آنکھیں بن جاتا ہوں، اُس کی زبان بن جاتا ہوں، اُس کا دل بن جاتا ہوں، اُس کے ہاتھ بن جاتا ہوں اور اُس کے پاؤں بن جاتا ہوں۔ پھر بندہ میرے ذریعے سنتا، میرے ذریعے دیکھتا، میرے ذریعے بولتا، میرے ذریعے چلتا، میرے ذریعے پکڑتا، میرے ذریعے ہی دل میں خیال لاتا ہے اور وہ صرف میری ہی خواہش کی تکمیل کرتا ہے۔

صحیح بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں:

فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وإِنْ سَأَلَنِي، لَأُعْطِيَنَّهُ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي، لَأُعِيذَنَّهُ. (۱)

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۵: ۲۳۸۴، رقم: ۶۱۳۷

میں اُس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اُس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، میں اُن کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے، میں اُس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے ضرور بالضرور عطا کرتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ کا طلب گار ہوتا ہے تو میں اُسے ضرور پناہ عطا کرتا ہوں۔

امام فخر الدین رازی 'صحیح بخاری' کی اس روایت کو کشف اور علمِ لدنی کی بنیاد بناتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَهٰذَا الْخَبَرُ يَدُلُّ عَلٰى أَنَّهُ لَمْ يَبْقَ فِي سَمْعِهِمْ نَصِيْبٌ لِغَيْرِ اللهِ.(۱)

اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ (جب اولیاء اللہ اس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں تو پھر) ان کی سماعت میں غیر اللہ کا کوئی حصہ نہیں رہتا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ کے ولی پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اسے اپنی قربت اور محبت کے ساتھ عطا کر کے اسے اس مقام پر فائز کر دیتا ہے کہ وہ اس کی آنکھیں بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے کان بن جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا ولی اس مقام پر فائز ہوتا ہے تو پھر اس شخص کا بطور بشر سماعت میں اپنا کوئی حصہ نہیں رہتا۔ اس کی سماعت سماعتِ الٰہیہ کی طرف منسوب ہو جاتی ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے براہِ راست فیض سے سننے لگتا ہے۔ اُس کی بصارت کا کوئی حصہ اپنا نہیں رہتا اور اس کی اپنی نفی ہو جاتی ہے۔ اب وہ دیکھتا ہے تو اپنی استعداد سے نہیں بلکہ فیضِ الٰہیہ سے دیکھتا ہے۔ یہ علمِ لدنی ہے، جس کا ذکر قرآن حکیم میں سورۃ الکہف کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

امام رازی پھر فرماتے ہیں:

۲۔ ابن حبان، الصحیح، ۲:۵۸، رقم: ۳۴۷

۳۔ بیہقی، السنن الکبری، ۱۰:۲۱۹

(۱) رازی، التفسیر الکبیر، ۲۱: ۷۶

وَلَا فِي بَصَرِهِمْ وَلَا فِي سَائِرِ أَعْضَائِهِمْ.[1]

اور نہ ان کی بصارت میں اور نہ ہی تمام اعضاء میں (غیر اللہ کا کوئی حصہ رہتا ہے)۔

یعنی اس کے تمام اعضاء کی جو اپنی استعداد و صلاحیت ہے جس میں کمی، بیشی، نفع، نقصان، کمال اور ناقص ہونے کی ساری خوبیاں اور نقائص شامل ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُنہیں ہٹا دیتا ہے۔ اب نورِ الٰہی اُس کی سماعت، اس کی بصارت اور اُس کے ہاتھ کی گرفت بن جاتا ہے۔ گویا نورِ الٰہی اُس کے قلب کے خیالات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے روحانی بدل (spiritual replacement) کا عمل بن جاتا ہے۔

امام فخر الدین رازی مزید فرماتے ہیں:

إِذْ لَوْ بَقِيَ هُنَاکَ نَصِيْبٌ لِغَيْرِ اللهِ لَمَا قَالَ: أَنَا سَمْعُهُ وَبَصَرُهُ.[2]

اگر ان کے ہاں غیر اللہ کا کچھ حصہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کیوں فرماتا کہ میں اُس کے کان بن جاتا ہوں اور میں اُس کی آنکھیں بن جاتا ہوں۔

یعنی اگر وہ بندہ جو غیر اللہ میں سے ہے، اگر اُس کے ان تمام اعضاء کی کارکردگی میں اپنا حصہ ہوتا، اُس کے کان اپنی استعداد سے سماعت کرنے والے ہوتے، اُس کی آنکھیں اپنی استعداد سے دیکھ رہی ہوتیں تو اللہ تعالیٰ کبھی نہ فرماتا کہ میں اُس کے کان بن جاتا ہوں اور میں اُس کی آنکھیں بن جاتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر اُس بندے کی نفسی، بشری اور مادی استعداد اور صلاحیتوں کا خاتمہ فرما دیا ہے۔ وہ اسی کیفیت کو کہتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آ جاتا ہے۔ یہاں سوال کھڑا ہوتا ہے کہ کتنی حفاظت میں آ جاتا ہے؟ یہ اس پر منحصر ہے کہ اُسے خالقِ دو جہاں نے اپنی کتنی قربت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ جب ساری کثافتیں دور ہو جاتی ہیں اور ملاء اعلیٰ کی

(۱) رازی، التفسیر الکبیر، ۲۱: ۷۶
(۲) رازی، التفسیر الکبیر، ۲۱: ۷۶

لطافت آنا شروع ہو جاتی ہے تو وہ بندہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آ جاتا ہے۔ جتنی حفاظتِ الٰہیہ بڑھتی چلی جاتی ہے اُتنا ہی علمِ لدنی خطا اور غلطی سے پاک ہوتا چلا جاتا ہے۔ تاہم ولایت کے باب میں غلطی کا امکان رہتا ہے جبکہ نبی کے علم میں امکانِ خطا قطعاً نہیں ہوتا۔

۷۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (۵۶۰-۶۳۸ھ)

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی بہت سی کرامات ہیں مگر اُن میں سب سے اعلیٰ کرامت علمِ لدنی ہے۔ ہواؤں میں اُڑنے، سمندروں اور دریاؤں پر پیدل چلنے، الغرض جتنی خوارقِ عادات کرامات ہیں اُن سب سے بڑھ کر یہی کرامت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دعا تلقین فرمائی گئی ہے:

رَبِّ زِدْنِی عِلْمًاo[1]

اور آپ (رب کے حضور یہ) عرض کیا کریں کہ اے میرے رب! مجھے علم میں اور بڑھا دےo

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کسی اور نعمت میں مزید اضافہ کرنے کا حکم اس طرح نہیں دیا کہ مجھ سے یوں دعا کیجئے۔ وہ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اس لیے علم (علم لدنی) سے بڑا کوئی خرقِ عادت عمل کرامت کے درجے میں نہیں ہے۔ یہ **الکرامة العظمی** ہے۔[2]

۸۔ امام نووی (۶۳۱-۶۷۶ھ)

امام ابو زکریا محی الدین النووی عظیم محدث ہیں، اُن کا واقعہ امام جلال الدین سیوطی نے ان کے شاگرد امام ابن العطار سے روایت کیا ہے کہ وہ امام نووی کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ دورانِ گفتگو انہوں نے فرمایا:

---

(۱) طٰہٰ، ۲۰: ۱۱۴

(۲) ابن عربی، الفتوحات المکیة، باب: ۱۸۴

قَدْ أُذِنَ لِي فِي السَّفَرِ قُمْ سَافِرْ لِزِيَارَةِ الْقُدْسِ.[1]

مجھے اب یہاں سے سفر کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اے مسافر! اٹھو اور قدس کی زیارت کے لیے سفر شروع کر دو۔

وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سمجھا کہ مجھے انہوں نے القدس (مسجد اقصیٰ) کی زیارت کے لیے چلنے کا کہا ہے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس سے ان کی مراد تو سفرِ حقیقی تھا کہ ان کے وصال کا وقت آ گیا ہے۔ ابن عطار کہتے ہیں کہ مجھے انہوں نے ساتھ لیا اور قبرستان گئے۔ جہاں اُنہوں نے اولیاء، مشائخ اور محدثین کی قبور کی زیارت کی اور فاتحہ پڑھی، پھر کہا: چلو اب جو اولیاء اور احباب زندہ ہیں ان سے ملاقات کر لیں۔

پھر اپنے زندہ احباب و اصحاب سے ملاقات کی۔ چنانچہ آپ نے شیخ یوسف الفقاہی، شیخ محمد الأخمیمی، شیخ شمس الدین ابن ابی عمر اور جو اس وقت محدثین، علماء، اولیاء اور صالحین میں سے حیات تھے، ان سب سے ملاقاتیں کیں، بعد ازاں القدس کی زیارت کے بعد واپس آئے تو کچھ روز بعد ان کا وصال ہوگیا۔

الغرض کشف و کرامات ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہیں کہ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ہمیں دینی معارف اور شرعی حقائق کے ایسے فیصلے جو عقائد سے متعلق ہیں اپنی عقل اور رائے سے نہیں کرنے چاہئیں، بلکہ دلائلِ شرعیہ کے ساتھ، ائمہ مجتہدین، فقہاء، محدثین اور محققین کی تصریحات کے ساتھ کرنے چاہئیں۔

۹۔ علامہ ابنِ تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ)

علامہ ابن تیمیہ اپنی معروف کتاب 'مجموع الفتاویٰ (۱۲۸:۶)' میں بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں علم الظاہر کا تو محتاج ہوں مگر علم باطن کا نہیں، یا یوں کہے کہ علم شریعت حضور نبی اکرم ﷺ سے لیتا ہوں اور علم حقیقت نہیں لیتا تو ایسا کہنے اور یہ عقیدہ رکھنے سے وہ

(۱) ابن عطار، تحفة الطالبين: ۷

دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اگر وہ اپنے آپ کو ظاہر اور باطن کے تمام علوم میں حضور ﷺ کا محتاج نہیں سمجھتا، یا شریعت اور حقیقت دونوں میں حضور ﷺ کا محتاج نہیں سمجھتا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہ جیسا شخص بھی علم ظاہر اور علم باطن کی تقسیم کے قائل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی عالم جس کے پاس قابلِ اعتماد علم ہے وہ پوری اسلامی تاریخ میں ان چیزوں کا منکر نہیں ہوا ہے۔ یہ بات متفق علیہ اور مسلمہ ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

وَكَذَالِكَ هٰذَا الَّذِي يَقُوْلُ: إِنَّ مُحَمَّدًا ﷺ بُعِثَ بِعِلْمِ الظَّاهِرِ دُوْنَ عَلَى الْبَاطِنِ. آمَنَ بِبَعْضٍ مَا جَاءَ بِهِ وَكَفَرَ بِبَعضٍ فَهُوَ كَافِرٌ.

اس طرح وہ شخص بھی کافر ہوگا جو یہ کہتا ہے: حضور نبی اکرم ﷺ صرف علم ظاہر کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے اور علم باطن نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ (کیونکہ) حضور ﷺ جو کچھ لے کر آئے وہ اُس میں سے کچھ مانتا ہے اور کچھ کا انکار کرتا ہے۔ لہٰذا وہ کافر ہے۔

یعنی حضور نبی اکرم ﷺ جس طرح علمِ ظاہر لائے ہیں اُسی طرح علمِ باطن کی نعمت بھی آپ ﷺ نے اُمت کو عطا کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وَهُوَ أَكْفَرُ مِنْ أُوْلٰئِكَ. لِأَنَّ عِلْمَ الْبَاطِنِ الَّذِي هُوَ عِلْمُ إِيْمَانِ الْقُلُوْبِ وَمَعَارِفِهَا وَأَحْوَالِهَا. وَهُوَ عِلْمٌ بِحَقَائِقِ الإِيْمَانِ الْبَاطِنَةِ. وَهُوَ أَشْرَفُ مِنَ الْعِلْمِ بِمُجَرَّدِ أَعْمَالِ الإِسْلَامِ الظَّاهِرَةِ. (۱)

علمِ باطن کا انکار کرنے والا دوسروں سے بھی بڑا کافر ہے۔ اس لیے کہ علمِ باطن دلوں کا علم ہے، دلوں کے ایمان کا علم ہے اور دلوں کے معارف کا علم ہے، احوال کا

(۱) ابن تيمية، مجموع الفتاوى، ۱۱: ۲۲۵

علم ہے۔ یہ ایمان کے باطنی حقائق کا علم ہے اور فقط اسلام کے ظاہری اعمال کے علم سے یہ علمِ باطن زیادہ اعلیٰ اور ارفع علم ہے۔

علامہ ابن تیمیہ اپنی کتاب 'العقيدة الواسطية' کی الفصل الثالث: التصديق بكرامات الأولياء' میں لکھتے ہیں:

وَمِنْ أُصُوْلِ أَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ التَّصْدِيْقُ بِكَرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ.[1]

اولیاء اللہ کی کرامات کی تصدیق کرنا اہل سنت کے بنیادی اور اصولی عقائد کا حصہ ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی اُمت کے ہر ولی کی کرامت کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ کرامت دراصل حضور ﷺ کے معجزات کا تسلسل ہی تو ہے۔ اُسے یہ مرتبۂ کرامت حضور ﷺ کی متابعت اور اتباع کے نتیجے میں ملا ہے۔

جہاں تک کشف اور علمِ لدنی کے موجود ہونے کی بات ہے تو اس کے انکار کی قرآن و حدیث میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ و مجتہدین، علماء و محدثین اور فقہاء میں سے کسی نے بھی چودہ سو سال میں یہ بات نہیں کہی کہ صحابہ کرام ﷺ کے زمانے کے بعد کشف نہیں ہوگا۔ علم کا ایک تسلسل اور تواتر ہوتا ہے، جس پر اُمت کا ہمیشہ سے اجماع رہا ہے۔ جس پر اختلاف ہی نہیں ہے اس کے حوالے سے ایسی بات کرنا دراصل پوری اُمت کی نفی کرنے کے مترادف ہوگا۔

آج بھی آنکھیں اسی طرح سے دیکھتی ہیں جس طرح پہلے دور کے انسان کی دیکھا کرتی تھیں۔ انسانی کان جیسے پہلے سنتے تھے، آج بھی اسی طرح سے سنتے ہیں۔ جس طرح آنکھوں کا دیکھنا اور کانوں کا سننا بند نہیں ہوا، عین اسی طرح باطنی ذرائع یعنی علمِ مکاشفات،

(۱) ۱۔ ابن تيمية، العقيدة الواسطية: ۴۵-۴۶
۲۔ ابن تيمية، مجموع الفتاوى، ۳: ۱۵۶
۳۔ قنوجي، قطف الثمر في عقيدة أهل الأثر: ۱۰۵

مشاہدات، علمِ باطن اور علمِ لدنی بھی بند نہیں ہوئے۔ قلب کی آنکھیں بھی اُسی طرح کارفرما ہیں جیسا کہ پہلے تھیں۔ روح کے ذرائع بھی جس طرح پہلے کارفرما تھے اسی طرح آج بھی مصروفِ عمل ہیں۔ ملاء اعلیٰ اور دل کا رابطہ بھی اسی طرح قائم ہے جیسے پہلے تھا۔ آج بھی اگر کوئی قلب کی صفائی کر لے تو اس پر وہی انوار و تجلیات اتریں گے۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ آج مکاشفات ممکن نہیں ہے، ایسا کہنا دینِ اسلام کے اصولوں کی نفی کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس لیے علامہ ابن تیمیہ نے کہا کہ یہ اُصولِ اہل سنت میں سے ہے کہ کسی بھی دور اور کسی بھی زمانہ میں اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ ابن تیمیہ مزید لکھتے ہیں:

وَمَا يُجْرِي اللهُ عَلٰى أَيْدِيهِمْ مِنْ خَوَارِقِ الْعَادَاتِ فِي أَنْوَاعِ الْعُلُوْمِ وَالْمُكَاشَفَاتِ، وَأَنْوَاعِ الْقُدْرَةِ وَالتَّأْثِيْرَاتِ، وَالْمَأْثُوْرِ عَنْ سَالِفِ الْأُمَمِ فِي سُوْرَةِ الْكَهْفِ وَغَيْرِهَا، وَعَنْ صَدْرِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ، وَسَائِرِ فِرَقِ الْأُمَّةِ، وَهِيَ مَوْجُوْدَةٌ فِيْهَا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ.[1]

اللہ تعالیٰ ان اولیاء کے ہاتھوں علوم و مکاشفات کی انواع میں سے اور قدرت و تاثیرات کی انواع میں سے جو خرق عادت اُمور جاری کرواتا ہے، سابقہ اُمتوں سے سورۃ الکہف اور دیگر سورتوں میں جو کرامات منقول ہیں اور اسی طرح اس اُمت مسلمہ کے ابتدائی حصہ میں صحابہ کرام ﷺ، تابعین اور اُمت کے تمام مکاتب فکر سے اس بارے میں جو کچھ منقول ہے (وہ حق ہے)۔ کرامات کا یہ سلسلہ قیامت تک موجود رہے گا۔

ایک مقام پر علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا کہ پہلے زمانے میں کرامات اور

---

(۱) ۱۔ ابن تيمية، العقيدة الواسطية: ۴۵-۴۶

۲۔ ابن تيمية، مجموع الفتاوى، ۳: ۱۵۶

۳۔ قنوجي، قطف الثمر في عقيدة أهل الأثر: ۱۰۵

مکاشفات تھے، آج کے زمانے میں نہیں یہ ایک غیر حقیقی بات ہے۔ جو اس کے اہل ہوں گے اُن کے لیے یہ علم ہوگا، جو اہل نہیں ہیں اُن کے لیے نہیں ہوگا۔ تاہم کسی کا دعویٰ کرنے سے یہ کشف و کرامت، مکاشفات اور علومِ لدنیہ (علم لدنی) ثابت نہیں ہو جاتا۔ ایسا دعویٰ کرنا تو صرف اللہ تعالیٰ کے نبی کا حق ہے۔

نبی کی نبوت پر ایمان لانا فرائض اور واجبات میں سے ہے۔ اگر اُس کا انکار کریں گے تو کافر ہو جائیں گے۔ ایک ولی اللہ کی ولایت کا انکار کریں گے تو اُس سے کافر تو نہیں ہوں گے، البتہ اللہ کی عنایات سے محروم ضرور ہو سکتے ہیں، لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ میں سرے سے ولایت کو ہی نہیں مانتا تو ولایت کے مطلقاً انکار سے بندہ کافر ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ قرآن مجید کی نصوص کا انکار ہے اور احادیثِ نبوی سے جو چیز ثابت ہے اُس سے منکر ہونے کا اعتراف ہے۔

دراصل جب کشف و کرامات کا انکار کریں گے تو یہ معجزۂ نبی کا انکار تصور ہوگا چونکہ تمام اولیاء کی کرامات اُس کے نبی کے معجزات کا تسلسل ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ اپنی کتاب 'النبوات (ص:۱۳۰)' میں بیان کرتے ہیں:

وَقَدْ ذَكَرَ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنَ الْعُلَمَاءِ. أَنَّ كَرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ مُعْجِزَاتٌ لِنَبِيِّهِمْ.

یہ ایک دو علماء نے نہیں بلکہ کثیر نے لکھا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی اُمت کے اولیاء کی کرامات اُن کے نبی کے معجزات ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے شرف اور عظمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نبوت کا سلسلہ تو بلاشبہ ختم ہوگیا ہے، مگر حضور ﷺ کی اُمت میں اب محدثین، اولیاء، صالحین اور مجددین قیامت تک آتے رہیں گے، یہ آپ ﷺ کے خلفاء اور نائبین ہیں۔

یہاں علامہ ابن تیمیہ بطور دلیل کہتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کی نبوت کی علامات میں سے ایک ہے۔ اگر آپ ﷺ کی نبوت جاری و ساری ہے تو آپ ﷺ کی اُمت کے ہر زمانے میں ولایت، کرامت اور کشف بھی جاری ہے اور رہنا بھی چاہیے۔

علامہ ابن تیمیہ اپنے بیان کا اختتام ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

وَهٰذَا هُوَ الصَّوَابُ.(۱)

اور یہی عقیدہ صحیح ہے۔

ابن تیمیہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء صاحبانِ تقویٰ ہوتے ہیں۔ وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی اتباع، اقتدا اور امر و نہی کی پیروی کے سبب اس مقام پر پہنچے ہوتے ہیں:

فَيُؤَيِّدُهُمْ بِمَلَائِكَتِهِ، وَرُوْحٍ مِنْهُ، وَيَقْذِفُ اللهُ فِي قُلُوْبِهِمْ مِنْ أَنْوَارِهِ، وَلَهُمُ الْكَرَامَاتُ الَّتِي يُكْرِمُ اللهُ بِهَا أَوْلِيَاءَهُ الْمُتَّقِيْنَ.(۲)

اللہ تعالیٰ پھر اپنے ملائکہ اور روح الامین کے ذریعے اُن کی تائید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں میں اپنے انوار داخل فرماتا ہے اور پھر انہیں کرامتیں عطا کرتا ہے۔ جن کے ذریعے اپنے اولیاء اور متقین کو اونچے درجے دیتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ مزید فرماتے ہیں:

مَا كَانَ مِنَ الْخَوَارِقِ مِنْ 'بَابِ الْعِلْمِ' فَتَارَةً بِأَنْ يُسْمِعَ الْعَبْدَ مَا لَا يَسْمَعُهُ غَيْرُهُ. وَتَارَةً بِأَنْ يَرٰى مَا لَا يَرَاهُ غَيْرُهُ يَقَظَةً وَمَنَامًا. وَتَارَةً بِأَنْ يَعْلَمَ مَا لَا يَعْلَمُ غَيْرُهُ وَحْيًا وَإِلْهَامًا أَوْ إِنْزَالُ عِلْمٍ ضَرُوْرِيٍّ أَوْ فِرَاسَةٍ صَادِقَةٍ، وَيُسَمّٰى كَشْفًا وَمُشَاهَدَاتٍ وَمُكَاشَفَاتٍ وَمُخَاطَبَاتٍ: فَالسَّمَاعُ مُخَاطَبَاتٌ وَالرُّؤْيَةُ مُشَاهَدَاتٌ وَالْعِلْمُ مُكَاشَفَةٌ وَيُسَمّٰى ذَالِكَ كُلُّهُ كَشْفًا وَمُكَاشَفَةً.(۳)

---

(۱) ابن تيمية، النبوات: ۱۳۰

(۲) ابن تيمية، مجموع الفتاوىٰ، ۱۱: ۲۷۴

(۳) ۱۔ ابن تيمية، مجموع الفتاوىٰ، ۱۱: ۳۱۳

۲۔ ابن تيمية، التصوف والصوفية، ۱۱: ۵-۲۴

اور خوارقِ عادات (کرامات) میں بہت بڑی چیز باب علم میں سے ہے۔ علم کے باب میں بڑی کرامت یہ ہے کہ بعض اوقات ایک ولی اللہ اور اللہ کا ایک مقرب بندہ وہ چیزیں سنتا ہے جو دوسرے آدمی کے کان نہیں سن سکتے۔ کئی بار وہ اُن چیزوں کو کشف کے ذریعے دیکھتا ہے جو دوسرے آدمی کی آنکھیں دیکھ نہیں پاتیں۔ یہ علوم بطریقِ رؤیا (خواب) بھی حاصل ہوتے ہیں اور بیداری کے ذریعے بھی نصیب ہوتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ اللہ کا ولی ایسی کئی چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے کہ اُس کے پاس علم آجاتا ہے جو علم دوسرے شخص کو نہیں آتا، تو یہ علم کبھی نبی پر وحی کے ذریعے نازل ہوتا ہے اور اولیاء پر الہام کے ذریعے اترتا ہے۔ کبھی یہ علم نورِ فراست کی شکل میں بھی ملتا ہے اور جو علم اللہ تعالیٰ براہِ راست نور کے ذریعے عطا کرتا ہے، اسے مشاہدات، مکاشفات اور مخاطبات کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اپنی اسی کتاب میں مختلف کرامات بیان کرتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم ﷺ کا حضرت ساریہ کو آگاہ کرنا اور اسی طرح کے کئی دیگر واقعات حوالہ جات کے ساتھ بیان کرتے ہیں، جن میں سے کچھ کا ذکر سابقہ باب میں گزر چکا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے ان روایات کو بیان کر کے کشف کا اثبات کیا ہے۔

۱۰۔ امام ابن الحاج المالکی (م ۷۳۷ھ)

امام ابن الحاج المالکی لکھتے ہیں:

إِنَّا لَا نُنْكِرُ مَنْ يَقَعُ هٰذَا مِنَ الْأَكَابِرِ الَّذِيْنَ حَفِظَهُمُ اللهُ تَعَالٰى فِي ظَوَاهِرِهِمْ وَبَوَاطِنِهِمْ. (۱)

یقیناً اکابرین سے جو کچھ واقع ہوا ہے ہم اُس کا انکار نہیں کر سکتے چونکہ اللہ نے اُن کی ظاہری طور بھی حفاظت فرما رکھی ہے اور وہ باطنی طور بھی محفوظ ہوتے ہیں۔

(۱) ابن الحاج، المدخل، ۳: ۱۹۴

قلب کا کشف اس مقام تک چلا جاتا ہے اور پردے اس مقام تک اٹھ جاتے ہیں کہ اولیاء کرام عالمِ خواب تو دور کی بات ہے عالم بیداری میں بھی حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت کرتے ہوئے بارگاہِ رسالت سے اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ بعض علمائے ظاہر نے بیداری کے عالم میں حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت کا انکار کیا ہے کہ ہماری آنکھیں فانی ہیں اور فانی آنکھیں باقی کا (وفات کے بعد جو مرتبہ آقا ﷺ کو مل گیا تو اس کا) دیدار نہیں کر سکتیں۔

وہ اس بات کا جواب دیتے ہیں کہ جب بندہ اللہ کی قربت میں چلا جاتا ہے تو اس کی فانی آنکھ کو باقی آنکھ کے ساتھ تبدیل کر دیا جاتا ہے چونکہ اللہ نے کہا کہ وہ اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ میری آنکھ سے نظارہ کرتا ہے۔ اسی طرح سے وہ اپنے کانوں سے نہیں سنتا بلکہ میرے کانوں سے سنتا ہے۔ اُس پر اب فانی آنکھ کے احکام نہیں لگیں گے بلکہ باقی رؤیت کے احکام لگیں گے، لہٰذا وہ باقی رؤیت سے باقی ہستی کا دیدار کرتا ہے۔

امام سیوطی لکھتے ہیں کہ سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی کو نماز ظہر سے پہلے حضور نبی اکرم ﷺ کی عالم بیداری میں زیارت ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عبد القادر! میرے بیٹے تو خطاب کیوں نہیں کرتا؟ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں عجمی ہوں۔ عراق کے لوگ بڑے فصیح و بلیغ عربی زبان بولنے والے ہیں، میں جسارت نہیں کر پاتا کہ ان کے سامنے خطاب کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹے اپنا دہن کھولو، میں نے تعمیل کی۔ آپ ﷺ نے سات مرتبہ اپنا لعابِ اقدس میرے منہ میں ڈالا۔ جس سے میرے سینے سے معرفت کے چشمے ابلنے لگے اور میری زبان سے فصیح اور بلیغ عربی رواں ہوگئی۔[1]

۱۱۔ امام تاج الدین السبکی (۷۲۷-۷۷۱ھ)

امام تاج الدین السبکی 'طبقات الشافعية الكبرى' میں کرامات پر کشف کی بحث

(۱) سيوطي، الحاوي للفتاوى، ۲:۳۱۲

کے آخر میں لکھتے ہیں کہ کرامات کی ایک سو سے زائد اقسام ہیں۔ انہوں نے سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی کی کرامات کی اقسام بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی امت کے اولیاء میں مردوں کو زندہ کرنے کی کرامت بھی شامل ہے۔ وہ اس ضمن میں سب سے پہلے سیدنا غوث الاعظم کی درج ذیل کرامت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے مرغی کا گوشت کھایا، سالن ختم ہوا، ہڈیاں رکھ دیں اور اس کے بعد ان ہڈیوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

قُوْمِي بِإِذْنِ اللهِ الَّذِي يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ. (۱)

اے مرغی! اُس اللہ کے حکم سے زندہ ہو کر کھڑی ہو جاؤ، جو ہڈیوں میں جان ڈال دیتا ہے۔

وہ مرغی کھڑی ہوگئی اور امام سبکی فرماتے ہیں کہ ان کی یہ کرامت حدِ شہرت کو پہنچی ہوئی ہے۔

اسی طرح انہوں نے مزید کرامات بیان کرتے ہوئے ان کی قسمیں بیان کی ہیں، مثلاً دریا کو پھاڑ دینا، مُردوں سے بعد از مرگ کلام کرنا، حیوانوں اور جانوروں سے گفتگو کرنا، بیمار کا اچانک شفایاب ہو جانا، نابینا کی بینائی بحال ہو جانا، حیوانات کا اطاعت کرنا، دعا کا قبول ہو جانا، علمِ لدنی کا حاصل ہونا، غیبی امور اور حقائق کا بیان کرنا، تھوڑے وقت میں زیادہ سفر طے کرنا اور تھوڑے عرصے میں بہت ساری کتابیں تصنیف کرنا شامل ہے۔ اس موقع پر وہ امام الحرمین ابو المعانی الجوینی کی مثال دیتے ہیں کہ انہوں نے تھوڑی عمر میں اتنی تصنیفات تحریر کیں کہ کوئی اور صاحبِ قلم عالم اس تھوڑے عرصے میں اس قدر لکھ نہیں سکتا۔

امام سبکی کہتے ہیں کہ کرامت کا یہی درجہ میرے والد کو بھی حاصل تھا کہ انہوں نے اپنے زندگی کے قلیل عرصہ میں اتنی تصانیف تحریر کیں کہ انہیں بغیر کرامت کے لکھے جانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ تصانیف کے علاوہ ان کی دیگر مصروفیات بھی ہوا کرتی تھیں، اُن کا عبادات پر بھی وقت لگتا تھا۔ وہ دروس بھی دیتے، خطاب بھی کرتے، تلاوت بھی کرتے، فتاویٰ

(۱) سبکی، طبقات الشافعية الكبرى، ۲: ۳۳۸

بھی دیتے اور بہت سارے دیگر معاملاتِ زندگی بھی ادا فرماتے تھے۔[1]

امام سبکی فرماتے ہیں:

وَهُوَ دَرَجَاتٌ تَخْرُجُ عَنْ حَدِّ الْحَصْرِ.[2]

اور کشف و کرامات کے اتنے درجات ہیں کہ حیطہ شمار میں ہی نہیں آ سکتے۔

اسی طرح فرمایا کہ پردوں کے پیچھے سے کسی دور کے مقام کو دیکھ لینا بھی کرامتوں میں سے ایک ہے۔ وہ اس کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

إِنَّ الشَّيْخَ أَبَا إِسْحَاقَ الشِّيْرَازِيَّ كَانَ يُشَاهِدُ الْكَعْبَةَ وَهُوَ بِبَغْدَادَ.[3]

امام ابو اسحٰق شیرازی ایسے ولی اللہ تھے کہ جب اُن کا دل کرتا (تو بغداد شریف میں رہتے ہوئے) پردہ اٹھ جاتا اور وہ کعبۃ اللہ کو دیکھ لیتے تھے۔

انہوں نے یہاں ایک ہی مثال دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کشف اور علمِ لدنی کی کرامات اتنی زیادہ ہیں کہ انہیں شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۱۲۔ امام جلال الدین سیوطی (۸۴۹-۹۱۱ھ)

امام جلال الدین سیوطی نے 'تنوير الحلق في إمكان رؤية النبي ﷺ والملک (حضور نبی اکرم ﷺ اور فرشتوں کو بیداری کے عالم میں دیکھنے کے امکان)' کے عنوان سے ایک پورا رسالہ لکھا ہے۔ انہوں نے اس رسالہ میں احادیث سے لے کر اولیاء اللہ کی کرامات اور ائمہ، محدثین اور فقہاء کی تصریحات کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ امام جلال الدین سیوطی کسی اور کا حوالہ نہ بھی دیں تب بھی وہ بذاتِ خود ایک سند ہیں۔ وہ اتنے بڑے عالم، محدث، فقیہ اور اتنی بڑی اتھارٹی

(۱) سبکی، طبقات الشافعية الکبریٰ، ۲: ۳۴۳

(۲) سبکی، طبقات الشافعية الکبریٰ، ۲: ۳۴۰

(۳) سبکی، طبقات الشافعية الکبریٰ، ۲: ۳۴۱

ہیں کہ ان کا لکھا ہوا ایک ایک جملہ بذاتِ خود ایک سند ہے۔

امام جلال الدین سیوطی اس رسالہ کو 'صحیح بخاری' اور 'صحیح مسلم' کی متفق علیہ حدیث سے شروع کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَسَيَرَانِي فِي الْيَقَظَةِ وَلَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِي.[1]

جو شخص خواب میں میری زیارت کرتا ہے وہ عنقریب (مرنے سے پہلے) عالمِ بیداری میں بھی میری زیارت کرے گا۔ (یہ گمان نہ کرے کہ میری زیارت نہیں ہوگی اس لیے کہ) شیطان میری شکل اختیار نہیں کر سکتا۔

یہ ایک منفرد مضمون کی حدیث ہے۔ امام جلال الدین سیوطی نے اس حدیث سے اپنا رسالہ شروع کرنے کے بعد صحابہ کرام ﷺ اور پھر اولیاء اللہ کی کرامات کے واقعات ذکر کیے ہیں۔

اس حدیث سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، سوائے اس آدمی کے جو کہے کہ میں حدیث کو ہی نہیں مانتا، حضور نبی اکرم ﷺ کے فرمان کو ہی نہیں مانتا میں تو صرف اپنی عقل کی بات مانتا ہوں۔ جو شخص قرآن و حدیث کو مانتا ہو، اس سے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یاد رہے کہ یہ متفق علیہ حدیث ہے۔ بطور حوالہ کوئی کم زور سند کی ضعیف حدیث پیش نہیں کی جا رہی۔

تمام ائمہ حدیث خواہ حافظ ابن حجر عسقلانی ہوں، امام قسطلانی ہوں، امام عینی ہوں اور

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، باب من رأی النبی ﷺ فی المنام، ۶: ۲۵۶۷، رقم: ۶۵۹۲

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الرؤیا، باب قول النبي ﷺ: من رآني في المنام فقد رآني، ۴: ۱۷۷۵، رقم، (۱۱) ۲۲۶۶

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۳۰۶، رقم: ۲۲۶۵۹

۴۔ أبو داود، السنن، کتاب الأدب، باب ما جاء في الرؤیا، ۴: ۳۰۵، رقم: ۵۰۲۳

تمام شارحینِ حدیث نے اس حدیث فَسَيَرَانِيْ فِي الْيَقْظَة پر دو قول بیان کئے ہیں۔ امام جلال الدین سیوطی اس رسالہ میں دونوں اقوال بیان کرتے ہیں:

بعض نے یہ کہا ہے کہ کہیں اس کا معنیٰ یہ نہ ہو کہ فَسَيَرَانِي فِي الْقِيَامَةِ کہ قیامت میں مجھے دیکھے گا۔ عنقریب یعنی بیداری میں دیکھنے سے مراد قیامت کی طرف اشارہ تو نہیں۔

امام سیوطی اس امکان کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر بات قیامت کے دن ہی دیکھنے کی ہے تو روزِ محشر تو ہر کوئی دیکھے گا، خواہ اُس نے اپنی زندگی میں خواب کے دوران حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت کی ہوگی یا نہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ سامنے ہوں گے اور شفاعت فرمائیں گے۔ قیامت کے دن تو ہر ایک نے دیکھنا ہے مگر یہاں تو آپ ﷺ تخصیص فرما رہے ہیں کہ 'جو خواب میں میری زیارت کرے گا وہ عنقریب بیداری کے عالم میں بھی مجھے دیکھے گا'۔

امام سیوطی اس قول کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بِأَنَّهُ لَا فَائِدَةُ هٰذَا التَّخْصِيْصِ.

پھر اس تخصیص کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔

ان کے اس قول کو محدثین، علماء اور ائمہ کی اکثریت نے قبول کیا ہے:

هُوَ عَلٰى ظَاهِرِهٖ.

اِس حدیث کا اِطلاق ظاہری معنی پر ہوگا۔

یعنی اس حدیث کے معنیٰ کو تبدیل نہ کیا جائے اور نہ ہی کچھ اور تاویل کی جائے، بلکہ اس حدیث کے معنیٰ کو اِس کے ظاہر پر محمول کیا جائے۔ حضور نبی اکرم ﷺ جو بات فرما رہے ہیں بس اُسی کو من وعن تسلیم کیا جائے۔ اُس میں کوئی من گھڑت تاویلات نہ نکالی جائیں۔ ظاہر کا مطلب ہے:

فَلَا بُدَّ أَنْ يَرَاهُ فِي الْيَقَظَةِ.

اس کا معنیٰ ہی یہ ہے کہ وہ بیداری میں دیکھے گا۔

حدیث مبارکہ میں خواب کے مقابلہ میں بیداری کو بیان کیا گیا ہے اور لفظ 'عنقریب' فرمایا گیا۔ اس سے قیامت کی طرف تو اشارہ نہیں جا سکتا، نیز بیداری کا لفظ زندگی کے اندر دیکھنے کی طرف دلالت کرتا ہے۔

امام ابومحمد بن ابی جمرہ 'صحیح بخاری' کے اوپر اپنی تعلیقات میں فرماتے ہیں:

يَدُلُّ عَلٰى أَنَّهٗ مَنْ رَآهُ فِي النَّوْمِ فَسَيَرَاهُ فِي الْيَقَظَةِ.

یہ واضح دلالت ہے جو شخص حضور نبی اکرم ﷺ کی خواب میں زیارت کرے گا، وہ بیداری میں بھی آپ ﷺ کو دیکھے گا۔

بعد ازاں اس حدیث پر مختلف انداز سے بحث کی گئی ہے کہ یہ تو طے ہوگیا کہ خواب میں آپ ﷺ کی زیارت کرنے والا زندگی میں بھی آپ ﷺ کو دیکھے گا، بعد از ممات قیامت میں آپ ﷺ کو دیکھنا اس میں شامل نہیں کیونکہ وہ تو ہر ایک کے لیے عام ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہر شخص نیکو کار یا گناہ گار ہے، جس خوش قسمت کو حضور نبی اکرم ﷺ کی خواب میں زیارت ہوگئی تو کیا ہر زیارت کرنے والا بیداری کے عالم میں بھی آپ ﷺ کی زیارت کرے گا؟

بعض نے کہا ہے کہ کہیں اس سے یہ مراد تو نہیں ہے کہ ان میں سے جو نیک، صالح اور متقی لوگ ہیں، اگر انہوں نے خواب میں زیارت کی تو اُنہیں بیداری میں بھی دیدار ہوگا۔ اس پر امام جلال الدین سیوطی اور دیگر ائمہ، علماء اور محدثین نے کہا کہ اس میں تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ جب حضور نبی اکرم ﷺ نے فرما دیا کہ 'جس شخص نے خواب میں میری زیارت کی وہ بیداری میں میری زیارت کرے گا'۔ لہٰذا اس عموم پر نیک، صالح، متقی اور پرہیزگاروں کی شرط کیوں لگاتے ہیں؟ آپ ﷺ نے پوری اُمت میں ہر ایک کے لیے یہ فیض کھول دیا۔ لہٰذا وہ تخصیص بھی نہ رہی۔ اس میں کوئی تخصص نہیں ہے کہ کس وجہ سے یہ شرط اور اضافی قید لگائی جائے؟

قبر میں حضور ﷺ کی پہچان کا تعلق قلبی معرفت سے ہے یا ظاہری کشف سے؟

ہر وہ شخص جسے خواب میں حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت ہوگی اسے بیداری میں بھی آپ ﷺ کا دیدار ضرور ہوگا۔ اب وہ بحث کرتے ہیں کہ زیارت کس طرح ہوگی؟ فرمایا: زیارت ہر صورت ہوگی، مگر یہ الگ بات ہے کہ اسے اس زیارت کا شعور ہوگا یا نہیں؟ اس کے مرنے سے پہلے حضور نبی اکرم ﷺ اس کے سامنے جسدِ مثالی میں ظاہر ہوں گے اور اپنی زیارت کروائیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پہچان سکتا ہے یا نہیں، کیونکہ پہچان کا تعلق اس کی قلبی معرفت کے ساتھ ہے۔ جیسے قبر میں ہر کوئی آپ ﷺ کو نہیں پہچان پائے گا۔ وہی شخص حضور نبی اکرم ﷺ کو قبر میں پہچانے گا جو پہچاننے کے قابل ہے، جس نے زندگی میں اتباعِ رسول ﷺ کو مقصود بنایا ہوگا۔ آپ ﷺ کے اُسوہ اور سیرتِ طیبہ کی پیروی کی ہو گی۔ آپ ﷺ کے اوامر و نواہی کی روشنی میں اپنے شب و روز ترتیب دیے ہوں گے۔ جس نے زندگی میں آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کیا ہوگا، تقویٰ و پرہیزگاری اپنائی ہوگی، دین کی پیروی کی ہوگی اور اسے اپنی زندگی میں نافذ کیا ہوگا، اُس پر سے تمام پردے اٹھا دیے جائیں گے۔ زیارت تو ہر کوئی کر رہا ہوگا مگر صرف معرفت والا شخص ہی حضور ﷺ کو پہچانے گا۔ جس طرح قبر میں زیارت تو ہر ایک کو ہوگی مگر ہر کوئی حضور ﷺ کو پہچان نہیں سکے گا۔ کئی ایک کہہ دیں گے کہ میں انہیں پہچان نہیں سکتا، جبکہ ایمان والے کہیں گے: ہاں! میں انہیں پہچانتا ہوں یہ تو ہمارے آقا ﷺ ہیں۔ اس لیے فرمایا گیا:

فَسَيَرَانِي فِي الْيَقَظَةِ.[1]

خواب میں زیارت کرنے والا عنقریب بیداری میں میری زیارت کرے گا۔

بالکل یہی عالم ہو گا کہ زیارت ہو جائے گی مگر وہ افراد جن کے قلب و نظر پر غفلت

(۱) بخاری، الصحیح، باب من رأی النبی ﷺ فی المنام، ۶: ۲۵۶۷، رقم: ۶۵۹۲

کے پردے پڑے ہوئے ہیں ان کو خبر ہی نہیں ہوگی کہ یہ حضور ﷺ تھے۔ پہچان انہی کو ہوگی جو آنکھ والے ہوں گے۔ لہٰذا انکار کی دلیل تلاش کرنے کی بجائے ہمیں اس قابل بننا چاہیے کہ آپ ﷺ کی زیارت سے بھی شرف یاب ہوسکیں اور پہچان کی توفیق بھی حاصل کرسکیں۔

امام جلال الدین سیوطی نے اس پر علماء و محدثین کے واقعات بیان کرتے ہوئے تفصیلی بحث کی ہے اور کہا ہے کہ کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی یہ چیز نصیب ہوئی اور آپ ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض نے بیداری کے عالم میں بھی آپ ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے۔

۱۳۔ محمد بن عبد الوہاب نجدی (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ)

محمد بن عبد الوہاب نجدی اپنی کتاب 'الرسائل الشخصية' اور رسالہ 'کشف الشبهات' دونوں میں لکھتے ہیں:

وَأُقِرُّ بِكَرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ وَمَا لَهُمْ مِنَ الْمُكَاشَفَاتِ وَلَا يَجْحَدُ كَرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ إِلَّا أَهْلُ الْبِدْعَةِ وَالضَّلَالِ.

میں عقیدہ رکھتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ میں اولیاء کی کرامات کو مانتا ہوں اور اُن کے مکاشفات کو مانتا ہوں۔ اولیاء اللہ کی کرامات اور اُن کے مکاشفات کا انکار صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو بدعتی اور گم راہ ہیں۔

یہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا عقیدہ ہے کہ اہلِ بدعت اور اہل ضلال ہی اولیاء کی کرامات اور مکاشفات کا انکار کر سکتے ہیں۔ وہ قرآن مجید کی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر جو الہام ہوا اُس کے تحت لکھتے ہیں:

وَفِيهِ إِثْبَاتُ كَرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ. (۱)

(۱) ۱۔ محمد بن عبد الوهاب، الرسائل الشخصية:۳
۲۔ محمد بن عبد الوهاب، كشف الشبهات، ۱:۱۶۹

اس میں اولیاء اللہ کی کرامات کا ثبوت ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ جب قرآن مجید سے اُس کا اثبات ہوگیا تو پھر کسی بھی زمانے میں اُس کا انکار ممکن نہیں رہتا۔

۱۴۔ علامہ شوکانی (۱۱۷۳-۱۲۵۰ھ)

علامہ شوکانی تحریر کرتے ہیں:

وَلَيْسَ لِمُنْكِرٍ أَنْ يُنْكِرَ عَلٰى أَوْلِيَاءِ اللهِ مَا يَقَعُ مِنْهُمْ مِنَ الْمُكَاشَفَاتِ الصَّادِقَةِ الْمُوَافِقَةِ فَهٰذَا بَابٌ قَدْ فَتَحَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ.

کسی منکر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اولیاء اللہ کے مکاشفاتِ صحیحہ صادقہ کا انکار کرے۔ یہ دروازہ رسول اللہ ﷺ نے خود کھولا ہے۔

پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں صحیحین سے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

قَدْ كَانَ فِي الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ مُحَدَّثُوْنَ، فَإِنْ يَكُنْ فِي أُمَّتِي أَحَدٌ مِنْهُمْ فَعُمَرُ مِنْهُمْ. (۱)

پہلے بھی امتوں میں محدثین تھے (جن سے مخاطبہ ہوتا تھا، پردے اٹھائے جاتے تھے اور ان کی زبان پر ملاء اعلیٰ کا کلام اور ملائکہ کا کلام جاری ہوتا)۔ فرمایا: اگر میری اُمت میں ایک شخص بھی ایسا ہوا تو عمر رضی اللہ عنہ ضرور ہوگا۔

ملا علی قاری 'مرقاۃ المفاتیح' میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یہ کلام موردِ نفی میں نہیں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے علاوہ امت میں سے کوئی نہیں ہوگا، بلکہ مورد تاکید میں ہے کہ قیامت کے دن تک ہر زمانے میں ایسے اولیاء

(۱) شوکانی، حدیث الولی: ۲۳۴-۲۳۵

ہوں گے جنہیں کشف ہوں گے اور علومِ لدنی اُن کی زبانوں سے جاری ہوں گے۔[1]

۱۵۔ علامہ آلوسی (م۱۲۷۰ھ)

علامہ آلوسی 'تفسیر روح المعانی' میں حضرت سری سقطی، حضرت جنید بغدادی اور دیگر کا قول روایت کرتے ہیں کہ علم لدنی اسرار و رموز اور مخفی حقیقتوں پر مطلع ہونے کا نام ہے۔ علم کشف یا مخفی حقائق و معارف کا ادراک اگر جسمانی، ظاہری اور مادی ذریعے کے بغیر حاصل ہو جائے تو یہ علمِ لدنی یا علم الاسرار کہلاتا ہے۔ مغیبات کا یہ علم اُسی وقت حاصل ہوتا ہے جب بندہ اپنے جسم کو اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر کی اطاعت پر لگا دیتا ہے اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، ان سے مکمل طور پر رُک جاتا ہے۔ اُس کا جسم اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کا پیکر بن جاتا ہے اور اُس کے ارادے و افکار ربِ دو جہاں کی اطاعت کے تابع ہو جاتے ہیں۔[2]

الغرض بتدریج جسم سے لے کر دماغ تک، ذہن سے لے کر نفس تک، نفس سے لے کر قلب (دل) تک اور قلب سے لے کر روح تک اُس کے تمام لطائف اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اتباع کے پیکر بن جاتے ہیں اور پھر اس پر مستزاد وہ مزید ریاضات اور مجاہدات کرتا ہے۔ یوں اُس کی روح اور نفس لطیف ہونے لگتا ہے۔ جوں جوں نفس کی کثافت ختم ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے پردے بھی اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ مقامِ مکاشفہ اور مقامِ مشاہدہ تک یہی وہ مقامات ہیں، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے خواص کو اسرار و غوامض اور مخفی حقائق پر آگاہی عطا فرماتا ہے۔

ایسے ہزارہا حوالے موجود ہیں جن کے ساتھ ائمہ، علماء، محدثین، فقہاء، اصولیین اور متکلمین کی کتب بھری پڑی ہیں۔ کشف اور علمِ لدنی کے حوالے سے یہ وہ عقیدہ اور تصور ہے کہ جس کا تیرہ سو سال سے علماء کے کسی مکتب فکر اور محدثین نے انکار نہیں کیا۔ آج اگر ہمارے

(۱) ملا علی القاری، مرقاۃ المفاتیح، ۱۱:۱۷۹
(۲) آلوسی، روح المعانی، ۱۶:۱۹

ذہنوں میں انکار در آئے تو اس کا سبب نفسانی اور شیطانی حملے کے سوا بھلا اور کیا ہو سکتا ہے؟ چونکہ اُمت کا چودہ سو سال سے تسلسل اور اجماع کے ساتھ جو عقیدہ رہا ہے اگر اُس سے انکار کریں گے تو پھر ہم قرآن سے اِکتساب فیض کر سکتے ہیں اور نہ ہی احادیث نبویہ سے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے قرآن مجید کی آیات کے اور احادیثِ نبوی کے معانی سمجھانے والے یہی امام تھے، انہی ائمہ کی کتب کے فیض سے علم کی شمعیں شرق تا غرب روشن ہوئی ہیں۔

۱۶۔ حاصلِ کلام

تحصیلِ علم کے لیے محنت و مشقت اور ریاضت و مجاہدہ ناگزیر ہے۔ علم جتنا زیادہ معیاری ہو وہ اُتنی ہی زیادہ سعی و کاوش کا تقاضا کرتا ہے، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حصولِ علم کے ذرائع کی ترقی کے ساتھ انسانوں میں کم کوشی اور سہل پسندی کا عنصر غالب آتا چلا گیا۔ اگر عصر حاضر کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ سائنس کی ہوش ربا ترقی نے انسان کو نقطۂ کمال پر پہنچا دیا ہے، لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ انسان کی سہل پسندی بھی انتہا پر نظر آتی ہے۔

زمانے کے تغیرات اس امر کے متقاضی ہیں کہ معاشرے میں علمی شغف کو فروغ دینے کے لیے نسل نو کو جھنجوڑتے ہوئے علمی انقلاب بپا کیا جائے۔ نئی نسل بلاشبہ صلاحیتوں میں کسی سے پیچھے نہیں ہے، مگر ان میں اپنے آباء اور اکابرین کے علمی ورثہ کو متعارف کروا کر جستجو اور اشتیاق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ یاد رہے کہ آنے والا کل، تصور سے زیادہ بھیانک ہوگا۔ دوسری اہم بات یہ کہ مادی ترقی کے ساتھ جیسے ظاہری علم کی طرف رجحان کم ہوا ہے ویسے ہی روحانی اقدار بھی رو بہ تنزل ہیں۔ حالات کی نزاکت ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ نسلِ نو کو اسلام کے حقیقی پیغام سے روشناس کراتے ہوئے انہیں علم کی حقیقی ماہیت، فضیلت اور ضرورت سے متعارف کرایا جائے۔ علمی حوالے سے مغربی نظریات کے بجائے اسلام کے آفاقی اور اٹل نظریات کی نورانی کرنوں سے ان کے قلوب و اذہان کو منور کیا جائے تاکہ مادہ پرستی کا خاتمہ ہو اور اسلام کی حقیقی روح ان پر آشکار ہو جائے۔ ان مقاصد حسنہ کی تکمیل میں موجودہ تصنیف ایک کاوش ہے۔ جو ایک طرف علم کے تمام گوشوں پر جامع انداز سے روشنی ڈالتی دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف اسلامی

روحانی اقدار اور مذہبی اصلاحات کا تعارف بھی احسن انداز سے کراتی نظر آتی ہے۔

اس دورِ پرفتن میں مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی وجہ علم کی دولت سے محرومی ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس دین نے ہر مسلمان مرد و عورت کے لیے علم حاصل کرنے کو لازمی فریضہ قرار دیا ہو اور تمام مسائل کا حل ام الکتاب کی صورت میں اس کے پیروکاروں کے پاس موجود ہو، پھر بھی وہ دنیا میں محکوم و مظلوم اور مفلس و بے حال قوم کے حوالے سے جانی جاتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کا بارہ سو سالہ عروج، ترقی و کمال اور وقار کا راز علم سے منسلک تھا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ علم کے رجحان کو فروغ دے کر امتِ محمدیہ میں علمی انقلاب برپا کر کے اسے پھر سے دنیا کی ایک خودمختار، باوقار اور جاہ و حشمت والی امت تسلیم کرایا جائے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب ہمیں علم کی حقیقی آگاہی حاصل ہو اور ہم اس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اس کا حق ادا کریں۔

دعا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ اس کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازتے ہوئے ہر دلِ مسلم میں حقیقی علم کی آشنائی عطا فرمائے اور اس کے تقاضوں پر عمل کر کے امتِ اسلامیہ کو پھر بامِ عروج تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مصادر و مراجع

١۔ القرآن الکریم

٢۔ آجری، ابوبکر محمد بن حسین بن عبداللہ (م ٣٦٠ھ)۔ **الشریعة**۔ ریاض، السعودیہ: دار الوطن، ١٤٢٠ھ/١٩٩٩ء۔

٣۔ آلوسی، امام شہاب الدین سید محمود بن عبد اللہ حسینی البغدادی (١٢١٧-١٢٧٠ھ/ ١٨٠٢-١٨٥٤ء)۔ **روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني**۔ بیروت، لبنان: دار إحیاء التراث العربی۔

٤۔ آلوسی، امام شہاب الدین سید محمود بن عبد اللہ حسینی البغدادی (١٢١٧-١٢٧٠ھ/ ١٨٠٢-١٨٥٤ء)۔ **روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني**۔ ملتان، پاکستان: مکتبہ امدادیہ۔

٥۔ آمدی، ابو الحسن سید الدین علی بن ابی علی بن محمد بن سالم (م ٦٣١ھ)۔ **غاية المرام في علم الكلام**۔ قاہرہ، مصر: المجلس الاعلی للشؤون الاسلامیہ۔

٦۔ ابن اثیر، ابو السعادات مبارک بن محمد بن محمد بن عبد الکریم بن عبدالواحد شیبانی (٥٥٥-٦٣٠ھ/ ١١٦٠-١٢٣٣ء)۔ **أسد الغابة في معرفة الصحابة**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

٧۔ ابن اثیر، ابو السعادات مبارک بن محمد بن محمد بن عبد الکریم بن عبدالواحد شیبانی (٥٥٥-٦٣٠ھ/ ١١٦٠-١٢٣٣ء)۔ **النهاية في غريب الحديث والأثر**۔ بیروت، لبنان: المکتبہ العلمیہ، ١٣٩٩ھ/١٩٧٩ء۔

۸۔ احمد بن حنبل، ابو عبد اللہ بن محمد (۱۶۴-۲۴۱ھ/ ۷۸۰-۸۵۵ء)۔ **الزھد**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیۃ، ۱۳۹۸ء۔

۹۔ احمد بن حنبل، ابو عبد اللہ بن محمد (۱۶۴-۲۴۱ھ/ ۷۸۰-۸۵۵ء)۔ **فضائل الصحابۃ**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔

۱۰۔ احمد بن حنبل، ابو عبد اللہ شیبانی (۱۶۴-۲۴۱ھ/ ۷۸۰-۸۵۵ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی للطباعۃ والنشر، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۸۷ء۔

۱۱۔ ازہری، ابو منصور محمد بن احمد (۲۸۲-۳۷۰ھ)۔ **تھذیب اللغۃ**۔ بیروت، لبنان: المکتبہ العلمیہ، ۲۰۰۱ء۔

۱۲۔ ابن اسحاق، محمد بن اسحاق بن یسار، (۸۵-۱۵۱ھ)۔ **السیرۃ النبویۃ**۔ معھد الدراسات والابحاث للتعریب۔

۱۳۔ اسماعیل حقی، اسماعیل حقی بن مصطفیٰ بن استانبولی حنفی خلوتی (۱۰۶۳-۱۱۲۷ھ/ ۱۶۵۲-۱۷۱۵ء)۔ **تفسیر روح البیان**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۲۰۱۰ء۔

۱۴۔ اسماعیل حقی، اسماعیل حقی بن مصطفیٰ بن استانبولی حنفی خلوتی (۱۰۶۳-۱۱۲۷ھ/ ۱۶۵۲-۱۷۱۵ء)۔ **تفسیر روح البیان**۔ کوئٹہ، پاکستان: مکتبہ اسلامیہ، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔

۱۵۔ اسماعیلی، ابوبکر احمد بن ابراھیم بن اسماعیل (۲۷۷-۳۷۱ھ)۔ **معجم الشیوخ/المعجم في أسامي شیوخ أبي بکر الإسماعیلي**۔ مدینہ منورہ، السعودیہ: مکتبۃ العلوم والحکم، ۱۴۱۰ھ۔

۱۶۔ اَشبیلی، عبد الحق بن عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن الحسین الازدی (م ۵۸۱ھ)۔ **العاقبۃ في ذکر الموت**۔ الکویت: مکتبہ دار الاقصیٰ، ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء۔

۱۷۔ اَصفونی،ابو الفضل محمد بن محمد بن محمد تقی الدین ابن فہد الہاشمی (م ۸۷۱ھ)۔ **لحظ الألحاظ بذيل طبقات الحفاظ**۔ دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء۔

۱۸۔ اَوشی، سراج الدین علی بن عثمان (م ۵۷۵ھ)۔ **جامع اللآلي شرح بدء الأمالي في علم العقائد**۔ بیروت، لبنان: شرکۃ دار البشائر الاسلامیہ، ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء۔

۱۹۔ باجوری، الشیخ ابراہیم بن محمد (م ۱۲۷۶ھ)۔ **فتح المجيد في بيان تحفة المريد على جوهرة التوحيد**۔ مکتبہ دار البیروتی، ۲۰۰۲ء۔

۲۰۔ باقلانی،ابو بکر محمد بن طیب (۳۳۸-۴۰۳ھ)۔ **الإنصاف فيما يجب اعتقاده ولا يجوز الجهل به**۔ قاہرہ،مصر: المکتبۃ الازہریہ للتراث۔

۲۱۔ بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۴-۲۵۶ھ/ ۸۱۰-۸۷۰ء)۔ **الأدب المفرد**۔ بیروت، لبنان: دار البشائر الاسلامیہ، ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء۔

۲۲۔ بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۴-۲۵۶ھ/ ۸۱۰-۸۷۰ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: دار ابن کثیر، الیمامہ، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء۔

۲۳۔ بزار، ابو بکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق بصری (۲۱۵-۲۹۲ھ/ ۸۳۰-۹۰۵ء)۔ **المسند (البحر الزخار)**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ علوم القرآن، ۱۴۰۹ھ۔

۲۴۔ بغوی، ابو محمد حسین بن مسعود بن محمد (م ۵۱۰ھ)۔ **معالم التنزيل في تفسير القرآن**. بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء۔

۲۵۔ بیضاوی، ناصر الدین، ابو الخیر عبداللہ بن عمر بن محمد شیرازی (م ۷۹۱ھ)۔ **أنوار التنزيل وأسرار التأويل**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۸ھ۔

۲۶۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **الاعتقاد**. بیروت، لبنان: دارالآفاق الجدیدۃ، ۱۴۰۱ھ۔

۲۷۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **الدعوات الکبیر**۔ الکویت: منشورات مرکز المخطوطات، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳ء۔

۲۸۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **دلائل النبوۃ**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ھ۔

۲۹۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **کتاب الزھد الکبیر**۔ مکہ مکرمہ، السعودیہ: مکتبہ دار الباز، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۴ء۔

۳۰۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **شعب الإیمان**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء۔

۳۱۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **السنن الصغری**۔ مدینہ منورہ، السعودیہ: مکتبۃ الدار، ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۸۹ء۔

۳۲۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **السنن الصغری**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء۔

۳۳۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/

۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **السنن الکبری**۔ مکہ مکرمہ، السودیہ: مکتبہ دار الباز، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء۔

۳۴۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **فضائل الأوقات**۔ مکہ مکرمہ، سعودی عرب: مکتبۃ المنارۃ، ۱۴۱۰ھ۔

۳۵۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **المدخل اِلی السنن الکبری**۔ کویت: دار الخلفاء للکتاب الاسلامی، ۱۴۰۴ھ۔

۳۶۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **معرفۃ السنن والآثار**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۳۷۔ ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام حرانی (۶۶۱-۷۲۸ھ/ ۱۲۶۳-۱۳۲۸ء)۔ **الاستقامۃ**۔ المدینہ المنورہ، السعودیہ: جامعہ الامام محمد بن سعود، ۱۴۰۳۔

۳۸۔ ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام حرانی (۶۶۱-۷۲۸ھ/ ۱۲۶۳-۱۳۲۸ء)۔ **العقیدۃ الواسطیۃ**۔ الریاض، السعودیہ: الرئاسۃ السامۃ لإدارات البحوث والإفتاء، ۱۴۱۲ھ۔

۳۹۔ ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام حرانی (۶۶۱-۷۲۸ھ/ ۱۲۶۳-۱۳۲۸ء)۔ **مجموع الفتاوی**۔ مکتبہ ابن تیمیہ۔

۴۰۔ ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام حرانی (۶۶۱-۷۲۸ھ/ ۱۲۶۳-۱۳۲۸ء)۔ **منہاج السنۃ النبویۃ**۔ مؤسسہ قرطبہ۔

٤١۔ ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام حرانی (٦٦١-٧٢٨ھ/ ١٢٦٣-١٣٢٨ء)۔ **النبوات**۔ قاہرہ، مصر: المطبعۃ السّلفیہ، ١٣٨٦ھ۔

٤٢۔ ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک (٢٠٩-٢٧٩ھ/ ٨٢٥-٨٩٢ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار إحیاء التراث العربی۔

٤٣۔ ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک (٢٠٩-٢٧٩ھ/ ٨٢٥-٨٩٢ء)۔ **الشمائل المحمدیۃ**۔ بیروت، لبنان: مؤسسہ الکتب الثقافہ، ١٤١٢ھ۔

٤٤۔ ثعالبی ابو زید عبد الرحمٰن بن محمد بن مخلوف (م ٨٧٥ھ)۔ **الجواهر الحسان في تفسير القرآن**۔ بیروت، لبنان: دار إحیاء التراث العربی، ١٤١٨ھ۔

٤٥۔ **جامع المتون: الأصول الثلاثة وأدلتها للإمام محمد بن عبد الوهاب، الأربعون اللنووية للإمام النووي، العقيدة الطحاوية للإمام أبو جعفر الطحاوي، عمدة الأحكام للمقدسي**۔ جمعیۃ إحیاء التراث الاسلامی۔

٤٦۔ جرجانی، علی بن محمد بن علی، سید شریف (٧٤٠-٨١٦ھ)۔ **التعریفات**۔ کراچی، پاکستان: مکتبہ حمادیہ، ١٤٠٣ھ/ ١٩٨٣ء۔

٤٧۔ ابن جعد، ابو الحسن علی بن جعد بن عبید ہاشمی (١٣٣-٢٣٠ھ/ ٧٥٠-٨٤٥ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: مؤسسہ نادر، ١٤١٠ھ/ ١٩٩٠ء۔

٤٨۔ ابن جوزی، ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن عبید اللہ (٥١٠-٥٩٧ھ/ ١١١٦-١٢٠١ء)۔ **التبصرۃ**۔ مصر، لبنان: دار الکتاب المصری، ١٣٩٠ھ/ ١٩٧٠ء۔

٤٩۔ ابن جوزی، ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن عبید اللہ (٥١٠-٥٩٧ھ/

١١١٦-١٢٠١ء)۔ **التحقيق في أحاديث الخلاف**۔ بيروت، لبنان: دار الكتب العلميه، ١٤١٥ھ/١٩٩٥ء۔

٥٠۔ ابن جوزی، ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن عبید اللہ (٥١٠-٥٩٧ھ/ ١١١٦-١٢٠١ء)۔ **تنوير الغبش في فضل السودان والحبش**۔ الرياض، السعودیہ: دار الشریف، ١٤١٩ھ/١٩٩٨ء۔

٥١۔ ابن جوزی، ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن عبید اللہ (٥١٠-٥٩٧ھ/ ١١١٦-١٢٠١ء)۔ **زاد المسير في علم التفسير**. بيروت، لبنان: المكتب الاسلامی، ١٤٠٤ھ/١٩٨٤ء۔

٥٢۔ ابن جوزی، ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن عبید اللہ (٥١٠-٥٩٧ھ/ ١١١٦-١٢٠١ء)۔ **صفة الصفوة**۔ بيروت، لبنان: دارالكتب العلميه، ١٤٠٩ھ/ ١٩٨٩ء۔

٥٣۔ ابن جوزی، ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن عبید اللہ (٥١٠-٥٩٧ھ/ ١١١٦-١٢٠١ء)۔ **المنتظم في تاريخ الملوک والأمم**۔ بيروت، لبنان: دار صادر، ١٣٥٨ھ۔

٥٤۔ ابن ابی حاتم، عبد الرحمٰن بن ابی حاتم محمد بن ادریس ابو محمد الرازی تمیمی (٢٤٠-٣٢٧ھ/ ٨٥٤-٩٣٨ء)۔ **تفسير القرآن العظيم**۔ سعودی عرب: مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، ١٤١٩ھ/١٩٩٩ء۔

٥٥۔ ابن الحاج، ابوعبداللہ محمد بن محمد بن محمد عبدری فاسی مالکی (م ٧٣٧ھ)۔ **المدخل**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ١٤٠١ھ/ ١٩٨١ء۔

٥٦۔ حارث، الحارث بن أبی أسامۃ/ الحافظ نور الدین الہیثمی (١٨٦-٢٨٣ھ)۔ **مسند**

الحارث (زوائد الهيثمی)۔ المدینہ المنورۃ، السعودیہ: مرکز خدمۃ السنہ والسیرۃ النبویہ، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء۔

۵۷۔ حاکم، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن محمد (۳۲۱-۴۰۵ھ/۹۳۳-۱۰۱۴ء)۔ **المستدرک علی الصحیحین**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء۔

۵۸۔ حکیم ترمذی، ابوعبد اللہ محمد بن علی بن حسن بن بشیر (م ۳۲۰ھ)۔ **نوادر الأصول في أحاديث الرسول**۔ بیروت، لبنان: دار الجیل، ۱۹۹۲ء۔

۵۹۔ ابن حبان، ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان التمیمی البستی (۲۷۰-۳۵۴ھ/ ۸۸۴-۹۶۵ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳ء۔

۶۰۔ ابن حجر عسقلانی ،احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳-۸۵۲ھ/ ۱۳۷۲-۱۴۴۹ء)۔ **الإصابة في تمييز الصحابة**۔ بیروت، لبنان: دار الجیل، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء۔

۶۱۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳-۸۵۲ھ/ ۱۳۷۲-۱۴۴۹ء)۔ **تلخیص الحبیر فی أحادیث الرافعی الکبیر**۔ مدینہ منورہ، سعودی عرب، ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء۔

۶۲۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳-۸۵۲ھ/ ۱۳۷۲-۱۴۴۹ء)۔ **فتح الباري**۔ لاہور، پاکستان: دار نشر الکتب الاسلامیہ، ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء۔

۶۳۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳-۸۵۲ھ/

۱۳۷۲-۱۴۴۹ء)۔ **لسان الميزان**۔ بیروت، لبنان، مؤسسۃ الأعلمی المطبوعات ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء۔

٦٤۔ حسام الدین ہندی، علاء الدین علی متقی (م ۹۷۵ھ)۔ **کنز العمال**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء۔

٦٥۔ حسان بن ثابت ﷺ، ابن منذر خزرجی (م ۵۴ھ/۶۷۴ء)۔ **دیوان**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء۔

٦٦۔ حمیدی، محمد بن فتوح (م ۴۸۸ھ)۔ **الجمع بين الصحيحين**۔ بیروت، لبنان: دار ابن حزم، ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء۔

٦٧۔ حمیدی، ابو بکر عبداللہ بن زبیر (۲۱۹ھ/۸۳۴ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ + قاہرہ، مصر: مکتبۃ المتنبی۔

٦٨۔ حلبی، علی بن برہان الدین (م ۱۰۴۴ھ)۔ **إنسان العيون في سيرة الأمين المأمون. الشهير بـ"السيرة الحلبية"**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۴۰۰ھ۔

٦٩۔ حلبی، علی بن برہان الدین (م ۱۰۴۴ھ)۔ **إنسان العيون في سيرة الأمين المأمون. الشهير بـ"السيرة الحلبية"**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۷ھ۔

۷۰۔ حموی، ابو عبداللہ یاقوت بن عبداللہ (م ۶۲۶ھ)۔ **معجم البلدان**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر۔

۷۱۔ ابو حنیفہ، امام اعظم نعمان بن ثابت (۸۰-۱۵۰ھ)۔ **العالم والمتعلّم**. قاہرہ، مصر: المکتبۃ الازہریہ للتراث، ۱۳۶۸ھ۔

۷۲۔ خرکوشی، ابو سعد عبد الملک بن ابی عثمان محمد بن ابراہیم (م۴۰۶ھ)۔ **شرف المصطفٰی**۔ مکہ مکرمہ، السعودیہ: دار البشائر الاسلامیہ، ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء۔

۷۳۔ ابن خزیمہ، ابو بکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ سلمی نیشاپوری، (۲۲۳-۳۱۱ھ/ ۸۳۸-۹۲۴ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰ء۔

۷۴۔ خطیب بغدادی، ابو بکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بن ثابت (۳۹۲-۴۶۳ھ/۱۰۰۲-۱۰۷۱ء)۔ **تاریخ بغداد**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۷۵۔ خطیب بغدادی، ابو بکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بن ثابت (۳۹۲-۴۶۳ھ/۱۰۰۲-۱۰۷۱ء)۔ **الرحلة في طلب الحديث**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۹۵ھ۔

۷۶۔ خطیب بغدادی، ابو بکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بن ثابت (۳۹۲-۴۶۳ھ/۱۰۰۲-۱۰۷۱ء)۔ **الفقيه والمتفقه**۔ السعودیہ: دار ابن الجوزی، ۱۴۱۲ھ۔

۷۷۔ خطیب بغدادی، ابوبکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بن ثابت (۳۹۲-۴۶۳ھ/۱۰۰۲-۱۰۷۱ء)۔ **موضح أوهام الجمع والتفريق**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۴۰۷ھ۔

۷۸۔ خطیب تبریزی، ولی الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ (م ۷۴۱ھ)۔ **مشكوة المصابيح**۔ بیروت، لبنان، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء۔

۷۹۔ خوارزمی، ابو المؤید محمد بن محمد (م ۶۶۵ھ)۔ **جامع المسانيد**۔ بیروت، لبنان، دار

الکتب العلمیۃ، ۲۰۱۱ء۔

۸۰۔ دارقطنی، ابوالحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن نعمان (۳۰۶-۳۸۵ھ/ ۹۱۸-۹۹۵ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء۔

۸۱۔ دارمی، ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن (۱۸۱-۲۵۵ھ/۷۹۷-۸۶۹ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ۔

۸۲۔ ابن ابی الدنیا، ابوبکر عبد اللہ بن محمد بن عبید بن بن سفیان قیس قرشی (۲۰۸-۲۸۱ھ)۔ **العیال**۔ السعودیہ: دار ابن القیم، ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء۔

۸۳۔ ابن ابی الدنیا، ابوبکر عبد اللہ بن محمد بن عبید بن بن سفیان قیس قرشی (۲۰۸-۲۸۱ھ)۔ **مکارم الأخلاق**۔ قاہرہ، مصر: مکتبۃ القرآن، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء۔

۸۴۔ ابن ابی الدنیا، ابوبکر عبد اللہ بن محمد القرشی (۲۰۸-۲۸۱ھ)۔ **من عاش بعد الموت**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ، ۱۴۱۳ھ۔

۸۵۔ دولابی، ابو بشر محمد بن احمد بن حماد (۲۲۴ھ-۳۱۰ھ)۔ **الذریۃ الطاھرۃ النبویۃ**۔ الکویت: (۱۴۰۷ھ/۱۹۸۶ء)

۸۶۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد ازدی سجستانی (۲۰۲-۲۷۵ھ/۸۱۷-۸۸۹ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۴ء

۸۷۔ دیلمی، ابو شجاع شیرویہ بن شہردار بن شیرویہ الدیلمی الھمذانی (۴۴۵-۵۰۹ھ/ ۱۰۵۳-۱۱۱۵ء)۔ **الفردوس بمأثور الخطاب**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء۔

۸۸۔ ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (۶۷۳-۷۴۸ھ/ ۱۲۷۴-۱۳۴۸ء)۔ **تاریخ الإسلام ووفیات المشاهیر والأعلام**۔ بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء۔

۸۹۔ ذہبی، ابو عبد اللہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (۶۷۳-۷۴۸ھ/ ۱۲۷۴-۱۳۴۸ء)۔ **تذکرة الحفاظ**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۹۰۔ ذہبی، ابو عبد اللہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (۶۷۳-۷۴۸ھ/ ۱۲۷۴-۱۳۴۸ء)۔ **سیر أعلام النبلاء**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء۔

۹۱۔ ذہبی، ابو عبد اللہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (۶۷۳-۷۴۸ھ/ ۱۲۷۴-۱۳۴۸ء)۔ **میزان الاعتدال في نقد الرجال**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۵ء۔

۹۲۔ رازی، فخر الدین محمد بن عمر بن حسن بن حسین بن علی تمیمی شافعی، (۵۴۴-۶۰۴ھ)۔ **مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۱ھ۔

۹۳۔ راغب اصفہانی، ابو قاسم حسین بن محمد (م ۵۰۲ھ/ ۱۱۰۸ء)۔ **المفردات في غریب القرآن**۔ دمشق، شام: دار القلم + بیروت، لبنان: الدار الشامیہ، ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء۔

۹۴۔ ابن راھویہ، ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم بن مخلد بن إبراہیم بن عبد اللہ (۱۶۱-۲۳۷ھ/ ۷۷۸-۸۵۱ء)۔ **المسند**۔ مدینہ منورہ، سعودی عرب: مکتبۃ الایمان، ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۱ء۔

۹۵۔ رویانی، ابو بکر محمد بن ہارون (م ۳۰۷ھ)۔ **المسند**۔ قاہرہ، مصر: مؤسسہ قرطبہ، ۱٤۱٦ھ۔

۹٦۔ زرکشی، ابوعبد اللہ بدرالدین محمد بن عبد اللہ بہادر (م ۷۹٤ھ)۔**البحر المحيط في أصول الفقه**۔ دارالکتبی، ۱٤۱٤ھ/ ۱۹۹٤ء۔

۹۷۔ زرقانی، ابوعبد اللہ محمد بن عبد الباقی بن یوسف بن احمد بن علوان مصری ازہری مالکی (۱۰۵۵-۱۱۲۲ھ/ ۱٦٤۵-۱۷۱۰ء)۔ **شرح المواهب اللدنية بالمنح المحمدية**۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱٤۱۷ھ/ ۱۹۹٦ء۔

۹۸۔ زمخشری، جاراللہ محمد بن عمر بن محمد خوارزمی (۴۲۷-۵۳۸ھ)۔ **الكشاف عن حقائق التنزيل وعيون الأقاويل في وجوه التأويل**۔ بیروت، لبنان: دارالکتاب العربی۔

۹۹۔ زمخشری، جاراللہ محمد بن عمر بن محمد خوارزمی (۴۲۷-۵۳۸ھ)۔ **الكشاف عن حقائق التنزيل وعيون الأقاويل في وجوه التأويل**۔ قاہرہ، مصر: ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء۔

۱۰۰۔ زیلعی، ابو محمد عبداللہ بن یوسف حنفی (م ۷٦۲ھ)۔ **تخريج الأحاديث والآثار**۔ الریاض، السعودیہ: دار ابن خزیمہ، ۱٤۱٤ھ۔

۱۰۱۔ زیلعی، ابو محمد عبداللہ بن یوسف حنفی (م ۷٦۲ھ)۔ **نصب الراية لأحاديث الهداية**۔ مصر: دارالحدیث، ۱۳۵۷ھ۔

۱۰۲۔ سبکی، تاج الدین بن علی بن عبد الکافی (۷۲۷-۷۷۱ھ)۔ **طبقات الشافعية الكبرى**۔ ھجر للطباعۃ والنشر التوزیع، ۱٤۱۳ھ۔

۱۰۳۔ سخاوی، شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن (۸۳۱ھ/ ۹۰۲ء)۔ **اِستجلاب اِرتقاء**

الغرف بحب أقرباء الرسول ﷺ وذوِی الشرف۔ بیروت، لبنان: دارالمدینہ، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء۔

۱۰۴۔ ابن سعد، ابوعبد اللہ محمد (۱۶۸-۲۳۰ھ/ ۷۸۴-۸۴۵ء)۔ **الطبقات الکبری**۔ بیروت، لبنان: دار بیروت للطباعہ والنشر، ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء۔

۱۰۵۔ سلمی، ابو عبد الرحمٰن محمد بن الحسین بن موسیٰ ازدی (م ۴۱۲ھ)۔ **حقائق التفسیر**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء۔

۱۰۶۔ سُلَمی، ابو عبد الرحمٰن محمد بن حسین بن محمد الازدی نیشاپوری (۳۲۵-۴۱۲ھ/ ۹۳۶-۱۰۲۱ء)۔ **طبقات الصّوفیہ**۔ قاہرہ، مصر: مبطعۃ المدنی، ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء۔

۱۰۷۔ سمرقندی، ابو منصور محمد بن محمد بن محمود الماتریدی (۳۳۳ھ/۹۴۴ء)۔ **کتاب التوحید**۔ بیروت، لبنان: مکتبۃ دار صادر۔

۱۰۸۔ سمرقندی، ابو اللیث نصر بن محمد بن احمد ابن ابراہیم (م ۳۷۳ھ)۔ **تفسیر السمرقندي، المسمی بـ"بحر العلوم"**۔ بیروت، لبنان: الدار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء۔

۱۰۹۔ سمرقندی، ابو اللیث نصر بن محمد بن احمد ابن ابراہیم (م ۳۷۳ھ)۔ **تنبیہ الغافلین بأحادیث سید الأنبیاء والمرسلین**۔ دمشق، بیروت: دار ابن کثیر، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء۔

۱۱۰۔ سمعانی، أبو المظفر منصور بن محمد بن عبدالجبار (۴۲۶-۴۸۹ھ)۔ **التفسیر**۔ ریاض، السعودیہ: دار الوطن، ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء۔

۱۱۱۔ سنیکی، ابویحی زکریا بن محمد بن احمد بن زکریا الانصاری (۸۲۴-۹۲۶ھ)۔

الحدود الأنيفة والتعريفات الدقيقة۔ بیروت، لبنان: دار الفکر المعاصر، ۱۴۱۱ھ۔

۱۱۲۔ سیوطی، جلالالدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **تاریخ الخلفاء۔** بغداد، عراق: مکتبۃ الشرق الجدید۔

۱۱۳۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **التدریب الراوي۔** الریاض، السعودیہ: مکتبہ الریاض

۱۱۴۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **الجامع الصغیر فی احادیث البشیر النذیر۔** بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۱۱۵۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **الحاوی للفتاوی۔** مصر: مطبعۃ السعادۃ، ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۹ء۔

۱۱۶۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **الحاوی للفتاوی۔** لائلپور، پاکستان: مکتبہ نوریہ رضویہ۔

۱۱۷۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **الخصائص الکبری۔** بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء۔

۱۱۸۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **الخصائص الکبری**۔ فیصل آباد، پاکستان: مکتبہ نوریہ رضویہ۔

۱۱۹۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **الدر المنثور في التفسیر بالمأثور**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفۃ۔

۱۲۰۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **الرسائل التسع**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء العلوم، ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۸ء۔

۱۲۱۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **شرح السنن ابن ماجه**۔ کراچی، پاکستان: قدیمی کتب خانہ۔

۱۲۲۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **شرح السیوطی علی سنن النسائی**، حلب، شام: مکتب المطبوعات الإسلامیہ، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء۔

۱۲۳۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء۔

۱۲۴۔ شوکانی: محمد بن علی بن محمد الشوکانی (۱۱۷۳-۱۲۵۰ھ/۱۷۶۰-۱۸۳۴ء)۔ **إرشاد الفحول**۔ بیروت، لبنان: مطبع دار ابن کثیر، ۲۰۰۰ء۔

۱۲۵۔ شوکانی، محمد بن علی بن محمد (۱۱۷۳-۱۲۵۰ھ/ ۱۷۶۰-۱۸۳٤ء)۔ **فتح القدیر**۔مصر: مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی و اولادہ، ۱۳۸۳ھ/ ۱۹٦٤ء۔

۱۲٦۔ شوکانی، محمد بن علی بن محمد (۱۱۷۳-۱۲۵۰ھ/ ۱۷٦۰-۱۸۳٤ء)۔ **فتح القدیر**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱٤۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء۔

۱۲۷۔ شوکانی : محمد بن علی بن محمد الشوکانی (۱۱۷۳-۱۲۵۰ھ/ ۱۷٦۰-۱۸۳٤ء)۔ **ولایة الله والطریق إلیها، الشهیر بـ"قطر الولي علی حدیث الولي"** ۔قاہرہ ،مصر

۱۲۸۔ شہرزوی، ابوعمرو عثمان بن عبد الرحمٰن بن عثمان (۵۷۷-٦٤۳ھ)۔ **أدب المفتي والمستفي**۔ بیروت، لبنان: مکتبۃ العلوم والحکم، ۱٤۰۷ھ۔

۱۲۹۔ شہرزوی، ابوعمرو عثمان بن عبد الرحمٰن بن عثمان (۵۷۷-٦٤۳ھ)۔ **فتاوی ابن الصلاح**۔ بیروت، لبنان: مکتبۃ العلوم والحکم، ۱٤۰۷ھ۔

۱۳۰۔ ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ الکوفی (۱۵۹-۲۳۵ھ/ ۷۷٦-۸٤۹ء)۔ **المصنف**۔ ریاض،سعودی عرب: مکتبۃ الرشد، ۱٤۰۹ھ۔

۱۳۱۔ طبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی (۲٦۰-۳٦۰ھ/ ۸۷۳-۹۷۱ء)۔ **المعجم الأوسط**۔ قاہرہ،مصر: دار الحرمین، ۱٤۱۵ھ۔

۱۳۲۔ طبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی (۲٦۰-۳٦۰ھ/ ۸۷۳-۹۷۰ء)۔ **المعجم الصغیر**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱٤۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔

۱۳۳۔ طبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی (۲٦۰-۳٦۰ھ/ ۸۷۳-۹۷۰ء)۔ **المعجم الکبیر**۔ موصل، عراق: مکتبۃ العلوم والحکم،

۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء۔

۱۳۴۔ طبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی (۲۶۰-۳۶۰ھ/ ۸۷۳-۹۷۰ء)۔ **المعجم الکبیر**۔ قاہرہ، مصر: مکتبہ ابن تیمیہ۔

۱۳۵۔ طبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر لخمی (۲۶۰-۳۶۰ھ/ ۸۷۳-۹۷۰ء)۔ **کتاب الدعاء**۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء۔

۱۳۶۔ طبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر لخمی (۲۶۰-۳۶۰ھ/ ۸۷۳-۹۷۰ء)۔ **مسند الشامیین**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔

۱۳۷۔ طبری، ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید بن خالد (۲۲۴-۳۱۰ھ/ ۸۳۹-۹۲۳ء)۔ **جامع البیان فی تفسیر القرآن**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۰۵ھ۔

۱۳۸۔ طحاوی، ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ بن عبد الملک بن سلمہ (۲۳۹-۳۲۱ھ/ ۸۵۳-۹۳۳ء)۔**شرح مشکل الآثار**۔ بیروت، لبنان: مؤسسہ الرسالہ، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۷ء۔

۱۳۹۔ طیالسی، ابو داؤد سلیمان بن داؤد جارود (۱۳۳-۲۰۴ھ/ ۷۵۱-۸۱۹ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ۔

۱۴۰۔ ابن عادل، ابوبکر سراج الدین عمر بن علی بن عادل حنبلی (م ۷۷۵ھ)۔ **اللباب في علوم الکتاب**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء۔

۱۴۱۔ ابن ابی عاصم، ابوبکر احمد بن عمرو بن ضحاک بن مخلد شیبانی (۲۰۶-۲۸۷ھ/ ۸۲۲-۹۰۰ء)۔ **الآحاد والمثاني**۔ ریاض، سعودی عرب: دار الرایہ، ۱۴۱۱ھ/

۱۹۹۱ء۔

۱۴۲۔ ابن ابی عاصم، ابو بکر عمرو بن ابی عاصم ضحاک بن مخلد شیبانی (۲۰۶-۲۸۷ھ/ ۸۲۲-۹۰۰ء)۔ **السنة**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۴۰۰ھ۔

۱۴۳۔ عاصمی، عبد الملک بن حسین بن عبد الملک الشافعی المکی (م ۱۱۱۱ھ)۔ **سمط النجوم العوالي في أنباء الأوائل والتوالي**۔ بیروت، لبنان: دار لکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء۔

۱۴۴۔ ابن عبد البر، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد (۳۶۸-۴۶۳ھ/ ۹۷۹-۱۰۷۱ء)۔ **الاستذکار**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۲۰۰۰ء۔

۱۴۵۔ ابن عبد البر، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد (۳۶۸-۴۶۳ھ/ ۹۷۹-۱۰۷۱ء)۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ بیروت، لبنان: دار الجیل، ۱۴۱۲ھ۔

۱۴۶۔ ابن عبدالبر، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد (۳۶۸-۴۶۳ھ/ ۹۷۹-۱۰۷۱ء)۔ **جامع بیان العلم وفضلہ**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء۔

۱۴۷۔ عبد بن حمید، ابو محمد عبد بن حمید بن نصر الکسی (م ۲۴۹ھ/ ۸۶۳ء)۔ **المسند**۔ قاہرہ، مصر: مکتبۃ السنۃ، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء۔

۱۴۸۔ عبد الحق محدث دہلوی (۹۵۸-۱۰۵۲ھ/ ۱۵۵۱-۱۶۴۲ء). **جذب القلوب إلی دیارِ المحبوب**۔ لکھنؤ، بھارت: مطبع منشی نولکشور۔

۱۴۹۔ عبد الرزاق، ابو بکر بن ہمام بن نافع صنعانی (۱۲۶-۲۱۱ھ/ ۷۴۴-۸۲۶ء)۔ **المصنف**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۴۰۳ھ۔

۱۵۰۔ عجلونی، ابو الفداء اسماعیل بن محمد بن عبد الہادی بن عبد الغنی جراحی

(۱۰۸۷-۱۱۶۲ھ/۱۶۷۶-۱۷۴۹ء)۔ **كشف الخفا ومزيل الألباس عما اشتهر من الأحاديث على ألسنة الناس**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۴۰۵ھ۔

۱۵۱۔ عجلی، ابو الحسن احمد بن عبد اللہ بن صالح (۱۸۲-۲۶۱ھ)۔**معرفة الثقات**۔ المدینۃ المنورہ، السعودیہ: مکتبۃ الدار، ۱۴۰۵ھ۔

۱۵۲۔ ابن عربی، ابو بکر محمد بن عبد اللہ (۴۶۸-۵۴۳ھ)۔**أحكام القرآن**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر للطباعۃ والنشر۔

۱۵۳۔ ابن عربی، ابو بکر محی الدین محمد بن علی (م ۶۳۸ھ)۔**التفسير**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء۔

۱۵۴۔ ابن عربی، ابو بکر محی الدین محمد بن علی (م ۶۳۸ھ)۔**الفتوحات المكية**۔ قاھرہ، مصر: الہیئۃ المصریہ العامہ للکتاب، ۱۹۸۵ء۔

۱۵۵۔ ابن عساکر، ابو قاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ بن عبد اللہ بن حسین دمشقی الشافعی (۴۹۹-۵۷۱ھ/۱۱۰۵-۱۱۷۶ء)۔ **تاريخ مدينة دمشق المعروف بـ: تاريخ ابن عساكر**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۹۹۵ء۔

۱۵۶۔ ابن العطار، ابو الحسن علی بن ابراہیم بن داود بن سلمان بن سلیمان (م ۷۲۴ھ)۔ **تحفة الطالبين فى ترجمة الإمام محيي الدين**۔ عمان، أردن: الدار الاثریہ، ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء۔

۱۵۷۔ ابن عطیہ اندلسی، ابو محمد عبد الحق بن غالب (م ۵۴۶ھ)۔**المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء۔

۱۵۸۔ عکری، عبد الحی احمد العکری الدمشقی (م ۱۰۸۹ھ)۔ **شذرات الذهب في أخبار**

من ذهب۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ ۔

۱۵۹۔ عمادی، ابو السعود محمد بن محمد (م ۹۵۱ھ)۔ **تفسیر أبي السعود۔** بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۱۶۰۔ ابو عوانہ، یعقوب بن اسحاق بن إبراہیم بن زید نیشاپوری (۲۳۰-۳۱۶ھ/ ۸۴۵-۹۲۸ء)۔ **المسند۔** بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۹۹۸ء۔

۱۶۱۔ عینی، بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد بن موسیٰ بن احمد بن حسین بن یوسف بن محمود (۷۶۲-۸۵۵ھ/ ۱۳۶۱-۱۴۵۱ء)۔ **عمدة القاری شرح صحیح البخاری۔** بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء۔

۱۶۲۔ غزالی، حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد الغزالی (م ۵۰۵ھ)۔ **إحیاء علوم الدین۔** مصر: مطبعہ عثمانیہ، ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء۔

۱۶۳۔ غزالی، حجۃ الاسلام محمد بن احمد الغزالی (م ۵۰۵ھ)۔ **المنقذ من الضلال۔** مصر: دار الکتب الحدیثہ۔

۱۶۴۔ فاسی، ابو العباس احمد زرُوق الفاسی (م ۸۹۹ھ)۔ **إغتنام الفوائد في شرح قواعد العقائد للإمام الغزالي۔** الکویت: دار الضیاء للنشر والتوزیع، ۲۰۱۰ء۔

۱۶۵۔ فاکہی، ابو عبد اللہ محمد بن اسحاق بن عباس مکی (م ۲۷۲ھ/ ۸۸۵ء)۔ **أخبار مکة في قدیم الدهر وحدیثه۔** بیروت، لبنان: دار خضر، ۱۴۱۴ھ۔

۱۶۶۔ فسوی، ابو یوسف یعقوب بن سفیان (م۲۷۷ھ)۔ **المعرفة والتاریخ۔** بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۹ء۔

۱۶۷۔ فیروز آبادی، ابو طاہر محمد بن یعقوب بن محمد بن ابراہیم بن عمر بن ابی بکر بن احمد بن محمود (۷۲۹-۸۱۷ھ/ ۱۳۲۹-۱۴۱۴ء)۔ **بصائر ذوي التمییز۔** قاہرہ، مصر:

المجلس الاعلی للشؤون الاسلامیہ، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء۔

۱۶۸۔ فیومی، احمد بن محمد بن علی المقری الفیومی (م ۷۷۰ھ)۔ **المصباح المنیر**۔قم، ایران: منشورات دار الھجرۃ، ۱۴۰۵ھ۔

۱۶۹۔ قاشانی، عبد الرزاق بن احمد بن محمد (م ۷۳۰ھ)۔ **لطائف الإعلام فی إشارات أھل الإلھام**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ

۱۷۰۔ قاضی عیاض، ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو بن موسیٰ بن عیاض بن محمد بن موسیٰ بن عیاض یحصبی (۴۷۶-۵۴۴ھ/۱۰۸۳-۱۱۴۹ء)۔ **الإلماع**۔ قاہرہ، تونس: المکتبہ العتیقیہ، ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۷۰ء۔

۱۷۱۔ قاضی عیاض، ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو بن موسیٰ بن عیاض بن محمد بن موسیٰ بن عیاض (۴۷۶-۵۴۴ھ/۱۰۸۳-۱۱۴۹ء)۔ **الشفاء**۔ ملتان، پاکستان: عبدالتواب اکیڈمی۔

۱۷۲۔ قاضی عیاض، ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو بن موسیٰ بن عیاض بن محمد بن موسیٰ بن عیاض یحصبی (۴۷۶-۵۴۴ھ/۱۰۸۳-۱۱۴۹ء)۔ **مشارق الأنوار**۔ بیروت، لبنان: المکتبۃ العتیقیہ و دار التراث۔

۱۷۳۔ ابن قدامہ، ابو محمد عبد اللہ بن احمد مقدسی حنبلی (م ۶۲۰ھ)۔**الرقة والبكاء في أخبار الصالحين وصفاتهم**۔ القاہرۃ، مصر: المکتبۃ التوفیقیۃ۔

۱۷۴۔ ابن قدامہ، ابو محمد عبد اللہ بن احمد مقدسی حنبلی (م ۶۲۰ھ)۔**المتحابين في الله**۔ دمشق، شام: دار الطباع، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء۔

۱۷۵۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر بن فرح (م ۶۷۱ھ)۔ **الإعلام بما في دين النصارى**۔ قاہرہ، مصر: دار التراث العربی، ۱۳۹۸ھ۔

۱۷۶۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن محمد بن یحیٰی بن مفرج (۲۸٤-۳۸۰ھ/ ۸۹۷-۹۹۰ء)۔ **الجامع لأحكام القرآن**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۱۷۷۔ قُسطلانی، ابو العباس شہاب الدین احمد بن محمد (۸۵۱-۹۲۳ھ/۱٤٤۸-۱۵۱۷ء)۔ **إرشاد الساري لشرح صحيح البخاري**۔مصر: دار الفکر، ۱۳۰٤ھ۔

۱۷۸۔ قسطلانی، ابو العباس احمد بن محمد بن ابی بکر بن عبد الملک بن احمد بن محمد بن محمد بن حسین بن علی (۸۵۱-۹۲۳ھ/ ۱٤٤۸-۱۵۱۷ء)۔ **المواهب اللدنية بالمنح المحمدية**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱٤۱۲ھ/ ۱۹۹۱ء۔

۱۷۹۔ قشیری، ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن نیشاپوری (۳۷٦-٤٦۵ھ/ ۹۸٦-۱۰۷۳ء)۔ **الرسالة**۔ بیروت، لبنان: دار الجیل۔

۱۸۰۔ قشیری، ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن نیشاپوری (۳۷٦-٤٦۵ھ/ ۹۸٦-۱۰۷۳ء)۔ **الرسالة**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱٤۲٦ھ/ ۲۰۰۵ء۔

۱۸۱۔ قشیری، ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن نیشاپوری (۳۷٦-٤٦۵ھ/ ۹۸٦-۱۰۷۳ء)۔ **لطائف الإشارات**۔مصر: الہیئۃ المصریہ العامۃ للکتاب۔

۱۸۲۔ قنوجی، ابو الطیب محمد صدیق خان بن حسن بن علی (۱۲٤۸-۱۳۰۷ھ)۔ **قطف الثمر في بيان عقيدة أهل الأثر**۔ الریاض،السعودیہ: وزارۃ الشؤون الاسلامیہ والاوقاف والدعوۃ والارشاد، ۱٤۲۱ھ۔

۱۸۳۔ ابن قیم، ابو عبداللہ محمد بن ابی بکربن ایوب بن سعد الذرعی (۶۹۱-۷۵۱ھ)۔

روضة المحبين ونزهة المشتاقين۔رياض، السعودي العربية: مكتبة الرشد ناشرون، ١٤٢٥ھ/ ٢٠٠٤ء۔

١٨٤۔ ابن قيم، ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر ایوب جوزیہ (٦٩١-٧٥١ھ/ ١٢٩٢-١٣٥٠ء)۔ **مدارج السالكين**۔ بيروت، لبنان: دار الكتب العلميہ، ٢٠٠٤ء۔

١٨٥۔ ابن قيم، ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر ایوب جوزیہ (٦٩١-٧٥١ھ/ ١٢٩٢-١٣٥٠ء)۔ **مفتاح دار السعادة**۔ بيروت، لبنان: دار الكتب العلميہ۔

١٨٦۔ ابن قيم، ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد الذرعی (٦٩١-٧٥١ھ)۔ **الوابل الصيب من الكلم الطيب**۔ قاہرہ، مصر: دار الحدیث، ١٩٩٩ء۔

١٨٧۔ ابن كثير، ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر بن زرع بصروی (٧٠١-٧٧٤ھ/ ١٣٠١-١٣٧٣ء)۔ **البداية والنهاية**۔ بيروت، لبنان: دار الفكر، ١٤١٩ھ/١٩٩٨ء۔

١٨٨۔ ابن كثير، ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر بن زرع بصروی (٧٠١-٧٧٤ھ/ ١٣٠١-١٣٧٣ء)۔ **تفسير القرآن العظيم**۔ بيروت، لبنان: دار الفكر، ١٤٠١ھ۔

١٨٩۔ كرمی، مرعی بن یوسف بن ابی بکر بن احمد المقدسی الحنبلی (م ١٠٣٣ھ)۔ **الشهادة الزكية في أثناء الأئمة على ابن تيمية**۔ بيروت، لبنان: مؤسسہ الرسالہ، ١٤٠٤ھ۔

١٩٠۔ كلاباذی، ابو بکر محمد بن ابی اسحاق بن ابراہیم بن یعقوب (م ٣٨٠ھ)۔ **التعرف**

لمذهب أهل التصوف۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ ۔

۱۹۱۔ کنانی، ابو الحسن علی بن محمد بن علی بن عراق (۹۰۷-۹۶۳ھ)۔ **تنزیه الشریعة**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۸۵ء۔۔

۱۹۲۔ لالکائی، ابو قاسم ھبۃ اللہ بن حسن بن منصور (م ۴۱۸ھ)۔ **شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة من الكتاب والسنة وإجماع الصحابة**۔ الریاض،السعودیہ، دار طیبہ، ۱۴۰۲ھ۔

۱۹۳۔ لالکائی، ابو قاسم ھبۃ اللہ بن حسن بن منصور (م ۴۱۸ھ)۔ **کرامات الأولیاء**۔ الریاض، السعودیہ، دار طیبہ، ۱۴۱۲ھ۔

۱۹۴۔ ماتریدی، ابو المعین میمون النسفی (م۵۰۸ھ/ ۱۱۱۴ء)۔ **تبصرة الأدلة في أصول الدين**۔ قاہرہ، مصر: المکتبۃ الازہریہ للتراث، ۲۰۱۱ء۔

۱۹۵۔ ابن ماجہ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۰۷-۲۷۵ھ/ ۸۲۴-۸۸۷ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر۔

۱۹۶۔ مازغنی،ابراہیم بن احمد الزیتونی المالکی الاشعری (م ۱۳۴۹ھ)۔**طالع البُشرى على العقيدة الصغرى**۔ الکویت:دار الضیاء للنشر والتوزیع۔

۱۹۷۔ مالک، ابنِ انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن حارث اصبحی (۹۳-۱۷۹ھ/ ۷۱۲-۷۹۵ء)۔ **الموطأ**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۵ء۔

۱۹۸۔ ابن مبارک، ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ بن واضح مروزی (۱۱۸-۱۸۱ھ/ ۷۳۶-۷۹۸ء)۔ **کتاب الزهد**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء۔

۱۹۹۔ مبارک پوری، ابو العلا محمد عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم (۱۲۸۳-۱۳۵۳ھ)۔ **تحفة الأحوذي**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۲۰۰۔ محبّ الدین طبری، ابوعباس احمد بن محمد، (م ٦٩٤ھ)۔ **ذخائر العقبى في مناقب ذوي القربى**۔ دارالکتب العصریہ۔

۲۰۱۔ محبّ الدین طبری، ابو عباس احمد بن محمد، (م ٦٩٤ھ)۔ **الرياض النضرة في مناقب العشرة**۔ بیروت، لبنان: دار الغرب الاسلامی، ۱۹۹٦ء۔

۲۰۲۔ محمد بن عبد الوہاب بن سلیمان (م ۱۲۰٦ھ)۔ **الرسائل الشخصية**۔ الریاض، السعودیہ: جامعۃ الامام محمد بن سعود۔

۲۰۳۔ محمد بن عبد الوہاب بن سلیمان (م ۱۲۰٦ھ)۔ **كشف الشبهات**۔ الریاض، السعودیہ: وزارۃ الشؤون الاسلامیہ والاوقات والدعوۃ والارشاد، ۱٤۱۸ھ۔

۲۰٤۔ مروزی، محمد بن نصر بن الحجاج، ابو عبداللہ (۲۰۲-۲۹٤ھ)۔ **السنة**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، ۱٤۰۸ھ۔

۲۰۵۔ مزی، ابو الحجاج یوسف بن زکی عبد الرحمٰن بن یوسف بن عبد الملک بن یوسف بن علی (٦٥٤-٧٤٢ھ/۱۲٥٦-۱۳٤۱ء)۔ **تهذيب الكمال**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱٤۰۰ھ/۱۹۸۰ء۔

۲۰٦۔ مسلم، ابو الحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم بن ورد قشیری نیشاپوری (۲۰٦-۲٦۱ھ/ ۸۲۱-۸۷٥ء)۔ **الصحيح**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۲۰۷۔ ابن مفلح، ابو عبد اللہ محمد المقدسی۔ **الآداب الشرعية**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱٤۱۷ھ/۱۹۹٦ء۔

۲۰۸۔ مقدسی، ابو عبد اللہ محمد بن عبد الواحد بن احمد حنبلی (٥٦۹-٦٤۳ھ/

۱۱۷۳-۱۲٤٥ء)۔ **الأحاديث المختارة**۔ مکہ مکرمہ، سعودی عرب: مکتبۃ النہضۃ الحدیثۃ، ۱٤۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء۔

۲۰۹۔ مقرئی ،ابوعمرو عثمان بن سعید بن عثمان بن سعید بن عمر اُموی (۳۷۱-٤٤٤ھ/ ۹۸۱-۱۰۵۲ء)۔ **السنن الواردة في الفتن**۔ ریاض، السعودیہ: دار العاصمہ، ۱٤۱٦ھ۔

۲۱۰۔ مقریزی، ابو العباس تقی الدین احمد بن علی بن عبد القادر بن محمد بن ابراہیم بن محمد بن تمیم بن عبد الصمد (۷٦۹-۸٤٥ھ/۱۳٦۷-۱٤٤۱ء)۔ **إمتاع الأسماع بما للنبی ﷺ من الأحوال والأموال والحفدة والمتاع**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱٤۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء۔

۲۱۱۔ ملا علی قاری، نور الدین بن سلطان محمد ہروی حنفی (م۱۰۱٤ھ/ ۱٦۰٦ء)۔ **مرقاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱٤۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء۔

۲۱۲۔ ابن الملقن، ابوحفص سراج الدین عمر بن علی بن احمد الشافعی (م ۸۰٤ھ)۔ **حدائق الأولياء**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۷۱ء۔

۲۱۳۔ ابن الملقن، ابوحفص سراج الدین عمر بن علی بن احمد الشافعی (م ۸۰٤ھ)۔ **خلاصة البدر المنير فی تخريج كتاب الشرح الكبير**۔ الریاض، السعودیہ: مکتبۃ الرشد، ۱٤۱۰ھ۔

۲۱٤۔ مناوی، عبدالرؤف بن تاج العارفین بن علی (۹۵۲-۱۰۳۱ھ/ ۱۵٤۵-۱٦۲۱ء)۔ **التيسير بشرح الجامع الصغير**۔ الریاض: مکتبہ الامام الشافعی، ۱٤۰۸ھ/۱۹۸۸ء۔

۲۱۵۔ مناوی، عبدالرؤف بن تاج العارفین بن علی (۹۵۲-۱۰۳۱ھ/ ۱۵۴۵-۱۶۲۱ء)۔ **فیض القدیر شرح الجامع الصغیر**۔ مصر: مکتبہ تجاریہ کبریٰ، ۱۳۵۶ھ۔

۲۱۶۔ منذری، ابو محمد عبد العظیم بن عبد القوی بن عبد اللہ بن سلامہ بن سعد (۵۸۱-۶۵۶ھ/ ۱۱۸۵-۱۲۵۸ء)۔ **الترغیب والترھیب من الحدیث الشریف**۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۷ھ۔

۲۱۷۔ ابن منظور، محمد بن مکرم بن علی بن احمد بن ابی قاسم بن حبقہ افریقی (۶۳۰-۷۱۱ھ/ ۱۲۳۲-۱۳۱۱ء)۔ **لسان العرب**۔ بیروت، لبنان: دار صادر۔

۲۱۸۔ نسائی، ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب بن علی (۲۱۵-۳۰۳ھ/ ۸۳۰-۹۱۵ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء + حلب، شام: مکتب المطبوعات الاسلامیہ، ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء۔

۲۱۹۔ نسائی، ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی (۲۱۵-۳۰۳ھ/ ۸۳۰-۹۱۵ء)۔ **السنن الکبری**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء۔

۲۲۰۔ ابن ناصر الدین، شمس الدین محمد بن عبد اللہ بن محمد ابن احمد بن مجاہد القیسی (م۸۴۲ھ)۔ **الرد الوافر**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۳۹۳ھ۔

۲۲۱۔ ابو نعیم، احمد بن عبد اللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ/ ۹۴۸-۱۰۳۸ء)۔ **حلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء**۔ بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔

۲۲۲۔ ابو نعیم، احمد بن عبد اللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ/ ۹۴۸-۱۰۳۸ء)۔ **مسند الإمام أبي حنیفۃ**۔ ریاض، سعودی عرب: مکتبۃ الکوثر،

١٤١٥ھ۔

٢٢٣۔ ابو نعیم، احمد بن عبد اللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصبہانی (٣٣٦-٤٣٠ھ/ ٩٤٨-١٠٣٨ء)۔ **معرفة الصحابة**۔ الریاض: دار الوطن للنشر، ١٤١٩ھ/ ١٩٩٨ء۔

٢٢٤۔ نمری، ابو زید عمر بن شبہ بصری (م ٢٦٢ھ)۔ **أخبار المدينة**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ١٤١٧ھ/ ١٩٩٦ء۔

٢٢٥۔ نووی، ابو زکریا، یحییٰ بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن محمد بن جمعہ بن حزام (٦٣١-٦٧٧ھ/ ١٢٣٣-١٢٧٨ء)۔ **التبيان في آداب حملة القرآن**۔ دمشق: الوکالۃ العامہ للتوزیع، ١٤٠٣ھ/ ١٩٨٣ء۔

٢٢٦۔ نووی، ابو زکریا، یحییٰ بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن محمد بن جمعہ بن حزام (٦٣١-٦٧٧ھ/ ١٢٣٣-١٢٧٨ء)۔ **رياض الصالحين من كلام سيد المرسلين** ﷺ۔ بیروت، لبنان: دار الخیر، ١٤١٢ھ/ ١٩٩١ء۔

٢٢٧۔ نووی، ابو زکریا، یحییٰ بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن محمد بن جمعہ بن حزام (٦٣١-٦٧٧ھ/ ١٢٣٣-١٢٧٨ء) **شرح صحيح مسلم**۔ کراچی، پاکستان: قدیمی کتب خانہ، ١٣٧٥ھ/ ١٩٥٦ء۔

٢٢٨۔ نووی، ابو زکریا یحییٰ بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن محمد بن جمعہ بن حزام (٦٣١-٦٧٧ھ/ ١٢٣٣-١٢٧٨ء)۔ **المجموع شرح المهذب**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ١٩٩٧ء۔

٢٢٩۔ نووی، ابو زکریا یحییٰ بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن محمد بن جمعہ بن حزام (٦٣١-٦٧٧ھ/ ١٢٣٣-١٢٧٨ء)۔ **المجموع شرح المهذب**۔ بیروت،

لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۲۳۰۔ نیشاپوری، نظام الدین حسن بن محمد بن حسین قمی (م ۸۵۰ھ)۔ **تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱٤۱٦ھ۔

۲۳۱۔ ہروی، ابو اسماعیل عبد اللہ بن محمد بن علی (۳۹٦-٤۸۱ھ)۔ **ذم الکلام وأھلہ**۔ المدینۃ المنورہ، السعودیہ: مکتبۃ العلوم الحکم، ۱٤۱۸ھ/۱۹۹۸ء۔

۲۳۲۔ ہروی، ابو اسماعیل عبد اللہ بن محمد بن علی الانصاری (۳۹٦-٤۸۱ھ)۔ **منازل السائرین**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱٤۰۸ھ/۱۹۸۸ء۔

۲۳۳۔ ہیتمی، ابو العباس احمد بن محمد بن علی ابن حجر (۹۰۹-۹۷۳ھ)۔ **الصواعق المحرقۃ علی أھل الرفض والضلال والزندقۃ**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالۃ، ۱٤۱۷ھ/۱۹۹۷ء۔

۲۳٤۔ ہیثمی، نور الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر بن سلیمان (۷۳۵-۸۰۷ھ/ ۱۳۳۵-۱٤۰۵ء)۔ **مجمع الزوائد ومنبع الفوائد**۔ قاہرہ، مصر: دار الریان للتراث + بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱٤۰۷ھ/۱۹۸۷ء۔

۲۳۵۔ ابو یعلیٰ، احمد بن علی بن مثنی بن یحییٰ بن عیسیٰ بن ہلال موصلی تمیمی (۲۱۰-۳۰۷ھ/ ۸۲۵-۹۱۹ء)۔ **المسند**۔ دمشق، شام: دار المأمون للتراث، ۱٤۰٤ھ/ ۱۹۸٤ء۔

۲۳٦۔ یافعی، ابو محمد عبد اللہ بن اسعد بن علی بن سلیمان (م ۷٦۸ھ)۔ **مرآۃ الجنان**۔ قاہرہ، مصر: دار الکتاب الاسلامی، ۱٤۱۳ھ/۱۹۹۳ء۔